UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224354

UNIVERSAL
LIBRARY

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۷۴

رسالۂ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ؍ مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

فی پرچہ ۴؍

تنقیح

مطبوعات الناظر پریس لکھنؤ

تاریخ عرب

مصنفہ

موسیو سیدیو فرانسیسی

عربوں کے متعلق یہ کتاب اُن تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے
جو یورپ ایشیا کے کتبخانوں کی زینت ہیں۔ مسلمانوں
کی ترقیات اور عربوں کے کمالات کا یہ آئینہ ہے
اور یورپ کے افترا و کذب کا بہترین جواب
قیمت مجلد چرمی ستہ مجلد پارچہ صہ

اسلام

[illegible] کا مقالہ در مضمون
قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

[illegible]

[illegible]
قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے [illegible])

قواعد المنتخب

جلال لکھنوی کا لاجواب رسالہ۔ جو
زبان کے متعلق بہترین تحقیقات سے لبریز ہے
قیمت ہ۱ر (خریداران الناظر سے ۳ر)

ترقی زبان بذریعہ تراجم

پروفیسر گھوشال ایم اے کا وہ قیمتی
لکچر جو لکھنؤ کی اردو کانفرنس میں پڑھا گیا
قیمت ہ۱ر
(خریداران الناظر سے ۳ر)

موازنہ انیسؔ و دبیرؔ

مؤلفہ

مولانا شبلی مرحوم

جس میں میر انیس کی شاعری پر تفصیلی
ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا
موازنہ کیا گیا ہے
قیمت ے ر
(خریداران رسالہ کے لیے ۱۲ٓ)

شوکیہ اور دو مظلوم بہنیں

قیصر بھوپالی کے دو مختصر افسانے
قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

مثنوی صبح امید

مولانا شبلی کی سب سے پہلی مطبوعہ نظم
قیمت ہ۱ر
(خریداران الناظر سے ۳ر)

مولانا شبلی کے متفرق مضامین

زیب النسا ۱ر
جہانگیر اور تزک جہانگیری ۲ر
اسلامی حکومت ۲ر
اسلامی مدارس ۴ر
(خریداران الناظر سے ¼ قیمت)

ملنے کا پتہ۔ الناظر، لکھنؤ

Checked 1975

بسم اللہ

Checked 1965

فہرست مضامین الناظر بابتہ ماہ جنوری ۱۹۲۵ء

1952

نمبر ۱۶۳ جلد ۲۸

خوشخبری

تصوف اسلام۔ مصنفہ مولوی عبد الماجد بی اے، جسکا دیباچہ اس پرچہ میں درج ہے چھپکر شائع ہوگئی ہے۔ جو صاحب چاہیں منگالیں۔ قیمت [illegible]

منیجر الناظر لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کا شکر ہے کہ

سچ اخبار

کا پہلا پرچہ ۲۔ جنوری یوم جمعہ کو نکل گیا۔ اور اُس وقت سے اب تک برابر ہر جمعہ کو نکل رہا ہے۔ اور ہر پرچہ میں ایڈیٹر کے سوا جناب مولوی عبدالماجد بی اے اور جناب مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کے مضامین دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔

الناظر کے پڑھنے والوں میں سے جو صاحب ایسا پرچہ دیکھنا پسند کرتے ہوں جو ہر قسم کے مسلمانوں کو اسلام کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر چلنے کی رائے دیتا ہو اور اُن میں جیسی جیسی خرابیاں آج پیدا ہو گئی ہیں انکو صاف صاف جتا کر چاہتا ہو کہ دُور کر دی جائیں وہ اسکے خریدار بنکر ہمارے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ فلسکیپ کے ۸ صفحے کا پرچہ ہے۔ لکھائی چھپائی الناظر کی سی۔ اور کاغذ اس سے کچھ موٹا۔ تین روپے بھیج دیجیے تو سال بھر تک پرچہ برابر پہونچتا رہے گا۔

پتہ۔ ظفر الملک مہتمم سچ اخبار۔ لکھنؤ

خود مختار رئیسوں کی خود مختاری

کو انگریز افسروں کی خفیہ دست درازیوں سے بچانے والا اور

دیسی ریاستوں کی بے زبان رعایا

کے حقوق کی حمایت میں فرعون بے سامان رئیسوں کی پروا نہ کرنے والا باتصویر ہفتہ وار اخبار

ریاست دہلی

جو صرف والیان ریاست اہلکاران ریاست اور باشندگان ریاست کیلئے جاری کیا گیا [illegible] خوشنما تصویر بھی ہوتی ہے۔ اردو کے سب اخباروں سے زیادہ شاندار اور دلچسپ [illegible] قیمت سالانہ پانچ رو[illegible]

صرف ایک کارڈ لکھ کر نمونہ [illegible]

پتہ: مینجر اخبار ریاست۔ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

النّاظر

نمبر ۱۶۳ جلد ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء

دیباچۂ تصوف اسلام

اب سے چند سال قبل، ہمارے عزیز دوست عبدالماجد صاحب کی فلسفیانہ تصانیف 'فلسفہ جذبات' اور 'فلسفۂ اجتماع' کے مقدمے، طبع و اشاعت کتاب سے پہلے 'الناظر' میں شایع ہوئے تھے، آج ہم اُنکی پہلی اسلامی تصنیف کا دیباچہ نذر ناظرین کرتے ہیں۔ کتاب غالباً اسی ماہ میں چھپ کر شایع ہو جائے گی۔

عبدالماجد صاحب کے فلسفیانہ مضامین اور تصانیف کو دیکھ کر، کون کہہ سکتا تھا۔ کہ وہی قلم جو وجودِ باری تعالیٰ کو مغربی عقلیت کے زعم میں، "ناقابلِ تسلیم" قرار دے رہا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دنیاوی لیڈر، اور زعیم سے زیادہ بلند مرتبہ نہیں لکھ سکتا تھا، ایک روز ایسا آئے گا کہ خدائے وحدہ لاشریک کی الہامی کتاب قرآن اور اُسکے آخری رسول کی بتائی ہوئی راہ کی دعوت دینے کے لیے وقف ہو جائے گا۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

عبدالماجد صاحب پر یہ رنگ، اس قدر گہرا چڑھ گیا ہے، کہ عہد سابق میں اُنھوں نے انگلستان کے نامور فلسفی، ہکسلے پر ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی، کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی، مگر اُسکے دو باب جنمیں ہکسلے کے سوانح رقم تھے، جب ہمنے الناظر کے لیے حاصل کرنا چاہے، تو عزیز موصوف نے اول تو مہینوں اس کو ٹالا، اور اسکے بعد جب، اصرار سے مجبور ہو کر، مسودہ ہمارے سپرد کیا، تو ساتھ ہی یہ ہدایت کر دی،

ہندوستان میں مسئلۂ ارتقا

ہر ملت، ہر قوم، ہر ملک کی قدیم مقدس کتابوں میں ابتدائے عالم اور خلقت انسانی ایک نہ ایک طور پر بیان کی گئی ہے۔ اگر ہم ہندوؤں کے اوتاروں کے بیانات کو اسی قبیل سے سمجھ کر تاویلات سے کام لیں تو یوں کہہ سکتے ہیں:۔

پورانوں میں زیادہ تر اوتاروں کا ذکر ہے۔ اوتار کے معنی نشانِ قدرتِ الٰہی یا ظہورِ قدرتِ الٰہی مانے جائیں تو پھر کوئی پیچیدگی غیروں کے لیے پیدا نہیں ہوتی۔ مسٹر ڈارون نے خلقت انسانی اپنے طور پر لکھی ہے اور ہندوؤں نے اپنے طور پر اس سے بہت پہلے بیان کی ہے۔ طرز بیان جدا جدا ہے لیکن ماحصل ایک ہے۔ پانی سے کائی اور کائی سے پانی کے کیڑے یا مچھلیاں ظہور میں آئیں۔ حکمائے ہند اسے یوں کہتے ہیں کہ جب کائی سے جاندار چیزیں پیدا ہونے لگیں تو غلط راستہ پر ارتقا چلا۔ گھونگھے یا سنکھ کی صورت کے جاندار پیدا ہونے لگے حالانکہ راہِ راست پر مچھلی کی خلقت تھی۔ زندگی کے لیے جھگڑنا فطرتی امر ہے۔ جسے (Struggle for existence) تنازع للبقا کہتے ہیں۔

مچھلیوں نے سنکھ پر فوقیت حاصل کی تاکہ ارتقا راہِ راست پر آجائے اور سنکھ مانع ترقی نہ ہو۔ اس لیے ابتدائے خلقت میں مچھلیوں کا گھونگھے یا سنکھ سے لڑنا اور ان پر فتحیاب ہو کے ترقی کے میدان میں ذی روح کے لیے راستہ صاف کرنا مذکور ہے یہ قدرت خداوندی ابتدائے خلقت میں "مچھ اوتار" کے نام سے موسوم کی گئی۔

پھر مچھلی سے ترقی کر کے کچھوے کی صورت ذی روح نے اختیار کی۔ اب تک تمام پانی ہی پانی تھا۔ اور کچھوؤں کی بود و باش کے لیے صرف پانی کافی نہ تھا زمین کی بھی ضرورت تھی۔ کچھوؤں نے دیتوں کو مار کر اُنکے منجمد خون سے زمین بنائی۔ خدا کی یہ قدرت "کچھ اوتار" کے کارناموں سے ظاہر کی گئی۔ اور یہ گویا خلقتِ انسانی کا دوسرا زینہ ہے۔

پھر بری جانوروں میں وہ تمام اعضا جو کچھوؤں میں پیدا ہوئے تھے خوب نمایاں ہوئے

اور انکو یہ فکر ہوئی کہ پانی زمین کو تہ آب نہ کر دے - اور اس لیے ملائکہ آب سے بڑی جانوروں کی لڑائی کی صورت دکھاکر بڑی جانوروں کی قوت باراہ اوتار سے تعبیر کی گئی - اور زمین کو سیلاب سے بچانے کے لیے مناسب تدابیر کرنے کا نام باراہ کا ہرناکس کو مغلوب کرنا بیان کیا گیا - واضح رہے کہ مچھ اوتار تک زمین کا وجود نہ تھا - مچھ اوتار کے زمانہ میں اُس کا وجود ہوا اور باراہ اوتار کے زمانہ میں اُس کا استحکام ہوا -

اب رفتہ رفتہ حیوانات نے صورتِ انسانی قبول کی - گو ابتک انسان حیوانوں سے بہت ممتاز نہ ہوے تھے - لیکن جو جامہ انسانی میں تھے اُن پر خالق عالم کا ماننا بوجہ عقل انسانی لازم تھا - راجہ ہرن کسب بوجہ اپنی قوت و اختیارات کے منکر ہوا اور خالقِ عالم کو بھولا اور اُسکے بیٹے پرہلاد نے اُسکے خیالات کی مخالفت کی - اُس وقت تک عقل انسانی ایسی مکمل نہ ہوئی تھی کہ جانوروں سے اُنکی قوت بڑھی ہوئی سمجھی جاتی - ہرن کسب کو جس نے ہلاک کرکے پرہلاد کو اُسکے غضب سے بچایا اُسکی صورت نرسنگھ کی سی نمایاں ہوئی اور اُسے نرسنگھ اوتار کا لقب دیا گیا - یہاں سے انتظامِ عالم کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے - اور یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ جو انسان کسی طرح راہ راست پر نہ آئے اُسکا علاج ہلاکت ہے -

اسکے بعد انسان نے اور ترقی کی اور ملک کا مالک بڑا راجہ بل ہوا - جسکی قوت ہر طرح بظاہر لازوال تھی - لیکن ایک چھوٹے قد والے آدمی نے جسے حکمت میں زیادہ تر دخل تھا تمام ملک سے اُسے بے دخل کر دیا اور وہ "باون اوتار" کہا گیا - اس سے خدا تعالیٰ کی یہ قدرت ظاہر ہوئی کہ انسان کی اصلی قوت اُسکی حکمت یا عقل ہے جو باون اوتار میں زیادہ تر اور راجہ بل میں کمتر تھی -

عقل اور حکمت جوہر انسانی ہیں - اس لیے ان کا ظہور شان کبریائی سے مگر پرسرام اوتار کے ذریعہ سے ہوا - جس نے تمام حکمراں قوموں کو تہ و بالا کر دیا - اور یہ سبق راجاؤں کو دیا کہ ہم وطن یعنی ذی علموں کو وہ کبھی حقیر نظر سے نہ دیکھیں -

راما اوتار کے ذریعہ سے حُبِ قومی کا سبق دیا گیا - اور اُسکے ساتھ ہی بڑوں سے ادب کرنے کا بہترین نمونہ دکھا دیا گیا -

جب زمانہ بہت کچھ ترقی کر چکا کرشنا اوتار کے ذریعہ سے حکمت، عدل، اور بہادری کا جو الگ الگ صفات ہیں ایک ساتھ استعمال کرنے کا نمونہ دکھایا گیا اور سری کرشن جی اس لیے خدا کے اوتار کہے گئے کہ انکے کارناموں اور تعلیمات میں خلقت انسانی بجمیع کمالات مکمل صورت میں نمایاں ہوئی۔ یعنی جس خلقت کی ابتدا مچھ اوتار کے زمانہ میں ہوئی تھی اب وہ انکے زمانہ میں مکمل صورت قدرت الٰہی میں ظاہر ہوئی۔

پوران کے اوتار ختم ہوئے لیکن ویدک پیشین گوئی پر نظر ڈال کر گوتم کو بھی بعض لوگ بدھ اوتار کہتے ہیں کہ اسکے ذریعہ سے قوم میں غرور و شان حکمرانی سے جو غیر مساوات کا خیال پیدا ہو چلا تھا اور جو ترقی کا لازمی نتیجہ تھا اُسکا استیصال بدھ کے ذریعہ سے ہوا۔ بعض لوگ کبیر صاحب کو جو حال میں گذرے ہیں اور جن کا سمادھ مگہر ضلع بستی ہے بدھ سمجھتے ہیں۔

انتہائے ترقی کا نتیجہ زوال ہے۔ اس لیے یہ خبر ہے کہ کسی بدترین زمانہ میں اصلاح قوم کے لیے ایک اوتار کلکی نام کا بھی ظہور ہوگا جو انسان کی گرتی ہوئی حالت کو پھر درست کریں گے۔

ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی (گورکھپور)

شکریہ

اصحاب ذیل دلی شکریہ قبول فرمائیں کہ انھوں نے الناظر کی توسیع اشاعت میں حصہ لیا:۔

قاضی ضیاء الدین احمد نگینہ (گڑگانوں) ۱-خریدار مولوی ضیاء احمد ایم اے بدایوں ۱-خریدار

قاضی غلام نذیر بی اے ایل ایل بی بدایوں ۲ " مولوی محمد اسحٰق نائب سوسی خیل (بلوچستان) ۱ "

گذشتہ چھ ماہ کے اندر ایک سو سے کم نئے خریدار احباب کی عنایت سے ہوئے ہیں یعنی جتنی خواہش لگائی تھی اُسکے نصف کے قریب۔ امید ہے کہ اس ششماہی میں بقیہ تعداد بھی پوری کردیجائیگی۔

الناظر کا حجم اگرچہ ہمارے حوصلہ اور معاونین قلمی کی عنایت کے مقابلہ میں بالکل ناکافی ہے مگر موجودہ حالت میں کسی اضافہ کی گنجایش نہیں ہے اسلیے نئے مسطر میں کچھ اور گنجایش نکالتے ہی پر قناعت کیجائیگی۔ البتہ جون تک اگر خریداروں کی تعداد میں معقول اضافہ ہوگیا تو انشاءاللہ حجم بڑھاکر پورے سو صفحے کردیے جائیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ ظفر الملک

تاریخ عرب

مصنفۂ موسیو سیدیو فرانسیسی - مترجمہ مولوی عبدالغفور صاحب رامپوری و مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی۔ تعداد صفحات (۵۷۲) ناشر:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔
قیمت:- قسم خاص (مجلد چرمی) ۸ عہ قسم عام (مجلد پارچہ) صہ ۸

"تاریخ عرب" اصل میں مشہور و معروف فرانسیسی مستشرق موسیو سیدیو کی تصنیف ہے اور آج سے کم و بیش ۶۰ برس قبل لکھی گئی تھی، پھر تقریباً ۱۳۰۵ھ میں مصر کے سررشتۂ تعلیمات کی توجہ سے اسکو عربی میں منتقل کیا گیا، اور اب ۱۹۲۴ء میں ہندوستان میں شائع ہوئی ہے۔

کل کتاب سات مقالوں اور مختلف ابواب پر منقسم ہے۔ اور جزیرہ نماے عرب کے جغرافیہ اور تاریخ قبل بعثت رسول کریم صلعم سے لیکر اس میں شمالی افریقہ کے اسوقت تک کے حالات آگئے ہیں جب آج سے ساٹھ ستر برس قبل فرانس اس سرزمین میں اپنے قدم جمارہا تھا۔ اور چونکہ کتاب کی تصنیف اور اس اقتدار و سیادت کا زمانہ بالکل ایک ہی ہے اس لیے اس میں سیاسی رنگ بھی ایک حد تک پایا جاتا ہے۔ فرانس کو اُس وقت ضرورت تھی کہ افریقہ کے عربوں کی تالیفِ قلوب کی جائے اور اُن پر یہ ظاہر کردیا جائے کہ اہل فرانس نہ صرف اُنکے دوست بلکہ انکی گذشتہ تہذیب و تمدن اور کارناموں کے مداح ہیں۔ موسیو سیدیو کی کتاب سے یہ غرض پوری ہوتی ہے۔ اسکے بعض مقامات تو ایسے ہیں جنکو پڑھکر نہ صرف عرب بلکہ تمام مسلمان مصنف کے مداح بن سکتے ہیں۔

موسیو سیدیو یورپ کے نہایت مشہور مستشرق ہیں۔ اور اُنکی یہ کتاب ایک مدت تک مستند مانی جاتی رہی۔ بلکہ اسوقت بھی اس کا علمی درجہ کچھ کم نہیں ہوا۔ الناظر بک ایجنسی کو قابل مبارکباد سمجھنا چاہیے کہ اُس نے اسکو اُردو داں پبلک کے سامنے پیش کیا۔ لیکن ہمیں یہ دیکھکر سخت افسوس ہوا کہ باوجود مصنف کی شہرت اور عظمت کے تمام کتاب غلط بیانات، غلط واقعات اور

بے احتیاط تاریخ سے بھری ہوئی ہے - چونکہ جو ترجمہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ درحقیقت ترجمہ در ترجمہ ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان غلطیوں میں سے کتنی کی ذمہ داری مصنف پر عائد ہوتی ہے اور کتنی کی عربی اور اُردو مترجمین پر - شروع کے چند صفحات میں اُردو مترجموں نے غلطیوں کو حاشیۂ زیریں میں ظاہر کرکے اُن کا ازالہ کردیا ہے - لیکن اسکے بعد یہ اہتمام باقی نہیں رہا - نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ غلطیاں جوں کی توں قائم رہ گئی ہیں - سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ مولانا سلیمان ندوی صاحب کی نظر سے بھی گذرا تھا اور آپ نے اُس پر نظرثانی فرمائی ہے - ہم کو زیادہ تعجب اس بات کا ہے کہ مولانا نے بھی ناظرین کی توجہ ان فروگذاشتوں کی طرف مبذول نہیں کی - جس طمطراق سے اس وقت یہ کتاب پیش کی جارہی ہے اس سے اندیشہ ہے کہ یہ غلطیاں بھی کہیں "مستند" نہ ہو جائیں -

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کتاب عرب کے جغرافیہ اور عرب قبل اسلام کے حالات سے شروع ہوتی ہے - اس حصہ میں جو صفحہ ۵۰ پر ختم ہوتا ہے مصنف نے کوئی خاص طور پر نئی اور مفید بات بیان نہیں کی - وہی پرانے طرز پر غلط یا صحیح واقعات بیان کردیے ہیں - اور انکے بیان کرنے میں بھی بعض اوقات غلطیاں کی ہیں - غنیمت ہے کہ مترجموں نے حاشیۂ زیریں میں ان کا ازالہ کردیا ہے - بہرنوع یہ ۵۰ صفحے کسی طرح بھی ہماری پرانی معلومات میں اضافہ نہیں کرتے - بلکہ اگر بے احتیاطی سے پڑھے جائیں تو یقیناً خرابی کا باعث ہوں گے - ضرورت ہے کہ انکو مستند نہ سمجھا جائے - اور پڑھنے میں احتیاط کی جائے -

ان پچاس صفحوں کے بعد مصنف نے سیرت نبویؐ پر خامہ فرسائی کی ہے - لیکن اس قدر بے ربطی کے ساتھ کہ پڑھنے والے کو نہ تو سیرت سے کوئی واقفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ وہ اس سے کوئی خاص نتیجہ ہی اخذ کرسکتا ہے - مثال کے طور پر غزوات کا حال ملاحظہ ہو (صفحہ ۶۵-۶۷) یہ واقعات اس قدر بے ترتیب ہیں کہ انکے پڑھنے سے ہرگز کوئی نتیجہ نہیں نکلتا - بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض بے وجہ قریش اور دوسرے کفار عرب سے لڑتے رہے تھے اور ان لڑائیوں کا مقصد سوائے لوٹ مار کے اور کچھ نہ تھا - مزید براں ان واقعات کے قلمبند کرنے میں بھی غلطیاں موجود ہیں - مثلاً موتہ کے واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اللہ نے انھیں (یعنی مسلمانوں کو) فتح عنایت

کی - پھر خالد مسلمانوں کو لیکر مدینہ لوٹ آئے" اس فقرہ کا پہلا حصہ غلط ہے - فتح طائف کے بیان میں عجیب و غریب تناقض ہے - صفحہ ۸۳ پر لکھتے ہیں کہ منجنیق سے ان پر سنگباری کی اور مغلوب کرکے انکی گردنیں ماریں" یہ واقعہ غلط ہے - مگر غنیمت ہے کہ خود مصنف نے ص۸۵ پر اسکی تردید کردی ہے "پھر بنو ثقیف کے سفیر آپ کے پاس آئے اور مسلمان ہوگئے"

سیرت سے آگے بڑھیے تو حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانۂ خلافت کے واقعات معلوم ہوتے ہیں - لیکن ص۱۱۸ پر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے جھگڑوں کا بیان بعض جگہ سے غلط ہے - اور ساتھ ہی ساتھ اس قدر مبہم ہے کہ پڑھنے والا نہ تو واقعات کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور نہ کسی نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے - بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اسکے پڑھنے سے غلط فہمیوں میں اضافہ ہوگا -

بحیرہ روم کی بحری جنگوں اور قسطنطنیہ کے پہلے محاصرہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :-

"اسکے بعد وہ (یعنی امیر معاویہ) مستقلاً خلیفہ ہوگئے اور ۳۱ھ میں رومیوں سے بحری معرکہ آرائیاں کیں - پھر انھوں نے ایک بیڑہ تیار کیا اور ۴۵ھ کے موسم بہار میں قسطنطنیہ کا رخ کیا - وہ بحیرۂ مرمرہ میں داخل ہوے اور قسطنطنیہ کے مغربی جانب اتر پڑے - وہ پیہم چھ برس تک محاصرہ کیے رہے .... اس لیے ۵۱ھ میں شام لوٹ آئے" (ص۱۳۵)

یہ تمام عبارت گلفشانیوں سے پر ہے - اول تو عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ ۳۱ھ میں یعنی اصلی واقعہ سے ٹھیک دس سال قبل خلیفہ ہوگئے تھے - دوسرے ۴۵ھ میں قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع ہوا اور ۵۱ھ میں ختم ہوا - یہ تمام عرصہ مصنف کے نزدیک صرف چھ برس کا ہوتا ہے!! پھر عبارت کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ خود اس محاصرہ میں شریک تھے - وہی اپنی فوج کو لڑاتے تھے اور وہی اسکو لیکر ۵۱ھ میں شام واپس آگئے - یہ سب غلط ہے -

صفحہ ۱۳۵ پر امیر معاویہ کے قبل از خلیفہ ہونے کے حالات درج تھے اسکے بعد باب ثالث میں پھر اکبارگی حضرت عمرؓ کے عہد کی طرف توجہ فرمائی گئی ہے - چنانچہ صفحہ ۱۳۷ پر لکھتے ہیں :-

"حضرت عمر ابن الخطاب فتح شام کے بعد وہاں سے حضرت عمرو ابن العاص کو اپنے ساتھ لے کر واپس ہوے کہ ان کو مصر کی طرف روانہ کریں - ان کا انتخاب انکے عزم و استقلال ...... کی بنا پر ہوا"

یہ واقعہ بالکل غلط ہے جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے حضرت عمرو ابن العاص نے خلیفہ کی اجازت کے بغیر مصر پر حملہ کیا تھا اور اسکی تیاری کے لیے مدینہ نہیں گئے تھے۔ بلکہ فلسطین میں جو فوج ان کے پاس تھی اسی کو لیکر مصر چلے گئے تھے۔

اب چند مزید انکشافات ملاحظہ ہوں۔

"ان (یعنی حضرت عمر) کی وفات کے بعد انھوں (یعنی سرداران قریش) نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنایا۔ لیکن حضرت عثمان سے اپنی رائے کے مطابق احکام جاری کرانے کے پیرایہ میں وہ اپنی برتری ظاہر کرنے لگے۔ مگر حضرت عثمان نے انکے غلبہ کو نہ مانا اور اُنکے قابو میں نہ آئے۔ اس لیے انھوں نے اُنکی تائید اور مدد سے دست کشی اختیار کی۔ یہ دیکھ کر انھوں نے اپنی تقریروں کے زور سے ممالک اسلامیہ میں لوگوں کو آمادۂ بغاوت کر دیا جس سے آخر کار خلیفہ کا قتل واقع ہوا" (صفحہ ۱۵)

متذکرہ بالا فقرہ میں دیگر غلطیوں کے علاوہ یہ معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ خط کشیدہ انھوں کی ضمیر کس کی طرف راجع ہوتی ہے۔ اور فقرے کے آخری حصہ کا مطلب مترجم صاحب کے نزدیک کیا ہے۔ اس قسم کی خامیاں ترجمہ میں اکثر جگہ نظر آتی ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو واقعہ کا واقعہ ہی بدل جاتا ہے۔ بہر حال اگر مترجم صاحب کا مطلب اُنھوں سے سرداران قریش یعنی بنی امیہ ہیں تو ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ واقعہ کہاں تک درست ہے کہ بنی اُمیہ نے اپنے شیخ و سردار حضرت عثمان کے خلاف تمام اسلامی ممالک میں اپنی تقریروں سے فساد پھیلایا تھا۔ اُنھوں کا ایک عجیب طلسم ملاحظہ ہو:۔

پھر انھوں نے انتقامِ حضرت عثمان کی بنا پر حضرت علی سے جدال و قتال شروع کر دیا۔ یہانتک کہ جب وہ اس معاملہ میں بھی کامیابی سے عاجز ہو گئے تو اُنھوں نے ایک ایسے شخص کو علی پر لگایا کہ جس نے اُنھیں دھوکے سے قتل کر دیا۔ (صفحہ ۱۵)

اس فقرہ میں اُنھوں کا استعمال قابل رشک ہے۔ پہلے انھوں سے تو یقیناً بنی اُمیہ مراد ہیں لیکن اگر دوسرا انھوں بھی اُنھیں کی طرف راجع ہے تو یقیناً مترجم یا مصنف نے انکی فرد قرارداد جرم میں ایک اور اضافہ کیا ہے جو بعض حضرات کے لیے خاص طور پر خوش آیند ہوگا۔

اب چند ایسے تاریخی انکشافات ملاحظہ ہوں جن کی مثال دوسری کتابوں میں نہ ملیلی :

"پھر زیاد ابن ابی سفیان اُٹھا ..... جس نے حضرت (امام) حسن کو بھی ۴۹ھ میں زہر دیکر اور عبد الرحمٰن ابن خالد ابن ولید کو بھی ...... اور نیز بہت سے آدمیوں کو قتل کرا دیا" (ص ۱۵۱)

"یہاں عبید اللہ ابن زیاد نے جو یزید ابن معاویہ کا نائب تھا شمر کو ان (امام حسین) کی طرف بھیجا کہ اُنھیں قتل کر دے ۔ اُس سے حضرت امام حسین نے کہا کہ میں تیرے ساتھ یزید کے پاس چلتا ہوں مجھے اپنے ساتھ لے چل اور نہیں تو مجھے مدینے لوٹ جانے دے مگر شمر نے نہ مانا" (ص ۱۵۲)

"اُس لیے مدینہ والوں نے انھیں (یعنی عبد اللہ بن زبیر کو) اپنا مقتدا بنا لیا ۔ اور جو شخص یزید کی طرف سے مدینہ کا والی تھا اُسے نکال باہر کیا" ص ۱۵۲

"جب ان (یعنی عبد اللہ ابن زبیر) کے بھائی مصعب ابن زبیر دمشق کی تسخیر کو گئے" (ص ۱۵۲)

"جب عبد الملک ابن مروان نے دیکھا کہ اسکے طرفداروں کو حج کرنا دشوار ہے تو اُس نے بیت المقدس کو زیب و زینت دی کہ لوگ وہاں جاکر زیارت کر لیا کریں" (ص ۱۵۴)

"مختار ابن ابی عبید ابن صرد کے بقیہ لشکر کو فراہم کرکے خود خلیفہ بن گیا" (ص ۱۵۴)

"موسیٰ ابن نصیر کو مکہ جلا وطن کر دیا" (ص ۱۶۶)

خلیفہ واثق نے اپنی عقل سے یہ مسئلہ ایجاد کیا تھا کہ قرآن مخلوق نہیں بلکہ ازلی ہے (ص ۱۸۵)

اول تو یہ واقعہ ہی سرے سے غلط ہے مگر زیادہ تعجب یہ ہے کہ خود مصنف نے اسکی تردید کردی ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

"معتصم اور واثق نے بھی اس (مامون) کا اتباع کیا" (ص ۱۹۶)

"ظاہر یہ خاندان میں سے اول ابراہیم ابن الاغلب ہوا" (ص ۱۹۹)

اسی پیراگراف میں دو سطر بعد ارشاد ہوتا ہے :-

"ان کے بعد جو تھا امیر طاہر ہوا جو خلیفہ مامون کے لشکر کا سپہ سالار تھا" (ص ۱۹۹)

"علویہ خاندان میں حسن بن زید سب سے اول دیلم، جرجان طبرستان کا والی مقرر ہوا" (ص ۱۹۹)

"معتز اور معتضد کے زمانہ میں وہ عربوں کے حملوں کی برابر مقاومت کرتا رہا اور پھر جب معتمد علی اللہ خلیفہ ہوا تو اُس کا بھائی موفق۔ الخ (صفحہ ۲۰۱)

معتضد معتمد کا بھتیجا اور موفق کا بیٹا تھا۔ معتمد کے بعد خلیفہ ہوا۔ بجائے معتضد کے مہتدی ہونا چاہیے۔ اس قسم کی فروگذاشتیں کتاب میں بکثرت ہیں۔ اور انکی وجہ سے کتاب میں اور چار چاند لگ گئے ہیں۔

"۳۲۳ھ میں بابک نے صوبۂ آذربائیجان میں فرقۂ اسماعیلیہ کی بنیاد ڈالی" (صفحہ ۲۰۶)

اس انکشاف کا جواب دنیا نہیں دے سکتی۔

"آخر پھر لوگوں نے حجر اسود کو مکہ بھیج دیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اُسے وہیں پھر رکھدیں۔ مگر اُس میں سے ایک ٹکڑا توڑ لیا اور اپنے مسکن کے دروازہ پر رکھدیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب لوگ بوت لوک میں جاتے تو دو زانو مودب بیٹھتے۔ اور اسی وجہ سے خلیفہ کے مسکن کو باب عالی سے تعبیر کرتے تھے۔ بعد ازاں سلاطین قسطنطنیہ کے باب پر اس کا اطلاق ہونے لگا" (صفحہ ۲۰۷)

باب عالی کے نام اور دو زانو مودب بیٹھنے کی اس سے زیادہ لطیف توجیہ غالباً ناظرین کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔

"چنانچہ اسی وقت سے (یعنی عبدالرحمٰن الداخل کے عہد سے) خلافت مغربیہ خلافت مشرقیہ سے جدا ہوگئی"۔ (صفحہ ۲۳۵)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عبدالرحمٰن الداخل کے اندلس پر قابض ہونے سے عبدالرحمٰن ثالث الناصر لدین اللہ کے نصف عہد حکومت تک نہ تو اندلس کے بنی اُمیہ نے خود خلیفہ ہونے کا دعوٰی کیا اور نہ انکو تاریخ میں خلیفہ کہا گیا۔ یہ تمام زمانہ امارت ہے۔ مصنف نے امارت اور خلافت میں فرق نہیں کیا۔ اور ہر جگہ اُس عہد کو بھی خلافت ہی سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مترجموں کی ادنیٰ کوشش سے اس غلطی کا ازالہ ہو سکتا تھا۔

"اسی غرض کے انجام کے واسطے امیر یوسف کے معاہد علی ابن مغیث والی قیروان نے چاہا الخ (صفحہ ۲۵۸)

علی ابن مغیث قیروان کے کسی والی کا نام نہ تھا۔ ایک شخص تھا جس کو منصور عباسی نے اندلس کے سیاسی حالات معلوم کرنے اور اگر موقع ہو تو امویوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے کے لیے بھیجا تھا مگر وہ عبدالرحمٰن الداخل کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہوا۔

"کیونکہ امیر پیلا دگا بھی نے عبد الرحمٰن اول سے پیشتر اندلس کے امراء سے ایک چھوٹی سی ریاست بالکل آزاد و باقی رکھوالی تھی تا کہ نصرانی پناہ گزیں ہوا کریں" (صفحہ ۲۶۴)

مذکورۂ بالا عبارت کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیلا دگا بھی اور اندلس کے امرا میں نہایت دوستانہ تعلقات تھے۔ اور انھیں کی بنا پر اندلس کی اسلامی فتح کے بعد پیلا دنے دوستانہ طریقہ سے امرائے اندلس سے کہا کہ "تم نے تمام ملک پر تو تم قبضہ کر ہی چکے ہو۔ مگر چھوٹی سی ریاست ہمارے لیے بھی چھوڑ دو کہ بھاگے ہوئے نصرانی وہاں پناہ گزیں ہوا کریں"۔ مسلمان امرانے پیلا دکی اس درخواست کو ازراہ مروت مان لیا تھا۔ اور نصرانیوں کے لیے یہ جگہ خالی کر دی تھی۔ تا کہ آئندہ وہ ترقی کر کے اپنے محسنوں کو ملک سے نکال دیں!!! معلوم نہیں کہ اس گلکاری کی داد مصنف کو ملنی چاہیے یا مترجموں کو۔

اسی قسم کے دو اور مبہم فقرے ہم ذیل میں نمونۃً درج کرتے ہیں۔ یقیناً ادنیٰ توجہ ایسے فقروں کا ابہام دور ہو سکتا تھا۔ لیکن جس صورت میں کہ وہ اسوقت کتاب میں موجود ہیں اُس سے واقعہ کا واقعہ بالکل تبدیل اور غلط ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے فقرے اور عبارتیں کتاب میں اکثر جگہ ملتی ہیں اور کتاب کی قدر و قیمت کو زیادہ کرتی ہیں:۔

"اسکے بعد وزیر منصور کو افریقیہ کے زناتہ قبائل کی طرف جانا پڑا" (صفحہ ۲۶۹)

پھر یہ وزیر بھی زناتہ کو مطیع کر کے اندلس لوٹ آیا" (صفحہ ۲۶۹)

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ منصور حاجب اور وزیر ہونے کے بعد کبھی افریقیہ نہیں گیا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"المنصور نصاریٰ پر کامل فتوحات حاصل کرنے کی وجہ سے ایسا ہر دلعزیز ہو گیا تھا کہ مسلمانوں نے حکومت اندلس اسی کے خاندان میں منتقل کر دینے کا ارادہ کر لیا"۔ (صفحہ ۲۸)

یہ تمام بیان سراسر غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ منصور باوجود اپنی فتوحات، جود و سخا، شان و شوکت اور تدبر و تنظیم کے کبھی اتنا ہر دلعزیز نہیں ہوا تھا کہ عوام الناس اپنے قدیم امراء و خلفاء کے خاندان کو اس قدر بھلا دیں کہ اُسے اور اُسکی اولاد کو اپنا بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ منصور کی موت کے بعد اُسکے بیٹے عبد الملک المظفر (جس کو ہمارے مصنف نے ذی طرح سے

المنصور ہی کا خطاب دیا ہے (ص ۲۵۰) اور خاصکر دوسرے بیٹے عبدالرحمٰن سنکول کی انھیں کوششوں نے اس عظیم الشان سلطنت کو عوام الناس کے ہاتھوں اس طرح برباد کیا کہ ان کا ایک فرد بشر بھی نہ بچ سکا اور انکے عالیشان محلات کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

"امام مالک کا مذہب سپین میں تو بہ پھیلا۔ اس کے اسباب یہ ہوے کہ خلیفہ حکم مرتضٰے ابن ہشام بن عبدالرحمٰن ابن معاویہ ابن ہشام ابن عبدالملک بن مروان بن الحکم نے اپنے باپ ہشام بن عبدالرحمٰن کے بعد سریر آرائے خلافت ہو کر ۱۸۰ھ میں لقب المنتصر اختیار کیا تو اُس نے امام ابو حنیفہ کا مذہب چھوڑ کر امام مالک کا مذہب اختیار کر لیا اور قاضی یحییٰ بن یحییٰ ابن کثیر کو اپنا مقرب خاص قرار دیا" (ص ۴۳۱)

تاریخی لحاظ سے اس عبارت کا ایک ایک لفظ غلط ہے۔ اس پر بحث کرنا تحصیل حاصل ہے۔

صفحات ۴۶۴ - ۴۵۳ میں مصنف علام نے عربی مورخوں کا ذکر کیا ہے اور اُنکے حالات لکھے ہیں۔ ان میں "خوبی" یہ ہے کہ نظام سنین کو غالباً مصنف نے بالکل بیکار سمجھ لیا ہے اور محض اپنی عقل و فہم پر بھروسہ کر کے جسکو چاہا ہے مقدم کر دیا ہے اور جسکو چاہا ہے مؤخر۔ مثلاً ابن خلدون۔ مقریزی اور سیوطی (ص ۴۵۵) کے بعد کہیں جا کر بیچارے مسعودی، طبری، ابن اثیر اور نویری کی باری آئی ہے (ص ۴۵۷)۔ پھر جس ترتیب سے ان ناموں کو بحث کے عنوان پر لکھا گیا ہے وہ بھی ہمارے مصنف کا خاص حصہ ہے۔ اسکے علاوہ بہت سے ناظرین کو پڑھ کر تعجب ہوگا کہ:۔

"عرب مورخین میں سے ابو الفداء، ابو الفرج، اور بہاء الدین کا شمار طبقۂ اُولیٰ میں کیا جاتا ہے" (ص ۴۵۳)

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ مورخین کے باب کے دس کے دس صفحے پڑھ جائیے۔ اور آپ قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے سوائے دردِ سر، اور خزف ریزوں کے اور کچھ حاصل نہیں کیا۔ نہ تو عبارت سے تاریخ اسلامی کے ارتقا ہی کا پتہ چلتا ہے اور نہ نظام سنین کی بے قاعدگی کی وجہ سے مورخین کی تقدیم و تاخیر کا۔ ہمارے نزدیک تو اگر یہ دس صفحے نہ لکھے جاتے تو بھی کتاب کے "مستند" ہونے میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ ان صفحوں میں کم از کم دو باتیں نہایت عجیب و غریب پائی جاتی ہیں۔ صفحہ ۴۵۷ پر تاریخ سنویہ مصر کا ذکر ہے اس سے ابو المحاسن، ابن تغری بردی کی کتاب النجوم الزاہرہ فی ملوک المصر و القاہرہ ص ۴۶۲ پر اللمحات المشرقیہ مصنفہ مصطفیٰ ابن عبداللہ

(حاجی خلیفہ) کا نام آتا ہے - اس سے حاجی خلیفہ کی مشہور و معروف کتاب کشف الظنون مراد لینی چاہیئے - ہمارے مترجموں نے ان کتابوں کے لاطینی ناموں کا ترجمہ کیا ہے - گر ہمکو یہ یاد کرنے میں بہت کچھ تامل ہے کہ فاضل مترجم ان دو مشہور و معروف کتابوں کے ناموں تک سے ناواقف ہیں۔

دو ہی صفحے آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :-

"المعتضد نے بوران سے شادی کی" (ص ۲۶۶)

اس فقرہ میں کمال کر دیا گیا ہے - تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بوران مامون کے ایرانی وزیر حسن ابن سہل کی بیٹی اور مامون کی بیوی تھی - معتضد معتصم کا پر پوتا تھا - اور معتصم مامون کا بھانجا - مامون کا انتقال ۲۱۸ھ میں ہوا ہے - اور معتضد ۲۷۹ھ مین خلیفہ ہوا ہے - خدا کرے یہ غلطی کاتب یا مصحح کے سر تھوپی جا سکے - جو ذرا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے -

تاریخ عرب کے ان نئے اکتشافات کے متعلق جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ نہایت مختصر تھا - کیونکہ طوالت کے خوف سے اور بہت سی "سیاہ دون" اور اکتشافات کو قلم انداز کر دیا گیا ہے - اگر ناظرین تکلیف کریں اور کتاب کو بنظر امعان پڑھیں تو کم و بیش ہر صفحہ پر اس قسم کی گلفشانیوں سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں -

اب تک ہم نے صرف اُن باتوں پر غور کیا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح مصنف سے سمجھا جا سکتا تھا - اور اُنکی ذمہ داری زیادہ تر اُسی پر عائد ہوتی تھی - مگر اب تصویر کے دوسرے رُخ پر غور کیجیے - ویسے تو کتاب کتابت کی غلطیوں سے اس قدر پُر ہے کہ بعض مرتبہ یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش اسکے ازالہ کے لیئے ایک غلطنامہ کا اضافہ کر دیا جاتا - اور چونکہ یہ اُردو کی مطبوعہ کتابوں کا ایک جزو لاینفک ہو گیا ہے - اس لیئے اس کا ہونا معیوب بھی نہیں سمجھا جا سکتا - اس قسم کی غلطیوں سے قطع نظر کر کے ہم صرف اُن غلطیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ جن کا الزام کسی طرح بھی کاتب کے سر نہیں رکھا جا سکتا - بلکہ اُنکو التزاماً غلط لکھ کر تاریخ کا خون کیا گیا ہے - لیکن چونکہ ان کا حصر کرنا بھی مشکل ہے اس لیئے چند الفاظ بطور نمونہ پیش کیئے جاتے ہیں -

صفحہ ۱۴۳ پر سب سے پہلے ہم نے عتبہ بن نافع کا نام پڑھا - خیال ہوا کہ کتابت کی غلطی ہو مگر اسکے بعد جب یہی نام ہر جگہ بجائے عقبہ بن نافع کے دہرایا گیا تو یقین آیا کہ بیچارے کاتب کا

اس میں کوئی قصور نہیں - اسی طرح صفحہ ۱۶۱ پر حسان (ابن لقمان) کی جگہ حسن ہے - اور ہر موقع پر یہی نام لکھا گیا ہے - صفحہ ۱۹۹ پر خاندان صفریہ کا حال درج ہے - لیکن ہم کو یقین ہے کہ اس نام کا خاندان کوئی نہیں گذرا - ہاں صفریہ خارجیوں کا ایک فرقہ ضرور ہے لیکن چونکہ اس موقع پر یعقوب ابن لیث بانیِ خاندان صفاریہ کا ذکر ہے اس لیے صفریہ سے صفاریہ" مراد" لی گئی ہے - یہ نام بھی التزاماً غلط تحریر ہوا ہے - اسی طرح بجائے سامانیہ کے سمانیہ (ص۲۰۳) امیر حمدان کے امیر ہمدان (ص۲۰۳) - اور تعجب پر تحجب یہ ہے کہ بجائے قرامطہ کے کرمانیہ (ص۲۰۶) - تاہرت کے طہرت (ص۲۴۹) - الحکم کے الحاکم (ص۲۵۴) ابن حمود کے ابن حامد - عروج کے ہروج (ص۳۲۹) - اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ خود ہندوستان کے شہر کالی کٹ کے بجائے ہر جگہ کلکتہ (ص۴۷۳) درج ہوا ہے - اس آخری غلطی سے کتاب کے ایک حصہ میں خاص "شگفتگی" پیدا ہوگئی ہے - اور پہلے پہل جب یہ نام آتا ہے تو پڑھنے والا ضرور مبہوت ہوکر رہ جاتا ہے - یہ تمام نام تو بالالتزام غلط لکھے گئے ہیں - صفحہ ۳۰۶ پر حنظوطہ، ہرجہ، اور جدمویہ تین بربری قبائل کے نام ہیں - ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے ان قبائل کے نام نہیں سُنے - لیکن یہ بھی یقین ہے کہ مترجم ذرا سی کوشش میں انکی صحت کر سکتے تھے بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی نام کو مختلف مقامات پر مختلف طور پر لکھا گیا ہے - اس سے جو پریشانی ناظر کتاب کو ہوتی ہے وہ ظاہر و باہر ہے - مثلاً اول تو سرقسطہ[1] کو سراقسطہ (ص۱۶۶) سراغوسا (ص۲۸۴) اور سراغوسہ (ص۲۹۷) بھی لکھا گیا ہے - اسی طرح شنت یا قوب کو قدلیں یا قوب کا کنسیہ (ص۲۶۸) اور کنسیہ سینٹ جاگ[2] لکھا گیا ہے - پڑھنے والے کو شبہہ ہوتا ہے کہ یہ مختلف مقامات کے نام ہیں -

علاوہ بریں خصوصاً شروع کے حصہ میں یونانی قیصروں اور دوسرے یوروپین لوگوں کے نام ہیں - یہ نام عام طور پر اُردو داں حضرات کے لیے بالکل نامانوس ہوتے ہیں - اور پھر انکے لکھنے کا ڈھنگ ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے انکی اس صفت میں بجائے کمی کے زیادتی ہوگئی ہے - اگر یہ نام صاف تحریر ہوتے یا ناموں کے بعد اصلی نام بھی انگریزی حروف میں لکھ دیے جاتے تو کتاب کا ایک نقص مٹ جاتا اور ناظرین کو پڑھنے میں دقت بھی نہ ہوتی -

کتاب میں متعدد مقامات ایسے بھی ہیں جن میں مصنف نے اپنے اُن خیالات کا اظہار کیا ہے جو بغیر رد و قدح اور بحث کے تسلیم نہیں کیے جا سکتے - اور بعض تو ایسے ہیں کہ بالکل ناقابل قبول ہیں - مثلاً:-

[1] اور دوسرے موقع پر بعض اوقات [illegible] لکھا گیا اور یہ دونوں نام [illegible] الگ الگ [illegible] دوسرے [illegible]

[2] [illegible]

"خلفائے امویہ نے ان بادشاہوں کے عادات و اخلاق کو اختیار کر لیا جن کے ملک پر انھوں نے قبضہ کیا تھا۔ یہاں کی رعایا ذلیل اور دنی الطبع تھی۔ اس لیے خلفاء بھی ویسے ہی ہو گئے جیسے قیاصرۂ روم و شاہان فارس تھے۔ اُنھوں نے اپنا طرز حکومت بالکل ستبدانہ کر لیا۔" (ص ۱۵۷)

"اُسی قساوت قلبی اور بے رحمانہ حرکت کے سبب لوگوں نے اسکو سفاح یعنی قتال کا خطاب دے دیا" (ص ۱۸۱)

"یہ فخر خلفاء کے زمرہ میں صرف ابوجعفر المنصور عباسی کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے عربوں کو دماغی اور ذہنی مشاغل کی طرف مشغول کیا" (ص ۳۶۸)

"تاہم وہ بنی اسرائیل کے طرز تمدن سے اس بارے میں ضرور خلاف تھے کہ مغلوب و فاتح اقوام کی عورتوں سے تناسلی اختلاط قائم کیا جائے۔ مگر اس تناسلی اختلاط کے باوجود اُنھوں نے اپنی عربی سرشت میں ذرہ بھر فرق نہ آنے دیا" (ص ۳۰۰)

"طاہر نے خلیفہ مامون کو مسند خلافت دلانے اور خراسان میں اسکی حکومت قائم رکھنے میں بڑی سرگرم کوشش کی تھی۔ اور شہر بغداد اور قصر خلافت کو امین سے چھین کر مامون کے حوالہ کیا تھا۔ اس لیے مامون نے اس اخلاص، وفاداری اور جاں نثاری کا صلہ یہ تجویز کیا کہ اُسے خراسان کا مطلق العنان و ذی اختیار گورنر بلکہ باتحت بادشاہ بنا دیا" (ص ۳۰۳)

"پھر اہل عرب نے یونانی کتابوں کا مطالعہ کیا تو نئی نئی بندشیں انکی نظر سے گذریں اور عربی زبان میں وسعت پیدا ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ترقی کرتے کرتے یہ اہل مشرق کی علمی زبان بن گئی" (ص ۴۳۰)

افسوس ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ان تمام خیالات پر مفصل بحث نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے آخری فقرہ خصوصاً قابل غور ہے۔ یہ تو کم و بیش مسلم ہے کہ مولدین کی عربی شاعری پر ایرانی اثرات نہ صرف پڑے تھے بلکہ غالب آ گئے تھے۔ لیکن یہ نہایت ہی دلچسپ سوال ہے کہ آیا عربی ادب پر یونانیوں کا کوئی اثر ہوا تھا یا نہیں؟

باوجود ان تمام خرابیوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا، یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کتاب تمام کی تمام

بالکل بیکار ہے۔ اسکے بعض حصے یقینی طور پر قابل تعریف ہیں۔ خصوصاً وہ حصے جن میں مصنف نے تاریخ کو چھوڑ کر عباسیوں، فاطمیوں، اور اندلس کے امویوں کے نظم و نسق اور علوم و فنون پر بحث کی ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۸۹-۱۹۳ تک خلفاء عباسیہ کے اعمال عامہ، صنعت و حرفت و فلاحت، اور فنون لطیفہ و صناعیہ کا ذکر نہایت واضح ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۵۵ پر عبد الرحمن الناصر لدین اللہ اموی کے کارنامے قابل دید ہیں۔ صفحہ ۲۷۲ پر اندلس کے عربوں کی فہم و ذہانت اور ان کے حسن اخلاق کا حال خوب ہے۔ اس قسم کے مقامات کتاب میں متعدد ملیں گے۔

مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ چونکہ کتاب مختصر ہے اور یہ تمام باتیں محض ضمناً بیان ہوئی ہیں اسلیے نہایت تشنہ ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے بھی اب تک ان باتوں کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی۔ حالانکہ ضرورت ہے کہ سیاسی تاریخ کو چھوڑ کر اس پر کام کیا جائے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا ابتدائی مرکز مدینہ منورہ تھا۔ وہاں سے یہ مرکز دمشق میں منتقل ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عرب اپنی فتوحات سے فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ اور اب تک بیرونی اقوام کا اثر ان پر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ انھوں نے اپنے لیے ایک الگ دنیا بنالی تھی۔ یہ خالص عربی تہذیب کا زمانہ تھا۔ اور بُرا ہو یا بھلا یہی وہ زمانہ تھا جبکہ آیندہ کی عظیم الشان اسلامی تہذیب کی بنیاد قائم ہوئی۔ بہر حال ۱۳۲ھ میں عربی عہد ختم ہوا۔ اور بنی عباس کے ساتھ بغداد میں "عربی - ایرانی" عہد شروع ہوگیا۔ اس زمانہ میں اسلامی تہذیب و حکومت ایشیا میں انتہائے عروج کو پہونچی۔ مسلمان تمام دنیا میں پھیل گئے۔ اور اُن کا دار الخلافہ بغداد دنیا کی نہ صرف تہذیب بلکہ صنعت، حرفت اور تجارت کا مرکز بنگیا تھا۔ عباسی کمزور ہوے۔ اور بغداد کی یہ حیثیت بھی ختم ہونے لگی تو قرطبہ اسکی جگہ لینے کو تیار ہو گیا۔ یہ شہر یورپ میں اس سے قبل بھی تہذیب بلکہ انسانیت کا مرکز تھا۔ مگر اب بغداد کے زوال کے بعد اسکو یہ درجہ تمام اسلامی یعنی متمدن دنیا میں حاصل ہوگیا۔ اسکو زوال ہوا تو فاطمیین کے قاہرہ نے اسکی جگہ لی اور اسلامی تہذیب کی درخشاں روایات کو درخشاں تر کردیا۔ یہ سلسلہ آخر اس شہر پر ختم ہوگیا۔ اور قسطنطنیہ کو کبھی وہ بات حاصل نہ ہوئی جو دمشق، بغداد، قرطبہ اور قاہرہ کو حاصل تھی۔ اس کم و بیش ہزار برس کے عرصہ میں مسلمانوں کی حکومت و سیادت اس سے بھی کہیں زیادہ تھی جو رومیوں کو اسکے زبردست ترین عروج کے زمانہ میں حاصل تھی۔ مسلمان دنیا کی

تہذیب و تمدن - تجارت، صنعت و حرفت، علوم و فنون، اور سیاست کے واحد مالک تھے
ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ وہ بلا کسی قسم کے قوانین کے اتنے عرصہ تک اپنے آپکو قائم رکھ
سکے ہوں - ایک زمانہ میں بغداد دنیا کی تجارت کا مرکز تھا - اور تجارتی دنیا میں اسکی وہی حیثیت
تھی جو آجکل لنڈن کو حاصل ہے - کیا ایسی حالت میں یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ بغداد کی تجارت
بغیر تجارتی قانون کی توضیع، بغیر صرافہ، اور بغیر کسی نہ کسی قسم کے بنکوں کے قائم رہ سکی ہوگی؟ مزدور
اور سرمایہ دار کی جنگ کسی نہ کسی صورت میں اُس وقت بھی موجود نہ تھی - اور اُس کا تصفیہ
حکومت کو نہ کرنا پڑتا ہوگا؟ یا کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس وقت کی تمام متمدن
دنیا پر حکومت کی ہو اور وہ تمام پیچیدہ مسائل اُنکو پیش نہ آئے ہوں جو آج کل پیش آتے رہتے
ہیں؟ اس قسم کی صدہا باتیں ہیں کہ جن کا جواب نہ تو اس کتاب میں ملتا ہے اور نہ اس قدر مختصر
کتاب میں ملنے کی توقع کی جا سکتی ہے - یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں
اور فنلے کے اس الزام کو مٹا دیں کہ ہارون الرشید ایک بڑے پیمانہ پر بردہ فروش تھا - یا پروفیسر
بیوری کے اس اعتراض کا جواب دیں کہ عباسیوں نے بغداد میں بیٹھ کر جبر و تعدی سے حکومت
کی اور دُنیا کا ستیاناس کر دیا -

محمد جمیل الرحمٰن ایم اے
پروفیسر تاریخ اسلام - کلیہ جامعہ عثمانیہ - حیدر آباد دکن

مولوی جمیل الرحمٰن صاحب کا دلی شکریہ کہ اُنھوں نے میری تحریک سے اس کتاب پر نہایت
آزادی کے ساتھ ریویو لکھا - سیدیو کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ علی مبارک پاشا مترجم عربی نے کتاب کو
ترجمہ کرتے وقت غالباً مختصر کرنے کے خیال سے اُس کا خلاصہ کر دیا - اور اُردو میں جن اصحاب نے ترجمہ کیا
اُنھیں اتفاقات نے اسکی مہلت نہ دی کہ وہ کتاب پر مفصل حواشی تحریر فرماتے - اگر اس کے
طبع ثانی کی نوبت آئی تو انشاءاللہ یہ تنقید پیش نظر رہے گی

ایڈیٹر

ملہر راؤ ہولکر

مالوہ کی فتح - پانی پت کی لڑائی

مہاراشٹر[51] کے مختلف النسل[52] باشندوں کو ایک مضبوط قوم بنا کر مرہٹوں کی سلطنت کا بنیادی پتھر رکھنے والا اقبالمند سیواجی چودہ سال ہوئے کہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ شاہنشاہ اورنگ زیب بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی ریاستوں کا سات[53] برس ہوئے کہ خاتمہ کر چکا۔ شہنشاہ کا صوبہ[54] دار بنگالہ انگریزوں کی تجارتی کمپنی کو سخت گوشمالی دے چکا۔

فرانسیسیوں نے پانڈیچری اور چندر نگر میں قدم جمائے تھے مگر اسوقت اُن کا ستارہ زوال پر ہے اور ڈچ قوم کے سوداگر پانڈیچری پر قابض ہیں۔

پرتگال کی ایشیائی حکومت کا عروج ختم ہو گیا۔ ساحل ملابار پر اُسکے بیشتر مقبوضات ہالینڈ والوں کے تصرف میں ہیں اور دارالحکومت "گووا" کے دروازہ تک مرہٹوں اور مغلوں کا خوف ہر شخص پر چھایا ہوا ہے۔

[51] مہاراشٹر ہندوستان کے جنوب مغرب میں اس ٹکڑے کا نام ہے جسکے مغرب میں سمندر، جنوب میں دریائے کرشنا، مشرق میں وین گنگا اور شمال میں نربدا ہے - یہ علاقہ پہلے سلاطین بہمنی کی حکومت میں شامل تھا لیکن پندرہویں صدی سے اس صوبہ کا بیشتر حصہ پرتگال والوں کے تصرف میں آگیا تھا جسکی یادگار (ابتک) شہر "گووا" پر اس قوم کا قبضہ بدستور قائم ہونے سے باقی ہے۔ بیجاپور کے بادشاہوں نے اس ملک کے باشندوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا اور شاہجہاں کے وقت میں ایک سردار ساہوجی بھوسلا بیجاپور کی حکومت میں دخیل تھا اور اُس نے بادشاہ دہلی کو کچھ مدد بھی دی تھی - اسی ساہوجی کا فرزند نامور سیواجی تھا جو ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا اور بیجاپور و دہلی کی حکومت سے آزاد ہو کر اس ملک کا خود مختار حاکم بنا۔ ۶ جون ۱۶۷۴ء کو اُسکے راج تلک کی رسم ادا ہوئی اور ۵ - اپریل ۱۶۸۰ء کو فوت ہوا - ۱۲

[52] اس ملک کے برہمن، راجپوت، کُرمی، اور شنکر جاتی سب ہی مرہٹہ کہے جاتے تھے - ۱۲

[53] عادل شاہی ۱۶۸۶ء میں اور قطب شاہی ۱۶۸۷ء میں ختم ہوئی - ۱۲

[54] شایستہ خاں نے ۱۶۹۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھاری تاوان وصول کیا - (امپیریل گزیٹیر جلد ۲ صفحہ ۴۷۰)

اولوالعزم سیواجی کا کمزور جانشین سمبھاجی شراب کے نشہ میں چور گرفتار ہوا اور پانچ برس ہوئے کہ قتل ہو چکا۔ اُس کا بھائی راجہ رام اپنے شیر خوار بھتیجے ساہوجی کی طرف سے سلطنت کا حاکم تھا لیکن چند ہی مہینے کے بعد اپنے معصوم برادر زادہ اور دارالسلطنت رائے گڈھ کو دشمنوں کے قبضہ میں چھوڑ کر کرناٹک کی طرف فرار ہو گیا اور اسوقت جنجی کے قلعہ میں پناہ گزیں ہے۔ مرہٹے مغلوں کے لشکر کو ستاتے اور اسکے صوبوں پر چھاپے مارتے رہتے ہیں لیکن انکی واقعی حکومت صرف چند قلعوں اور پہاڑی علاقوں تک محدود ہے اور اُس کا انتظام رامچندر نیلکنٹھ کے سپرد ہے جو "حکومت پناہ" کے لقب سے راج کا کاروبار سنبھالے ہے اور موقع سے اپنے بھاگے ہوئے راجہ کو بھی مدد بھیجتا رہتا ہے۔ راجپوتانہ عالمگیر کے دبدبہ سے خاموش ہے۔ شمالی ہندوستان میں امن ہے اور ہمالیہ کی ترائی سے تنجور تک کل جزیرہ نمائے ہند شہنشاہ کی عظمت کے آگے سر تسلیم جھکائے ہوئے ہے۔

اسوقت کون کہہ سکتا تھا کہ چند سال کے اندر اس عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے پارچے ہو جائیں گے اور یک بیک ایسی ہوا پلٹے گی کہ ایک صدی سے پیشتر شاہجہاں اور عالمگیر کا بد قسمت جانشین آنکھیں کھو کر سیواجی کے غلاموں کا پنشن خوار بنے گا!! مگر ازل کے رجسٹروں میں یہی اندراج تھا اور قضا و قدر کے دفتر سے مغلوں کی تباہی کا فرمان صادر ہو چکا تھا اسلیئے غیب سے قدرت خداوندی ظاہر ہونے کے سامان جمع ہونے لگے!!

اکتوبر ۱۶۹۳ء میں پونا سے چالیس میل کے فاصلہ پر نیرا ندی کے کنارے ایک غیر مشہور گانوں "ہُل" نام میں ایک معمولی کاشتکار کے گھر بچہ پیدا ہوا جسکی پیشانی پر خط تقدیر سے لکھا تھا کہ یہ فرزند خاندان تیمور کا غرور توڑنے اور مرہٹوں کی حکومت کو عروج دینے میں نمایاں حصہ لیگا۔

اس خوش قسمت کاشتکار کا نام کھنڈوجی تھا۔ اسکے آبا و اجداد کسی زمانہ میں متھرا کے قریب بھیڑ بکری چراتے تھے اور وہاں سے اُجڑ کر پہلے چتور کے قریب میواڑ میں بسے پھر تبدیل سکونت کر کے دکن آئے جہاں وہ اسوقت "ہُل" میں آباد تھے۔ اور وہ دن قریب تھا کہ ایک اقبالمند کے طفیل سے یہ گانوں ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیئے یادگار ہو جائے!!

یہ ہونہار لڑکا چار ہی پانچ برس کا تھا کہ اُس کا باپ مرگیا۔ رشتہ داروں نے بیوہ سے جھگڑا کیا

لہ کھنڈوجی راؤ موضع ہُل کا مکھیا یا مکھیا کا نائب تھا۔ ۱۲

اور مصیبت زدہ ماں اپنے یتیم بچہ کو لیکر بھائی کے گھر چلی گئی - ماموں نے اپنے بیکس بھانجے کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا اور بیوہ بہن کا بوجھ اُٹھانے پر تیار ہوگیا - اسکے پاس سردار کدم[۵۱] بندی کی طرف سے کچھ جاگیر تھی جسکے عوض میں اُسکو پچیس سوار مرہٹوں کی امداد کیلیے مہیا رکھنا پڑتے تھے - لیکن بھانجا ابھی بہت کم عمر تھا اور کسی فوجی خدمت کے قابل نہ تھا اس لیئے خاندان کی بھیڑ بکری چرانے کی خدمت اسکے حوالہ کی گئی -

یہ یتیم بچہ جس کا نام مُلہر راؤ تھا کئی سال تک اسی خدمت پر مامور رہا - صبح کو بھیڑوں کا گلہ لیکر جنگل کی طرف نکل جاتا - دن بھر مویشیوں کی نگہبانی کرتا اور شام کو گھر واپس آتا تھا - ایک دن بستی سے دُور کھیت کی مینڈ پر سر رکھے سوتا تھا کہ ایک سانپ اُسکے قریب آیا اور اپنا پھن اُٹھاکر لڑکے کے سر کے پاس کھڑا ہوگیا - اتفاق سے گانوں کے کچھ آدمی اُس طرف آگئے اور اُنھوں نے یہ تماشا دیکھ لیا کہ سانپ سر کے پاس کھڑا ہے مگر بچہ پر چوٹ نہیں کرتا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ لڑکے کے چہرہ کو آفتاب کی شعاعوں سے بچائے ہوے ہے - آدمیوں کی آہٹ پاکر سانپ بھاگ گیا اور ملہر راؤ بھی جاگ پڑا - مگر یہ قصہ دیہات میں مشہور ہوگیا - لوگوں نے ماموں کو یتیم بھانجے سے بیخبری کا طعنہ دیا اور سانپ کے حملہ سے محفوظ رہنا لڑکے کی خوش نصیبی کا نشان بتایا - لڑکا گلہ بانی کی خدمت سے ہٹا لیا گیا اور اُسکو لڑائی کے ہنر سکھائے گئے - تھوڑی ہی مدت میں وہ گھوڑے کی سواری اور ہتھیاروں کے استعمال میں طاق ہوگیا اور کدم بندی والے رسالہ میں بھرتی کر لیا گیا -

اب ملہر راؤ کو اپنی بہادری کے اظہار کا موقع ملا اور چند ہی روز کے بعد وہ کدم بندی کے رسالہ میں ایک بڑا دلیر اور جری سپاہی سمجھا جانے لگا -

اس عرصہ میں شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات ہوچکی تھی اور دکن کا علاقہ سخت بد امنی کی حالت میں تھا - صوبہ دار دکن سے مرہٹوں کی روز لڑائی رہتی تھی - ایک مرتبہ کدم[۵۲] بندی کا رسالہ بھی میدان

[۵۱] بھائی کا نام بھوج راج برگل تھا - اور وہ خاندیس کے تلودہ گانوں میں رہتا تھا - ۱۲

[۵۲] کدم بندی کا خاندان کسی زمانہ میں بیجاپور کے بادشاہوں کی جانب سے "پٹیل" تھا مگر بعد کو سیواجی کے ہمراہیوں میں ہوگیا تھا اور اب کافی حیثیت رکھتا تھا - ۱۲

[۵۳] یہ جنگ غالباً ۱۷۱۶ء میں ہوئی تھی اور اس میں مرہٹوں نے سید حسین علی صوبہ دار دکن کو شکست دی تھی (گرانٹ ڈف تاریخ مرہٹہ جلد ۱ - صفحہ ۳۶۲) اسوقت ملہر راؤ کی عمر ۲۰ سال کی ہوگی -

میں موجود تھا اور اس موقع پر ملہر راؤ نے نظام الملک کے ایک سردار کو ایسی جرأت اور ہمت سے قتل کیا کہ مرہٹوں کے سردار کو اس نوجوان سپاہی کی تعریف کرنا پڑی۔ ماموں کا دل بھانجے کی تعریف سے باغ باغ ہوا اور اُس نے اپنی بیٹی گوتما بائی کی شادی اُسکے ساتھ کر دی۔ اس مبارک شادی نے ملہر راؤ کی بہادری دُور دُور مشہور کر دی اور مرہٹوں کے حاکم اعلیٰ کو رفتہ رفتہ اسکی شجاعت و دلیری کی خبر پہونچی۔

عالمگیر کے مرنے کے بعد سیواجی کا پوتا ساہوجی مغلوں کی قید سے چھوٹ کر آیا تھا اور بادشاہ دہلی کی اجازت سے "ستارہ" میں راج کرتا تھا لیکن ریاست کا انتظام چند وزیروں کے سپرد تھا جن میں سے کانکن[۱] کے علاقہ کا ایک برہمن بالاجی وشواناتھ نہایت لائق اور عقلمند تھا۔ اس برہمن نے "پیشوا" کا موروثی خطاب پاکر جنوب میں مرہٹوں کی دھاک بٹھادی تھی اور "بادشاہ گر" سیدوں[۲] سے میل کرکے (جنکی داستانیں تاریخ ہند میں مشہور ہیں) اپنے ہمقوموں کو ایکبار دہلی کی بھی ہوا کھلا لایا تھا۔ اور حسن خدمات کے صلہ میں دکن میں سواراج قائم کرنے کا فرمان بھی اُس کو مل گیا تھا۔ بلکہ بادشاہ فرخ سیر کے قتل کے وقت دہلی میں موجود تھا۔ رفیع الشان اور رفیع الدرجات کی چند روزہ سلطنتیں اسکے سامنے بنیں اور مٹ گئیں اور جب آخر کار دکن واپس آیا تو محمد شاہ کی مُہر بھی اُس فرمان پر تھی جسکے رُو سے ساہوجی دکن کا خود مختار حاکم تسلیم کیا گیا تھا۔

بالاجی "پیشوا" اکتوبر ۱۷۲۰ء میں مرگیا اور اُس کا بیٹا باجی راؤ اول مرہٹوں کی سلطنت کا منتظم تھا کہ اُسکو ملہر راؤ کی بہادری اور ہمت کی خبر ملی اور اُس نے اس بلند ہمت نوجوان کو براہ راست اپنی خدمت میں رکھنا چاہا۔ ملہر راؤ کی عمر اُسوقت ۲۶ سال سے زیادہ ہوچکی تھی مگر ابھی تک کدم بندی کے رسالہ کا ایک سپاہی ہی تھا۔ اپنے آقا سے اجازت لیکر وہ باجی راؤ کی ملازمت میں آیا اور فوراً پانچسو سوار کا افسر مقرر کیا گیا۔ لیکن قدیم ولی نعمت کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اُس نے اپنے جھنڈے پر بندی سرداروں کا سا نشان لگایا جو دو سو برس کے بعد بھی ہولکر کے خاندان کا آج تک نشان[۳] ہے۔

[۱] کانکن۔ مہاراشٹر کے اُس حصہ کا نام ہے جو مغربی گھاٹ اور کوہستان اور سمندر کے درمیان واقع ہے۔

[۲] سید حسین علی اور سید عبداللہ۔

[۳] یہ نشان ایک مثلث شکل کا ہے۔ جس میں سرخ و سفید دھاریاں ہیں۔ اور بالائی حصہ پر انہی دو رنگوں کے پھریرے ہیں۔ ۱۲

"پیشوا" کی فوج میں عہدہ پانے کے بعد ہی وہ کانکن[١] کی فتح کے لیئے مامور کیا گیا اور اس لڑائی میں اُس نے نیکنامی حاصل کی۔ مگر اس بلند ہمت کا سب سے بڑا کارنمایاں جس نے خاندان ہولکر کو دنیا میں مشہور کیا اور سلطنت مغلیہ کو جسم بیجان بنا دیا صوبۂ مالوہ کی فتح تھا۔

یہ صوبہ جنوب میں نربدا سے شمال میں چنبل تک اور مغرب میں راجپوتانہ و گجرات سے مشرق میں بندیلکھنڈ تک پھیلا ہوا تھا اور جس وقت سے کہ اکبر نے گجرات و مانڈو کی جداگانہ سلطنتوں کا خاتمہ کیا۔ شہنشاہ دہلی کی حکومت میں شامل تھا۔ یہ علاقہ آگرہ سے قریب اور دکن کے راستہ میں واقع تھا اسلیئے جب تک دہلی کی سلطنت کمزور نہیں ہوئی اس خطہ کا پُرامن اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا ضروری سمجھا گیا مگر عالمگیر کے بعد دہلی کی طاقت مضمحل ہوئی۔ دکن کی طرف پہلے کی سی توجہ نہ رہی اور مالوہ کے صوبہ دار بھی روز تبدیل ہونے لگے۔ محمد شاہ کے عہد میں کبھی نظام الملک یہاں کا صوبہ دار ہوا۔ کبھی گردھار کبھی محمد خاں بنگش اور کبھی راجہ جے سنگھ۔ اور عاملوں کے جلد جلد تبدیل ہونے سے حکومت کے کل پُرزے ڈھیلے پڑ گئے۔

باجی راؤ کو پیشوائی کی مسند پر بیٹھتے ہی مالوہ کے فتح کی دُھن سوار ہوئی تھی۔ اُس نے راجہ ساہو کو سمجھایا کہ "مغلیہ سلطنت کی بنیاد گل سڑ گئی ہے اس لیے مناسب ہے کہ درخت کے تنہ پر صدمہ پہونچایا جائے تاکہ ہری بھری شاخیں خودبخود گر پڑیں"۔ اور اُسکو یقین دلایا کہ "مالوہ فتح دہلی کی کنجی ہے۔ اگر اس علاقہ پر ہم قابض ہوگئے تو آگرہ اور دہلی چند روز کے مہمان ہیں"۔ راجہ کو یہ مشورہ پسند آیا اور اُس نے مرہٹوں کی فوج کو نربدا سے عبور کرنے کا حکم دیا۔

جب بُرا وقت آتا ہے تو تباہی کے سامان ہر طرف سے ہجوم کر لیتے ہیں۔ آصف جاہ نظام الملک جو امرائے دہلی میں سب سے زیادہ قابل اور ذی وجاہت اور مالوہ و گجرات کے خراج کا ذمہ دار تھا محمد شاہ کی بدافعالیوں اور اُسکے مصاحبوں کے ناشایستہ حرکات سے آزردہ ہوکر اکتوبر ١٧٢٣ء میں عہدۂ وزارت سے مستعفی ہوا اور دکن جاکر حیدرآباد کی خودمختار ریاست قائم کی۔ بادشاہ نے مالوہ کی صوبہ داری

---

[١] ملکم صاحب اپنی "یادداشت مالوہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہولکر اسی زمانہ میں پیشوا کے بھائی چمن جی کے ساتھ پرتگیز سے لڑنے گیا لیکن یہ واقعہ غلط ہے۔ مرہٹوں کی پرتگال والوں سے لڑائی جسکا سپہ سالار چمن جی تھا ١٧٣٩ء میں ہوئی تھی اور اُس میں بھی ملہار راؤ شریک تھا۔ اسوقت جو کانکن میں جنگ ہوئی وہ ایک غیرمشہور حملہ تھا اور اُس میں چمن جی شریک نہ تھا۔

اُس سے لیکر ایک برہمن گردھر بہادر کے سپرد کی اور اسی زمانہ میں مرہٹوں نے اپنی فوج کو مالوہ پر قبضہ کرنے کے لیئے حرکت دی - نظام الملک یہ سوچ کر کہ حیدرآباد اور دہلی کے درمیان مرہٹوں کا قبضہ مالوہ پر ہو گیا تو اُسکو مغلوں کے خوف سے ہمیشہ کے لیئے نجات ملجائے گی سدراہ نہ ہوا - اور مرہٹے بخوف نربدا کے پار ہو گئے -

قدیم کاغذات سے ثابت ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے ۱۶۹۰ء ۱۶۹۴ء و ۱۶۹۶ء میں بھی مالوہ پر غارتگری کے چھاپے مارے تھے اور مانڈو وہار پر بھی کچھ دنوں کے لیئے قابض ہو گئے تھے لیکن اُسوقت تک نہ تو کسی مستقل فتح کا ارادہ تھا اور نہ مرہٹوں کو ایسی قدرت تھی کہ اپنے وطن سے دُور کسی علاقہ پر تصرف کا خیال کریں - وہ ان موقعوں پر لوٹ مار کے لیے آئے - جو کچھ ہاتھ لگا کھسوٹا اور چلے گئے - مگر اب وہ اس صوبہ کو اپنے ملک کا ایک جزو بنانے پر مستعد تھے اور دہلی سے کسی سخت مزاحمت کا اندیشہ باقی نہ تھا - باجی راؤ کا لشکر ۱۷۲۳ء یا ۱۷۲۴ء میں مالوہ سے "چوتھ" وصول کرنے کے لیئے آیا اور ۱۷۲۸ء سے قبل اس صوبہ کا اتنا وسیع حصہ انکے قبضہ میں آچکا تھا کہ ملہر راؤ ہولکر کو جس نے اس علاقہ کی فتح میں سب سے زیادہ کام کیا تھا حُسن خدمات کے صلہ میں بارہ محال نربدا کے اس پار بطور جاگیر کے عطا کیئے گئے - ۱۷۲۹ء میں باجی راؤ خود مالوہ کی طرف آیا اور صوبہ دار گردھر بہادر کو شکست فاش دیکر قتل کیا - اُس کا بھتیجا اور جانشین دیا بہادر مالوہ کے باقی ماندہ حصہ پر حکومت کرتا تھا مگر ملہر راؤ ہولکر نے ۱۷۳۲ء میں مقامی زمینداروں کی امداد سے اُسکو بھی قتل کیا[۱] - اور قریب قریب کُل صوبہ پر مرہٹوں کی سلطنت قائم کر دی - پیشوا نے اندور کا ضلع ہولکر کو بطور جاگیر عنایت فرمایا - مگر جنگ ابھی ناتمام تھی کیونکہ دہلی کے امرا اس زرخیز علاقہ کو ایسی آسانی سے ضایع نہیں کرسکتے تھے -

سرکار دہلی سے محمد شاہ بنگش مالوہ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا مگر چند ہی روز کے بعد اُسکو مرہٹوں سے شکست کھا کر ایک قلعہ میں پناہ لینی پڑی وہ بمشکل اپنی جان بچا کر الہ آباد بھاگا اور بادشاہ نے یہ صوبہ راجہ جے سنگھ والیِ جے پور کے سپرد کیا -

کہا جاتا ہے کہ باجی راؤ نے مالوہ پر چڑھائی کرنے سے پہلے ہی راجہ جے سنگھ سے سازش کر لی تھی اور "پوران" سے ایک عبارت نقل کر کے غرض مطلب کے لیئے اُسکے پاس بھیجی تھی :

[۱] یہ لڑائی "دہار" کے قریب ہوئی تھی - ۱۲

"تو مثل اس بادل کے ہے جو سمندر کا پانی پیتا ہے اور پھر اس پانی کو گرج اور تڑپ کے ساتھ زمین
کی طرف واپس کرتا ہے تاکہ گھاس اُگے اور سرسبزی ہو - پہاڑ اندر کے خوف سے تیرے پاس پناہ کے
لیئے آتے ہیں - تو تمناؤں کا درخت ہے بلکہ تو وہ سمندر ہے جس کے فیض سے تمناؤں کا درخت اُگتا ہے
تیری گہرائی کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ تو سمندر کی طرح بے تھاہ ہے -
تجھکو ہر حال میں اگست منی[1] کو یاد رکھنا چاہیئے"-

جے سنگھ نے اس تحریر کا پوران ہی کے الفاظ سے جواب دیا تھا -

"برہما کی اولاد اگر میرا قصور کرے تو میں معاف کروں گا - یہ میرا وعدہ ہے - میں اسپر قائم ہوں
اگست منی اکیلا سمندر کا پانی پی گئے تو کیا حاصل ہوا - اگر خدا اُن دیواروں کو جو سمندر کے گرد ہیں
گرا دیتا تو دنیا تباہ ہو جاتی اور تب اگست منی کہاں رہتے"-

اس سوال و جواب کے ظاہری الفاظ سے کوئی بغاوت ثابت نہیں ہوتی لیکن باجی راؤ اور جے سنگھ
کا جو مطلب تھا وہ ان دونوں نے بخوبی سمجھ لیا یعنی مرہٹے اگر مالوہ پر حملہ کریں تو جے سنگھ مخالفت نہ
کرے گا مگر مغلوں کی طاقت بڑی ہے اور اگست منی کے قائم مقاموں کو انکی قدرت سے خائف
رہنا چاہیئے - !!

یہ خط کتابت معلوم نہیں کہ درحقیقت واقع ہوئی[2] یا فقرہ بازوں نے قصہ تراش لیا لیکن اس میں
کلام نہیں کہ صوبہ داری مالوہ پر نامزد ہونے کے بعد جے سنگھ نے بجائے مرہٹوں کو تباہ و پسپا کرنے کے
بادشاہ سے سفارش شروع کی کہ یہ علاقہ پیشوا کے سپرد کر دیا جائے !! اور ۱۷۳۶ء میں باجی راؤ مالوہ کا
صوبہ دار بنا دیا گیا اگرچہ ملہر راؤ بزور شمشیر اسکو پہلے ہی فتح کر چکا تھا -
مصاحبان شاہی نے سمجھا ہوگا کہ باجی راؤ مالوہ کی صوبہ داری کا زبانی وعدہ لیکر خاموش ہو جائیگا
اور کوئی تازہ چھیڑ نہ نکالے گا لیکن اُنکا خیال غلط ثابت ہوا اور مرہٹوں نے اصرار کیا کہ مالوہ اور گجرات
کی چوتھ وصول کرنے کا فرمان حسب ضابطہ عنایت کیا جائے - محمد شاہ کے مشیروں نے پروانہ جاری کرنے
میں پس و پیش کیا تو پیشوا نے اپنے سرداروں کو دہلی کے مقبوضات پر چھاپے مارنے اور دار السلطنت

[1] اگست منی ایک رشی تھے جو ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق ایکبار سمندر کا سب پانی پی گئے تھے - ۱۲
[2] ملکم صاحب اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ اُن سے چند مرہٹوں نے یہ قصہ بیان کیا تھا - ۱۲

آگرہ تک دھاوے کرنے کی اجازت دی تاکہ دہلی کے ارکان حکومت کو باضابطہ فرمان عطا کرنے کے لیئے یاددہانی ہوتی رہے!! مالوہ کا صوبہ مرہٹہ سرداروں میں تقسیم کیا گیا اور جنوبی حصہ جو سب سے زیادہ محفوظ تھا ملہر راؤ کو عنایت فرماکر پیشوا دکن کو واپس گیا۔

ملہر راؤ ہولکر نے راجپوتانہ اور ہندوستان پر چھاپے مارنا شروع کیئے اور اُس کا اقبال ہر مہم میں ساتھ تھا۔ ایک دفعہ محمد شاہ کی بیگم ملکۂ زمانیہ کا خیمہ و خرگاہ بھی اُس نے لوٹ لیا اور اس فتح کی دو یادگاریں مدت تک خاندان ہولکر میں محفوظ رہیں جن میں سے ایک تو رتھ تھا جسکے پردوں میں موتی ٹکے ہوئے تھے اور دوسری جواہرات کی ایک کنگھی تھی جسکی قیمت کا تخمینہ ایک لاکھ کا کیا جاتا تھا۔

جس قدر فرمان کے اجرا میں دیر ہوتی گئی اُتنا ہی باجی راؤ اپنے مطالبوں کو بڑھاتا گیا یہانتک کہ مالوہ اور چنبل کے جنوب کے علاوہ متھرا، الہ آباد، اور بنارس کے مقدس شہروں کو بھی اپنی جاگیر میں شامل کیئے جانے کا آرزومند ہوا۔ شاہی لشکر کئی بار مرہٹوں سے مقابل ہوا لیکن ملہر راؤ فنونِ حرب میں یگانۂ روزگار تھا۔ وہ مغلوں سے جم کر لڑائی نہ کرتا تھا بلکہ اچانک حملوں سے اُنکے لشکر کو تباہ کردیتا تھا اور خیمہ و خرگاہ لوٹ لیتا تھا۔

عاجز آکر بادشاہ نے مرہٹوں کو راجپوتانہ سے خراج وصول کرنے اور آصف جاہ کی قلمرو سے اپنی مرضی کے مطابق نذرانہ لینے کا اختیار دیا۔ لیکن یہ ترکیب بھی نہ چلی اور باجی راؤ صوبہ داری کا فرمان لینے کے لیے بذات خاص ہندوستان کی طرف بڑھا۔ ملہر راؤ نے جمنا پار کا ہندوستانی علاقہ بیدریغ لوٹنا شروع کیا لیکن اودھ کے صوبہ دار نواب سعادت خاں نے سلطنت کی آبرو رکھ لی اور مرہٹوں کو پسپا کیا۔ باجی راؤ نے اس خفیف مزاحمت کی کچھ پروا نہ کی اور ۱۷۳۷ء میں دہلی کے سامنے پہونچ گیا۔

اب آصف جاہ کو ہوش آیا کہ مغلوں کی عداوت سے جو اندیشہ تھا وہی اُنکی کمزوری سے ہے اور جب دہلی کی سلطنت مٹ جائیگی تو مرہٹے اُس کا ملک بھی باقی نہ رکھیں گے لہذا وہ دکن سے بادشاہ کی امداد کے لیئے چلا۔ اُدھر قمرالدین خاں وزیر سلطنت اور سعادت خاں نے باہم متحد ہو کر مرہٹوں سے مقابلہ کا ارادہ کیا۔ یہ سیلاب بڑھتا دیکھ کر باجی راؤ دکن کی طرف واپس گیا اور مالوہ کی صوبہ داری بادشاہ نے آصف جاہ کے بیٹے غازی الدین کو عطا فرمائی۔ شاہی لشکر مرہٹوں کی سرکوبی

کے لیئے روانہ ہوا لیکن بھوپال کے مقام پر بعض سرداروں کی غفلت سے ایسی سخت شکست ہوئی کہ آصف جاہ کو باجی راؤ کے کل شرائط منظور کرنا پڑے - اور یہ معاہدہ[41] ہوا کہ نربدا سے چنبل تک جس قدر علاقہ ہے اور جس کا ایک جزو مالوہ بھی ہے مرہٹوں کو دیا جائیگا اور اس عہدنامہ پر بادشاہ کے مُہر و دستخط کرا دیئے جائیں گے - اس قول و قرار کے بعد آصف جاہ دہلی کو واپس گیا اور باجی راؤ نے ممالک مذکور پر قبضہ کرلیا - ابھی عہدنامہ پر شاہی دستخط نہ ہو پائے تھے کہ نادرشاہ[42] نے ہندوستان پر چڑھائی کی اور اُسکے قتل و غارت سے تمام شمالی ہندوستان نیم مردہ ہوگیا -

جب باجی راؤ کو نادرشاہ کے خوف و ہراس سے اطمینان نصیب ہوا تو اُس نے عہدنامہ پر دستخط ہونے کا تقاضا کیا اور کہا کہ وہ دہلی پر حملہ کرکے بادشاہ سے اپنی من مانی شرطیں منظور کرا لیگا، مگر ہندوستان پر چڑھائی کرنے سے قبل آصف جاہ[43] کے بیٹے ناصر جنگ سے لڑائی ہوگئی اور ۱۷۴۰ء میں مرہٹوں کو ایسی سخت زک پہونچی کہ نظام سے صلح کرنا پڑی اور دہلی کی چڑھائی ملتوی رہی - باجی راؤ کو اس غیر متوقع شکست کا نہایت صدمہ ہوا اور اُس نے اپنے گُرو کو ایک خط لکھا جسکے چند فقرے[44] یہ ہیں:

> "میں مشکلات میں گرفتار ہوگیا - قرضہ اور مایوسی نے مجھکو دبا لیا - میری اسوقت وہ حالت ہے جسمیں آدمی زہر کھانے کو تیار ہو جاتا ہے - راجہ کی مجلس میں میرے بدخواہ جمع ہیں - اگر میں "ستارہ" جاؤں تو دشمن میری چھاتی پر کود دوں دَلینگے - اس وقت موت آجائے تو خدا کا شکر کروں"

اُسکی دعا قبول ہوئی - اور اپریل ۱۷۴۰ء میں ناصر جنگ سے شکست کھانے کے چند ہی روز بعد وہ نربدا کے کنارے دنیا سے راہی ہوگیا -

باجی راؤ کے بعد اُسکا بڑا بیٹا بالاجی راؤ پیشوا ہوا جو ہوشیاری اور طراری میں اپنے باپ کے برابر تھا - اُسنے ایک ہی سال کے اندر ملک کے انتظامات اندرونی درست کرلیئے اور دہلی کے دربار کو

---

[41] یہ معاہدہ فروری ۱۷۳۸ء میں ہوا - ۱۲

[42] نادرشاہ کے قتل عام و غارتگری کی داستان ہندوستان میں مشہور ہے - ایسٹ انڈیا کمپنی کے "بمبے ریکارڈس" سے معلوم ہوتا ہے کہ نادرشاہ دہلی سے ۵ - مئی ۱۷۳۹ء کو واپس گیا - ۱۲

[43] آصف جاہ دہلی میں تھا اور اُس کا دوسرا بیٹا ناصر جنگ دکن میں فوج کا سپہ سالار تھا - ۱۲

[44] گرانٹ ڈف تاریخ مرہٹہ - جلد ۱ - صفحہ ۴۵۶ - فٹ نوٹ -

مالوہ کی جاگیر کے لیئے یاددہانی شروع کی -

اُس زمانہ کے بہادر بھولے ہوے وعدوں کی یاددہانی کاغذ کے پرزوں سے نہیں کیا کرتے تھے بلکہ تلواروں، نیزوں، اور بھالوں سے قول وقرار یاد دلایا کرتے تھے - مرہٹوں نے بنگال پر حملہ کیا اور وہاں کا صوبہ دار الہ وردی خاں عاجز آ کر بادشاہ سے امداد کا خواستگار ہوا - محمد شاہ کے پاس فوج کہاں باقی تھی جو بنگال کی مدد کرتا البتہ اس بہانہ سے بادشاہ دہلی کو مرہٹوں سے پُرانا عہدنامہ یاد آگیا!! مالوہ کا صوبہ مرہٹوں کے سپرد کرنا دکن کی حکومت سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا تھا - اس لیئے رنگیلے بادشاہ کو شراب کے نشہ میں بھی یہاں کا علاقہ چھوڑنے کی ہمت نہ پڑتی تھی گر بالاجی نے حکمت عملی سے راجہ جے سنگھ کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اُسنے چھ مہینے کے اندر مالوہ کی صوبہ داری کا فرمان ساہو جی کے نام جاری کرانے کا وعدہ کرلیا - اُدھر نظام الملک نے بھی بالاجی کو مالوہ کی نائب صوبہ داری دلانے کا اقرار کیا اور مرہٹوں نے پچاس لاکھ روپیہ کا ایک جدید مطالبہ پیش کیا تھا (جسکی بنیاد یہ قائم کی تھی کہ بادشاہ دہلی نے نادرشاہ کے خلاف مدد دینے کے لیئے اس انعام کا اقرار کیا تھا اور باوجودیکہ مرہٹے اُسوقت دہلی کو مدد نہیں پہونچا سکے لیکن انعام تو بہرحال ملنا چاہیئے!!) جسکو سنکر بھیڑیئے اور میمنے کی قدیم کہانی یاد آتی ہے مگر نظام الملک نے سلطنت کی کمزوریوں پر نظر کرکے اس رقم کے دلانے کے لیئے بھی سفارش کا وعدہ کرلیا -

جب سب طرف سے بالاجی کا پایہ زبردست ہوگیا اور محمد شاہ کے دست و بازو قابو سے باہر ہوگئے تو اُس نے مجبور ہوکر اپنی آبائی سلطنت کی خودکشی کا پروانہ جاری کیا - یعنی پیشوا کو صوبہ دار مالوہ تسلیم کرلیا اور ۲۲ - جمادی الاول ۲۴ سنہ جلوس (مطابق ۱۷۴۳ء) کو فرمان[۱] پر دستخط کردیئے - مگر اطمینان کے لیئے مرہٹہ قوم کے چار بڑے سرداروں سے جن میں سے ایک ملہر راؤ بھی تھا ضمانت لی کہ پیشوا سلطنت دہلی کے تابع رہیگا - اور اگر وہ بغاوت کرے تو یہ چاروں سردار اُسکی ملازمت سے بے تعلق ہوجائیں گے -

اس تاریخ سے مالوہ سلطنت دہلی سے جدا ہوگیا اور یہاں ملہر راؤ نے مرہٹوں کی مستقل حکومت

---

[۱] یہ فرمان ریاست پونا کے محافظ خانہ میں آخری پیشوا کے عہد تک موجود تھا - اور اس کا انگریزی ترجمہ گرانٹ ڈف نے اپنی تاریخ مرہٹہ میں نقل کیا ہے (جلد ۲ - صفحہ ۹)

کی وہ بنیاد ڈالی جو دلّی کے تباہ ہونے، پونا کا دربار لٹنے اور انگریزی راج قائم ہونے پر بھی نہ ہل سکی!!
خدا کی شان! ملہر راؤ جو بچپن میں بکریاں چراتا تھا آج ایسا معزز ہوا کہ اُسکی ضمانت پر بادشاہ دہلی اپنا بہترین علاقہ مرہٹوں کے سپرد کرتا ہے اور وہ اس حکومت پر قناعت نہ کرکے تخت دہلی کی بھی ہوس رکھتا ہے!!!

جس دن سے دریائے نربدا کو عبور کر کے مرہٹوں کے ہراول سپاہی مالوہ کے حدود میں داخل ہوئے ملہر راؤ اس صوبہ کی فتح کے متعلق تمام فوجی مشوروں میں شریک تھا۔ ۱۷۳۱ء میں پیشوا نے اُسکو نربدا پار کے تمام علاقہ کا حاکم بنا دیا۔ اور مالوہ پر مرہٹوں کا قبضہ درحقیقت اُسی کی کوشش کا ثمرہ تھا۔

اس علاقہ پر باضابطہ متصرف ہونے کے بعد اُس نے مرہٹوں کی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کیا اور نیت کی کہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال کر پیشوا کو دہلی کے تخت پر بٹھا دے۔ اُسنے اودھ سے اٹک تک اور راجپوتانہ سے کمایوں تک دھاوے شروع کیئے۔ جس طرف سے گذرا مرہٹوں کا رعب رعایا کے قلوب پر بٹھا دیا۔ جس قدر اُسکے دبدبہ میں اضافہ ہوتا تھا اُتنی ہی بادشاہ دہلی کی بیوقعتی ہوتی تھی اور دوآبہ کے باشندے جو اکبر و جہانگیر کے جاہ و جلال کی بدولت ابھی تک دلّی کے نام پر جان دیتے تھے روز بروز وہاں کے بادشاہ سے برگشتہ ہوتے جاتے تھے۔

اس عرصہ میں مرہٹوں کا برائے نام راجہ ساہوجی مرگیا اور پیشوا کی کوشش سے راجہ رام مسبوق الذکر کا لڑکا ستارہ کا حاکم ہوا تو مالوہ کے محاصل سے ۷۵ لاکھ کی جاگیر ملہر راؤ کو عنایت کی گئی۔ مالوہ کی کُل نکاسی اُسوقت ۱½ کروڑ تھی اور اُس میں سے نصف ہولکر کو عطا ہوتا اور بقیہ میں سندھیا[1] وغیرہ

[1] رنوجی سندھیا کا خاندان کسی زمانہ میں معزز اور باحیثیت تھا مگر انقلاب زمانہ سے غریب ہوگیا تھا یہاں تک کہ رنوجی پیشوا کا کفش بردار تھا۔ ایک دن پیشوا کو راجہ ساہو کی مجلس میں دیر تک حاضر رہنا پڑا اور یہ ملازم اپنے آقا کی جوتیاں ہاتھوں سے تھامے ہوئے سوگیا۔ جب پیشوا باہر آیا تو اپنی جوتیاں ملازم کے ہاتھ میں اُسکے سینے پر رکھی ہوئی دیکھ کر اور ملازم کو نیند کی غفلت میں بھی اپنی خدمت سے خبردار پاکر بہت خوش ہوا اور اُسکو پیگاہ کے سواروں میں بھرتی کرلیا۔ رفتہ رفتہ وہ سلطنت کا ایک رکن ہوگیا۔ مالوہ کی فتح میں شریک تھا۔ اور اُس کا اقبالمند لڑکا "مادھاجی" ہندوستان کی تاریخ میں مشہور ہے۔ شاہ عالم اسی کا وظیفہ خوار تھا۔ اور گوالیار کی موجودہ ریاست اسی کے جانشینوں کے پاس ہے۔

بہت سے سرداروں کا شریک کیا جانا اس دعوے کا ثبوت ہے کہ ملہر راؤ سے زیادہ کسی سردار کی عزت پیشوا کی نظر میں نہ تھی۔ اور اُس سے زیادہ شجاع اور کارآزمودہ جنرل مرہٹوں کے ملک میں کوئی موجود نہ تھا اگر اُسکے صلاح و مشورہ پر آیندہ بھی عمل ہوتا تو یقیناً ہندوستان میں مرہٹوں کی سلطنت قائم ہوجاتی اور آج تاریخ ہند میں کچھ اور ہی داستان نظر آتی مگر اسکی تفصیل کا ابھی وقت نہیں آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسکا انجام ظاہر ہوگا۔

مالوہ کی جاگیر کے علاوہ راجپوتانہ میں رامپورہ، بھانپورہ[1] اور ٹونک کا علاقہ بھی اُسکے قبضہ میں تھا اور دکن میں بھی کافی جائداد اُسکے پاس تھی اور اُسکی فوجی طاقت اس قدر قوی تھی کہ جب ۱۷۵۰ء میں دہلی کے وزیر صفدر جنگ کو جو اپنے باپ سعادت خاں کی جگہ اودھ کا صوبہ دار اور دہلی کا وزیر ہوا تھا روہیلوں نے ستایا تو اُس نے سلطنت کی ذلت و حقارت کا لحاظ نہ کرکے اپنے ملک کی حفاظت کے لیئے ملہر راؤ سے مدد مانگی۔ ہولکر ایسے موقع کا منتظر ہی تھا فوراً وزیر کی امداد کو پہونچا اور ایک عجیب و غریب چالاکی سے دشمن کو شبخون مار کر تباہ کردیا۔ کہتے ہیں کہ کارتھیج کے مشہور سپہ سالار ہنیبال[2] نے رومیوں کو زک دینے کے لیئے یہ ترکیب کی تھی کہ رات کے وقت دو طرف روشنی کردی اور تیسری طرف سے اندھیرے میں حملہ کیا۔ رومیوں نے یہ سمجھ کر کہ وہ تین طرف سے گھرے ہوئے ہیں چوتھی طرف سے بھاگنا شروع کیا۔ ملہر راؤ کے وقت تک کارتھیج کی قدیم تاریخ تو ہندوستانی کم جانتے ہوں گے اس لیئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہولکر کے دماغ میں خود بخود وہی نقشہ جما جو ہنیبال کو سوجھا تھا۔ اس نے ہزاروں جانوروں کی سینگوں میں مشعلیں باندھیں اور اُنکو روشن کرکے ایک طرف سے دشمن کی جانب ہانک دیا۔ دوسری سمت درختوں اور جھاڑیوں پر ہزاروں قندیلیں آویزاں کردیں۔ اور تیسری طرف سے اپنی فوج

---

[1] راجہ جے سنگھ والی جے پور کے مرنے کے بعد اُسکے لڑکوں میں وراثت کے لیئے جھگڑا ہوا۔ ہولکر نے چھوٹے بیٹے مادھو سنگھ کا اس بنا پر ساتھ دیا کہ وہ اودے پور کی ایک لڑکی کے پیٹ سے ہے اور اس لیئے شرافت میں افضل ہے۔ بڑا لڑکا خودکشی کرکے مرگیا اور ہولکر کا دوست راجہ ہوا تو اُسنے ۶۴ لاکھ روپیہ نقد اور رامپورہ و بھانپورہ اور ٹونک کا علاقہ ہولکر کو نذر کیا۔ ۱۲۔

[2] ہنیبال اور ملہر راؤ کے منصوبوں کا انجام بھی یکساں ہوا۔ نہ وہ رومتہ الکبریٰ میں کارتھیج کا سکہ چلا سکا نہ یہ پیشوا کو دہلی کے تخت پر بٹھا سکا۔ مگر روما میں کچھ دم باقی نہ رہا تھا اور خلاف اُمید معاملات نے اُسکو پسپا ہونے پر مجبور کیا اُسی طرح دہلی کی سلطنت میں کوئی قوت باقی نہ رہی تھی اور احمد شاہ ابدالی بھی ملہر راؤ کو زیر نہ کرسکتا اگر پانی پت کی لڑائی میں اُسکے مشورہ پر عمل ہوتا جیسا آگے بیان ہوگا۔ ۱۲۔

لیکر حملہ کیا۔ روہیلوں نے سمجھا کہ وہ ہر طرف سے گھر گئے اور خوفزدہ ہوکر ایسے بھاگے کہ ہمالیہ کے دامن میں پناہ لی۔ اُن کا خیمہ و خرگاہ لوٹ لیا گیا۔ اودھ کا صوبہ محفوظ ہوگیا اور شاہ دہلی کی طرف سے روہیلوں کو تباہ کرنے کے انعام میں چند ورکی سرویش مکھی یعنی دس فی صدی مالگذاری وصول کرنے کا ہولکر کو فرمان عنایت ہوا۔ (ظریف کہتے ہیں کہ ؎ رسم یاں ہے نگوڑ مارنیا۔ اُلٹا دینا پڑا ہے خون بہا۔)

کہا جاتا ہے کہ جب ملہر راؤ نے روہیلوں کو اپنی تدبیر و حکمت سے تباہ کیا اور صفدر جنگ کی گلو خلاصی ہوئی تو اُس نے ہولکر سے پوچھا کہ وہ اس فتح کا کیا معاوضہ چاہتا ہے؟ وفا پرست سردار نے عاجزی سے جواب دیا کہ "میں پیشوا کا غلام ہوں اور اُسکی ماتحتی سے الگ ہوکر کوئی نفع نہیں چاہتا البتہ خاندیس میں چند ورکی دیش مکھی اگر مجھکو عطا فرمائی جائے تو میں بہت خوش ہوں گا" چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی اور چند ورکی جاگیر دی گئی۔

ملہر راؤ کو صفدر جنگ سے کوئی خاص محبت نہ تھی۔ وہ اپنے ارادہ کی تکمیل کے لیئے وزیر کا شریک ہوا تھا۔ اور اس بہانہ سے اُس نے روہیلوں کی زبردست فوج کو کچل ڈالا۔ وہ دہلی کے امرا کے ساتھ اسوقت وہی بازی کھیل رہا تھا جو پچاس برس کے بعد ایک اقبالمند قوم نے اُسکے ہموطنوں کے مقابلہ میں دکھائی۔ اُس نے صفدر جنگ سے مل کر روہیلوں کو تباہ کیا اور پھر نظام الملک کے بیٹے غازی الدین سے مل کر صفدر جنگ کو زچ کرنے لگا۔ یہ چال پہلے سے بھی زیادہ گہری تھی۔ غازی الدین کی سازش سے حیدرآباد اور دہلی دونوں جگہ مرہٹوں کا اقتدار قائم کرنا منظور تھا۔ جب غازی باپ کے مرنے کے بعد دکن کی ریاست پر قبضہ کرنے کو چلا تو ہولکر اپنی فوج لیئے ہوئے اُسکی مدد کو ساتھ تھا! پیشوا نے بھی موقع مناسب سمجھ کر حیدرآباد میں قدم جمانا چاہے۔ اور مرہٹوں کی فوجیں غازی الدین کو بزور شمشیر حیدرآباد کی مسند پر بٹھانے کو اورنگ آباد میں جمع تھیں کہ غازی الدین[1] کا دفعۃً انتقال ہوگیا۔ فریق مخالف بغیر مزاحمت کے مسند نشین ہوا اور مرہٹوں کو دست اندازی کا کوئی بہانہ باقی نہ رہا۔

---

[1] بعض انگریز مورخوں نے لکھا ہے کہ غازی الدین کو اُسکی ماں نے زہر دیا۔ جب یہ روایت خلاف فطرت سمجھی گئی تو دوسرے مورخوں نے اصلاح کی کہ سوتیلی ماں نے زہر دیا تھا مگر ان میں سے کسی قول کی دکن کی اسلامی تاریخوں سے تائید نہیں ہوتی۔ کیا اچانک موت بغیر زہر خورانی کے ممکن نہیں؟ خدا کو حیدرآباد کی ریاست قائم رکھنا منظور تھی ورنہ پونا کے راج کے ساتھ اُسکا بھی خاتمہ ہو جاتا!!

غازی الدین کا ایک لڑکا دہلی میں تھا اُسکو صفدر جنگ نے غازی الدین خاں خطاب اور امیر الامرائی کا منصب دلا کر باپ کا قائم مقام کیا لیکن وہ اپنے محسن کے خلاف ہو گیا اور اُسکا زور کم کرنیکے لیئے احمد شاہ کو تخت سے اُتار کر عالمگیر ثانی کو بادشاہ بنایا اور خود اُس کا وزیر بنگیا۔

محمد شاہ رنگیلے کے وقت میں نادر شاہ کے حملہ کے بعد ہندوستان پر ایک چڑھائی[1] احمد شاہ ابدالی نے کی تھی (جو نادر شاہ کی موت کے بعد افغانستان کا حاکم ہو گیا تھا) اور اپنا رقبۂ حکومت پنجاب تک وسیع کرکے لاہور میں ایک نائب السلطنت قائم کیا تھا۔ اور اس طرح سے یہ زرخیز صوبہ بھی دہلی کی حکومت سے الگ ہو چکا تھا۔ محمد شاہ کے بعد اُسکا بیٹا احمد شاہ دہلی میں تخت نشیں ہوا تو اُس نے بھی پنجاب پر دوبارہ تسلط قائم کرنے کی کوشش نہیں کی اور جب ابدالی کا نائب بقضاء الٰہی فوت ہو گیا تو اُسکے شیر خوار بیٹے کو (بولایت اسکی ماں کے) پنجاب کا حاکم رہنے دیا تھا لیکن عالمگیر ثانی کا زمانہ آیا اور غازی الدین وزیر ہوا تو اس صوبہ کو ابدالی کے پنجہ سے نکالنے کی کوشش شروع کی گئی۔ غازی الدین نے مرحوم صوبہ دار کی بیوہ سے خط کتابت کی اور اُس کی ناکتخدا بیٹی سے نکاح کا پیام دیا۔

رشتہ منظور ہوا تو وزیر اپنا بیاہ رچانے کے بہانہ سے لاہور کی طرف بڑھا۔ ۱۷۵۶ء میں یکایک شہر کو جا دبایا اور مظلوم بیوہ کو سوتے ہوئے گرفتار کیا۔ جب وہ قید ہو کر وزیر کے سامنے آئی تو غازی الدین کو کوسنے لگی اور پیشین گوئی کی کہ اُس کا آقا احمد شاہ ابدالی اس ذلت کا بدلہ لیگا۔ یہ قول بالکل صحیح ثابت ہوا۔ ابدالی اپنی متوسلہ کی بربادی سنکر مدد کو دوڑا اور پنجاب سے گذر کر دہلی کے قریب تک پہونچ گیا۔ وزیر نے خوشامد سے بیوہ کا غصہ ٹھنڈا کیا اور اُسکو بیچ میں ڈال کر احمد شاہ سے معافی مانگی لیکن وہ اپنا سفر خرچ وصول کرنے کے لیئے دہلی کی طرف بڑھا اور متھرا کو لوٹ کر جون ۱۷۵۷ء میں اپنے ملک کو واپس گیا۔ رخصت کے وقت بادشاہ دہلی نے ابدالی کی منت کی کہ اُسکو غازی الدین وزیر کے رحم پر چھوڑنا مروت کے خلاف ہے تو اپنے سامنے ہی اُس نے نجیب خاں روہیلہ کو دہلی کا امیر الامرا بنایا۔ اور اس سردار کو بادشاہ کی حفاظت کی تاکید کی۔

جیسے ہی ابدالی اقلیم ہند سے باہر ہوا غازی الدین نے دوبارہ سر اُٹھایا اور حاکم فرخ آباد احمد خاں بنگش کو امیر الامرائی کا منصب عنایت کرکے نجیب خاں کو معطل کر دیا۔ خود غازی الدین کو اتنی قوت نہ تھی

---

[1] یہ احمد شاہ کا پہلا حملہ تھا جو ۱۷۴۷ء میں ہوا۔

کہ نجیب الدولہ کو زیر کر سکے لہذا اُس نے پھر مرہٹوں سے امداد طلب کی۔ اُنکی اعانت سے شہر پر متصرف ہو کر قلعۂ شاہجہانی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور مرہٹوں کا ایک فوجی دستہ نجیب الدولہ کے وطن روہیلکھنڈ پر حملہ کرنے کو روانہ کیا۔

جب بادشاہ کو قلعہ کی حفاظت سے مایوسی ہوئی تو اُس نے حکمت عملی سے اپنے بیٹے علی گوہر کو بھگا دیا اور ملہر راؤ ہولکر سے نامہ و پیام کر کے نجیب الدولہ کی جان بچائی۔ ان امور سے فراغت کے بعد بادشاہ نے قلعہ کے دروازے کھول دیئے اور غازی الدین کو اپنا وزیر تسلیم کر لیا۔ اسوقت ہولکر کی سازش سے نجیب خاں کی خلاصی ہوئی تو ہمیشہ کے لیئے ان دونوں میں ایک خفیہ دوستی قائم ہو گئی۔ لیکن ملہر راؤ کا مقصود اس امداد سے نجیب الدولہ کی ہمدردی نہ تھی بلکہ غازی الدین خاں سے برابر کی چوٹ کے لیئے ایک زبردست مخالف کا زندہ رکھنا مرہٹوں کی آیندہ کامیابیوں کے لیئے مناسب تھا۔ نجیب الدولہ سہارنپور کی طرف بھاگا اور اس تہ کو نہ سمجھ کر ملہر راؤ کا بہت ممنون ہوا اور اُس کی شکرگذاری آیندہ بہت پھول پھل لائی۔

بہرحال اس مہم کے بعد ۱۷۵۸ء میں وزیر کے مشورہ سے مرہٹوں نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اور وہاں سے ابدالی کے نائب کو ہٹا کر دوسرا سردار پنجاب کی حکومت پر تعینات کیا۔

مرہٹوں کا دستہ جو روہیلکھنڈ کی طرف گیا تھا اُس نے نجیب الدولہ کا ملک خوب لوٹا اور پھر اودھ کی طرف رخ کیا۔ قریب تھا کہ پنجاب سے بنگالہ کی سرحد تک کُل علاقہ مرہٹوں کے تصرف میں آ جائے مگر شجاع الدولہ نے اپنی قدیم رنجشوں کو فراموش کر کے روہیلوں سے میل کیا اور نومبر ۱۷۵۹ء میں مرہٹوں کو گنگا پار ہٹا دیا۔

احمد شاہ ابدالی کو نجیب الدولہ کی معطلی اور بے بسی کی خبر ہوئی تو وہ کابل سے کوچ کر کے پھر پنجاب تک آ پہونچا۔ غازی الدین کو خوف پیدا ہوا کہ بادشاہ اُسکی زیادتی کی شکایت کرے گا اور نجیب الدولہ کی تباہی کا انتقام لیا جائے گا تو اُس نے مظلوم عالمگیر ثانی کو (بتاریخ ۲۰ - دسمبر ۱۷۵۹ء) قتل کر دیا اور دوسرے شہزادہ[۵] کو تخت پر بٹھانا چاہا مگر یہ ترکیب کارگر نہ ہوئی شہزادہ علی گوہر شجاع الدولہ کی پناہ میں تھا اور باوجود معزور ہونے کے وہی شاہ عالم کے خطاب سے ہندوستان کا جائز بادشاہ متصور رہا۔ اگرچہ دارالسلطنت دوسروں کے قبضہ میں تھا۔

---

[۵] یہ شہزادہ کام بخش پسر اورنگ زیب کا لڑکا تھا۔

بہرحال بادشاہ کو قتل کر کے غازی الدین نے مرہٹوں کی فوجیں ابدالی کو روکنے کے لیئے پنجاب کی طرف بڑھائیں۔ یہ لشکر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک پر دتاجی[1] سندھیا اور دوسرے پر ملہار راؤ ہولکر حاکم تھا۔ رعایا غازی الدین اور مرہٹوں سے بیزار تھی اس لیئے ابدالی کے کوچ و مقام کی ان سرداروں کو صحیح خبر نہ مل سکی۔ دتاجی کی فوج پر ابدالی نے یکایک چھاپا مارا اور اُسکے لشکر کا بیشتر حصہ کاٹ کر پھینکدیا۔ ہولکر نے دانشمندی سے چمبل کی طرف واپسی شروع کی تاکہ دشمن کی رسد روک دے۔ مگر افغانوں نے اُسکو بھی ایک دن گھیر لیا اور تباہی کے لگ بھگ پہونچا دیا۔ بڑی حکمت سے وہ اپنی فوج کا زیادہ حصہ بچا کر جنوب کی طرف بھاگا اور ابدالی دو آبہ میں داخل ہو گیا۔

باوجود اس اتفاقی ناکامی کے مرہٹوں کی قوت اسوقت شباب پر تھی۔ شمال میں ہمالیہ اور دریائے اٹک تک اُن کا دبدبہ قائم اور جنوب میں سمندر تک اُنکی حکومت تھی۔ جو صوبے اُنکی اطاعت سے آزاد تھے وہ یا تو باجگزار بنگئے تھے یا اس قدر ضعیف اور کمزور ہو چلے تھے کہ مرہٹوں کی غلامی میں داخل ہونے کو بہانہ ڈھونڈھتے تھے۔ مرہٹوں کا راجہ بدستور "ستارہ" میں نظر بند تھا اور حکومت پیشوا کے ہاتھ تھی۔ فتوحات میں دوسرے سرداروں نے بھی مدد کی تھی مگر اس ترقی کا سب سے بڑا باعث ملہار راؤ ہولکر تھا جو قریب قریب ہر میدان میں کامیاب ہوتا تھا اور جس جگہ صورت دگرگوں نظر آتی تھی وہاں سے اپنی فوج کو نہایت خوبی کے ساتھ ہٹا کر دوسرے کمزور مقاموں پر حملہ کر دیتا تھا اور مرہٹوں کی سطوت و جبروت میں فرق نہ آنے دیتا تھا۔

جبکہ ہولکر شمالی ہندوستان کو مرہٹوں کی سلطنت کے لیئے صاف کر رہا تھا۔ پیشوا کا چچا زاد بھائی "سداشیو بھاؤ" دکن میں سلطنت کو وسعت دینے اور نظام کے زیر کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے صوبہ دار دکن کو شکست دے کر بہت علاقہ اور روپیہ وصول کیا تھا اور اس مہم سے فارغ ہو کر اُس نے پیشوا کو صلاح دی تھی کہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال دینا ہی بہتر ہے تاکہ آئے دن کے جھگڑوں بکھیڑوں سے نجات ملے اور ملک کو اطمینان نصیب ہو۔ اب مرہٹوں نے اپنا فوجی نظام درست کر لیا تھا۔ اُن کا لشکر لوٹیروں کی جماعت نہ تھا بلکہ اُس میں منتخب سوار ملازم تھے اور دس ہزار قواعد داں پیادے تھے۔ ان کا توپخانہ بہت ترقی کر گیا تھا اور کل سامان جنگ اُنکے پاس مغلوں سے بہتر موجود تھا۔ سندھیا اور ہولکر کو احمد شاہ ابدالی

---

[1] یہ دتاجی سندھیا مسبوق الذکر کا لڑکا تھا۔ ۱۲

سے زک ملی تو اُس نے مرہٹوں کی آتش غضب پر تیل چھڑکا اور پونا میں مستقل ارادہ کر لیا گیا کہ ایکدفعہ ہندوستان پر ایسی بھاری چوٹ کی جائے کہ ہمیشہ کے لیئے یہ قصہ ہی پاک ہو جائے - انسان تجویز کرتا ہے اور خدا کی بارگاہ سے احکام صادر ہوتے ہیں - آدمی کا کام صرف عمل کی نیت کرنا ہے اُسکا سرانجام پانا یا ناتمام رہنا آسمانی طاقت کے سپرد ہے - !!

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

احمد شاہ ابدالی سندھیا اور ہلکر کو شکست دیکر خوش ہوا ہو گا مگر ستمبر ۱۷۵۹ء[۱] میں پونا سے اُسکی سرکوبی کے لیئے ایک زبردست فوج روانہ ہو چکی تھی جو عنقریب اُسکی خوشیوں کو مبدل بہ غم کرنے کے لیئے دہلی پہونچا چاہتی تھی !!

"سداشیو بھاؤ" مع پیشوا کے لڑکے "وشواس راؤ" کے بڑے ساز و سامان کے ساتھ دکن سے چلا تھا - بڑے بڑے سورما برہمن اور چُنے ہوئے سردار اُسکے ہمرکاب تھے - ایک مضبوط توپخانہ اور دس ہزار بندوقچی اور توپچی جلو میں تھے جن کا افسر ایک شخص "ابراہیم گردی" نام تھا جس نے فرانسیسیوں سے فنونِ حرب کی تعلیم پائی تھی، بیس ہزار مرہٹہ سردار بیش قیمت گھوڑوں پر سوار اُسکے اشارہ پر جان دینے کو ہمراہ تھے - گجرات سے گیکوار اپنی فوج لیکر ساتھ ہوا - مالوہ سے ملہر راؤ ہولکر نے اپنی امداد شامل کی - بندیلکھنڈ سے وہاں کا سردار گووند پنتھ اپنے رسالہ کو لیکر حاضر ہوا - راجپوت سرداروں نے بھی مدد دی اور بھرتپور کے جاٹ راجہ سورج مل نے ۲۰ ہزار سپاہی پیش کیئے - یہاں تک کہ ہندوستان کے قریب پہونچتے پہونچتے چار پانچ لاکھ فوج ہو گئی !!

مرہٹوں کے لشکر میں اسوقت سب سے زیادہ ہوشمند اور تجربہ کار ملہر راؤ ہولکر تھا - اُسکی عمر ۷۶ سال کے قریب ہو چکی تھی - وہ مرہٹوں کے قدیم عادات و اطوار اور اُنکے مجرب فنونِ جنگ سے آگاہ تھا - اُس نے دیکھا کہ "بھاؤ" کے ساتھ بڑے بڑے پُرتکلف ڈیرے اور شامیانے ہیں جن میں ریشم اور زربفت کا کام کیا ہوا ہے - ہاتھیوں اور گھوڑوں پر بیش قیمت جھولیں پڑی ہیں - سامان خوراک و اسباب عیشت کی سیکڑوں گاڑیاں ساتھ ہیں اور وہی سب ساز و سامان جمع ہے جو پچھلے زمانہ میں مغلوں کے ساتھ ہوتا تھا اور مرہٹے چھاپے مار کر اُس کو

---

[۱] گرنٹ ڈف - تاریخ مرہٹہ - جلد ۲ - صفحہ ۱۳۹ -

لوٹا کرتے تھے۔ طرہ یہ کہ سپہ سالار تکبر و خود پسندی کے نشہ میں مست ہے اور اپنی طاقت کے زعم میں زمین پر پاؤں نہیں رکھتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ برعکس ہو جائے۔ افغانی اپنے تیز گھوڑوں پر چڑھ کر دھاوے کریں اور مرہٹے یا تو اس سامان سے ہاتھ دھوئیں یا اپنی جانیں گنوائیں!! اُس نے سورج مل جاٹ سے مشورہ کیا اور ان دونوں نے متفق ہو کر بھاؤ کو صلاح دی کہ توپ خانہ اور بھاری سامان بھرت پور میں چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ کسی مضبوط قلعہ میں رکھا رہے اور سردار صرف سواروں کی جمعیت سے مرہٹوں کے قدیم اصول جنگ کے مطابق دشمن کو زچ کریں اور لڑائی کو اتنا طول دیں کہ افغان جو کئی مہینے سے ہندوستان آئے ہوئے ہیں آب و ہوا کی ناموافقت سے مجبور ہو کر اپنے ملک کو واپس جائیں۔

کوئی شک نہیں کہ ملہر راؤ کا مشورہ نہایت مناسب تھا مگر بھاؤ کی قسمت میں وہ تباہی لکھی تھی جو ہمیشہ غرور کے ساتھ چلتی ہے۔ اُس نے قواعد داں پیادہ فوج اور توپ خانہ پر بھروسہ کرکے خدا کو فراموش کیا اور ملہر راؤ سے کہا "میں بکریاں چرانے والے کی صلاح نہیں چاہتا" پھر سورج مل کی طرف مخاطب ہو کر بولا کہ "چھوٹے زمینداروں کو بڑے بڑے ملکوں کے انتظام کی قابلیت نہیں ہوتی ہے" ملہر راؤ شرمندہ ہوا اور سورج مل کو یہ چوٹ بہت ناگوار ہوئی مگر مصلحتِ وقت دیکھ کر دونوں خاموش رہے اور بھاؤ بڑے شان و شکوہ سے دہلی کی طرف بڑھا۔

دار السلطنت میں اسوقت کوئی بادشاہ نہ تھا۔ شاہ عالم مفرور تھا اور تھوڑی سی افغانی فوج قلعہ کی حفاظت کے لیے موجود تھی۔ وہ اس سیلاب عظیم کا کیا مقابلہ کرتی۔ بھاؤ نے آسانی سے شہر پر قبضہ کرلیا۔ قلعہ میں خوب لوٹ کھسوٹ کی اور دربار عام کی چھت میں جو چاندی[1] نادر شاہ کی غارتگری سے بچ رہی تھی اسکے ہاتھ آئی۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ دہلی پر متصرف ہونے کے بعد بھاؤ نے پیشوا کے لڑکے وشواس راؤ کو تخت پر بٹھایا اور شجاع الدولہ کو منصب وزارت عنایت کیا۔ لیکن یہ روایت قطعاً غلط ہے۔ مرہٹوں کی کتابوں[2] سے بھی اسکی کوئی سند نہیں ملتی۔ ممکن ہے کہ بھاؤ کی نیت اس عمل کی ہو اور اپنے حلقۂ احباب میں اُس نے یہ خیال ظاہر کیا ہو لیکن جب تک احمد شاہ ابدالی ہندوستان میں موجود تھا اس تجویز پر

[1] اس چاندی کی قیمت کا تخمینہ سترہ لاکھ کیا جاتا ہے۔ ۱۲

[2] ڈف گرانٹ صاحب لکھتے ہیں کہ اُس نے شاہ عالم کے لڑکے مرزا جواں بخت کو بادشاہ بنایا تھا۔ (جلد ۲۔ صفحہ ۱۴۳)

عمل کرنا بالکل غیر ممکن اور خلاف قیاس تھا -

سورج مل جاٹ پہلے ہی بھاؤ سے آزردہ تھا - فتح دہلی کے بعد اُس کا چڑھا ہوا پارہ دیکھ کر جاٹ نے شجاع الدولہ سے خفیہ ساز کیا اور اپنے ملک کو چلا گیا - مگر بھاؤ نے اسکی کچھ پروانہ کی اور دسہرہ کے بعد ہی احمد شاہ سے مقابلہ کے لیئے دہلی سے روانہ ہوا - ۸۰ میل کے فاصلہ پر کنج پورہ میں ایک فوجی چھاؤنی افغانوں کی لوٹ کر اپنے خیال کے مطابق سابقہ فتوحات میں ایک کڑی کا اور اضافہ کیا!!

احمد شاہ اس عرصہ میں انوپ شہر کے مقام پر مقیم تھا اور شجاع الدولہ کو ہموار کرنے کی کوشش کر رہا تھا - نجیب الدولہ اور روہیلوں کی فوجیں پہلے سے اُس کے ساتھ تھیں لیکن وہ اودھ کا لشکر بھی مرہٹوں سے مقابلہ کے لیئے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا - نجیب الدولہ کے سمجھانے بجھانے سے شجاع الدولہ راہ پر آگیا اور اگرچہ مرہٹوں سے خط و کتابت کا سلسلہ اُس نے قائم رکھا لیکن جولائی ۱۷۶۰ء میں احمد شاہ کے کیمپ میں داخل ہوگیا -

جب ابدالی کو اودھ کی طرف سے اطمینان ہوا تو برسات گذرنے سے قبل اُس نے انوپ شہر کی چھاؤنی توڑ دی اور دہلی کی طرف بڑھا - راستہ میں خبر ملی کہ مرہٹوں نے کنج پورہ کی چوکی پر دھاوا کیا ہے تو اُس نے غضبناک ہوکر دریاے جمنا کو عبور کیا جو ابھی تک پایاب نہ ہوا تھا - اُسکی فوج کا ایک حصہ دریا کے عبور میں ضایع ہوگیا مگر اس ہمت و دلاوری کا رعب ایسا چھایا کہ ۲۶ - اکتوبر کو ایک ہلکی لڑائی[1] کے بعد ہی مرہٹے شمال کی طرف پسپا ہوئے اور پانی پت کی دیواروں کے نیچے پناہ لیکر کیمپ کے گرد حفاظت کے لیئے ایک گہری خندق کھود دی اور دمدمے اور مورچے لگائے - احمد شاہ وہاں پہونچا تو اُس نے بھی دشمن کے مقابل اپنے خیمے گاڑے -

دو مہینے تک یہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں اور اب اُس نیک مشورہ کا نتیجہ ظاہر ہوا جو ملہر راؤ نے سال بھر پہلے دیا تھا اور اسکے انعام میں جھڑکی پائی تھی اور طعنہ سنا تھا یعنی تختہ اُلٹ گیا - مرہٹے خود محصور ہو گئے - افغان اِردگرد دیہات میں چکر لگاتے اور دشمن کو رسد اور چارہ نہیں لانے دیتے تھے - بندیلکھنڈ کا رئیس گووند پنت ہمت کرکے چارہ کی تلاش میں دُور نکل گیا تو ہزار آدمیوں کے ساتھ میرٹھ کے قریب مارا گیا اور مرہٹوں کے لشکر میں قحط پڑ گیا -

---

[1] یہ لڑائی سونی پت کے مقام پر ہوئی تھی - ۱۲

اسوقت افغانوں کی فوج میں بروایت صحیح ۱۸ ہزار کابلی ۱۸ ہزار روہیلے سوار ۳۸ ہزار ہندوستانی پیادے اور ۸۰ ہزار توپیں تھیں۔ مرہٹوں کی جمعیت کاشی[۱] رائے معتمد نواب شجاع الدولہ کے قول کے مطابق پانچ لاکھ تھی۔ لیکن اس تعداد میں غالباً کیمپ کے خلاصی اور ملازمین بھی شامل تھے۔ لڑنیوالے بہادر ۷۰ و ۸۰ ہزار کے درمیان تھے۔ اور انکے علاوہ ایک بڑی تعداد لٹیروں کی ہمراہ تھی۔ دوسو توپیں ساتھ تھیں۔ اور ایک بہت بڑا ذخیرہ "بان" کا تھا جو مرہٹوں کا موروثی آلۂ جنگ ہے اور جسکے استعمال میں انکو خاص ملکہ تھا۔

دونوں فریق مقابلہ میں پڑے پڑے عاجز آگئے تھے۔ ہلکی ہلکی لڑائیاں ہوتی تھیں جنسے کچھ نتیجہ نہ تھا۔ سب چاہتے تھے کہ جلد ایک فیصلہ کُن جنگ ہوکر معاملہ یکسو ہوجائے لیکن احمدشاہ لڑائی کو ٹالتا تھا اور ہندوستانی سرداروں سے کہتا تھا کہ "ہرایک کام تمہارے اختیار میں ہے اور میں کچھ دخل نہیں دیتا لیکن لڑائی کا شروع کرنا میری مرضی پر چھوڑدو۔" اُس نے بھی اپنے لشکر کے گرد خندق بنائی تھی اور اُسکے سامنے ایک سرخ رنگ کا ڈیرا کھڑا کیا تھا جس میں طلوع آفتاب کے بعد اشراق کی نماز پڑھتا تھا اور شام کو کھانا کھاتا تھا۔ دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار مختلف جنگی مقامات کو دیکھتا پھرتا تھا اور پچاس ساٹھ میل کا چکر ایک دن میں لگاتا تھا۔ رات کے وقت پانچ ہزار سواروں کا پہرہ شب خون سے حفاظت کے لیے قائم کرتا۔ خود اسکی نگرانی رکھتا اور ہندوستانی رئیسوں کو آرام کی اجازت دیتا تھا۔ ایک چشمدید[۲] گواہ کا بیان ہے کہ احمدشاہ کے احکام کی تعمیل اُسکے لشکر میں فرمانِ تقدیر کی طرح ہوتی تھی یعنی اُسکے حکم کا ٹلنا محال تھا!

ایسے جفاکش اور جہاں دیدہ جنرل کے مقابلہ کے لیے ملہر راؤ کی دانشمندانہ صلاح کو نہ مان کر بھاؤ ایک متعفن نشیب میں محصور تھا۔ جہاں فاقہ سے مرے ہوئے جانوروں کی لاشیں دماغ کو پریشان کرتی تھیں۔ اور بھوکے پیاسے سپاہیوں کا شوروہنگامہ سرداروں کو زندگی سے عاجز بناتا تھا۔ ایکدن مصیبتوں سے تنگ آکر سب نے بھاؤ سے عرض کیا کہ اب کھانے پینے کو کچھ باقی نہیں رہا، رسد کے ذخیرے ختم ہوگئے بھوکوں مرنے سے لڑائی کی جوکھم اُٹھانا آسان ہے۔ بھاؤ نے اُنکی رائے سے اتفاق کیا اور سب نے

[۱] کاشی رائے اس جنگ کا چشم دید گواہ ہے۔ اُس کی مرتب کی ہوئی داستان جنگ ایشیاٹک ریسرچز جلد سوم میں اسوقت تک محفوظ ہے۔ ۱۲

[۲] کاشی رائے۔ ۱۲

لڑنے مرنے کی قسم کھائی - فوج کو حکم سنایا گیا کہ کل طلوع آفتاب سے پہلے دھاوا ہوگا -

بھاؤ کو ابھی آس باقی تھی کہ شجاع الدولہ ابدالی کا ساتھ چھوڑ کر مرہٹوں کا شریک ہو جائیگا۔ آدھی رات کے وقت اُس نے کاشی رائے کو خاص اپنے ہاتھ سے لکھا کہ "اب پیالہ لبریز ہو گیا اور ایک بوند کی بھی گنجایش نہیں ہے - کچھ بن پڑے تو کرو ورنہ صاف جواب دو کیونکہ اسکے بعد لکھنے پڑھنے کا وقت نہ ملے گا" کاشی رائے یہ رقعہ پاتے ہی شجاع الدولہ کے پاس گیا - اور ابھی خط سنا ہی رہا تھا کہ جاسوس دوڑتا ہوا آیا اور عرض کی کہ مرہٹے مسلح ہو رہے ہیں - شجاع الدولہ فوراً احمد شاہ کے ڈیرہ پر گیا اور پہرے والوں سے کہا کہ بادشاہ کو جگانا چاہیے - اسکی آواز سنکر احمد شاہ خود باہر نکل آیا تو ہتھیاروں سے آراستہ تھا - وہ شجاع الدولہ سے دو دو باتیں کرکے گھوڑے پر سوار ہوا اور فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔

جب صبح کا سپیدا پھیلنے لگا تو مرہٹوں کی فوج آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوئی - توپ خانہ آگے تھا، قلب لشکر میں بھاؤ، داہنی طرف ہولکر اور سندھیا کی فوجیں اور بائیں طرف ابراہیم گردی کی قواعد داں پیادہ فوج تھی - احمد شاہ نے بھی اپنی فوج کو آراستہ کیا - بائیں طرف سندھیا اور ہولکر سے مقابلہ کے لیے نجیب الدولہ اور روہیلوں کو قائم کیا - انکے بعد نواب اودھ کو دو ہزار سواروں کے ساتھ رکھا - قلب میں حافظ رحمت خاں[1] کو اور داہنی طرف گردی کے مقابل ایرانیوں کا لشکر کھڑا کیا - انکے علاوہ دو ڈویژن منتخب سواروں کے افغان سرداروں کی ماتحتی میں فوج محفوظ کے طور پر الگ رکھے اور خود لال ڈیرے میں جا بیٹھا جو اب فوج کے پیچھے ہو گیا تھا -

مرہٹوں کے توپ خانہ نے آتشباری شروع کی اور ایرانی رسالہ کے قدم اُکھڑ گئے - ابراہیم گردی کے پیادے روہیلوں پر اس زور سے بڑھے کہ آٹھ ہزار پٹھان کام آگئے - اور تین گھنٹے تک گردی میدان کا فاتح رہا - شجاع الدولہ بدحواس ہو گیا - وہ نہ لڑتا تھا نہ بھاگتا تھا - البتہ نجیب الدولہ دمہوں کی آڑ سے سواروں کی زد روکتا تھا اور بار بار چلاتا تھا کہ "سب سردار غلطی کر رہے ہیں لیکن میں ایسی خطا کرکے کہاں رہوں گا"

جب اسی حال میں دوپہر ڈھل گئی اور تقریباً ایک بجے کا وقت ہوا تو احمد شاہ اپنی فوج محفوظ لیکر قلب لشکر کی امداد کو آیا اور ہر طرف سے مرہٹوں کو گھیر لیا - اسکے بعد بھی ایک گھنٹہ تک جان توڑ

[1] روہیلوں کا مشہور سردار جو شجاع الدولہ کی لڑائی میں بعد کو قتل ہوا - ۱۲

لڑائی رہی لیکن اس تازہ دم فوج سے بھوکے پیاسے مرہٹے کیونکر مقابلہ کر سکتے تھے۔ سب سے پہلے جس سردار نے میدان سے بھاگنے کا ارادہ کیا وہ سپہ سالار بھاؤ تھا۔ اُس نے اپنے متعلقین ہولکر کی حفاظت میں دیئے اور گھوڑے کی باگ موڑ کر سرپٹ فرار ہو گیا۔ ملہر راؤ کو فتح سے پہلے ہی مایوسی تھی لیکن اپنے خلوص اور وفاداری کے جوش سے وہ ابھی تک جان پر کھیل رہا تھا۔ جب وشواس راؤ قتل ہو گیا تو اُسنے بھی طے کیا کہ اس میدان سے اپنے لشکر کو زندہ و سلامت نکال لیجانا مرہٹوں کی آیندہ بہبودی کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ اور اپنی ماتحت فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ نجیب الدولہ ہولکر کا ممنون تھا اُسنے تعاقب نہیں کیا اور ملہر راؤ کی فوج اس حسرت انجام میدان سے قریب قریب بے داغ نکل گئی۔

کہا جاتا ہے کہ بیشمار مرہٹے اس لڑائی میں قتل ہوئے اور جو دشمنوں کی مار سے بھاگے انکو تعاقب کرنے والے سواروں نے قتل کیا یا دیہاتیوں نے کپڑوں اور ہتھیاروں کے لالچ سے صاف کیا۔ ابراہیم گردی زخموں سے چور گرفتار ہوا اور ایک ہفتہ کے اندر مر گیا۔ کاشی راے کا بیان ہے کہ افغانیوں نے ابراہیم کے ساتھ بیرحمی کا برتاؤ کیا اور اُسکے زخموں پر زہر کے پھاۓ چڑھائے۔ لیکن یہ روایت خلاف قیاس ہے۔ اُس زمانہ میں دشمن کی جان لینا ایک معمولی بات تھی۔ اگر ابراہیم سے مرہٹوں کے ساتھ دینے کا بدلہ لینا منظور ہوتا تو احمد شاہ اُسکو ایک ہفتہ تک کیوں زندہ رہنے دیتا؟

خاندان سندھیا میں سے جنکوجی زندہ گرفتار ہوا۔ اور با وجود شجاع الدولہ کی سفارش کے قتل کر دیا گیا۔ مادہاجی سندھیا جسنے ملہر راؤ کے بعد ہندوستان میں بہت عروج پایا اس خونی میدان سے ایک دکھنی گھوڑی پر سوار بھاگا، اور ایک افغانی نر گھوڑے پر سوار اُسکے تعاقب میں چلا۔ گھوڑی بیسیوں کوس کی منزل ایک سانس میں کر سکتی تھی مگر گھوڑا مادہ کی بو پا کر اُسکا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ جب افغانی نے تعاقب سے عاجز آکر واپس ہونا چاہا تو مست گھوڑا اُسکے قابو سے باہر تھا۔ آخر کار مادہ خوف کھا کر ایک خندق میں گر گئی اور پٹھان نے مادھاجی کے پاؤں پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ ہمیشہ کے لیے لنگڑا ہو گیا۔ سندھیا کے قیمتی کپڑے اُتار لیے۔ ہتھیار چھین لیے اور اُسکو زندہ چھوڑ کر اپنے لشکر کی طرف واپس گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک مسلمان سقہ رانا خاں نام بیل پر پکھال لادے خندق کے پاس سے گذرا اور مادھاجی کو خستہ و مجروح دیکھ کر اپنے بیل پر سوار کیا اور حفاظت کی جگہ پہونچا دیا۔ سندھیا اس احسان کو نہیں بھولا اور سقہ کو اپنا بھائی کہتا رہا اور تک

کہ سندھیا کے انتہائی عروج کے وقت یہی سقہ اُسکی فوج کا ایک جنرل اور سلطنت دہلی کے وکیل مطلق کا دست و بازو تھا!!

میدان جنگ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک لاش بے سر کی ملی۔ جسکی بابت یقین کیا گیا کہ وہ بھاؤ کی ہے۔ شجاع الدولہ کے اصرار سے اُس جسم بے سر کی کریا ہوئی۔ اگرچہ یہ معاملہ مشتبہ رہا کہ وہ لاش واقعی بھاؤ کی تھی یا نہیں۔ بڑے بڑے مرہٹہ سردار اس جنگ میں قتل ہوئے اور گرانٹ ڈف صاحب[۲] کے قول کے مطابق مرہٹوں کے کاغذات سے مقتولین کی تعداد دو لاکھ معلوم ہوتی ہے۔

بالاجی پیشوا دکن سے مزید فوج لیکر بھاؤ کی امداد کو چلا تھا اور نربدا کے کنارے خیمہ زن تھا کہ اُسکو مرہٹوں کے ساہوکار کا قاصد ملا جو دکن میں گماشتہ کے نام خط لیے جاتا تھا۔ پیشوا نے خط چھین کر پڑھا تو اُس کے یہ الفاظ تھے:

"دو موتی گھل گئے۔ ۲۷ اشرفیاں کھوئیں۔ چاندی اور تانبے کی میزان کا کچھ شمار نہیں"

اس مبہم عبارت سے پیشوا نے سمجھ لیا کہ لشکر کو شکست ہوئی۔ اُسی وقت وہ سپاہی بھی آنا شروع ہوئے جو میدان سے منہ موڑ کر بھاگے تھے۔ اور اُنھوں نے اس خیال کی تصدیق کی۔ پیشوا نے آگے بڑھنا بے سود سمجھ کر فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ اور گمان کیا جاتا ہے کہ اسی شکست کے صدمہ سے جون ۱۷۶۱ء میں جنگ سے پانچ[۳] مہینے بعد مر گیا۔

پانی پت کی لڑائی بہت زیادہ تفصیل سے بیان کی گئی لیکن ملہر راؤ کی زندگی اور نیز مرہٹوں کی تاریخ میں یہ سب سے زیادہ مہلک جنگ تھی اور اسنے ہولکر کی تمام عمر کی کوشش بیکار کر دی۔ بھاؤ کی خودسری سے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔ اور ہولکر اپنی فوج کو اگر دور اندیشی سے بچا نہ لاتا تو ہندوستان کے ساتھ مالوہ سے بھی مرہٹوں کی حکومت غائب ہو جاتی۔ اُس پر آجکل الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ میدان جنگ سے بہت جلد چلا آیا اور اُسنے کوئی نمایاں خدمت اپنے قوم و ملک کی اس میدان میں نہیں کی

[۱] کئی برس کے بعد ایک مکار نے بھیس بدل کر اپنے کو سداشیو بھاؤ کے نام سے مشہور کیا۔ لیکن اُس کا فریب جلد ظاہر ہو گیا - ۱۲

[۲] تاریخ مرہٹہ: جلد ۲ صفحہ ۱۵۶ -

[۳] جنگ پانی پت جنوری ۱۷۶۱ء میں ہوئی تھی - ۱۲

لیکن الزام قائم کرنیوالے بھول جاتے ہیں کہ ساری تباہی اُسکی نصیحت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ اور ایسی حالت میں جو کچھ سرفروشی اُس نے ظاہر کی وہ محض اُسکے خلوص و وفاداری کا نتیجہ تھی۔ علاوہ اسکے اگر ہولکر اپنی فوج کو صحیح و سلامت نہ لے آتا تو مرہٹے دوبارہ ہندوستان پر چڑھائی کرنے کی ہمت نہ کرتے۔ کیونکہ آیندہ جو کچھ کامیابیاں مرہٹوں کو نصیب ہوئیں وہ درحقیقت اُسی دانشمندی کا ثمرہ تھیں جو ملہر راؤ نے اپنی فوج کو بلوہ سے بچا لانے میں دکھائی تھی۔

بہرحال ہولکر نہایت قلق کے ساتھ مالوہ واپس ہوا اور ہندوستان سے مایوس ہوکر اپنی ریاست کی اصلاح میں مصروف ہوا۔ اُسکے پاس مالوہ میں ۴۷ ½ لاکھ اراضی تھی۔ راجپوتانہ میں رامپورہ بھانپورہ اور ٹونک کی جاگیر پر قبضہ تھا۔ دکن میں ایک وسیع علاقہ تھا۔ خاندیش میں ریاست تھی۔ وادی نربدا کے جنگل اسکی املاک تھے۔ ست پوڑا اور بندھیاچل کے پہاڑوں پر اسکے قلعے تھے۔ غرض اپنی انتظامی قابلیت صرف کرنے کے لیے ملہر راؤ کے پاس بہت زرخیز میدان موجود تھا۔ لیکن چالیس برس تک فوج کی سرداری کرنے کے بعد اپاہج بنکر گھر بیٹھنا مشکل تھا۔ ہندوستان سے واپس آتے ہی وہ نئے پیشوا مادھوراؤ کی مدد کے لیے نظام دکن سے لڑنے گیا اور راکشس بن کی مشہور لڑائی میں مغلوں کو ایسی شکست دی کہ صوبہ آنبہ ہولکر کو جاگیر میں دیا گیا۔

۱۷۶۴ء میں جب بھرت پور کے راجہ سورج مل نے دہلی سے سرتابی کی اور وزیر نے راجہ کو قتل کر دیا تو ملہر راؤ اپنی فوج لیکر سورج مل کے بیٹے کی مدد کو پہونچا اور دہلی پر چڑھائی کردی مگر نجیب الدولہ کو وزیر کی مدد پر دیکھ کر اُسکی آنکھ احسانمندی قدیمانہ کے بوجھ سے نیچی ہوگئی اور اپنے ملک کو واپس چلا آیا۔

جب مرہٹوں کی حالت سنبھلی اور پیشوا کا چچا رگھوناتھ راؤ ہندوستان کا دوبارہ عازم ہوا تو باوجود ضعیفی کے ملہر راؤ کو چین نہ آیا اور ۷۰ برس کی عمر میں اپنی فوج لیکر ساتھ ہوا۔ مگر عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ۲۲ مئی ۱۷۶۶ء کو عالم پور کے ضلع میں گوالیار سے تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اسی مقام پر اُسکی چھتری بنائی گئی۔ اور وہ گاؤں آج تک ملہر گنج کہلاتا ہے اور ہولکر کے جانشینوں کے قبضہ میں ہے۔

اس بہادر سردار کی پرائیوٹ لائف بالکل دریافت نہ ہوسکی جسکی ساری ہوا سے خصائل کا اندازہ صرف واقعات تاریخی ہی سے ہوسکتا ہے۔ مشہور

حلم و تواضع میں کوئی مرہٹہ سردار اُسکے مقابلہ کا نہ تھا۔ رئیسوں اور شریفوں کے ساتھ اُسکا برتاؤ بہت اچھا تھا اور اُسکی فیاضی، ریاست ہولکر میں ضرب المثل ہے۔ جب کسی سپاہی سے خوش ہوتا تو حکم دیتا تھا کہ اسکی ڈھال روپیوں سے بھردو۔ دولت کی اُسکو کچھ قدر نہ تھی۔ اور کہا کرتا تھا کہ حساب کتاب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ پیشوا کا تمام عمر نیازمند و وفادار رہا اور باوجود عروج پانے کے وہ دن اُسکو کبھی فراموش نہیں ہوا جب وہ کھیت میں بکریاں چراتا ہوا سو گیا تھا۔ اور سانپ اُس کے سر کے پاس آیا تھا۔

سچ ہے کہ شریف آدمی اپنی حالت کبھی نہیں بدلتے اور میوہ سے لدی ہوئی ڈالی ہمیشہ اپنا سر زمین کی طرف جھکائے رہتی ہے۔ وفاداری۔ اولوالعزمی، ہمت، بہادری، سادگی، فروتنی اور فیاضی وہ خاص اوصاف ہیں جن میں ملہر راؤ اپنے ہمچشموں سے ممتاز تھا۔ اور ہندوستان کی موجودہ نسل کو اس بہادر کی سوانحعمری سے ان خوبیوں کا سبق لینا چاہیے۔

"خافی خاں"

انعامی مضمون

دسمبر کی آخری تاریخوں میں بعض اصحاب نے اپنے مضامین ارسال فرمائے۔ ایک صاحب نے حیدرآباد سے تحریر فرمایا کہ طاعون کیمپ میں مقیم ہونے کی وجہ سے اطلاع دیر میں پہونچی۔ اسلیے دو ہفتہ مہلت دی جائے۔ دوسرے صاحب نے علیگڈھ سے جوابی تار پر تین دن کی مہلت طلب کی۔ مشتہرہ میعاد میں اگر کافی مضمون وصول ہو گئے ہوتے تو یقیناً ہمیں آخرالذکر بزرگ کو مہلت دینے میں عذر ہوتا مگر ۳۱ دسمبر تک کل نصف درجن مضامین وصول ہوئے تھے جن میں سے ایک شرائط مقابلہ کے خلاف اسقدر مختصر ہے کہ مجلس انتخاب کے روبرو نہ پیش کیا جا سکے گا۔ اس بنا پر ہم نے پہلے حیدرآبادی بزرگ کو مہلت دیدی اور پھر علیگڈھ کے تار کا جواب بھی اثبات میں لکھدیا۔ جملہ مضامین موصولہ انشاءاللہ آخر جنوری تک جانچنے والے اصحاب کے حوالہ کر دیے جائیں گے۔ آیندہ نمبر میں ہم اُن اصحاب کے نام بھی درج کر دینگے جنکے مضامین جانچ کیے جائیں گے۔ اور جانچ کا نتیجہ انشاءاللہ مارچ کے الناظر میں درج ہو سکے گا۔

ایڈیٹر

اتحاد بین المسلمین والہنود

تشخیص مرض و تدبیر علاج

بحمد اللہ کہ فقیر نے اس وقت تک سیاسیات حاضرہ میں حصہ لینے یا رائے دینے کی کبھی جسارت نہیں کی جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے فقیر کے پاس نہ وقت ہے نہ دماغ اور نہ علم۔ بنا براں فقیر نے اپنے لیے کنج خمول ہی بہتر سمجھا۔ مگر مسئلۂ اتحاد بین المسلمین والہنود کو فقیر سیاسی نہیں بلکہ ایک خالص تمدنی و عمرانی مسئلہ سمجھتا ہے۔ اسی اعتبار سے فقیر کو ہمت ہوئی کہ اپنے افکار و مساعی کو اربابِ بصیرت کی خدمت میں پیش کرے۔

چونکہ رسالۂ الناظر بھی سیاسیات سے اجتناب اور اس مسئلے کے اذعانِ صحیح میں فقیر کا ہم نوا و ہم خیال ہے لہذا یہ توقع بے جا نہیں کہ اس کے متعلق فقیر کے خیال و عمل کی اشاعت و اعلان میں اعانت سے دریغ نہ فرمایا جائے گا۔

فقیر نے نہایتِ فکر و نظر اور کمالِ حدتِ بصر سے کام لے کر مسئلے کے مالہٗ و ما علیہ پر غور کیا ہے۔ فریقین کے صاحبانِ رائے اور واقفانِ حال سے بحث و تحیص کی ہے اور الحمد للہ کہ فقیر اس خاص سبب کے دریافت کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوگیا ہے جو صدیوں کی یکجائی اوطان اور یکسانی اغراض کے باوجود اس توحش و تجنب کا داعی حقیقی ہے اور فقیر نے اپنے ظرفِ دماغ کے بقدر اس کا چارہ کار بھی سوچا ہے۔

⁂

تصنع موقوف و تکلف برطرف۔ امر واقعی یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند نے باوجود اپنی قلت تعداد و استعداد کے ہندو بھائیوں کو اپنی طرف سے یکسر خائف و غیر مطمئن کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ خوف و عدمِ اطمینان عموماً اولُ الذکر کے کسی فعل یا ترک فعل کا نتیجہ نہیں ثابت ہوتا مگر اسکو کیا کیجیے کہ اُن کی ہیئتِ کذائی۔ اُن کی اُفتادِ خیال اور صورتِ حال ہی ایسی ہے جو ہر بیگانے جار الجُنُب اور صاحب بالجنب کے لیے موجب اجتناب ہو سکتی ہے۔

باوجودیکہ اکثر ہندو ارباب علم و اثر اور خود فقیر نے بہت کچھ افہام و تفہیم کی اور اطمینان و تسلی دی کہ "بھائی صاحبو! خوف و اضطراب کی کیا بات ہے۔ اَنتم رجال و ہم رجال۔ باوجود بال محدود اور بنین شہود۔ باوجود تفاخر اولاد اور تکاثر اموال کے تم مٹھی بھر۔ ننگے بھوکے۔ جاہل کاہل مسلمانوں سے اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ وہ تمھارے اپنے ہیں۔ ضرورت کے وقت کام دیں گے۔ دُکھ درد میں شریک ہونگے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کا تمھارا خون ایک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ باقی جو ایسے ہیں جن کا تمھارا خون ملا ہوا نہیں ہے وہ بھی اسی ملک کے باشندے ہیں تم سے تعلقات رکھتے ہیں تم سے توقعات رکھتے ہیں۔ ان کا مرنا جینا بھی اسی ملک میں ہے۔ تم اُنکے پڑوسی ہو، دوست ہو۔ رنج و راحت کے شریک ہو۔ بہتر ہے کہ آپس میں بیگانے بنکر نہ رہو بلکہ یگانے بن کر رہو۔"

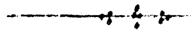
مگر قَذَفَ فی قلوبہم الرُّعب۔ صاف صاف عرض کرنا پڑتا ہے اور تشخیص مرض کے لیے اسباب و علامات کو صاف صاف بیان کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ اُنھیں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہم مذہبوں کے ممالک ماورائے سرحدِ ہند سے لیکر برابر ایک دوسرے سے ملحق و متصل دور تک چلے گئے ہیں۔ جس وقت خفیف سی تُو تُو مَیں مَیں بھی ہو گئی تو یہ اپنے ہم مذہبوں کو ادھر بُلا لیں گے اور اُس وقت جو گزرے گی سو گزرے گی۔



فقیر نے بھی غور کیا تو پایا کہ خطرہ بے اصل و بے بنیاد نہیں۔ پنجاب کی شمالی و مغربی حد سے لیکر جو مسلمانوں کے ممالک کثّر اللہ سوادہم شروع ہوتے ہیں تو دُنیا کے اور چھور تک جا پہونچتے ہیں۔ سرحد سے بالکل ہی ملا ہوا افغانستان ہے۔ اُسکے بعد مشرق کی طرف تو ترکستان ہے اور مغرب کی جانب ایران۔ ایران سے ملے ہوئے ایک سمت کو شام و فلسطین و عراق و جمہوریۂ ترکیہ اور دوسرے رُخ کو عرب۔ عرب سے ملی ہوئی مصر کی سرحد ہے اور مصر سے قریب طرابلس الغرب۔ طونس۔ الجزائر اور اُس کے بعد ہی ہسپانیہ والوں کا وہ سر مُنڈا حریف[1] ہے جس کی شہامت و بسالت نے دنیا کے بہت سے ایوانہائے سیاست میں تہلکہ ڈال رکھا ہے۔ اُس کے ادھر اُدھر۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسلامی

[1] حریف کے سر کو مونڈو تو حریف رہ جائے گا۔

آبادیاں کہاں کہاں تک متحد ومنتشر چلی گئی ہیں - اب تک تو مست الست مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کی ہمہ گیر کثرت کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن اگر کسی وقت اُنھوں نے اپنی ہمہ جا قلت کو محسوس کر کے حقیقت میں اپنے ہم مذہبوں کے اِس گروہ کثیر الانفار اللّٰہم زد فزد کو " الارازی - الارازی " " بیا - بیا " (فارسی) " تعال - تعال " (عربی) " گلے - گلے " (ترکی) " وریاکالے - وریاکالے " (سواحلی) کہہ کر پکار لیا تو واقعہ یہ ہے کہ وہ ساعت اُدبے دامَر ہوگی جسکے تصور سے ہر مسلمان کانپ اُٹھتا ہے -



فقیر اسکے سداد وعلاج کے سوچنے پر اپنا بہترین وقت صرف کر چکا ہے - ابتداءً یہ رائے ہوئی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں سے چندہ لے کر اپنے اہتمام سے درۂ خیبر اور درۂ بولان کو تنفیہ کرا دے اور ہمالیہ کی دیوار پر سرتا سر بوتلوں کے ٹکڑے سیمنٹ سے نصب کرا دے تاکہ اِدھر سے ایاب وذہاب کا راستہ ہی مسدود ہو جائے - مگر اس میں یہ قباحت نظر آئی کہ ادھر تو میوہ جات ومغزیات کی درآمد منقطع ہو جانے سے مسلم اُمرا کو ضعف دماغ اور اُدھر بازیزہ ہلیت (بیٹک) کی درآمد مسدود ہو جانے سے ہندو ساہوکاروں کو سوءِ ہضم کی شکایت ہو جائے گی - معہذا ممکن ہے کہ اغیار تبت وکراچی کی راہ سے آ جائیں - لہذا کامل غور وخوض کے بعد یہ طے کیا کہ اس امر کی کوشش کی جائے کہ یہ اسلامی آبادیاں سب اپنی اپنی جگہ سے بہت دور ہٹوا دی جائیں اور ہمارے ہندوستان کی سرحد کے کنارے کنارے صدہا میل تک ایک طویل وعریض غیر مملوکہ - غیر مقبوضہ - غیر معمورہ اور غیر مزروعہ قاع صفصف (چٹیل میدان) پڑا رہے جس میں بشرطِ گنجائش رقم طویل وعمیق خندقیں کھُدوا دی اور گچ چونے سے پختہ کرا دی جائیں - اِس سے ہمیں آرام واطمینان کی نیند تو آئے گی اور بھائی بھائی میں روز روز کی بدمزگی وبے اعتباری تو جائے گی



اس کے متعلق فقیر نے بطور خود اور بصرف کثیر آغاز سعی کیا - فقیر کے کرم گستر واقفانِ حالات جانتے ہیں اور شہادت دے سکتے ہیں کہ فقیر نے محض اللہ تعالیٰ کے توکل اور اپنی طاقت کے بھروسے پر ہندوستان سے باہر کا دور ودراز سفر اختیار کیا تھا - اور یہ امر از راہ تفاخر نہیں بلکہ بطور تحدی عرض کیا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان بھر کے کسی بڑے یا چھوٹے رئیس یا امیر یا تاجر یا زمیندار یا راجے یا مہاراجے یا سیٹھ یا ساہوکار - یا کسی کانگرس یا خلافت یا مسلم لیگ یا سنگھٹن یا تنظیم یا کسی چھوٹی یا بڑی یا گپتا

یا سُپتا نے کسی وقت یا کسی موقع پر ایک حبّۂ سیاہ یا ایک پشیز شکستہ (بھونی کوڑی) سے اس فقیر حقیر کی امداد و اعانت کی ہو تو آج وقت ہے کہ علیٰ رؤس الاشہاد شہادت پیش کر کے فقیر کی تکذیب و تبکیت کر دے۔ ہَاتو ابُرہانکم۔

٭ ٭ ٭

المختصر فقیر شدّ رحال کر کے مع جریبِ زیتونی و تسبیح یشمی و گلیمِ پشمی و عبائے قُطنی و عمامۂ کھدّری بقصدِ سفر نکلا۔ تذکرۂ مصائبِ طریق و مہالکِ سبیل بے صرفہ باعثِ اطناب و تطویل ہوگا۔ اور چونکہ سطورِ ہٰذا کے ذریعہ روودادِ سفر کی تدوین و ترتیب پیشِ نظر نہیں لہٰذا تفصیل لاحاصل ہے۔

اس ہفتخواں کی اولین منزل مقصود چونکہ سرزمین انگوزہ و انگور تھی لہٰذا سب سے زیادہ صعوبت حصول پروانۂ راہداری میں پیش آئی۔ ادھر اپنے بے اطمینان اُدھر پرائے بدگمان۔ حالانکہ اس مُہم میں اگر فقیر کو کامیابی ہوجاتی تو اخراجاتِ تحفظ ہند کے موازنہ میں موجودہ رقم خطیر نہ رہنے پاتی۔

٭ ٭ ٭

بارے سب مزاحمتوں کا مقابلہ کر کے فقیر افغانستان پہونچ گیا اور وہاں کے خانوں اور سرداروں ملکوں اور ارباب۔ سرخیلوں اور مُلّاؤں سے ملا۔ اگرچہ اُنھوں نے ضیافتِ اسلامی کے آداب مرعی رکھے۔ نانِ سنگک (موٹی روٹی) و نانِ تنک (پتلی روٹی)۔ تکہ و کباب۔ قورت (دہی خشک گوشت) غوڑی و قورت بانجن (پورانی)۔ پلاؤ و چلاؤ۔ شیر و پنیر مسکہ و جغرات کھلائے۔ قریات و قنایت اور کاریز و فالیز کی سیر کرائی۔ کشمش و مشمش۔ شفتالو و زردالو۔ بہ و بادام انگور و انجیر۔ سیب و انار پیش کیے مگر باتیں بہت (آب جاہی) اُکھڑی اُکھڑی کیں۔ اُنھوں نے فقیر کی درخواست کو سُن کر چھوٹتے ہی کہا:—

"مُلّا! تمھارا ہندوستان بُرا مُلک اور تم ہندی بُرا آدمی۔ ہم تمھارا مُلک سے ناواقف نہیں۔ ہم جانتا ہے تم لوگ کام کا آدمی نہیں کلام کا آدمی ہے۔ تم لوگ دال روتی۔ پوری کچوری کھا کر پان چبا کر خالی خولی چاؤ چاؤ۔ کاؤ کاؤ کرنا جانتا ہے۔ تمھارے ملک کے اندر ریول کی فراوانی۔ جنس کی ارزانی اور حمل و نقل کی آسانی ہے۔ تم لوگ تجارت کرتا ہے۔ زراعت کرتا ہے۔ چاکری کرتا ہے۔ پیشہ وری کرتا ہے۔ اس طور تم دولت جمع کرتا ہے بعدہٗ باخود ہا لڑائی کرتا ہے اور لڑائی عورت کا مانند۔ ہم لوگ تمھارا طرح نہیں۔ واللہ ہم مرد ہے۔ اگر لڑتا ہے مرد ہو کر۔ و گر ملتا ہے مرد ہو کر۔ لاکن اس سے ہم کو غرض نہیں۔ لڑو یا ملو وہ تمھارا خوشی۔ رہا ہمارا اِس مُلک سے جانا سو مُلّا سنو کہ افغان گُل محمد خان

ہیں اور گُل محمد کے واسطے شاعر پہلے ہی کہہ گیا ہے۔ "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" لہذا بابا تمھارا خوشی آئے سو کرو خان کا گُتنا تو یہاں سے ہٹنے والا نہیں۔"

٭ ٭ ٭

یہ ٹکا سا جواب سُن کر فقیر اپنا سا مُنہ لیکر واپس ہوا اور سیدھا ایران پہونچا۔ یہ لوگ کمال تہذیب و تپاک سے پیش آئے۔ کوفتہ پلاؤ۔ خُرما پلاؤ۔ متنجن۔ مسنجن۔ قلیا و قورما۔ بُغرا و بورانی۔ بیضہ و بریانی۔ شیر برنج و شیر بادام۔ صابونی و سکاروتی۔ لولہ کباب و سیخ کباب۔ بادام کاغذی و انار رطلی۔ سردہ و گرک۔ انگور مشقالی و ریش بابا و۔۔۔ فلاماں سب کھلائے۔ قہوہ و شیر چاء و غلیان و تریاک کی تواضع کی مگر اصل مطلب قبلہ قبلی و آری بلی۔ این و آں و چنین و چناں ہی میں ٹال دیا۔ لیکن جب فقیر نے اصرار کے ساتھ مطالبۂ جواب کیا تو آخر کار اپنی مشہور لسّانی و چرب زبانی سے کام لے کر فرمایا :۔

"قربانِ شما۔ ہم اپنے گرگاب و جوشاب۔ اپنے بے ستون و دراو کان۔ اپنے تنگہ اللہ اکبر و وادیِ گُل پوشاں اپنے حافظیّہ و سعدیّہ۔ اپنے سلطانیہ و ناصریہ۔ اپنی اِس خوش آب و خوش گِل گُل زمین سے کس دل و جگر سے مفارقت گوارا کریں جو ہماری مقدس قومیت کا مسکن قدیم و موطن قویم ہے۔ جہاں سب سے پہلے تہذیب انسانی نے ظہور کیا۔ جس کے بہادروں نے تمدن یونانی و رومانی کے پرخچے اُڑا دیے۔ اور جب یہاں کی خاک نیّرِ اسلام کے نور سے مستنیر ہوئی تو تاریخ شاہد ہے کہ اس خاک کے ذرّوں نے دُنیائے معلوم و مسکون کے گوشے گوشے اور چپّے چپّے کو معمور و نور کر دیا۔ ہائے ما! عشق وطن نے ہمیں اس حال کو پہونچا دیا ہم حوادثِ روزگار کی لطمہ خوری اور مصائبِ اغیار کی لگدکوبی کے لیے وقف رہے لاکن با ایں ہمہ ہم خاکِ پاک ایران سے مفارقت پر راضی نہ ہوئے۔ ہماری مائیں ہمیں لوریاں دیتی ہیں

تو کودک ایرانی و ایراں وطنِ تست　　تو جانی و ایراں چو تنِ تست

جاں را تن بے عیب بکارست بلم لائے　　لم لائے۔ بلم لائے۔ بلم لائے

"جناب آغا! ہم تو دیارِ رستم و اسفندیار کو چھوڑ کر بہشت بریں بھی نہ جائیں گے کیونکہ غیبی زبان پہلے ہی ہم سے کہہ چکی ہے

"کہ در جنت نخواہی یافت　　کنارِ آبِ رُکنا باد و گلگشتِ مصلّی را۔"

"آغا معاف دارید! معلوم ہوتا ہے اہل ہند اپنے ملک سے عشق و شیفتگی نہیں رکھتے بلکہ اپنی خودی سے"

محبت رکھتے ہیں۔ ورنہ روز روز کی ان باہمی ہنگامہ آرائی و آویزش کے کیا معنی جس سے مفادِ ملک کو نقصان پہونچ رہا ہے۔ اگر اختلافِ عقائد و معاشرت کا عذر کیا جائے تو یہ بیکار عذر ہے۔ ہمہ درزیرِ کاسہ نیم کاسہ دارند کیا ہمارے ملک میں پیروانِ زردشت نہیں۔ مگر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے کہ یہاں قدیم و جدید باشندوں اور گبر و مسلمان میں نہ فرق و امتیاز ہے نہ جنگ و جدال۔ ہم اُنکی قلت کا احترام کرتے ہیں اور وہ ہماری کثرت کا اعتبار۔ تعجب ہے کہ جب براہمۂ ہند اتنی تعداد کثیر میں ہیں تو وہ کس واسطے ڈرتے اور تنگ دلی سے پیش آتے ہیں۔ اُنھیں چاہیے کہ خوف یا بخل سے کام لینے کی جگہ محبت و سیرچشمی سے کام لیں۔ ہم نہایت متاسف و متالم ہیں کہ آپ کی خواہش پر عمل نہیں کر سکتے۔"

⁂

فقیر یہاں سے بھی بے نیل مرام واپس آیا اور عرب شریف حاضر ہوا۔ وہاں کے لوگوں نے بھی سیادت و شیخوخت کا احترام کیا اور اپنی ضرب المثل مہمانداری و مسافر نوازی سے کام لیا۔ ترویقہ میں لبن و عسل۔ رطب و عنب۔ حب حب سوسی و بطیخ فرنساوی۔ برتقال و تفاح۔ جبنہ و زبدہ۔ قہوہ و شای۔ غدا و عشا میں خبز خمیر و خبز فطیر۔ قدید و ثرید و مرقہ و شوربہ۔ کباب و کستلاتہ۔ لحم مقلی و لحم مسلوق۔ لحم طیر و لحم صید۔ فریک و رز۔ اور سجارہ و کبریت سے تکریم و تواضع کی مگر حرفِ مطلب کو لیت و لعل اور تمنی و ترجی ہی میں رکھا۔ آخرکار جب فقیر نے اداے جواب کے لیے پیہم تقاضے کیے تو صاف صاف کہا:۔

"صلے علی نبینا یا شیخ۔ تم نے کہا کہ اپنا ملک چھوڑ دو۔ ہم اس کا جواب دیتے ہیں۔ کیا یہ ہمارا ملک نہیں۔ کیا ہم بنو اسمٰعیل نہیں؟ پھر کیا ہم بنو قیدار۔ پھر بنو عدنان۔ پھر بنو معد۔ پھر بنو مضر۔ پھر بنو کنانہ۔ پھر بنو فہر۔ پھر بنو غالب۔ پھر بنو لوے۔ پھر بنو کعب۔ پھر بنو مرہ۔ پھر بنو کلاب۔ پھر بنو عبد مناف اور پھر بنو ہاشم نہیں؟ اگر ہیں اور تم کو ماننا پڑیگا کہ دنیا کی تمام اقوام سے زیادہ عرب اپنے انساب سے واقف ہیں تو کیا ہم ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں داخل نہیں؟ پھر کیا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کو وادی غیر ذی زرع میں بیت المحرم کے پاس خاص اللہ تبارک و تعالیٰ کی منظوری سے سکونت نہیں دی تھی؟ کیا ہمارا ملک نافِ زمین اور دنیا کا وہ مشہور ترین ملک نہیں جس کا تذکرہ کتب عتیق میں ہے؟ کیا اس ملک میں ہماری قومیت متحدہ نے آزادی کی چالیس صدیاں نہیں گزاریں؟ پھر کیا ہمارے ملک و ہماری

قوم اور ہمارے قبیلے میں فخر کائنات خلاصۂ موجودات خاتم النبیین رحمۃ للعالمین نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم پیدا نہیں ہوئے؟ کیا ہماری زبان اُم الالسنہ نہیں؟ کیا خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری زبان میں اپنا کلام پاک نازل فرماکر اُسے دنیا کی کل زبانوں کا سرتاج نہیں بنا دیا؟ پھر کیا ہمارا شہر مکہ مبارک دنیا کے پردے پر سب سے پُرانا شہر۔ اُم القریٰ۔ بلدًا امینا۔ بلد امین۔ مولد النبی اور مہبطِ وحی نہیں؟ کیا بیت اللہ شریف اول بیتٍ وُضع للناس نہیں؟ کیا حِل وحَرَم دنیائے اسلام کے لیے باعث تعظیم وتکریم نہیں؟ کیا اُنکی خدمت ودربانی کا فخر ہمیں حاصل نہیں جس دربانی کو حضرت داؤد علیہ السلام اپنی زبور میں عیش وآرام کے خیموں سے بہتر بتاتے اور بیت العتیق کے آستانے پر رہنے کی تمنا کرتے ہیں؟ اگر یہ سب صحیح ہے تو ہمارے کان آج یہ کیوں سُن رہے ہیں کہ ہم اس ملک کو چھوڑکر چلے جائیں؟ تم نے قرآن کریم پڑھا ہے؟ اگر پڑھا ہے تو کیا اُس میں یہ نہیں پڑھا اخراج اہلہ منہ اکبر عند اللہ؟

"پہلے ستاروں سے کہو کہ جوّ السماء چھوڑدیں۔ طیور سے کہو کہ کرۂ ہوا چھوڑدیں۔ وحوش سے کہو کہ جنگلوں کو چھوڑدیں۔ مچھلیوں سے کہو کہ سمندروں کو چھوڑدیں اور پھر ادویا اور امریکا کے باشندوں سے کہو کہ اپنے ممالک چھوڑدیں۔ جب یہ سب تمہارے کہنے پر عمل کرلیں تو ہمارے پاس بھی آؤ۔ اور اگر نہیں تو قسم ہے فالق الحب والنویٰ اور خالق الارض والسماء کی کہ کوئی شخص ہمیں ہمارے ملک سے نکال نہیں سکتا۔ یہ ہمارا جواب ہے۔ افعلوا ما شئتم۔

"یا سیدی۔ ہم بدنصیب تھے کہ ہم نے اپنے رسول و خداداد کی وصیتِ آخری کی تعمیل میں تقصیر و تقاعد کیا۔ اب تو ہم نہ یہاں کا قبضہ چھوڑیں گے نہ غیر کو یہاں قبضہ کرنے دینگے۔ الملکُ ملکی والزمانُ زمانی۔ والسلام؎

٭ ٭ ٭

فقیر سفر افغانستان و ایران وعرب سے بہت خستہ وماندہ ہوگیا تھا اور اب ہر ایک باقی ماندہ ملک میں فرداً فرداً جانا نہایت مشکل تھا لہذا مصر میں ایک جلسۂ اسلامی کا اہتمام کیا گیا جس میں باقی ماندہ ممالک اسلامی کے وکلاء و نواب جمع ہوئے۔ حضرت شیخ جمال الدین افغانی کے شاگردِ خاص حضرت شیخ کمال الدین منفالی نے بہ حیثیت صدر جلسہ اکابر ملت کی جانب سے جو کچھ فرمایا اُس کا ملخص یہ ہے:۔

"بحمداللہ کہ اغیار کے جگانے سے اب ہم بیدار ہوگئے ہیں اور ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہم نے اپنے ممالک کی سرزمین کو اپنے خون کے آخری قطرہ اور اپنی حیات کے آخری لمحے کے بدلے خریدا ہے۔ یا شیخ! تم تو تم اب تو چچا اروپا بھی ہم سے یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ جیتے جی ہم یہاں سے ایک منٹ کے لیے بھی ہٹنے اور ایک شبر زمین چھوڑنے کا نام لیں۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھو۔ چاہے تم لوگوں کو بخار چڑھے یا اختلاج قلب ہو جائے ہم اپنے اپنے ملکوں سے ٹلنے اور نکلنے والے نہیں۔ اگر تمھیں ہماری طرف سے بدگمانی ہے تو ہم اطمینان دلاتے ہیں کہ ہمیں اپنے ہی معاملات سے اتنی فرصت نہیں کہ تمھارا خیال کریں۔ لیکن اگر ہمیں کبھی تمھارا خیال آتا ہے تو ہم اسلامی سچائی سے یقین دلاتے ہیں کہ وہ خیال محبت، ہمدردی اور شکرگزاری کا خیال ہوتا ہے۔ اگر ہو سکے گا تو ہم تمھارے افکار کو رفع کرنے میں مدد دیں گے۔ نہ یہ کہ خدانا خواستہ تمھاری پریشانیوں میں اضافہ کریں گے۔ جس طرح ہم خود اپنے ملک میں آرام و اطمینان سے رہنے کے خواہشمند ہیں اسی طرح چاہتے ہیں کہ تم بھی اپنے ملک میں اطمینان۔ امن اور آزادی سے رہو۔

"اگر تمھیں ناگوار نہ ہو تو ہم چند باتیں صاف صاف کہیں۔ ہمیں افریقہ۔ اروپا اور امریکا ہر ملک کے آدمیوں سے ہر وقت واسطہ رہتا ہے ہم سب کے مزاج و طبیعت سے واقف ہیں۔ لیکن اگر ہم نہیں سمجھ سکے ہیں تو اہل ہند کو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تم ہندوستانی لوگ کس طبیعت کے آدمی اور کس مٹی کے بنے ہو۔ تمھارے ملک کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ تم مُسلم بھی ہو اور مسلم کُش بھی۔ تم محتاج بھی ہو اور مُسرف بھی۔ تم مظلوم بھی ہو اور ظالم بھی۔ تم مصیبتوں میں گھرے بھی ہو اور آپس میں لڑتے بھی ہو۔ میرے بھائی! میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ قاعدہ ہے کہ اگر کسی گھر میں آگ لگے تو گھر والے سب ایک دل ہو کر بجھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں میں نے نہیں سُنا کہ وہ اُس وقت کو باہمی تکرار و فساد سب و شتم یا باہمی ہمت شکنی میں صرف کرتے ہوں اور آگ بجھانے سے بے پروا ہو جاتے ہوں۔ اگر وہ ایسا کریں تو پھر سمجھا جائے گا کہ یا تو گھر میں آگ ہی نہیں یا آگ لگی ہے تو گھر اُن لوگوں کا نہیں یا کسی وجہ سے اُنھیں سامان بچانے سے دلچسپی نہیں۔ مثلاً بیمہ کمپنی سے روپیہ وصول کرنا ہے لیکن اگر یہ سب کچھ نہیں اور آگ لگی ہے تو پھر سمجھنا چاہیے کہ گھر والوں کے حواس اس قدر مختل اور دماغ اس درجہ بیکار ہو گئے ہیں کہ نقصان کا احساس ہی نہیں۔

"ہم نہیں جانتے کہ اہل ہند میں اس قدر باہمی نا چاقی کیوں ہے۔ اگر اس کا باعث اختلاف مذہب ہے تو مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔ مذہب تو بنی نوع انسان سے محبت سکھاتا ہے۔ اسکے علاوہ

مظلومیت و مملوکیت ایسی مشترک مصیبت اور محبتِ وطن اور حفاظت ملک ایسی مشترک خدمت ہے جس سے کسی باشندے کو انکار و اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یہ اشتراک مصیبت و خدمت بجائے خود اتحاد کا قوی محرک ہونا چاہیے۔ اگر مختلف باشندوں کی قلت و کثرت بے اعتباری کا باعث ہو تو ہماری رائے میں جس قوم کی تعداد سب سے زیادہ ہو اُس کا اور صرف اُسی کا اخلاقی اور سیاسی اور وطنی فرض ہے کہ وہ اپنے عمل سے اپنے قلیل التعداد بھائیوں کی استمالت و دلجوئی کرے۔ اُن کی نظر میں اپنا وقار و اعتبار بڑھائے اور انھیں یقین دلادے کہ کثرت کسی وقت قلت کو نقصان نہ پہونچائے گی اور اُسکے حقوق تلف نہ کرے گی۔ کیا تمھارے برادران ہنود اس معمولی بات کو نہیں سمجھتے کہ جب تک قلیل التعداد اقوام والے "مزدوران خوش دل" نہ ہوں انھیں کیا پڑی ہے کہ "کاربیگار" کریں۔ جب تک انھیں یہ خطرہ رہے گا کہ جس چھپر کے اُٹھانے میں اُن سے مدد لی جاتی ہے اُسکے سائے میں آرام دوسرے پائیں گے تو وہ اُس چھپر کو اُٹھانے ہی کیوں لگے۔

"کیا ہم لوگوں کے ہاں قلت و کثرت کا سوال نہیں ہے؟ ضرور ہم میں عقل ہے ہم میں انصاف ہے۔ ہمارا دماغ اس مسئلے کو صحیح پہلو سے سوچتا اور ہماری آنکھ صحیح زاویے سے دیکھتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب گاڑی میں کئی پہیے ہوں تو ایک پہیا کبھی گاڑی کو چلا نہیں سکتا۔ اس لیے ہم سب پہیوں کو یکساں مضبوط حالت میں رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی عیسائی۔ یہودی۔ قبطی۔ نبطی سبھی ہیں۔ دیکھو ترکی ممالک میں۔ دیکھو شام و عراق و فلسطین میں۔ دیکھو مصر میں۔ اور سب مل کر کام کرتے ہیں۔ ہم اُنکی حد سے زیادہ دلجوئی کرتے ہیں۔ اور اگر بلقان اور آرمینیا کے فسادوں کا طعنہ دو تو اب یہ راز طشت از بام ہو چکا ہے کہ یہ ساری ریشہ دوانی و موشک پرانی سرزمین آسیہ بلکہ کُل سرزمین مشرق کے الدُّ الخصام مغرب کی تھی۔ اور اگر خدانخواستہ اب بھی کبھی اور کہیں یہ آگ لگے تو سمجھ لو کہ اُسکی چنگاری بھی مغربی آتشدان ہی سے آئی ہے۔ خدا نہ کرے کہ تمھارے ہاں بھی وہی ہوا کام نہ کر رہی ہو جو ہر جگہ آگ سلگاتی پھرتی ہے۔

مجھے مسلمانان ہند سے خصوصیت کے ساتھ کچھ عرض کرنا ہے۔ ہنود کی تنہا خوری تو مسلم ہے مگر بذل و ایثار۔ برادرنوازی و سیرچشمی۔ حریت پسندی و امن دوستی کا جو جوہر تمھاری گھٹی میں پڑا تھا اُسے آج کیا ہو گیا۔ کیا تم اپنے وطن سے دور ہو کر اپنا آموختہ سبق بھی بھول گئے؟ تم نے ہندوستان میں صدیوں اصلاح کا کام کیا ہے لہذا تم خصوصیت کے ساتھ اس "امر" کے مامور و مخاطب ہو کہ "ولا تفسدوا فی الارض"

بعد اصلاحیا" اگر تمھارے ہندو بھائی تمھارے ساتھ تنگ نظری اور تنگ حوصلگی کا برتاؤ کرتے ہیں تو مضائقہ نہیں۔ تم اپنی بلند نظری اور عالی حوصلگی کو ہاتھ سے کیوں دو۔ وہ تم سے ڈرتے اور بھاگتے ہوں تو تم اُن سے ملو اُنھیں کلیجے سے لگاؤ۔ وہ تم سے نفرت کرتے ہوں تو تم اُن سے محبت کرو اور ثابت کر دو کہ تم اُن کے اچھے بھائی اور اپنی مادرِ وطن کے اچھے بیٹے ہو۔ اُمید کہ ہمارا یہ پیام تم اپنے ہر بھائی تک پہونچا دوگے۔ والسلام"

ان سب ممالک میں سعی لاحاصل کرنے کے بعد فقیر وطن واپس آیا اور پھر سوچنا شروع کیا کہ کیا تدبیر کی جائے جس سے ہندو بھائیوں کا انتشار و اضطرار رفع ہو۔ چنانچہ آخری اور قطعی تدبیر یہ سوجی اور اِس کے سوا کوئی اور تدبیر سمجھ میں نہیں آئی کہ مقدس سرزمینِ ہند ہی کو اُسکے مقرِ اصلی سے ہٹا کر کہیں اور لیجایا جائے" تاکہ ماوراے سرحد کے وحشی اور اُجڈ پڑوسیوں سے پیچھا تو پاک ہو۔

وہ جو کہتے ہیں" جوئندہ یابندہ" سو فقیر نے جگہ بھی ایسی ڈھونڈھ نکالی ہے کہ باید و شاید۔ آرام بھی بہت اور پڑوسی بھی مہذب و معتبر۔ متمول و مستیقظ۔ آب و ہوا نہایت معتدل۔ بارش بکثرت۔ کائنات الجو میں نباتات و حیوانات کی پرورش کی بدرجہ اتم طاقت۔ مگر جگہ کسی قدر تنگ ہے اور پورے ہندوستان کی سمائی مشکل۔

ہندوستان کو مع ہمالیہ اور دامنِ کوہ کی سطوح مرتفع کے لے چلنا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ قطع نظر گرانیِ کوہ بھوٹان و نیپال و سکم و کشمیر و تاہن و کلسیہ۔ اپنی ریاستی حیثیت کھوکر اپنے مقامات سے ہٹنا کیوں گوارا کریں گی۔ اسکے علاوہ سندھ و پنجاب و مشرقی بنگال و ریاست ہاے راجپوتانہ بھی تبدیل مقام کے خواہشمند نہیں اور ولسن صاحب کے اصول خود انتظامی کی رو سے کسی کو حق نہیں کہ اُنھیں خلافِ مرضی مجبور کرے خصوصاً جب اہل برار کی مرضی کے بغیر واپسیِ امانت ناممکن ہے تو بلا حصول رضامندی تبدیل مقام کیسے ہو سکتا ہے۔ لہذا فقیر نے حساب کیا تو ۲۵ درجہ عرض البلد کے جنوب کا کل حصہ قابلِ حمل و نقل رہا۔ مگر اس پر بھی عمل درآمد ذرا طاقت طلب اور ہمت آزما ہے۔

۔۔۔۔مسلمان اول تو بہت ہی کتنے اور جو ہیں بھی اُن میں سے مرزا پھویا نوابوں اور رئیسوں اور حکام جو رلیڈر

اور مولویوں کو نکال کر باقی سب کے سب فاقہ مست بیفکرے یا پست ہمت ہیچکارے رہ جاتے ہیں لہذا اُن سے تو کسی طاقت طلب اور ہمت آزما کام کی اُمید فضول ہے یہ وقت ہے ہندو بہادروں کی ہمت دکھانے کا کہ ہندوستان کو اُسکی جگہ سے اُٹھا کر ہاتھوں ہاتھ لے چلیں اور مشرق کی طرف رُخ کر کے آبنائے ملاکا سے گذر کر۔ بندرگاہ سنگاپور سے گذر کر۔ فرانسیسی کوچین چاینا سے گزر کر۔ ہانگ کانگ سے گزر کر۔ خلیج فارموسا سے گزر کر ٹھیک خط سرطان پر مابین درجہ ہائے ۱۲۰ و ۱۴۰ طول البلد و ۱۰ و ۳ عرض البلد یعنی جزیرۂ فارموسا و جزیرۂ کیوسیو کے درمیان خالی قطعے میں لنگر انداز کر دیں۔ یہ مقام ایک طرف ساحل چین سے متصل اور دوسری جانب جزیرۂ جاپان سے ملحق ہے اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں قلیل التعداد آنا قیوں اور اقامت گزینوں کو مستثنیٰ کر کے تمام و کمال بدھ مذہب کے پیرووں کی آبادی ہے جو ہندو سبھا منعقدۂ بنارس کی قرارداد کے مطابق سب کی سب ہندو جاتی میں شامل و داخل ہے۔

اِس نقلِ مکان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اب تک ہندو بھائی بجا طور پر مسلمانوں کے سفرِ حج و زیارات کو مشتبہ نظر سے دیکھتے تھے اور نیز اُنھیں طعنہ دیتے تھے کہ جب تک اُن کی محبت و ہمدردی ممالکِ غیر اور اقوامِ غیر کے ساتھ ہے وہ سچے محبِ وطن اور اچھے خادمِ ہند نہیں ہو سکتے۔ اِس نقلِ مکان کے بعد چونکہ ہندوؤں کے مقدس مقامات مثلاً گوری شنکر۔ کیدار ناتھ۔ ہردوار۔ متھرا۔ اجودھیا اور بنارس اور مقدس دریائے گنگ و جمن ہمالیہ کے ساتھ یہیں رہ جائیں گے لہذا ہندوؤں کو بھی تیرتھ جاترا کے لیے وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر یہاں آنا پڑے گا۔ اور اس کے بعد مسلمانوں پر تعریض کا موقع نہ رہے گا بلکہ فقیر کی رائے پر عمل ہو تو ہندو پنڈت اور مسلمان مولوی ایک ہی جہاز میں بیٹھ کر گھر سے نکلیں گے۔ ایک ساحل کراچی پر اُتر کر تیرتھ جائے گا دوسرا ساحل جدہ پر اُتر کر حج کر آئے گا۔ اور پھر جاتری اور حاجی دونوں اپنی اپنی گنگا جل اور زمزم شریف کی شیشیاں لیکر ایک ہی جہاز سے گھر لوٹیں گے مسلمان اپنے ہم مذہب عربوں۔ ترکوں۔ مصریوں۔ شامیوں اور افغانوں سے محبت کرنے اور تعلقات بڑھانے میں آزاد ہوں گے اور ہندو اپنے پس ماندہ بھوٹانیوں۔ نیپالیوں۔ کشمیریوں۔ سندھیوں۔ پنجابیوں۔ بنگالیوں اور اچھوتوں سے پریم بڑھانے کے مختار ہوں گے۔ اب تک ہندوؤں کی محبت و ہمدردی محض ہندوستانِ قدیم کی چار دیواری میں محدود و مرکوز تھی اب ہندوستانِ قدیم و جدید میں برادر نوازی کی داد دے سکیں گے۔ اور مسلمانوں پر بدگمانی کا موقع خود بخود رفع ہو جائے گا۔ جدید ہندوستان میں ہندو اور مسلمان نہایت

محبت و پریم سے بسر اور پوجیہ مہاراج لاجپت رائے کے احکام ثلاثہ مشتہرہ پر عمل کریں گے۔

فقیر نے اپنے پندار میں تدبیر تو کمال غور و فکر کے بعد سوچی ہے مگر اس میں صرف ایک امر محل نظر ہے اور وہ یہ کہ نیا پڑوسی جاپان ابھی حال ہی میں جوان ہوا ہے لہذا جدید ہندوستان کو اپنے مال سے پولیس اور کیل کانٹے سے درست رہنا پڑے گا۔ ایسا نہ ہو کہ ذرا آنکھ چوکی اور چراغ گل پگڑی غائب۔ ہندوستان کو مغلوب ہوجانے کی پرانی عادت ہے۔

ان فی ذالک لذکرے لاولی الالباب ؕ

فقیر مضمون اعلیٰ (لازبودماتی)

بہار بلاغت

(مولفہ خان صاحب محمد قلندر علی خاں بی ایم اے وکیل حصار (پنجاب) قیمت ۸/)

فن تعلیم کے ماہرین باصرار کہتے ہیں کہ شرحوں کے ذریعہ سے مدارس کے طلبہ کی تعلیم کو نقصان پہونچتا ہے مگر طلبہ اپنی نادانی سے اور کچھ عام دستور کے مطابق ایک قدم بھی شرح کے بغیر نہیں بڑھانا چاہتے۔ حتی کہ اردو کتاب اگر کوئی نصاب میں داخل ہوجاتی ہے تو اسکی بھی شرح کے طالب پیدا ہوجاتے ہیں۔ اور جب تک یہ ضرورت باقی ہے، خواہ ماہرین تعلیم کتنا ہی انکار کریں نئے نئے طریقوں سے شرحیں پیدا ہوتی رہیں گی۔ معلوم نہیں صوبہ پنجاب کے ماہرین تعلیم کا اس بارہ میں کیا رویہ ہے مگر صوبجات متحدہ میں تو شروح کو روکنے کی کافی کوششیں نظر آتی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ مشرقی میں حدائق البلاغت وغیرہ فارسی علم بیان و عروض کی کتابیں داخل ہیں۔ کتاب زیر تبصرہ دراصل اسی کی شرح ہے البتہ توضیح مطالب کی غرض سے اور غالباً اس خیال سے کہ ایک ہی کتاب سب کتابوں کی شرح کا کام دے لائق مولف نے نہر الفصاحت، چہار گلزار اور عروض سیفی وغیرہ کو بھی لپیٹ لیا ہے۔ اور امید ہے کہ انکی یہ کوشش پنجاب کے طلبہ میں بہت مقبول ہوگی۔ اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب زیادہ مفید نہیں اسلیے کہ اردو میں علم بیان اور صنائع و بدائع کی طرف توجہ ہی کم ہے۔ البتہ عروض و قوافی کا اردو شاعری سے گہرا تعلق ہے۔ اگر تمام مثالیں فارسی کی نہ دی جاتیں بلکہ ہر جگہ نہیں تو اکثر مقامات پر اساتذۂ اردو کے کلام سے فائدہ اٹھایا جاتا تو یہ بحث زیادہ کارآمد بنجاتی۔

ایڈیٹر

کلام ریاض

کہاں سے میکدے میں آئے کیوں آئے کہاں آئے
یہی شیخ حرم ہیں بن کے جو پیرِ مغاں آئے

چلے ساغر۔ سبو اُچھلے۔ کھِے مینا۔ کہاں آئے
مزا آئے۔ اِدھر واعظ۔ اُدھر پیرِ مغاں آئے

پُرانے یار بچپن کے ہیں قیس و کوہکن دونوں
سُنانے آج ہمکو اپنی اپنی داستاں آئے

جگہ دی تھی نزاکت نے سایۂ دیوارِ دشمن میں
یہاں بھی جان لینے تم نصیبِ دشمناں آئے

یہ مینخانہ ہے سُنتا کون ہے پنبہ بگوشوں میں
بنے وہ قلقلِ مینا اگر شورِ اذاں آئے

مقام ایسے پڑے رستے میں جن میں ہو کا عالم تھا
چلے تو سامنے آنکھوں کے کتنے لامکاں آئے

پلے اتنی کہ آئیں پے بہ پے خمکدے لدکر
حرم کی راہ میں کوئی اگر مے کی دُکاں آئے

کسی کی یاد آتے ہی مرے لب پہ ہنسی آئی
فرشتے قبر میں لینے جو میرا امتحاں آئے

کہیں صیاد دل سے آرزو جائے رہائی کی
ہوا ایسی چلے اُڑکر قفس تک آشیاں آئے

مجھے واماندگی میں بھی بہت آنا سہارا ہے
مرے کانوں میں آوازِ جرس لے کارواں آئے

یہ ہمسے ناتواں کو سایۂ دیوار نے پیسا
ہوا معلوم ہم کو آج زیرِ آسماں آئے

گلی سے اُنکی ہٹ کر رات کو یہ کون کہتا تھا
نہ تجکو نیند جیتے جی کبھی اے پاسباں آئے

چھلکے خُم بھی سبو بھی جام بھی مینا بھی اے ساقی
ریاض آئے یہ مینخانے میں یا پیرِ مغاں آئے

نعتِ سیدِ کونینؐ

ہر موجِ ہوا زلفِ پریشانِ محمدؐ — ہے نورِ سحر صورتِ خندانِ محمدؐ

کچھ صبحِ ازل کی نہ خبر شامِ ابد کی — بیخود ہوں تہِ سایۂ دامانِ محمدؐ

تو سینۂ صدیق میں اک رازِ نہاں ہے — صدقے ترے اے صورتِ جانانِ محمدؐ

چھُٹ جائے اگر دامنِ کونین تو کیا غم — لیکن نہ چھُٹے ہاتھ سے دامانِ محمدؐ

دے عرصۂ کونین میں یارب کہیں وسعت — پھر وجد میں ہے روحِ شہیدانِ محمدؐ

واللیل ہے محوِ شکنِ زلفِ معنبر — والشمس فدائے رُخِ تابانِ محمدؐ

بجلی ہو، مہ و مہر ہو، یا شمعِ حرم ہو — ہے سب کے جگر میں رُخِ تابانِ محمدؐ

اے حسنِ ازل اپنی اداؤں کے مزے لے — ہے سامنے آئینۂ حیرانِ محمدؐ

اصغر ترے نغموں میں بھی ہے جوشِ درود اب
اے بلبلِ شوریدۂ بستانِ محمدؐ

اصغر (گونڈہ)

ظنِ خام

دین میں سود کیوں حرام ہوا — مفسدِ دیں یہ ظنِ خام ہوا

فارغ البال ہو گئی دُنیا — فیل اپنا ہر ایک کام ہوا

قسط دیتا تھا کل جو ہمسایہ — بینکر آج اُس کا نام ہوا

شیخ جی کا اسی تردد میں — رُخ سوئے رہگذارِ عام ہوا

اُڑتی موٹر میں اک پری دیکھی
برملا اُس کی دلبری دیکھی

زیورِ آرائشِ شباب نہ تھا — [illegible] دولت کا کچھ حساب نہ تھا

گنجِ قاروں کی روح بیچے مگر — اُس کو منظور یہ خطاب نہ تھا
بجلیاں گر رہی تھیں لوگوں پر — کون تھا جس کا دل کباب نہ تھا
جب یہ چاہا کہو بیاں کچھ حال — پھر مخاطب کو کچھ جواب نہ تھا
یعنی رقاصۂ رذیل تھی وہ
فاحشہ، بیسوا، ذلیل تھی وہ

بعد اُس کے جو ٹوٹے ہوئی کچھ راہ — رل گئے مرشدِ قمار آگاہ
طالبِ قحط محتکرِ بے رحم — بے حمیت عدوئے خلق اللہ
حسب دریافت ہو گیا معلوم — ہے ہوا پر بنائے حشمت و جاہ
کرتے رہتے ہیں کام سٹے کا — یعنی سٹے کی مشق خاطر خواہ
تیز دستی کے فن میں فرد ہیں آپ
ہارنے جیتنے کے مرد ہیں آپ

جب کسی سے نظر ہوئی دوچار — تھا یہی رنگ رونقِ بازار
سب کہ مائل تھا دل بسعیِ فلاح — فیصلہ کر دیا یہ آخر کار
کہ بجز اہتمامِ زر بہ فعلِ زبوں — اہلِ دنیا کو دیں سے کیا سروکار
ہاں مگر بہر حفظ رسم و رواج — حیلہ بازی ہے بالیقیں درکار
پڑھ کے دو اک سبق دبستاں میں
لائے فتووں کی فوج میداں میں

سب حلال اور حرام کچھ بھی نہیں — پیش و پس روک تھام کچھ بھی نہیں
اور اگر ہو تو از رہِ تاویل — درخورِ التزام کچھ بھی نہیں
مذہبِ بادشاہ مذہب ہے — اعتقادِ غلام کچھ بھی نہیں
فحش، فیشن میں جبکہ ڈھل جائے — اُس کا پھر انتظام کچھ بھی نہیں
مصلحِ قوم بنے ہیں حضرت
درد سے بیقرار ہیں حضرت

تپش (رفو توی)

بی امّاں

نازہے قدرتِ صانع کو تری ہستی پر
رشک کرتا ہے ترے سوز پہ اعجازِ شرر

جسپہ قربان ہوں سو زیست عدم تیرا ہے
جسپہ چلتا ہے جہاں نقشِ قدم تیرا ہے

تیری تعمیر میں سرمایۂ غیرت پنہاں
تیری فطرت میں اک احساسِ حمیت پنہاں

درسِ ایثار کچھ اس طرح پڑھایا تو نے
ایک عالم کو رہِ حق پہ لگایا تو نے

زندگی تیری صداقت کا اک افسانہ ہے
جو نہ سمجھے تری دعوت کو وہ دیوانہ ہے

ہر روش دہر کی پیغامِ اجل دیتی ہے
پر تری زیست یہ تعلیمِ عمل دیتی ہے

زندگی نذرِ رہِ ملتِ بیضا کر دے
ذرۂ خاک کو ہمدوشِ ثریا کر دے

آنکھ نے چوٹ ہے گو نشترِ غم کی کھائی
دیدۂ دل نہیں شرمندۂ نابینائی

نورِ حق دیکھتا ہوں خاک میں تیری مستور
جسکے ہر لمعہ میں ہو جائے فنا شعلۂ طور

خاک میں ہمتِ پرواز ابھی باقی ہے
اُڑکے ہر بار سوئے عرشِ بریں جاتی ہے

ذرے جب شدتِ انوار سے تھرّاتے ہیں
دامنِ بنتِ پیمبرؐ سے لپٹ جاتے ہیں

جلیل قدوائی (علیگ)

سفرِ حجاز کی مختصر رُوداد

(بسلسلۂ ماہ دسمبر ۱۹۲۴ء)

مکہ معظمہ کی طرح مدینہ منورہ کے لیے بھی میرے پاس کچھ امانت اور خیرات کی رقوم تھیں۔ امانت کو بحفاظت پہونچا دینے میں تو بحمد اللہ جلد کامیابی ہو گئی مگر تقسیم خیرات کا کام بہت دشوار ثابت ہوا۔ مکہ معظمہ میں بھی رقوم کے تقسیم ہو جانے کے بعد میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا اور یہاں جب اسی طریقہ پر ابتدا کی گئی تو زیادہ برداشت نہ کر سکا اور میں نے تہیہ کیا کہ بقیہ چیزیں اور رقمیں خود مستحقین کو تلاش کر کے پہونچاؤں۔ اس غرض کے لیے مدینہ منورہ کے فقرا و مساکین تک پہونچنے میں میرا بہت سا وقت صرف ہوا جس کی وجہ سے مسجد نبوی میں بخلاف اوقات نماز زیادہ وقت تک حاضری سے محروم رہا۔ قافلہ کی واپسی کے بعد سے تقریباً ہر روز صبح کو ظہر سے قبل تک اور کبھی کبھی سہ پہر یا رات کو بھی فقرا و مساکین کی تلاش میں وقت گذرتا۔

ایک روز نماز ظہر کے بعد سید زین العابدین صاحب مجھے اور یمین تاجر کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ کو حرم شریف سے باہر لائے اور مشہد سیدنا عثمانؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مکان، دیار حضرات عشرہ مبشرہ، حضرت عبد اللہ (حضور کے پدر) اور حضرت مالک ابن سنان علمبردار غزوۂ احد کے مزارات کی زیارت کرائی۔

عشاء کے بعد ایک دفعہ حرم نبوی سے گھر جا رہا تھا۔ طبیعت پر کسی قدر حزن طاری تھا۔ راہ میں ایک درویش صورت شخص سے ملاقات ہوئی جو حرم شریف میں پانچوں وقت نماز ادا کرنے آتے تھے۔ میں نے اپنی قلبی کیفیت کا اُن سے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ذکر کیا۔ پہلے وہ سمجھے نہیں کہ ایک مسافر و سائل مہمان کرانے گھر لیچلنے اور کھانا کھلانے پر آمادہ ہوے۔ جب مزید گفتگو سے اُنھیں معلوم ہوا کہ طالب دُنیا نہیں ہوں تو دوسری طرح پیش آئے۔ گھر ساتھ لیگئے۔ اور باوجودیکہ کھانا کھائے ہوئے تھا باصرار دودھ اور نان خطائیوں سے میری ضیافت کی اور دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ انکا نام شیخ حسین ہے، فرقہ شاذلیہ (ناصری) سے تعلق رکھتے ہیں اور فاز (مراکش) کے رہنے والے ہیں۔ جب میں گھر جانے کے لیے رخصت ہوا تو میری استدعا و التجا کے باوجود ہمراہ تشریف لائے اور میرے گھر کے قریب تک پہونچا گئے۔ سبحان اللہ کیا اخلاق ہیں۔

دوسرے دن سید زین العابدین صاحب کی معیت میں مسجد قبا کی زیارت کرنے گیا۔ ایک درجن سے زیادہ عورتیں اور مرد ساتھ تھے۔ مسجد قبا شہر سے باہر تقریباً دو ڈھائی کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اور چونکہ راہ غیر محفوظ ہے اسلیے حکومت کی طرف سے گاڑیوں کے ہمراہ مسلح بدو ساتھ گئے تھے۔ مسجد قبا کی زیارت کے بعد مسجد سیدنا عمرؓ سیدنا علیؓ وسیدنا ابوبکرؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کی چکی کی زیارت کی اور وہاں سے بیر خاتم پر آکر پانی پیا جسمیں حضور انورؐ کی انگشتری مبارک گر گئی تھی۔ واپسی میں شہر کے اندر سیدنا عمرؓ حضرت بلالؓ اور سیدنا ابوبکرؓ کی مسجدوں کی زیارت کی۔ سیدنا علیؓ کی مسجد بند ملی اسلیے باہر ہی سے زیارت کرلیگئی۔ زیارات کے موقعوں پر ہر جگہ سید زین العابدین صاحب کچھ عامی عربی زبان میں باواز بلند پڑھتے تھے اور سب لوگ اُن الفاظ کی تا بارکان تکرار کرتے جاتے تھے۔ مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا خاص ثواب ہے اسلیے وہاں توجتنی دیر قیام ہوا میں نوافل پڑھتا رہا باقی اور سب مقامات پر بھی کم سے کم دو رکعت نفل ضرور پڑھ لی۔

مسجد قبا کا راستہ ناہموار تھا۔ نیز جن گاڑیوں پر ہم لوگ گئے تھے اُن میں کمانیاں نہ تھیں۔ اسلیے آمدورفت کی مسافت زیادہ نہ ہونے کے باوجود تکلیف اور تھکن بہت ہوئی۔ بعد ادائے نماز ظہر حسب وعدہ شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ فوراً قہوہ سے ضیافت کی اور تقریباً دو گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ اور چلتے وقت میرے حزن کو دفع کرنے کی ترکیب بتائی۔

آج ایک بہار کے رہنے والے نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام حامد رسول ہے۔ اور یہ جنگِ بلقان کے زمانہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب جو طبی مشن لیکے گئے تھے اُسکے ایک رُکن تھے۔ اب ہجرت کرکے مدینۂ منورہ میں مقیم ہیں اور طبابت کرتے ہیں۔ اُن سے دیر تک عام حالات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ رات حرم شریف میں بسر ہوئی۔ الحمد للہ

چونکہ زیارت حرمین شریفین کے سلسلہ میں مجھے اسکی فکر بھی تھی کہ مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ میں بقیہ عمر گذارنے کی صورت پیدا ہو اسلیے مدینہ منورہ میں جن حضرات سے موقع ملتا اس بارہ میں گفتگو کی جاتی۔ مہاجرین میں سے جو اصحاب متوکلین میں ہیں اور حصول معاش کے لیے کوئی کام نہیں کرتے انکی تابعیت ایک دنیا کے کتے سے نہیں ہوسکتی۔ اسلیے ایسے اصحاب کے مشورہ سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا جو وہاں کسی قسم کا کاروبار کرتے ہیں۔ مولوی سید احمد صاحب سے تو تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ مگر جب تک زائرین کا ہجوم رہا اس بارہ میں گفتگو کا موقع نہ ملا۔ اب اُنکو فرصت تھی تو صبح ہی کو میں اُنکے یہاں حاضر ہوا اور دیر تک اس بارہ میں بات چیت ہوئی۔ وہ خود متعدد قسم کی تجارتوں میں مشغول ہیں اور کافی تجربہ یہاں کی زندگی کا رکھتے ہیں۔ اسلیے اُن کی

دایوں سے مجھے بہت مدد ملی۔

ظہر کے بعد شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ پہلے اُنھوں نے گرم گرم کبابوں اور عمدہ سکی ہوئی روٹی سے ضیافت کی۔ پھر دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ اور اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ رات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں ہوئی تو مُنہ چھپائے ہوئے تھے اسلیے کچھ عرض نہ کر سکا۔ یہ گویا میرے حزن کے رفع نہ ہوسکنے کی طرف اشارہ تھا۔

حافظ شبراتی صاحب سے روزانہ کئی کئی دفعہ ملاقات ہوتی اور جب ضرورت پڑتی تو وہ میرے ساتھ ہی اپنا وقت گذارتے۔ اُن کا قیام میاں مظہر کی رباط میں ہے۔ میاں مظہر صاحب حضرت مجدد سرہندی کی اولاد میں ایک بزرگ کامل گزرے ہیں جن کا مدینہ منورہ میں غیر معمولی ادب و احترام کیا جاتا تھا۔ یہ رباط اُنھیں کی بنائی ہوئی ہے اور اب اُنکے صاحبزادہ میاں احمد کے زیر اہتمام ہے۔ حافظ شبراتی صاحب نے از راہ محبت میری دعوت فرمائی۔ ایکبار پہلے اُنکی ہمراہی میں اُن کا جائے قیام دیکھ گیا تھا۔ اب دعوت کھانے اپنے میزبان جناب مولوی عبد الباقی صاحب کے ہمراہ گیا۔ اور وہاں دیر تک ٹھہرا تو رباط کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ سرائے کی قطع کی دومنزلہ عمارت ہے جس میں چاروں طرف برآمدہ کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمرے ٹھہرنے والوں کے لیے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں طلبا و مہاجرین رہتے ہیں۔ مکان کے ایک قطعہ میں خود میاں احمد صاحب کے اہل و عیال رہتے ہیں۔ صاحب موصوف کے دو بیبیاں ہیں۔ ایک رباط میں رہتی ہیں اور دوسری حرم نبوی کے قریب ایک مکان میں۔ اس رباط کے رہنے والوں کو آپ کے حلقہ میں بھی حاضری دینا ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بزرگ عموماً اور حضرات مجددین خصوصاً پیرزادگی کے عام طریقوں پر عمل پیرا نہیں ہوتے مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ خواص اور صاحبانِ دل تو ضرور ان باتوں سے بچتے ہیں [illegible] عام طور پر اُن میں بھی وہی سب کمزوریاں موجود ہیں جو دیگر سلاسل وطرق میں پائی جاتی ہیں۔

میاں احمد صاحب اُسوقت موجود نہیں تھے اس لیے اُنکی قدمبوسی کا شرف حاصل نہ ہوا۔ بلکہ اُن سے ملنے کے لیے ایک دن اُنکے بازار والے مکان پر حاضر ہونا پڑا۔

آج خبر ملی کہ ڈاک آئی ہے۔ ڈاک خانہ گیا تو معلوم ہوا کہ ڈاک بازار میں تقسیم ہونے کو دی گئی ہے۔ رباط مظہری میں ایک طالبعلم یٰسین نامے رہتے ہیں جو مولوی عبد الباقی صاحب سے پڑھتے ہیں اور اس سبب سے تقریباً روزانہ آتے تھے۔ انکی زبانی معلوم ہوا ایک ہندوستانی عبد الرزاق نامی ہیں جو ڈاکخانہ سے مخصوص کر

تقسیم کرتے ہیں۔ اُنکی تلاش میں کئی بار گیا۔ شام کو اُن سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ دوسرے روز ڈاک دیکھکر بتائیں گے۔

رات مسجد نبویؐ ہی میں بسر ہوئی۔ آج شب جمعہ تھی اس لیے حرم شریف میں حاضر رہنے والوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوا اور ایک بخاری بزرگ سے جن کا اسم شریف محی الدین اور طریقہ نقشبندیہ تھا۔ ملاقات ہوئی۔ چونکہ فارسی میں گفتگو ہوسکتی تھی اس لیے میں نے اُنکو جلد اپنی طرف متوجہ کرلیا اور اُسے اپنے حزن کا تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے بھی رفع حزن کی ایک ترکیب بتائی۔

دوسرے دن جمعہ تھا خبر ملی کہ شیخ شمس کا قافلہ دوشنبہ کو روانہ ہوگا۔ لہذا صبح کو بازار جاکر کھجور خریدی۔ بعد نماز جمعہ مولوی ضیاء الدین کے ہمراہ رباطِ مغربی میں گیا جو حرم شریف سے قریب ہی واقع ہے۔ ناظر یا مہتمم رباط سے کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی۔ پھر دار الضیافۃ میں جاکر مولوی محی الدین بخاری کی قدمبوسی حاصل کی۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ عصر کے وقت شیخ حسین ناصری حرم شریف میں ملے تو فرمانے لگے کہ جب تک تنباکو مطلقاً ترک نہ کروگے تمھارا حزن دفع نہ ہوگا۔ نماز مغرب کے بعد حکیم حامد رسول کے ساتھ عمر قاشوجی کے یہاں گیا۔ یہی صاحب ہمارے مزور ہیں۔ عرصہ سے شدید علالت میں مبتلا ہیں اس وجہ سے سید زین العابدین صاحب کو اپنی طرف سے یہ خدمت سپرد کر رکھی ہے۔

سال میں دو دفعہ روضۂ اطہر کو غسل دیا جاتا ہے۔ غسل کی رات کو روضۂ اطہر پر حاضر ہوکر لوگ مرادیں مانگتے ہیں اور اس غرض کے لیے کہ غسل کرنے میں شرکت ہوجائے پاک کپڑے میں برادۂ صندل وغیرہ رکھکر اور پوٹلی بناکر روضۂ اطہر کی جالی میں ڈالدیتے ہیں اور غسل کے بعد غسل کا پانی تقسیم ہوتا ہے۔ میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ میری حاضری کے زمانہ میں غسل ہونے والا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے وعدہ کیا کہ غسل کا پانی لادیں گے۔ دوسرے روز کہ یوم غسل تھا صبح کو میں دیر تک روضۂ اطہر پر حاضر رہا۔ اُسی دن ایک صاحب جو ہندوستانی ہیں تشریف لاکر مجھ سے ملے، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک خاتون کو ہندوستان بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے ہمراہ لیجاؤں۔ مجھے اس میں تامل ہوا تو فرمانے لگے کہ کم سے کم مکہ معظمہ تک پہونچادینا۔ مجھے منظور کرنا پڑا۔

میرا شغدف بیرونی منافہ سے اُٹھ گیا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے اطمینان دلایا تھا کہ مل جائیگا۔ اب جو واپسی کا زمانہ آیا تو مجھ کو اُسکی فکر ہوئی کئی بار سید زین العابدین صاحب سے کہا کہ

انھوں نے اپنے کسی کارکن کو میرے ساتھ جانے کی ہدایت کی کبھی خود وعدہ کیا۔ بالآخر ایک دن ان کی معیت میں اندرونی منافہ گیا تو دیکھا کہ شغدف تو کھلا پڑا ہے اور چٹائی جو اوپر بندھی تھی اور صراحیوں کی زنبیلیں وغیرہ غائب ہیں۔ غنیمت ہے کہ شغدف کا پتہ چل گیا۔

شام کو اُسی طرف پھر نکلا۔ ایک جگہ تازہ انجیر فروخت ہو رہے تھے۔ دو قرش کے سیر ستر ملے خوش ذائقہ معلوم ہوئے اور میں سب کھا گیا۔ دن میں اتفاق سے ایک جگہ بہت سے کباب اور ایک ہندوستانی مٹھائی والے کے یہاں سے کچھ مٹھائی لیکر کھائی تھی۔ ان بدعنوانیوں نے طبیعت خراب کر دی۔ گرانی سر اور نزلہ پیدا ہوگیا۔ اور دوسرے دن بخار آ گیا۔ اتفاق سے ایک شخص عبدالرحمٰن خیاط سے اُس روز ملنے کا وعدہ تھا اُسی حالت میں انکے یہاں چلا تو گیا مگر بخار کے کرب کی وجہ سے بہت بے چین رہا۔ اور ان غریب کو بھی کافی پریشانی ہوئی۔ مغرب کے وقت تک تو خیر نماز کے لیے حرم شریف جاتا رہا مغرب کے بعد اس قدر الجھن بڑھی کہ حرم شریف جانے کا کیا ذکر نماز تک کا ہوش نہ رہا۔ زیادہ رات گذرنے پر کچھ بخار میں کمی ہوئی تو نیند آئی۔ دوسرے دن اہلیہ مولوی عبدالباقی صاحب کے مشورہ سے ایک سہلہ دوا پی جسکو سنگو یا منقوح کہتے ہیں۔ اُسکے اثر سے دن بھر پتلے پتلے دست آتے رہے مگر دستوں کا سلسلہ شام تک بند نہ ہوا۔ نصف شب کے بعد کہیں جاکر دستوں کا سلسلہ موقوف ہوا۔ جس سے بہت ضعف پیدا ہوگیا۔

نظرے خوش گزرے

ملک میں چاروں طرف تخفیف مصارف کی کمیٹیاں کئی سال سے مصروف کار ہیں اور سرکاری و نیم سرکاری، قومی و غیر قومی سب مجالس اس نئی وبا میں کم وبیش مبتلا رہی ہیں۔ دفتر الناظر میں بھی تقریبًا چھ مہینے ہوئے تخفیف مصارف کے جراثیم داخل ہوگئے تھے مگر اب تک کچھ اثر نمودار نہیں ہوا تھا۔ سنہ سال کے چہرہ نما ہوتے ہی کمیٹی نے یاد دہانی کی۔ جسکی بنا پر اعلان کیا جاتا ہے کہ جن احباب کو سالہائے ماسبق میں الناظر ہدیۃً ارسال کیا جاتا رہا اب نئے بجٹ میں اُنکے لیے افسوس ہے کہ کوئی گنجایش باقی نہیں۔ صرف الناظر کے وہ محترم قلمی معاونین جنکے مضامین سے رسالہ کی زینت ہوتی ہے اور ہمارے وہ معاصرین کرام جنکے قابل قدر جرائد کے رکھنے کی دفتر میں گنجایش ہے اس حکم تخفیف سے مستثنیٰ رہیں گے۔

بعض اصحاب جن کے دل ناکامی غم کھانے میں بہت بودے ہیں، نظرے خوش گزرے کی تاب نہیں لا سکتے۔ اور اب جو دفتر الناظر سے ایک اخبار بھی نکلنے لگا جس کا نام ہی بجائے خود تمام چھوٹے معبودوں کو لرزہ براندام کر دینے کے لیے کافی ہے تو اُنکے نازک دلوں پر عجیب خوف وہراس طاری ہے۔ حالت اضطراب میں باہر کے ایک روزانہ اخبار کی ہمدردی حاصل کی گئی اور جرأت مردانہ کی نمایش شروع ہوگئی ہے۔ اللھم زد فزد

احمد آباد (گجرات) سے جہاں مہاتما گاندھی کا قیام ہے ایک گلدستہ نشتر "زیر نظر" سرپنچ افغان مولانا عیسیٰ خاں نشتر جاری ہوا ہے جو "باہتمام" حسین میاں "ایڈیٹر" بمبئی میں چھپتا ہے۔ اسکے منیجر بھی نشتر صاحب ہیں۔ اس کا تیسرا نمبر ہمارے پاس بغرض ریویو آیا ہے۔ پرچہ کے شروع میں نشتر صاحب کی تصویر درج ہے نیچے انگریزی اور گجراتی میں چند سطروں کی عبارت ہے۔ گجراتی سے ہم ناواقف ہیں۔ انگریزی عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"سرپنچ افغان عیسیٰ خان نشتر یعنی گجرات کے انور (انور پاشا) مہاجرین کے معاون و محافظ، عالی مرتبت مذہبی و تمدنی رہنما، جنھوں نے اپنی دولت، صحت اور راحت و آرام کو تحکیر مسئلہ خلافت کو انتہائی عروج تک پہونچانے کی کوشش کی اور جو گجرات میں تحریک خلافت کے بلغ تھے۔"

ایسے بلند قدر بزرگ قوم کے اُردو صحافت میں گامزن ہونے پر جملہ خدمتگذاران اُردو کی طرف سے غلغلہ شادمانی بلند کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ فارسی کے مشہور مقولہ "مشک آنست کہ خود ببوید" کی تفسیر اس سے پہلے نہیں سمجھ میں آئی تھی۔

انجمن اُردو کے سالانہ جلسہ کی تاریخیں ایک خوش مزاج دوست کے بقول بالے میاں کی برات کے مانند برابر تغیر پذیر ہیں۔ پہلے وسط جنوری میں جلسہ کرنے کی تجویز ہوئی تھی، پھر ۲۴-۲۵ تاریخ مقرر ہوئی۔ اب ان تاریخوں کو بھی بدلنا پڑا۔ اور ۸-۱۵ یا ۲۲ فروری میں سے کوئی تاریخ رکھی جائے گی۔ ابھی مجلس انتظامیہ کی طرف سے اعلان نہیں ہوا ہے۔ ناظرین الناظر میں سے جن صاحب کو انجمن سے دلچسپی ہو وہ مقامی اخبارات میں آخری اعلان ملاحظہ کریں۔

شہزادہ کے چوٹ کھائے ہوئے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اُتار کر اس لڑکی کو پنھا دیا۔ دیکھنے والے کھٹکے کہ عیش پرست شہزادہ شاید اس لڑکی کو اپنے رنواس میں داخل کرنے والا ہے۔ مگر یہ کون گمان کر سکتا تھا کہ راہلیا رنے گلے کا ہار اُتار کر دنیا سے تعلقات چھوڑنے کا اعلان کیا ہے!!

کپل واستو کی رعایا نے خوشی منائی، شہر میں چراغاں ہوا۔ قلعۂ شاہی میں رقص وسرود کی محفل منعقد ہوئی۔ خاطر احباب سے راہلیا ربھی بزم طرب میں شریک ہوا اور آدھی رات تک گانا سُنتا رہا۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو شہزادہ نے سوچا کہ اس وقت قلعہ کے سب محافظ شراب عشرت سے مست اور بے خبر ہیں۔ اس سے بہتر موقع یہاں سے فرار ہونے کا نہ ملے گا۔ چنانچہ رتھبان کو بلایا اور گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ سائیس کی کیا مجال تھی کہ خلاف عادت آدھی رات کے وقت طلب ہونے کا سبب دریافت کرتا تعمیل ارشاد کے لیے اصطبل کی طرف گیا اور ادھر راہلیا رسفر کی تیاری کرنے لگے۔

زن طریق عشق کی پہلی راہزن ہے۔ جسودھرا کی محبت نے قدم پکڑے اور دل نے نہ مانا کہ اُسکو ایک بار دیکھے بغیر گھر سے نکل جائے۔ دبے پاؤں بیوی کے کمرہ میں گیا۔ دیکھا کہ زنمکس ہاروں اور پھولوں سے دولھن بنا ہوا ہے اور جسودھرا اپنے ننھے بچہ پر ہاتھ رکھے بے خبر سو رہی ہے۔ دل بیچین ہوا کہ بچہ کو ایک دفعہ چھاتی سے لگا لینا چاہیے معلوم نہیں کہ پھر دیدار نصیب ہو یا نہ ہو۔ آگے بڑھتا ہے تو بیوی کے جگ پڑنے کا اندیشہ ہے اور اُس کا جاگنا ممکن ہے کہ اس وقت سفر عشق میں خلل انداز ہو۔

دنیوی محبت اور روحانی فرض میں جنگ ہوئی۔ محبت ہار گئی۔ اور راہلیار پژمردہ اور افسردہ لوٹ آیا۔ جب اپنے کمرہ تک پہونچا تو دُنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی اور بیخودی کے عالم میں پھر جسودھرا کے پاس گیا۔ اُسکے قدم اپنے ہونٹوں سے چھوے اور دل بیتاب کو یوں تسلی دی کہ یہ مفارقت چند روزہ ہے۔ موت کی جدائی البتہ دائمی ہوتی ہے۔ جوگ میں کمال حاصل کرکے پھر واپس آنا اور آج کی بیوفائی کی معافی چاہنا ممکن ہے۔

اس طرح بہلا پھسلا کر دل سے زن و فرزند کو وداع کرنے کی اجازت حاصل کی۔ گھوڑا تیار ہی

تھا۔ سوار ہوا اور ایک دم میں قلعہ سے باہر تھا۔

کہتے ہیں کہ جس وقت یہ مقدس شہزادہ گھربار، بیوی بچہ، باپ اور سلطنت کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لینے پر تیار تھا تو شیطان سامنے آیا اور سات دن کے اندر ہفت اقلیم کا راجہ بنا دینے کا وعدہ کیا بشرطیکہ وہ اس وقت اپنے بوڑھے باپ۔ زچہ بیوی اور ننھے بچہ کو نہ چھوڑے۔ لیکن راجکمار کو تلاش حق کی دُھن تھی۔ دنیا کی محبت سے دل سرد ہو چکا تھا۔ اُس نے شیطانی تجویزوں کو نامنظور کیا۔ اور گھوڑے کی رکاب پر قدم رکھا۔ شیطان افسردہ ہو کر بولا کہ "یہ انسان ہے کسی وقت تو اس پر خواہش، حرص یا غصہ کا اثر ہوگا۔ اور وہی میری کامیابی کی گھڑی ہے!"

چنا رتھ بان بھی رفیق سفر ہوا۔ اور راجکمار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ یہ جولائی کا مہینہ تھا اور اُس وقت چاندنی خوب پھیلی ہوئی تھی۔ اسی ہجرت کو عقیدت کیش بودھ مہابن شکرماں یا زہد عظیم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ رات جس قدر باقی تھی سفر میں گذری اور صبح ہوتے شہزادہ رجگان شاکیہ اور کولین کے علاقوں سے باہر تھا۔ ندی انوما کے کنارے گھوڑے سے اُترا۔ اپنی زلفیں تراشیں۔ گھوڑا جس پر سوار ہو کر آیا تھا اور زیور جو اُسکے بدن پر تھا اُتار کر چنا کے حوالہ کیا اور اُسکو واپس جانے کا حکم دیا۔ چنا کو اپنے مخدوم کی جدائی منظور نہ تھی لیکن شہزادہ کی تاکید سے مجبور ہو گیا اور چھاتی پر پتھر رکھ کر مالک کے قدم چھوڑے۔

مایا دیوی!! آپ بڑی خوش قسمت تھیں کہ یہ مصیبت کی خبر سُننے اور جدائی کی سخت گھڑی دیکھنے کو زندہ نہ رہیں!! بوڑھے باپ پر اس دردناک خبر سے کیا گذری اور جاں نثار بیوی نے اپنی کیا گت بنائی؟ قلم کو تفصیل کی تاب نہیں!!

راجکمار سات دن تک انوما ندی کے قریب آم کے باغ میں تنہا مقیم رہے اور غور کرتے رہے کہ زندگی اور موت پر کیونکر قابو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک ہفتہ کے تفکر کے بعد یہ رائے قائم ہوئی کہ پہلے رائج الوقت فلسفہ کسی ماہرِ فن سے پڑھنا چاہیے تب معلوم ہوگا کہ عقائد و رسوم میں کیا خرابیاں ہیں جنکی وجہ سے خوبصورت دنیا مصیبتوں کا گھر بنگئی ہے۔

آفتاب تاریکی میں نور لاتا ہے اور وہ پورب سے طلوع ہوتا ہے۔ علم کی روشنی تلاش کرنے کے لیے اُس نے مشرق کا رخ کیا اور مگدھ کے راج کی طرف روانہ ہوا۔

شمالی ہندوستان میں اُسوقت سولہ بڑی سلطنتیں تھیں اور ان میں سے ایک مگدھ کا راج تھا۔ اس کا دارالسلطنت راجگڈھ تھا اور زمام حکومت راجہ بسار کے ہاتھ میں تھی۔ گوتم اُفتاں وخیزاں راجگڈھ تک پہونچا۔ بسار نے خاطر مدارات کی اور وہاں کے نامی پنڈتوں آرادہ اور اودرک کے حضور میں راجکمار نے زانوئے ادب تہ کیا۔

یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ راجگڈھ میں کتنی مدت تک قیام رہا اور فلسفہ کے علاوہ کوئی دوسرا علم بھی تحصیل کیا گیا یا نہیں۔ اگر دانشمندوں کا قول صحیح ہے کہ ۴۰ سال کی عمر سے پہلے کسی کو درجۂ کمال نہیں ملتا تو آیندہ واقعات کی مدت کا حساب لگانے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مہاتما ۴ یا ۵ سال تک راجگڈھ میں مقیم رہے۔ للتا وستارا کا مولف کہتا ہے کہ "حصول کمال سے پہلے دس سال ریاضت میں صرف ہوئے"۔ جپ تپ کی مدت معتبر روایات کے مطابق صرف ۶ سال ہے۔ لہذا یہ بقیہ چار سال جو ایام ریاضت میں شامل کیے گئے ممکن ہے کہ بسلسلہ تحصیل علوم راجگڈھ میں بسر کیے گئے ہوں۔

بہرحال، علوم کی تحصیل سے یہ حاصل ہوا کہ مہاتما کو مذہب مروجہ پر عقیدت نہ رہی۔ قربانیوں کا وسیلہ جو مقبول عوام تھا اُنکو قابل نفرت نظر آیا۔ مسئلہ تناسخ یا آواگون اُنھوں نے تسلیم کیا لیکن اس سلسلۂ نامتناہی سے نجات پانے کی کوئی صورت فلسفہ کی مدد سے دستیاب نہ ہو سکی۔ کیونکہ انسان جب تک زندہ ہے خواہش کا بندہ رہے گا اور ہر ایک جنم میں گناہ ضرور سرزد ہوگا جو دوبارہ دنیا میں کھینچکر لائے گا اور ممکن ہے کہ ایک روح جو اپنے نیک اعمال کے عوض میں اگلے برہمن کے گھر پیدا ہوئی ہے آیندہ قالب میں سانپ بچھو بن جائے!

وہ اپنے عقائد کی درستی کے لیے عین الیقین اور حق الیقین کے طلبگار رہتے اور فلسفہ کے دارالصحت میں اس مرض کا کوئی علاج نہ تھا۔ لہذا کرم کھنڈ چھوڑ کر ویدانت پر عمل کرنے اور جوگ

ل للتا وستارا ایک اگلے وقتوں کی سنسکرت کتاب گوتم بدھ کے احوال میں ہے۔ یہ تبت میں دستیاب ہوئی اور اس کا ترجمہ ۱۸۴۸ء میں پیرس سے شایع ہوا۔ اس پر انگلستان کے ایک فاضل "ارنسٹ رینان" نے ریویو لکھا ہے جو اُن کی کتاب "اسباق تاریخ مذاہب" مطبوعہ ۱۸۸۶ء میں شامل ہے۔ اور اسی کتاب سے وہ اقتباس بھی لیا گیا ہے جو گوتم کی حیرت انگیز کیفیت ولادت کے متعلق عقیدت کیش سوانح نگار کے نام سے اوپر درج کیا گیا۔

کی مدد سے صراط مستقیم دریافت کرنے کے لیے اُنھوں نے راجگڈھ کا قیام چھوڑا اور انسانی آبادی سے دُور اورولوا کے جنگل میں جو بندھیاچل پہاڑ کے شمالی دامن میں واقع تھا مجاہدہ اور مراقبہ شروع کیا۔

اُنکے "زہد عظیم" کی حکایت سُن کر پانچ فقیر بھی جپ تپ کے شریک ہوے اور نفس کشی، ریاضات اور مجاہدات کی کوئی حد نہ باقی رکھی۔

جنگل میں نہ اناج ملتا تھا نہ میوے۔ گھاس پات کھاتے تھے اور وہ بھی بہت کم۔ پانی میسر آتا تھا تو پیتے تھے مگر بہت تھوڑا۔ چند روز کے بعد غذا بالکل ترک کردی تھی اور صرف ہوا پر زندگی تھی۔ چھ سال برابر ایک ہی مقام پر عبادت میں مصروف رہے مگر کشود کار نہ ہوا۔ نفس کو مغلوب کرنے کی کوشش میں روح بھی مضمحل ہوگئی اور ایک دن ضعف کی شدت سے غش کھا کر مہاتما گر پڑے۔ چیلوں نے جانا کہ خاتمہ ہوگیا اور مُکتی پراپت ہوگئی!!

دیر کے بعد ہوش آیا تو فوراً جپ توڑنے کا ارادہ کر لیا۔ پانی پیا اور کھانا مانگا۔ چیلے ڈرے کہ گروجی پر مایا کا داؤں چل گیا اور وہ قبل از وقت ترک ریاضت سے گنہگار اور بے دین ہوگئے۔ ایسے اُستاد سے فیض پانے کی کیا امید باقی تھی پانچوں چیلے بدعقیدہ ہوکر بنارس کی طرف چل دیے اور مہاتما کو جنگل میں اکیلا چھوڑا۔

اب گوتم کے دل میں بھی شک آیا اور دیر تک نفس سے محاسبہ کرتا رہا کہ اُس نے دنیا کی محبت سے ریاضت کو ترک کیا ہے یا طلب حق کی خاطر سے۔ دل نے جواب دیا کہ زندگی کے لیے غذا اور پانی لازمی ہے اس لیے تپ کا توڑنا ہی مناسب تھا۔ شک نے کہا کہ زندگی جب مصیبت کا گھر ہے تو اُسکو قائم رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ دل کوئی معقول جواب نہ دے سکا اور جپ تپ کے بغیر جو جنگل کی زندگی کا شغل تھا ویرانہ میں وقت کاٹنا مشکل ہوگیا۔

چھ برس سے جو بیابان گھر ہو رہا تھا اُسکو چھوڑا اور ضعف کی شدت سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہوا ندی نرنجارا کے کنارہ پہونچا۔ وہاں ایک دیہاتی لڑکی سجاتا نام ملی جسکو راجکمار کی حالت زار اور جسم لاغر پر رحم آیا۔ اُس نے مہاتما کو پیٹ بھر روٹی کھلائی۔ مدت کے بعد گوتم کو انسانوں کی غذا میسر ہوئی اور سجاتا کا مبارک نام ہمیشہ کے لیے تاریخ عالم کے صفحوں پر یادگار ہو گیا۔ کیا خوب

سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ ایک گھنے سایہ دار پیپل کے نیچے جو آج تک "بُدھ کا پیڑ" یا "شجرۃ العقل" کہلاتا ہے مہاتما نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور اپنی آئندہ زندگی میں ہمیشہ سجاتا کی اس غریب نوازی کا شکریہ ادا کرتے رہے۔

اسوقت ایک بھولی ہوئی کہانی یاد آگئی۔ مصر کا ایک جلیل القدر رہنما جو بادشاہِ وقت کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوا تھا دشمنوں کے خوف سے جلا وطنی اختیار کرتا ہے اور وطن سے سیکڑوں کوس کے فاصلہ پر بھوک کی تکلیف سے خستہ و زار ہو کر ایک درخت کے سایہ میں پناہ لیتا ہے اور نہایت عاجزی سے کریم کارساز کی درگاہ میں عرض کرتا ہے کہ اسوقت جو نعمت اپنے خزانۂ غیب سے مجھکو عنایت فرمائیں اُس کا میں محتاج اور سائل ہوں۔ دعا کی تاثیر ایک لڑکی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو شرماتی ہوئی آتی ہے اور بڑی منت سے اس تھکے ماندے مسافر[1] کو اپنے گھر لیجاتی ہے اور اپنے باپ کے دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتی ہے!

کیا خدا اور عالم کی سرکار سے غریبوں اور بیکسوں پر ترس کھانے کی خدمت عورتوں ہی کے سپرد کی گئی ہے؟ کیا قسام ازل نے مصیبت زدوں اور درماندوں کی چارہ سازی اسی جنسِ نازک کو عنایت فرمائی ہے؟ اے نزاکت کی دیبی! عشرت و شادمانی کے وقت تو تیرا دل ہوا میں پتہ۔ رنگ میں پانی ہے اور تجھکو خوش کرنا ہتھیلی پر سرسوں جمانا۔ تیرا راضی رکھنا پانی میں آگ لگانا ہے۔ لیکن جب ماتھا دُکھے یا درد و مصیبت کا سامنا ہو تو بیشک تو ہی فرشتۂ رحمت ہے!!!

قدر ہر نعمت سپت بعد زوال۔ دل شکستہ نامہ نگار حسرت کے پھول اور آنسوؤں کے موتی تجھپر نثار کرتا ہے۔

زہر غم ہجر تو سجان کار گر افتاد   امید لقاء تو بہ عمر دگر افتاد

القصہ سجاتا کی مسافر نوازی کے بعد اسی درخت کے سایہ میں بدھ گیا کے تاریخی مقام پر گوتم کے دل سے وہ پس و پیش دور ہونا شروع ہوا جو ریاضت کے ترک کرنے اور چیلوں کی ناراضی سے پیدا ہوا تھا اور اُسی دن آفتاب کے غروب ہوتے ہی تمام تشکوک دل سے دور ہو گئے اور جواب مل گیا کہ زندگی کا قائم رکھنا اس لیے ضروری تھا کہ "موت اختیاری ہونا چاہیے نہ کہ اضطراری یعنی

[1] حضرت موسیٰ و صفورا بنت شعیب علیہما السلام

کمزوری کی وجہ سے جو موت ہوئی اُس سے زندگی کا تعلق منقطع نہ ہوگا - اور اعمال کی جزا و سزا ملیگی لیکن اختیاری موت اگر نصیب ہو تو اُسکے بعد ابدی آسایش ہے اور اس مرتبہ تک پہونچنے کے لیے زندگی کا قائم رکھنا اور غذا استعمال کرنا لازمی تھا - وہ ساری رات مہاتما نے اُسی درخت کے نیچے کاٹی اور اُسکے بعد سات دن تک سامم رہے - آٹھویں روز حجاب کے پردے اُٹھ گئے اور عرفان حاصل ہوگیا - عقیدتمند سوانح نگار کہتے ہیں کہ برہما یا کسی اور فرشتہ نے تمام علوم باطنی اُنکے سینہ پر نقش کر دیے - اور اُنکو مشاہدہ کرا دیا کہ ریاضاتِ شاقہ فضول ہیں - نجاتِ ابدی کے حاصل کرنے کا راستہ رحم اور محبت ہے -

اب گوتم نے نیت کی کہ وہ اپنی جدید فلسفہ کا دنیا میں اعلان کرے اور تمام عالم کو آواگون کے پھندے سے نجات دلائے - اُسکے قدیم اُستاد آرادہ اور اودرک دنیا میں باقی نہ تھے لہذا وہ اپنے چیلوں کی تلاش میں بنارس کی طرف چلا تا کہ سب سے پہلے اُنھیں کو راہ حق کی ہدایت کرے - جنھوں نے چھ برس رفاقت کی تھی اور پھر بدعقیدہ ہو کر جدا ہو گئے تھے -

مہاتما بنارس کے قریب پہونچے تو ایک پُرانے آشنا سے ملاقات ہوئی جو اُنکے دنیا ترک کرنے اور جوگ سادھنے کا قصہ سن چکا تھا - وہ محبت سے بغلگیر ہوا اور پوچھا کہ اب کیا خیال ہے اور کہاں کا ارادہ ہے ؟ گوتم نے جواب دیا کہ تمام بُری خواہشوں پر کامل فتح حاصل ہوگئی ہے اور مادی دنیا کی غلامی سے نجات مل گئی ہے - اب وجود کی غرض صرف یہ ہے کہ حق کی تبلیغ کی جائے اور جو علم باطنی عطا ہوا ہے اُس سے دوسروں کو فائدہ پہونچایا جائے - دوست گوتم کے چہرہ پر خوشی کے آثار دیکھکر سمجھا تھا کہ شاید جوگ سے اُنکا دل سرد ہوا اور اب پھر عیش دنیوی کی طرف مائل ہو نگے - لیکن یہ خشک جواب سُن کر جوش مسرت ٹھنڈا ہوگیا اور جنگل کی طرف اشارہ کرکے اُس نے کہا کہ یہ حال ہے تو آپ کا راستہ اُدھر ہے - اور خود دوسری طرف روانہ ہوا -

اس کج ادائی کا مہاتما پر کچھ اثر نہ ہوا اور شام ہوتے ہوتے اُنھوں نے "دشت غزالاں" میں اپنے قدیم رفیقوں کو ڈھونڈھ نکالا -

سُست عقیدہ شاگرد اُستاد کو آتے دیکھکر تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوے اور آپس ہی عہد کیا کہ یہ بدمذہب فقیر اگر ہمارے پاس آئے تو اُسکو صحبت میں شریک نہ کیا جائے بلکہ اُس سے بیٹھنے کو بھی

نہ کہا جائے۔ مگر جب محبت کا اوتار قریب پہونچا تو دلوں میں خود بخود عجز و انکسار جاگزین ہوا۔ غرور کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ خود پسندی کے ارادے ٹوٹ گئے اور سب مرعوب ہو کر اسکے قدموں پر گر پڑے۔ مہاتما نے خلعت عرفان سے سرفراز ہونے کا مژدہ سنایا اور اپنے جدید کشف و کمال سے آگاہ کیا تو سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ پانچ دن سلسلۂ وعظ و تلقین جاری رہا تب چیلوں کے قلوب صاف ہوئے اور سب سے پہلے جو مہاتما پر ایمان لائے وہ یہی پانچوں فقیر تھے۔

گوتم کے مذہب پر مفصل تنقید کا تو ابھی وقت نہیں آیا مگر مسلسل داستان کے لیے مختصر طور پر اسکے اصول اور قواعد اس جگہ بیان کر دینا ضروری ہے:-

"جو چیز جسم رکھتی ہے وہ مادّہ سے بنی ہے۔ مادہ غیر مستقل اور فانی ہے اس لیے ہر جسم رکھنے والی چیز میں فنا کے جراثیم موجود ہیں۔

انسان حیات جسمانی رکھتا ہے اور اُس کو فنا سے چارہ نہیں ہے۔ غم۔ کمزوری۔ بیماری اور موت فنا کے مدارج ہیں۔

جب تک ناپاک خواہشیں باقی ہیں حرص، فکر اور آرزو کا ساتھ رہے گا یعنی غم اور کمزوری نصیب ہوگی۔

جسم کو تکلیف پہونچا کر خواہش کو قطع کرنے کی کوشش خطرناک ہے کیونکہ اس سعی میں اگر زندگی ختم ہوگئی تو موت اضطراری ہوگی۔ اور آواگون سے نجات نہ ملیگی۔

جو چیز انسان کا تعلق مادّی دنیا سے قائم رکھتی ہے وہ دل کی بُرائی ہے۔ جب تک دل میں ذرہ برابر بھی بدی باقی رہے گی دنیا کا علاقہ قطع نہ ہوگا۔

دل کی بدی کے ساتھ نیک اعمال فائدہ بخش نہین کیونکہ نیکی کا ثمرہ ملے گا مگر بدی کی جزا میں دوبارہ زندگی اور موت کی مصیبت جھیلنا ہوگی۔ اور اُس جنم میں معلوم نہیں کہ نیکی کی توفیق ہو یا نہ ہو۔ اس لیے بغیر جسم کو تکلیف پہونچائے اور روح کو مضمحل بنائے خواہشوں کو دُور کرنا اور دل کا تمام عیوب سے صاف کرنا نجات کے لیے ضروری ہے۔

ہر ایک خواہش کا ہلاک کرنا لازمی ہے۔ عدم وجود کی خواہش بھی اُتنی ہی خطرناک ہے جتنی کہ وجود کی!!

لہذا نیک اعتقاد۔ نیک نیت۔ نیک قول۔ نیک فعل۔ نیک زندگی۔ نیک کوشش۔ نیک خیال اور نیک مراقبہ سے "نروان" حاصل کرنا چاہیے یعنی تمام قوائے بدنیہ بے حس کر دی جائیں اور زندگی موت کی مرادف بنالی جائے۔

مندرجۂ بالا آٹھ نیکیوں کو عمل میں لانے اور بام "نروان" تک رسائی حاصل کرنے کے چار زینے ہیں۔ پہلی سیڑھی دل کی بیداری ہے یعنی غم اور شادی کا راز دریافت کرنے کی طلب۔ جب تلاش حق میں مرشد کامل تک رسائی ہوگئی تو یہ درجہ طے ہوگیا۔ دوسری سیڑھی ناپاک شہوات کو ترک کرنا اور عوض لینے کا خیال دل سے نکال ڈالنا ہے۔ جب اس عہد پر ثابت قدم ہوا تو دوسرا زینہ بھی تمام ہوگیا۔ تیسری سیڑھی جہالت۔ شک۔ غصہ۔ حرص اور تمام کمینہ خصلتوں کو دور کرنا ہے۔ جب ان نقائص سے پاک ہوا تو لوح دل صاف ہوئی اور تیسرا درجہ حاصل ہوگیا۔ آخری سیڑھی عشق و محبت کا سینۂ بے کینہ پر نقش کرنا ہے جس طرح ماں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے اکلوتے بچہ کی نگرانی اور نگہبانی کرتی ہے اُسی طرح طالب نجات [illegible] روح پر اپنی جان نثار رکھنے کو تیار ہو جانا چاہیے۔

جس دشمن کو سب سے پہلے مغلوب کرنا چاہیے وہ خواہش نفسانی ہے اور آخری ہم عالمگیر عشق و الفت کا سوتے جاگتے دھیان رکھنا ہے۔

نہ قربانی کی ضرورت ہے نہ برہمنوں کی امداد کی۔ ہر انسان کی نجات خود اُسکے ہاتھ میں ہے۔"

بقول صوفی

دو قدم راہست سوے کردگار   یک قدم بر نفس و دیگر سوے یار

مسئلۂ تناسخ اُس وقت ہندوستان میں ہر کس و ناکس کو تسلیم تھا اور انسان کا فانی ہونا روزانہ آنکھوں سے دیکھتے تھے لہذا شریعت گوتم جس کی بنیاد انھیں علوم متعارفہ پر تھی سننے والوں کے قلوب میں فوراً راسخ ہو جاتی تھی اور جو ایک بار بھی اس کی تقریر سنتا ہمیشہ کے لیے اُنکا غلام بنجاتا تھا۔

مالک الملک نے گوتم کو بھولی صورت۔ چوڑی پیشانی اور میٹھی بولی کے ساتھ رعب دار آواز اور پُر شکوہ چہرہ عنایت فرمایا تھا۔ وہ جب سقراط کی طرح اپنی منطق سے دلائل کو کاٹنا شروع

کلام حالی

مولانا حالی کی متفرق نظمیں جو بے حد مقبول ہیں

شکوہ ہند ۲؍ بیوہ کی مناجات ۲؍ عرض حال ۲؍

مسدس ۲؍ نشک خدمت ۲؍ مناظرہ رحم و انصاف ۱؍

حب وطن ۱؍ چھوا دیلے کا مناظرہ ۱؍

(خریداران الناظر کے لیے تین چوتھائی قیمت پر)

مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر و انشا پرداز فلسفی مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم جسے اردو میں اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ خیالات کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا۔ قیمت ۴؍

(خریداران رسالہ کے لیے ۳؍)

کلام اقبال

ڈاکٹر اقبال کی مقبول عام نظمیں:-

شکوہ ۲؍ جواب شکوہ ۳؍ شمع و شاعر ۳؍

بلال ۱؍ فریاد امت ۳؍ تصویر درد ۳؍

۱؍

(خریداران رسالہ کو تین چوتھائی قیمت پر)

مسلمانان اندلس

نامور مورخ اسٹینلی لین پول کی کتاب "مورس ان اسپین" کا اردو ترجمہ از مولوی سید عبد الغنی وارثی قیمت ۱۲؍

(خریداران رسالہ سے ۱۲؍)

خوان دعوت

لڑکیوں کو کھانا پکانا سکھانے کیلیے م۔ ب صاحب لکھنوی نے افسانہ کے دلکش پیرایہ میں یہ کتاب مرتب کی ہے جس میں باورچی خانہ کے ضروری انتظامات اور عمدہ و لذیذ کھانوں کی مجرب ترکیبیں ذاتی تجربہ کی بنا پر تحریر کی ہیں۔

قیمت ۸؍

(خریداران رسالہ کے لیے ۶؍)

تذکرہ حزیں

مشہور شاعر شیخ علی حزیں۔ جو ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے ان کی دلچسپ سوانح عمری قیمت ۴؍

(خریداران رسالہ سے ۳؍)

دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خدا پرست اور دنیا دار کی کہانی ۱؍ ۔ مساوات ۔ از مسٹر سلطان حیدر جوش ۱؍ اتفاقات زمانہ ۱؍

(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

حیات نظامی

مشہور شاعر حضرت نظامی گنجوی کی سوانح عمری۔

قیمت ۴؍

(خریداران الناظر کے لیے ۳؍)

جمیل و بثینہ

عرب کے حسن و عشق کا دلچسپ افسانہ

قیمت ۳؍

(خریداران الناظر کے لیے ۲؍)

عورتوں کی انشا

خواتین اور لڑکیوں صاحبزادیوں کو خطوط نویسی سکھلانے والی کتاب مصنفہ بیگم صغریٰ علی صاحبہ۔ قیمت ۱۰؍

(خریداران رسالہ کے لیے ۸؍)

مصنوعی شوہر

انقلاب ایران کی ایک ظریفانہ داستان ہنستے ہنستے لوٹ جائیے گا۔

قیمت ۲؍

(خریداران الناظر کے لیے ۱؍)

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مسلمانوں کی تہذیب

یعنی مسلمانوں کی تمدنی ترقی کے متعلق نواب محسن الملک مرحوم کا ایک فاضلانہ لکچر۔

قیمت ۶ر

(خریداران الناظر سے ۵ر)

میلاد النبی

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے اصل عربی متن کے مقابل اس کا نہایت فصیح اردو ترجمہ۔

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم جس میں لفظ صوفی کی تحقیق، تصوف کی ابتدا اور اسکی درجہ بدرجہ ترقیوں کا ذکر ہے اور آخر میں تصوف کے تمام شعبوں کو اسلام سے تطبیق دیگئی ہے

قیمت ۸ر (خریداران رسالہ کے لیے ۵ر)

مقدمہ شعر و شاعری

مولانا حالی نے اپنے دیوان کے شروع میں لاجواب مقدمہ لکھا تھا دوسرے ایڈیشن کے وقت ایڈیٹر الناظر نے دیوان سے علیحدہ کرکے چھاپا۔ اسمیں شعر کی حقیقت، ماہیت اور شاعری کے اصول و اساس پر بحث کرکے اردو شاعری پر ایک بسیط تبصرہ لکھا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر (خریداران رسالہ سے ۸ر)

خطاب

(از "ملا" جی)

سرکاری خطابات کے آرزومند کوشش کرنے سے پہلے اسکو ملاحظہ فرمالیں ۴ر

(خریداران الناظر کیلئے ۳ر)

ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار و تاریخ مولفہ مسٹر عنایت اللہ بی اے رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۴ر

(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

وکرم اروسی

مترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم۔ یہ کالی داس کے مشہور معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے جس میں لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ اضافہ کیا ہے اور ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر بحث کی اور کالی داس کا موازنہ شیکسپیر اور سیر ائیس وغیرہ سے کیا ہے۔ قیمت ۱۲ر خریداران الناظر سے ۸ر

تسخیر فرانس

شیکسپیر کے لاجواب ڈرامہ ہنری دی ففتھ کا اردو ترجمہ۔ از منشی تفضل حسین صاحب ناتر۔ قیمت ۸ر

(خریداران الناظر کے لیے ۶ر)

سفرنامہ مصر و شام و روم

مولانا شبلی کا مشہور سفرنامہ جو ان ممالک کے متعلق بہترین تاریخی علمی معاشرتی معلومات فراہم کرتا ہے۔ قیمت ۸ر

(خریداران الناظر کے لیے ۶ر)

میکفرن و رلوسی

حضرت شوق قدوائی کا لاجواب ڈراما

قیمت ۲ر

(خریداران الناظر سے ۱ر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ٹرڈ نمبر ل ۴۶۸

رسالہ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ؎ مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

فی جلد پیسہ ۳

[illegible]

مطبوعات الناظر پریس لکھنؤ

تاریخ عرب

مصنفۂ

موسیو سیدیو فرانسیسی

عربوں کے متعلق یہ کتاب اُن تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے
جو یورپ ایشیا کے کتبخانوں کی زینت ہیں مسلمانوں
کی ترقیات اور عربوں کے کمالات کا یہ آئینہ ہے
اور یورپ کے افترا و کذب کا بہترین جواب
قیمت مجلد چرمی ہعہ مجلد پارچہ صہ

الکلام

از حسن الملک کا قول دیباچہ مضمون
قیمت ۱۲ر (خریداران الناظر سے ۱۰ر)

الانتقاد علی التمدن الاسلامی

خواجہ غلام الحسنین ... زیدان کی کتاب ...
قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

قواعد المنتخب

جلال لکھنوی کا لاجواب رسالہ۔ جو
زبان کے متعلق بہترین تحقیقات سے لبریز ہے
قیمت ۴ر (خریداران الناظر سے ۳ر)

موازنۂ انیس و دبیر

مولفۂ

مولانا شبلی مرحوم

جس میں میر انیس کی شاعری پر تفصیلی
ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا
موازنہ کیا گیا ہے
قیمت ے ر
(خریداران رسالہ کے لیے ۱۲؍)

مثنوی صبح اُمید

مولانا شبلی کی سب سے پہلی مطبوعہ نظم
قیمت ۴ر
(خریداران الناظر سے ۳ر)

ترقی زبان بذریعۂ تراجم

پروفیسر گھوشال ایم اے کا وہ قیمتی
لکچر جو لکھنؤ کی اردو کانفرنس میں پڑھا گیا
قیمت ۴ر
(خریداران الناظر سے ۳ر)

مولانا شبلی کے متفرق مضامین

زیب النسا ۱ر
جہانگیر اور تزک جہانگیری ۲ر
اسلامی حکومت ۲ر
اسلامی مدارس ۴ر
(خریداران الناظر سے ¾ قیمت)

شوکیہ اور دو مظلوم بہنیں

قیصر بھوپالی کے دو مختصر افسانے
قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

النّاظر

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ فروری ۲۵ء ۱۹

نمبر ۱۶۴ — جلد ۲۸

تصوف اسلام

جناب مولوی عبد الماجد بی اے کی تازہ تالیف۔ جس میں آپ نے شیخ ابو نصر سراجؒ، شیخ علی ہجویریؒ، استاد قشیریؒ، شیخ عبد القادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ، اور مولانا جامیؒ کی کتابوں پر تبصرہ کرکے اسلامی تصوف کا عطر پیش کیا ہے۔ قیمت عہ

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔

کافوری جنتری ۱۹۲۵ء کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کے کارخانہ کی بہ مفید و کارآمد جنتری
اعلیٰ درجے کے چکنے کاغذ پر چھپی ہے اور درخواست پر مفت بھیجی جاتی ہے

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی

مقوی باہ کی گولیاں

۱۵ برس سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو رہی ہیں۔ طاقت دینے والی مشہور دوائیں فاسفورس ڈٹلینا و ڈمیانہ ملا کر گولیاں بنی ہیں اسلیے مغز پٹھے رگ اور خون کو طاقت دینے کا خاص دعویٰ رکھتی ہیں۔ زیادہ محنت جوانی کی خرابی و بے اعتدالی خواہ کسی وجہ سے ہو ان گولیوں کے استعمال سے اول ہی روز سے فائدہ ظہور میں آتا ہے۔ بدن میں قوت مزاج میں گرمی معلوم ہونے لگتی ہے۔ چہرہ پر رونق جوانی میں ضعیفی کی سی حالت ٹوٹے ہوئے جسم میں دوبارہ جوش لاتی ہے۔
قیمت ۳۰ گولیوں کی شیشی ایک روپیہ چار آنہ (عہ) محصولڈاک ایک سے دو شیشی تک چھ آنہ (۶/)

مکردھج یعنی خالص سونے کا کشتہ

مریض اور تندرست دونوں کیلیے یکساں مفید۔ کون ہے جو سونے کے کشتہ کے فوائد سے واقف نہیں فقط حکیم اور وید ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے ڈاکٹر بھی اسکے مداح ہیں۔ یہ سونے کا کشتہ خاص ہمارے کیمیا خانہ میں تیار کیا گیا ہے اور احتلام۔ دمہ۔ بدہضمی و دیگر امراض کیلیے نہایت ہی مفید ہے قیمت سات خوراک کی ایک روپیہ (عہ) محصولڈاک سات خوراک سے ۲۱ خوراک تک چھ آنہ (۶/)

دمہ کی دوا

یوں تو کوئی بھی ایسا مرض نہیں جسکی تکلیف سے مریض نالاں و پریشان نہ ہو لیکن افسوس بدقسمتی سے دمہ کے مریض خاصکر ناقابل برداشت تکلیف۔ دمہ سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں اور راتدن سانس پھولنے کی وجہ سے دم نکلے جاتے ہیں اور نیند تک حرام ہو جاتی ہے دیکھیے آج انکو کسقدر تکلیف ہے۔ لیکن افسوس کہ اسکا علاج مرض کی بازاری دوا جو زیادہ تر نشیلی اشیا و دھتورہ بھنگ۔ بلادونا۔ پوٹاس اور ڈاٹورا دیکر بنتی ہیں۔ اس سے فائدہ ہونا تو درکنار مریض بے موت مارا جاتا ہے۔
ڈاکٹر ایس کے برمن کی کیمیائی اصول سے بنی ہوئی دمہ کی دوا ایک انمول جوہر ہے یہ صرف ہماری ہی آزمائی ہوئی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مریض اس سے شفا پاکر اسکے مداح ہیں۔ آپنے بہت کچھ خرچ کیا ہوگا لیکن ایک مرتبہ اسے بھی آزما کر دیکھیے اسمیں کسی قسم کا نقصان نہیں ہے
قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) محصولڈاک چھ آنہ (۶/) اس دوا کے دو خاص فوائد ہیں (۱) اول ہی خوراک میں دمہ دبتا ہے (۲) کچھ روز کے برابر استعمال سے جڑ سے جاتا رہتا ہے اور جبتک استعمال میں ہے دورہ نہیں ہوتا

ڈاکٹر ایس کے برمن — پوسٹ بکس ۵۴۴ — تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ۔ ڈاکٹر گنگارام جیٹلی۔ چوک۔ لکھنؤ

مطبوعات جدیدہ

سیر انصار (حصہ اول)

جب حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مکہ کے صحابہ جنھوں نے حضور کے ساتھ ہجرت کی مہاجرین کہلانے لگے اور مدینہ کے صحابہ کو انصار کا لقب ملا۔ انھیں حضرات کرام کی سوانحعمریوں کا ذخیرہ اس کتاب میں فراہم کیا گیا ہے جو حال ہی میں دار المصنفین کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ قیمت [illegible]

تاریخ الحرمین شریفین

(از مولانا عبد السلام ندوی)

جس میں مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے تاریخی حالات، اہل مکہ و اہل مدینہ کے اخلاق و عادات اور خانہ کعبہ، مسجد نبوی، حج، قربانی، حجر اسود وغیرہ کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ایک رنگین اور بہت سی علمی تصاویر اور ایک رنگین اور متعدد سادہ نقشے دیے گئے ہیں۔ جنکی مدد سے گھر بیٹھے حرمین شریفین کا پورا حال سمجھ میں آجائیگا۔ قیمت [illegible]

فطرت نسوانی

یہ ایک فرانسیسی کتاب کی تلخیص ہے عربی ترجمہ کے ذریعہ سے۔ جس میں فلسفیانہ طور پر عورت کی اخلاقی، معاشرتی اور ذہنی تاریخ بیان کی گئی ہے اور مرد اور عورت کی فطرت و اخلاق کا فلسفیانہ موازنہ کیا گیا ہے۔ از مولانا عبد السلام ندوی۔ قیمت [illegible]

گلِ رعنا

یعنی جناب مولانا حکیم سید عبد الحی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلما کا قابل دید تذکرہ شعرائے اردو جس میں اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اسکی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے باکمال شعرائے اردو کے صحیح حالات اور انکے منتخب اشعار، اور انکے ہر قسم کے کلام کا نمونہ درج ہے۔ اور حال ہی میں دار المصنفین نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ حجم ۵۴۸ صفحے۔ قیمت [illegible]

دیوان مجروح

میر مہدی مجروح شاگرد رشید مرزا غالب کا دیوان جو عرصہ سے نایاب تھا اب چھپ گیا ہے۔ جلد اصحاب ذوق منگالیں۔ قیمت [illegible]

دیوان بشیر

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی خلف اکبر شمس العلما مولوی نذیر احمد مرحوم کا دیوان۔ جس میں غزلیات اور جدید قسم کی نظمیں دونوں ہیں۔ قیمت [illegible]

شفیع محشر

جناب مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی نے مناقب ائمہ میں جو قصائد لکھے ہیں ان کا مجموعہ ہے۔ قیمت [illegible]

المشتہر مینجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔

حضرت "چلبی" کا تبصرہ

اخبار "سچ"

اگر یہ صحیح ہے، کہ مسلمانوں کی اسوقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے، کہ زندگی کے ہر شعبہ میں مسالک اسلام کی جانب انکی رہنمائی کیجاتی رہے، تو یہ بھی ضروری ہے، کہ یہ دعوت انکے سامنے دلنشیں پیرایہ میں باربار پیش ہوتی رہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھکر سال رواں کے آغاز سے ہفتہ وار اخبار سچ دفتر الناظر سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ اصلی و بنیادی مقصد صرف اسقدر ہے کہ دین و دنیا، اخلاق و معاشرت، تمدن و سیاست غرض ہر شعبہ میں مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات پر متوجہ کیا جائے، فرقہ وارانہ آمیزشوں اور زیادتیوں سے الگ ہوکر اسلام کو اسکی سادہ، خالص، و بے آمیز صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، اور روزانہ واقعات کی مدد سے اسلام و نظام اسلامی کا، تمام نوع انسانی کے لیے سراسر برکت و رحمت ہونا سب پر روشن کر دیا جائے۔ پرچہ کی زبان قصداً نہایت سلیس، سنجیدہ، و عام فہم رکھی گئی ہے، تاکہ ہر طبقہ آسانی سے سمجھ سکے، اور اسکا خاص اہتمام رکھا گیا ہے، کہ حتی الامکان کسی خاص شخص یا فریق کی دلآزاری نہ ہونے پائے۔

اسلامی زندگی کی ترویج میں اسوقت عملاً سب سے بڑا سنگ راہ ملک کا محکوم و غلام ہونا ہے، اور وہ بھی ایسی حکومت کے پنجہ میں ہونا جو ہر ہر جزئیہ میں اپنے قانون کو خدا کے قانون پر مقدم سمجھتی ہے، اور جسکے قانون میں خدا کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر چلنا بغاوت کے مرادف ہے۔ اسی بنا پر قدرۃً سچ کا دوسرا مقصد، اسلامیت کی راہ سے اس سنگ گراں کو دور کرنا، اور آزادی ملک کی تبلیغ کرنا ہے۔ پھر ملکی آزادی کا حصول بغیر اتحاد ملک کے ممکن نہیں، اور اسلام یوں بھی ہمسایوں سے صلح و آشتی اور حسن سلوک قائم رکھنے کی تاکید کرتا ہے، اسلیے لامحالہ تمام اقوام ہند میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، تیسرا مقصد قرار پایا۔ یہ تینوں مقاصد (جو دراصل ایک ہی مقصد، ترویج احکام اسلامی کی تین مختلف صورتیں ہیں) لیکر سچ خدا کے فضل و کرم پر بھروسہ کرکے دنیا کے سامنے نمودار ہوا ہے۔ خدا ہم سب کو سچ بولنے اور سچ کے سننے اور قبول کرنے کی توفیق عطا کرے۔"

سچ کا سالانہ چندہ تین روپیہ (۳ر) بذریعہ منی آرڈر بھیجنا چاہیے۔ وی پی نہ بھیجا جائیگا۔

خادم

ظفر الملک مہتمم "سچ" لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۴ جلد ۲۸ — فروری سنہ ۱۹۲۵ء

فیہ مافیہ

(از خامہ: چلبی)

دو بھائیوں کی والدہ قرآن میں

کسی پچھلے نمبر میں، انھیں اوراق میں بیان ہو چکا ہے کہ خدائے حکیم و عزیز نے ایک مرتبہ ایک مظلوم و محکوم قوم کو ایک زبردست و ظالم متمدن حکومت کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کے لیے "دو بھائیوں" کو مبعوث کیا تھا، اور اُن دونوں برادران محترم کو شرف نبوت و رسالت سے سرفراز کیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے حالات و خصوصیات کی تفصیل قرآن پاک ہی کی زبان میں اُس نمبر میں گذر چکی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک نے ایک اور برگزیدہ ہستی، یعنی ان برادران محترم علیہما الصلوٰۃ والسلام کی والدۂ ماجدہ کا ——— اور یہ خیال رہے کہ والدین کا نہیں، صرف والدہ کا ——— تذکرہ بھی فرمایا ہے، جس سے اس امر کا واضح اشارہ نکلتا ہے، کہ اُن خاتون محترم کا بھی اپنے فرزندان جلیل کے مقصدِ بعثت (مشن) سے کوئی خاص تعلق، تھا۔

ان خاتون کا شرف و احترام محض اس بنا پر نہیں، کہ وہ دو پیامبران برحق کی والدۂ ماجدہ، دو سچے علمبرداران حریت کی مادر مہربان، اور دو پاکیزہ رہبران ملت کی پیدا کرنے والی اور پرورش کرنے والی

تھیں، بلکہ خود بھی ذاتی طور پر وحیِ الٰہی سے مشرف ہو چکی تھیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ جب خود مہبطِ وحی و الہام ہوئے، تو انھیں یاد دلایا گیا، کہ

اِذْ اَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّکَ مَا یُوْحٰی (طٰہٰ - ع ۲)	اے موسیٰ جب ہمنے تمھاری والدہ کی طرف وہ وحی بھیجی، جو ہمیں بھیجنا تھی۔

اور پھر کلام پاک میں ایک دوسرے موقع پر بھی اسی انعامِ الٰہی کو یاد دلایا گیا ہے،

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْہِ (قصص ع ۱)	ہم نے موسیٰ کی والدہ کی جانب وحی بھیجی کہ انھیں دودھ پلاؤ۔

باپ اور بیٹے دونوں شرفِ رسالت سے ممتاز ہوں، اس کی متعدد مثالیں کلام مجید میں ملتی ہیں، لیکن ماں اور اولاد دونوں براہِ راست وحیِ الٰہی سے مشرف ہوں، یہ فضیلت انھیں دونوں بھائیوں اور انکی والدہ کے نصیب میں آئی۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔ صلوٰۃ و سلام ایسی مبارک اولاد پر، اور رحمت و برکت نازل ہو ایسی محترم ماں پر۔

پُر قوت و متمدن گورنمنٹ نے قانون نافذ کر دیا، کہ مظلوم و محکوم قوم بنی اسرائیل کا کوئی لڑکا جینے پائے، یہ الفاظِ توریت،

"فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کرکے کہا، کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو، اُسے دریا میں ڈال دو"

(کتاب خروج: باب اول)

سرکار عظمت مدار کے اقبال کا مقابلہ بکیس و بے بس رعایا بیچاری کیا کر سکتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر گھر کے چراغ روشن ہوتے ہی پھونک مار مار کر گُل کیے جانے لگے، ہر کلی کھلتے ہی باغبان کے قلم سے نوچ ڈالی جانے لگی، کہ عین اسی اثنا میں حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی۔ بچہ کیسا ہی ہو، اپنی ماں کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے، کون ماں ہے، جو اپنے ہاتھ سے اُسکی زندگی کا خاتمہ کر سکتی ہے، چہ جائیکہ وہ بچہ جس پر شاہدِ ازل نے خود اپنے

وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ (طٰہٰ - ع ۲)	محبوبیت کا پرتو ڈال کر اسکی محبوبیت میں چار چاند لگا دیے ہوں

اسنا بھری ماں کا دل تلملایا، بدن تھرتھرایا، کلیجہ کپکپایا، کہ بھری ہوئی گود کو ظالم حکومت کے خوف سے ابھی خالی کرنا پڑے گا۔ سکینتِ الٰہی نے مگر ڈھارس بندھائی، اور زبانِ وحی نے فرمایا، کہ گھبراؤ

فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَادُّوْہُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ	نہیں، بے خوف و خطر موجِ بحر کے سپرد کرو، پھر ہماری قدرت کا تماشہ دیکھو، کہ ہم اسے دوبارہ تم تک لائیں گے اور

(قصص ، ع ۱)　　اس بچہ کو آزادی قوم کے لیے پیمبر بنا کر بھیجنا منظور رہے!

بڑے سخت امتحان کا وقت، بڑی نازک آزمائش کی گھڑی تھی۔ اولاد، معصوم اولاد، اور پھر ایسی منموہن اور دلکش اولاد، کون ماں، خون اور گوشت کا دل رکھ کر، صبر و ضبط کے ساتھ اس حکم کی تعمیل کر سکتی تھی؟ لیکن جس ہستی میں یہ حکم دینے کی طاقت تھی اُسی میں یہ قدرت بھی تھی کہ ماں کے دل کو موم سے پتھر، اور بجائے مضغۂ گوشت کے پنجۂ فولاد بنا دے۔ چنانچہ توفیق الٰہی معین ہوئی، اور ماں نے ارشاد خداوندی کی تعمیل میں، اپنے جیتے جاگتے، کلیجہ کے ٹکڑے، کو آغوش دریا کے سپرد کر دیا!!

و اصبح فواد ام موسیٰ فرغاً ان کادت لتبدی به لولا ان ربطنا علیٰ قلبها لتکون من المومنین (قصص ، ع ۱)

اپنے ضوابط و قوانین پر مغرور، اپنی حکمت و دانائی پر نازاں، اور اپنی قوت و اقبال پر فخر کرنے والا، فرعون یہ نہ سمجھ سکا، کہ اُسکے سارے مصاحبوں اور درباریوں، وزیروں اور مشیروں، کیبنٹ اور کونسل سے کہیں بڑھ چڑھ کر، قدرت والی، حکمت والی، اقبال والی، ایک اور برتر ہستی موجود ہے، جسے یہ منظور تھا، کہ رہزن سے رہنما کا، گرگ سے پاسبان کا، زہر سے تریاق کا، دشمن سے دوست کا، اور فرعون سے موسیٰ کی پرورش و پرداخت کا کام لیا جائے! چنانچہ خود فرعون اور فرعونیوں ہی نے اس بظاہر بےکس و بے بس بچہ کو موج دریا سے نکال کر اپنے آغوش شفقت میں تربیت دی۔ اور اس وقت ان "عاقل و فرزانہ" "خوش اقبال" "مدبرین سلطنت" کی عقلوں پر ایسے گہرے پردے پڑ گئے، کہ اپنے آیندہ دشمن شدید کو اپنے ہی سایۂ عاطفت میں پروان چڑھاتے رہے! اور یہ عقل پر پردے پڑ جانا صاف اُنھیں کے شامت عمل اور خدا فراموشی کا نتیجہ تھا!

یا خذه عدو لی و عدو له (طٰه - ع ۲)

فالتقطه آل فرعون لیکون لهم عدواً و حزناً، ان فرعون و هامان و جنودهما کانوا خاطئین (قصص ع ۱)

اور یہی نہیں، کہ اُس وقت کی شامت زدہ گورنمنٹ اپنے دشمن کو دشمن نہ سمجھ سکی، بلکہ سب کے سب مل کر اُلٹی یہ اُمیدیں قائم کرنے لگے، کہ آگے چل کر اس سے بہت کچھ فائدے حاصل ہوں گے، اور جوان ہو کر یہ ہماری قوت بازو بنے گا۔ یہ تھی اُن "داناؤں" کی "نادانی"۔

عسیٰ ان ینفعنا او نتخذه ولداً و هم لا یشعرون (قصص - ع ۱)

چند روز کے بعد بالآخر وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہا، ماں کو جو تشفی دی گئی تھی، وہ سچی نکلی۔ خالی گود ایکبار پھر بھری۔ ماں اپنے بچھڑے ہوئے نورِ دیدہ سے ملی! اپنے کلیجہ کو ٹھنڈا کیا۔ آنکھوں کو طراوت پہونچائی، اور بیٹے کو پروان چڑھتے۔ صابر و خوش نصیب ماں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا! فردونہ الی امہ کے تقر عینہا ولا تحزن ولتعلم ان وعد اللہ حق ولاکن اکثرہم لا یعلمون۔ (قصص ع ۱)

دو بھائیوں کی والدہ ہندوستان میں

ان محترم ماں کے واقعات و حالات ہم نے اپنے کانوں سے سنے اور ان پر ہمارا ایمان قائم ہوا۔ ایک اور بزرگ ماں کے حالات و واقعات ہم نے حال میں آنکھوں سے مشاہدہ کیے، اور ہمارے ایمان کو مزید تقویت و تازگی حاصل ہوئی۔ قرآن کے دو بھائیوں کی والدہ کے نام کی صراحت کے بجائے خدا نے "اُم موسیٰ" ہی کے لقب سے یاد کیا۔ ہندوستان کے دو بھائیوں کی والدہ کو بھی دنیا نے "بی اماں" ہی کے لقب سے پکارا۔ وہاں وحی الٰہی سے سرفرازی ہوئی، یہاں خدا نے ورع و تقویٰ کی فضیلت بخشی۔ پیمبران مرسل کی والدۂ ماجدہ کے شرف و احترام کی تھاہ کون پا سکتا ہے امت محمدیہ کی اس خادمہ کا یہ کمال اس دورِ تنزل میں دیکھا، کہ پچاس سال سے نماز فجر، سفر حضر، بیماری، شب بیداری، کسی حال میں نہ قضا ہونے دی! اُم موسیٰ کی اولاد غرقِ دریا ہوجانے کے بعد پیام حق پہونچانے کے لیے زندہ و سلامت رہی۔ "بی اماں" کی اولاد بھی مادیت و عقلیت کے بڑے بڑے سمندروں میں غوطہ کھانے کے بعد خدمت اسلام کے کام پر مستعد رہی۔ اُم موسیٰ (علیہما الصلوۃ والسلام) کے فرزندوں کو خدائے جلیل نے اس سفارت کے لیے چن لیا تھا، کہ ایک بڑی انسانی آبادی کو مخلوق کی غلامی سے آزادی دلاکر خالق کی غلامی میں لائیں۔ بی اماں کے دونوں فرزند بھی آج اسی اسوۂ موسوی و ہارونی کو اپنے لیے دلیلِ راہ بنائے ہوئے ہیں! اُم موسیٰ کے فرزندانِ محترم کا مشن جس حد تک کامیاب رہا، اُس کا نتیجہ اوراقِ لیل و نہار پر ثبت ہے، بی اماں کے فرزندوں کے مشن کا انجام لوحِ غیب میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، اُسے بھی ہر صاحب بصیرت پڑھ سکتا ہے۔

مبارک ہیں وہ بندگان الٰہی جنھیں کسی نبی مرسل کے آثار قدم پر چلنے کی سعادت نصیب ہو، اور مبارک ہیں وہ کلمہ گو جو اپنی روزانہ زندگی کے لیے ہر بصیرت و ہدایت "کلام مبین" ہی سے تلاش کریں!

عدل نوشیروانی سے بڑھ کر

تانجور (علاقہ مدراس) سے خبر آئی ہے، کہ ریلوے اسٹیشن پر چوکتا بون اد

اخبارات کی دوکان ہوتی ہے، اُس پہ ایک "صاحب" ڈاکٹر سینسن تشریف لائے، اور دو آنہ کی قیمت کا ایک اخبار خرید کر ایک چونی مرحمت فرمائی۔ ہندوستانی دُکاندار زمین پر بیٹھا ہوا خود اخبار پڑھنے میں مشغول تھا، جیب میں واپسی کے لیے دو آنے پیسے تلاش کرنے لگا، اور اس تلاش میں دو منٹ اور پانچ منٹ کے درمیان کوئی مدت صرف ہوگئی۔ "صاحب" ایک ہندوستانی دُکاندار کی اس بدتمیزی سے کیونکر درگزر فرماسکتے تھے، معاً اپنے دست مبارک سے اُسکی گوشمالی شروع فرمادی۔ دُکاندار نے عدالت میں نالش دائر کی۔ انگریز حاکم نے یہ ارشاد فرما کر دعویٰ خارج کردیا، کہ دُکاندار کو اُسکے فرائض پر متوجہ کرنے کے لیے مشغول خریدار کا یہ فعل بالکل حق بجانب" تھا۔!

مجسٹریٹ بہادر کی یہ معدلت پروری" قانون بجانب" یقیناً ہوگی، البتہ بعض جاہل دریافت یہ کررہے ہیں، کہ آیا فرائض پر توجہ دلانے کے اس "حق بجانب" طریقہ کا اطلاق صرف ہندوستانی دکانداروں کے کانوں اور انگریز گاہکوں کے ہاتھوں تک محدود رہے گا، یا حکام والا مقام اور سرکار فیض آثار کو بھی کبھی اسی "جائز" طریقہ سے احساس فرائض پر توجہ دلائی جاسکتی ہے؟

کنھیا جی بندرابن میں! سری کرشن جی ہندوستان کے ایک نامور ہادی ورہبر گذرے ہیں، اور اس لیے نہ صرف ہندوؤں کے بلکہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک واجب التعظیم بزرگ ہیں، لیکن عوام ہنود نے اپنی جہالت سے اُنکے متعلق جو روایات کثرت سے مشہور کررکھی ہیں، اُن سے یہ تصویر ذہن میں آتی ہے، کہ بندرابن کے گھنے باغوں اور سبزہ زاروں میں ایک خوش رو نوجوان خرام نازمیں مصروف ہے، سیکڑوں حسین عورتیں اُسکے حُسن صورت پر دیوانی ہوکر اُسے اپنی طرف پرچا رہی ہیں، جن میں سب سے زیادہ خوش نصیب کامیاب رادھا جی ہیں، اور کنھیا جی گویا اس پرستان کے راجہ اندر ہیں!

یہ "ضعیف الاعتقادی" کا ایک "افسانہ" تھا، لیکن اسے کیا کیجیے، کہ "روشن خیالی" کے مرکز نے "افسانہ" کو "واقعہ" کر دکھایا۔ راویان صداقت شعار و ناقلان دیانت آثار کا بیان ہے، کہ ۲۶- جنوری ۱۹۲۵ء کو مشتاقان وصال و شیدائیان جمال کی ہزارہا دعاؤں اور بیشمار التجاؤں کے بعد، سروبوستان خوبی، گل گلشن محبوبی، سرورو لبیران سرآمد گلرخاں، یوسف ثانی، نوریزدانی، لارڈ ریڈنگ نے سرزمین علیگڈھ پر قدم رنجہ فرمایا؛ اور ساڑھے دس بجے دن سے ایک بجے دن تک، ڈھائی گھنٹے کی طویل مدت تک اس خوش نصیب خطۂ ارض کو رشک فردوس و جناں بنائے رکھا! پڑوس کے اہل جامعہ وعدۂ فردا کے انتظار ہی میں رہے،

اور یہاں عیش امروز حاصل ہو کر رہا۔ کیسی ہمایوں و مبارک تھی ۲۶ - جنوری کی تاریخ سعید، کہ افق علیگڈھ پر اُس روز بجائے ایک کے دو آفتاب طلوع ہوئے! اور کیسی فرخ و فرخندہ فال تھی اس مبارک تاریخ کی مبارک دوپہر، کہ عین نماز ظہر کے وقت ایک زندہ قبلۂ مقصود کی جانب پیشانیاں خم، لب مشغولِ مدح و ثنا، اور زبانیں سرگرم التجا و دعا رہیں! خسرو غریب نے انتہائی بلند پروازی سے کام لیکر ایک "کجکلاہ" کو اپنا "قبلہ" فرض کیا تھا، اُسے کیا خبر تھی، کہ پانچ سو سال بعد علیگڈھ کے شاعر مزاج، رنگیں طبع، و تخئیل پرست نہیں، بلکہ سنجیدہ و متین، بزرگان قوم کسی "کج کلاہ" کے بجائے ایک "صاحب ہیٹ" کو اپنا قبلۂ مقصود تسلیم فرمائیں گے!

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے!

نامحرمان طریق محبت و ناآشنایان آئین الفت، ممکن ہے، زبان طعن کھول بیٹھیں، کہ اس قدر طویل انتظار، اس قدر شدید اشتیاق، اور اس والہانہ جوش و بیتابی کے مظاہرہ کے بعد کسی سرو رعنا کا صرف ڈھائی گھنٹے کے لیے حدودِ علیگڈھ میں بسر کرنا، کیسی بیدردی و جفا پسندی تھی! لیکن کوئی محرمان اسرار و خلوتیان راز کے دلوں سے پوچھے کہ ڈھائی گھنٹے اور ڈھائی گھڑی کا سوال تو الگ رہا، ایک منٹ بلکہ ایک لمحہ کی نگاہِ ناز، روئے نگار کی ایک مسکراہٹ، عاشق صادق کی نظر میں کیا قیمت رکھتی ہے! یونیورسٹی کے سرکاری پرچہ کا بیان ہے، کہ جس وقت والیسرائے بہادر نے اسٹریچی ہال میں قدم رکھا، تو

"حاضرین کا اُسوقت کا جوش قابل دید تھا، جو بجائے خود اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہا۔"

کالج و متعلقات کالج کی سرزمین کو ہفتوں پیشتر سے جس شاندار طریق پر آراستہ کیا گیا تھا، اس "فراخ حال پیمانہ پر آرایش" "سدا بہار پھول پتیوں" اور "اعلیٰ درجہ کے زریں ساز و سامان" کی تفصیل کس کے قلم میں یارا ہے، جو بیان کر سکے، بہ قول یونیورسٹی گزٹ کے یہ کیفیت

"صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔"

اور اس سارے ساز و سامان سے، جس نے علیگڈھ کی زمین کو رشک آسمان بنا دیا تھا، کہیں بڑھ کر، اور کہیں زیادہ قابل دید،

"وہ مطمئن و مسرور مجمع تھا، جو علیگڈھ میں خدا کے فضل و کرم سے سالہا سال بعد جمع ہوا۔"

چند خوش نصیب ہستیوں نے اسٹیشن ہی پر شرف استقبال حاصل کیا۔ ممبران کورٹ کو یہ شرف کالج کے ایک دروازہ پر حاصل ہوا، اور پھر ارکان اسٹاف کو کالج کے اندر۔ غرض مختلف مواقع پر رسم تعارف

ادا ہوئی، وائسرائے بہادر نے سرسید کورٹ کا معاینہ فرمایا، سائنس لیبوریٹری دیکھی، لائبریری کو ملاحظہ فرمایا، سرسید کے مقبرہ اور مسجد کی زیارت کی، اسکے بعد ہال میں پہلے آیات قرآنی کی تلاوت ہوئی۔ پھر بیگم صاحبہ بھوپال نے اُردو ایڈریس پڑھا، اسکے بعد صاحبزادہ نے انگریزی ایڈریس سُنایا۔ اسکا جواب وائسرائے بہادر نے مرحمت فرمایا۔

یہ سارے مراتب ڈھائی گھنٹے سے کم کی مدت میں، جس برق رفتاری کے ساتھ طے ہوگئے، اسکے بعد علیگڈھ کی اس سرکاری زبان کو جھٹلانے کی کون جرأت کرسکتا ہے کہ

"اس طرح وہ مبارک تقریب بہ خیر و خوبی اختتام کو پہنچی، جس کا ہفتوں اور مہینوں سے انتظار تھا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہز اکسلنسی کی تشریف آوری نے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا ہے"

سُنا ہے کہ بعض مسن و معمر بزرگانِ قوم و حاملینِ روایات خلوص و وفا، جنھوں نے مدت سے کالج یونیورسٹی کی جانب رُخ نہیں کیا تھا، ابکی اسی شدید سردی میں دُور دُور سے زحمت سفر گوارا فرمائی، اور نادان و حقیقت فراموش دنیا پر ثابت کردیا، کہ جنکے قلوب میں خلوص و نیاز کی انگیٹھیاں گرم رہتی ہیں، اور جنکے سینے نالہائے آتشیں اور آہ شرربار کے تنور ہوتے ہیں، اُنھیں موسم کی سردی سے بالکل بے نیازی حاصل ہوجاتی ہے! یہ نہ معلوم ہوسکا، کہ گویوں کے اس جھرمٹ میں رادھا کا پارٹ کس خوش نصیب ہستی کے حصہ میں آیا!

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی!

ہمارے حکام والامقام کے ارشادات عالیہ محض اسلیے ہوتے ہیں، کہ انسان ہمہ تن گوش ہوکر اُنھیں سُن لے، باقی اگر اسکے بعد وہ اپنے "حیوان ناطق" ہونے کا ثبوت دینا چاہتا ہے، تو یقیناً وہ انسان نہیں! اس اصول موضوعہ کے مسلم ہوجانے کے بعد کس کی مجال ہے، جو وائسرائے بہادر کے مقالۂ علیگڈھ پر کچھ لب کشائی کرسکے، لیکن سرکاری انسانیت کے دائرہ سے باہر نکل کر تو جناب وائسرائے کے حسن تقریر و کمال بلاغت کی داد چند لفظوں میں دی جاسکتی ہے۔ بھولے وائس چانسلر نے اپنے ایڈریس میں کچھ ذکر یونیورسٹی کی موجودہ ضروریات (لائبریری، میوزیم، وغیرہ) کا کیا تھا۔ وائسرائے کے ارشاد گرامی کا کمال یہ ہے، کہ اس قسم کی ساری ضروریات کو اپنے جواب میں سرے سے نظر انداز فرمادیا ہے، اور تفصیل نہ سہی اجمالاً چند لفظ بھی ان چیزوں کے متعلق زبان مبارک سے صادر نہیں ہوئے! بلکہ دُرفشانی کا سارا زور اُسی بحث عزیز و دلچسپ پر ہے، جس نے چانسلر اور وائس چانسلر دونوں کے ایڈریس تقریباً خالی تھے۔

یعنی علیگڈھ کی گذشتہ زندگی کے خطرات اور ان میں بھی خصوصاً تارکین موالات کا حملہ ۱۹۲۰ء میں!

ملک معظم کے اس جوانمرد و جواں ہمت نائب السلطنت کو معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ علیگڈھ کے سارے تعلیمی شاہنامہ میں لے دے کے

"منیژہ منم دخت افراسیاب"

ہی ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے، اور اس نے عین اُسوقت جب مسلمانوں کے بچھڑے ہوئے گروہوں میں رفع اختلافات و یگانگی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ملک معظم کی رعایا کے دو گروہوں کے درمیان ہویا نہ ہو لیکن ملک الملوک کے پرستاروں کے دو گروہوں کے درمیان نفاق و تفرقہ ڈالنے کی انتہائی کوشش کر ڈالی! ممکن ہے کہ تعزیرات ہند میں یہ کوئی جرم نہ ہو لیکن خدائے حی و قیوم کے ضابطہ تعزیرات میں وائسرائے ہند اور کالج کی مسجد کے موذن سب برابر ہیں۔ آج اگر نہیں، تو کل یقیناً یہ ظاہر ہو کر رہیگا کہ مصلحین بہت کون تھے، اور مفسدین و فتنہ پرداز کون؟

واذا قیل لہم لاتفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون۔ الا انہم ہم المفسدون ولکن لا یشعرون (بقرہ-۲)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے، کہ خدا کی زمین کو اپنی فتنہ پردازیوں کا تختۂ مشق نہ بناؤ، تو کہتے ہیں، کہ فتنہ کیسا، ہم تو امن و آئین کو قائم و برقرار رکھنے والے ہیں! سو جی! حقیقی فتنہ پردازیہی لوگ ہیں، اور انھیں اپنی اس مفسدہ پردازی کا احساس تک نہیں ہوتا!

میکڈانل اور ہیوٹ لارڈ ریڈنگ کس قدر درومندی اور دلسوزی کی اوا کے ساتھ کالج کی پچھلی زندگی کے بعض "نہایت زبردست خطرات" کا ذکر فرماتے ہیں، اور ایک "نہایت زبردست حملہ" کی بالکل بے محل اور بلا ضرورت یاد دلاتے ہیں لیکن انھیں یاد نہیں رہا کہ سب سے زیادہ "خطرناک حملہ" یہ نہ تھا، بلکہ وہ تھا جو آج سے پچیس سال قبل نواب محسن الملک مرحوم کے زمانہ میں محض اس قصور پر ہوا تھا کہ کالج کے سکرٹری نے "اردو ہندی" کی سیاسی شورش میں کیوں حصہ لیا۔ اُسوقت کے حملہ آور کا نام لارڈ ریڈنگ ممکن ہے بھول جانا قرین مصلحت سمجھیں، لیکن مسلمانوں کا حافظہ بقدر ضعیف نہیں کہ سر انٹنی میکڈانل (حاکم صوبہ متحدہ) کا اسم گرامی اُس سے محو ہو جائے! پھر ایک دوسرے زبردست و خطرناک حملہ آور کا نام بھی گو لارڈ ریڈنگ کو فراموش ہوگیا ہو مگر از کم موجودہ "اُس چانسلر" کو تو بہر حال فراموش نہیں ہو سکتا، "سرجان ہیوٹ" (حاکم صوبہ متحدہ) کا اسم مبارک ہے، جو آج سے ۱۹۱۵ء ۱۰ سال قبل علیگڈھ اور ہوا خواہان علیگڈھ کیلئے کسقدر سخت و زبردست خطرہ تھے۔ وہ زمانہ قریب آرہا ہے جب خود مسلم یونیورسٹی کے اہل حل وعقد کو دوست دشمن اپنے اور بیگانے کے درمیان صحیح شناخت ہو جائیگی، اُسوقت نظر آئیگا کہ با کہ باختہ عشق در شب دیجور!

مولانا آزاد کی تحقیق و تدقیق

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ابھی سیر المصنفین کی جلد اول ہی شایع ہوئی ہے اور جلد دوم کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی کہ نکتہ چینی کا بازار گرم ہوگیا۔ اور میرا تو یہ خیال ہوتا ہے کہ مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی نے الناظر بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۲۴ء ہی کو دیکھ کر میری ناچیز تصنیف یا تالیف کی طرف عنانِ توجہ منعطف فرمائی ہے۔ بہر حال مجھے سب سے پہلے مولوی صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ وہ سیر المصنفین کو غلطیوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں اور اپنے مفید مشوروں سے مجھے استفادہ حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

اول میں آزاد کے متعلق جو کچھ میں نے انکے حالات کے تحت میں لکھا ہے اپنی کتاب سے نقل کرکے اُنکو پیش کرتا ہوں بعد ازاں اپنے مزید خیالات کا اظہار کروں گا۔

مشاعروں کی شرکت

"آپ کو اپنے اُستاد کی بدولت اکثر نامی گرامی اشخاص سے ملنے جُلنے کا موقع ملا۔ اور بعض لوگوں کے مشاعروں میں شرکت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ اُنکو کمال حاصل ہوا وہ حضرت ذوق کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا۔ آزاد جو کچھ اپنے اُستاد سے سُنتے تھے یا اُنکی صحبت میں دوسرے بزرگوں کی زبان فیض ترجمان سے ادا ہوتا تھا اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتے جاتے تھے۔ جب ہنگامۂ غدر کا خاتمہ ہوا اور آزاد کو اطمینان نصیب ہوا تو لاہور میں بیٹھکر بفراغت تمام اگلی پچھلی باتوں کو از سر نو یاد کیا اور اُن صحبتوں کو صفحۂ قرطاس پر دوہرایا۔ کچھ آپ بیتی تھی، کچھ جگ بیتی، غرض وہ کہانی سنائی کہ جسکو سُنکر ہر کہ و مہ اُسکا والہ و شیفتہ ہوگیا۔ اور دو سو برس سے لیکر اُس وقت تک شعرا کی جتنی محفلیں قائم ہوئیں تھیں اور یہ فلک تفرقہ پرداز اُنکو درہم و برہم کرتا رہا تھا، سب کا نقشہ اِس خوبی سے کھینچکر دکھلا دیا کہ وہ تمام بزرگ چلتی پھرتی تصویروں کی طرح نظر آنے لگے۔ اس مرقع کا نام آب حیات ہے جسنے نہ صرف اگلے جلسوں کو تازہ کر دیا اور اُن مٹی ہوئی صورتوں میں جان ڈالدی بلکہ اپنا نام بھی زندۂ جاوید بنا دیا، اور زمانہ نے اُن بزرگوں کے طفیل میں آزاد کو بھی خلعت بقائے دوام عنایت فرمایا۔"

آگے چل کر ایک موقع پر حسب ذیل عبارت درج ہے :-

اُردو کی ترقی میں آزاد کا حصہ

اُردو پر آزاد کے احسانات عظیم ہیں۔ نہ صرف یہ کہ تمام صوبۂ پنجاب خاص اُردو کی واقفیت کے لیے اُن کا ممنون ہے بلکہ پنجاب کو اُردو سکھانے کے لیے جو تصنیفات و تالیفات اُنھوں نے کیں، اُسوقت اُردو زبان کو اُنکی اشد ضرورت تھی۔ پُرانے سلسلہ میں اُردو کی پہلی دوسری اور تیسری کتابیں، اُردو کا قاعدہ، قصص ہند کا دوسرا حصہ، جامع القواعد اور نئے سلسلہ کی بھی کئی ابتدائی کتابیں لکھیں اور اُنھوں نے ہم کو زندہ فارسی سکھائی، ایران کے روزمرہ کی تعلیم دی۔ جو کچھ اُنھوں نے لکھا، جو محاورات اور روزمرہ اُنھوں نے ہمکو سکھائے وہ قدما کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد اُنکی مروجہ زبان کی ذاتی تحقیق و تلاش کے نتیجے تھے۔ ایران اور تاتار وغیرہ ممالک میں جہاں فارسی بولی جاتی ہے اُنکی سیاحت موجودہ زبان کی تحصیل میں بہت معاون ہوئی۔

[illegible]

محاورہ کی صحت استعمال کا ذکر

دوسری مرتبہ مولانا آزاد جب ایران کے سفر سے واپس آئے تو ایک پشتارہ نوٹوں، سودوں، یادداشت اور تحقیقات کا اپنے ساتھ لائے۔ تقریباً ۱۸۸۶ء میں وہ کتبخانۂ آزاد کی عمارت تعمیر کرا رہے تھے۔ ایک کمرہ بن چکا تھا اور فرط اشتیاق سے اُس میں چند الماریوں کی ترتیب اور خانہ پری میں مصروف تھے۔ اتفاق سے محاورہ کی صحتِ استعمال کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمانے لگے کہ ایک غیر زبان کے محاورہ کو صحیح اور باموقع استعمال کرنا بہت مشکل ہے اور یہ دلچسپ روایت بیان کی کہ ایک دن میں ایران کے ایک صاحب خانہ کا مہمان تھا۔ کھانا پک رہا تھا، ماں دس بارہ برس کی لڑکی کو چولھے کے پاس چھوڑ کر آپ اندر دالان میں کوئی کام کرنے لگی اور لڑکی سے کہتی گئی کہ دیگچی کا خیال رکھے تاکہ کھانا جوش کھا کر اُبل نہ پڑے۔ رفتہ رفتہ آنچ تیز ہوتی گئی۔ اب میں نے سوچا کہ چاول اُبل کر باہر نکل پڑیں گے۔ دیکھوں تو اس کیفیت کو یہ لڑکی کن الفاظ میں ظاہر کرتی ہے۔ اور فرمایا کہ میں اپنی فارسی کی لغات اور زبان دانی کے دفتروں کو اپنے ذہن میں دوہراتا تھا اور اس خیالی کیفیت کے مختلف اظہار گھڑتا تھا کہ شاید یہ کہیگی یہ کہیگی، کہ وہ وقت آپہونچا اور میرے تمام خیالی دفتر خیالی پلاؤ ثابت ہوئے۔ جوں ہی دیگچی میں چاول جوش کھانے سے اُسکا ڈھکنا ایک طرف سے ایک آدھ انچ اوپر کو اُٹھا کہ لڑکی چیخی "اماں اماں دیگچہ سر کردہ" لفظ گویا میرے کانوں میں الہامی کلمہ کی طرح پڑے اور میری آنکھیں کھل گئیں۔

جس شخص کو زباندانی کا یہاں تک مذاق ہو، جو شخص اس قدر نکتہ رس اور صاحب تلاش ہو جس نے

غیر زبانوں کی تحقیق میں اس درجہ کاوش اور کوشش کی ہو وہ خود اپنی زبان میں کیا کچھ نہ کر دکھاتا اور حق الامر یہ ہے کہ اُردو میں آزاد نے وہ کچھ کر دکھایا جسکی اُن جیسے شخص سے توقع کی جا سکتی تھی"۔

دوسرے موقع پر یہ عبارت درج ہے :

آزاد کی تصنیفات پر ایک عام رائے

آزاد کی ہر کتاب میں ایک خاص وصف ہے اور وہ یہ کہ تحقیق و تدقیق کا مادہ اُنکی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہے۔ جو کتاب لکھی ہے نہایت سلیقہ کے ساتھ اور اپنی تلاش اور جستجو کی داد دی ہے۔ زبان جو اختیار کی ہے اُس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ جو شیرینی اور گھلاوٹ اُنکی زبان میں ہے جس قدر اُسکی تعریف کی جائے کم ہے۔ تشبیہات و استعارات بکثرت پائے جاتے ہیں اور ہر ایک اس قرینہ سے سجایا ہے کہ بے اختیار زبان سے سبحان اللہ اور واہ واہ کے نعرے نکل جاتے ہیں۔ اُنکی نظمیں بھی بجائے خود اچھی ہیں لیکن دراصل وہ اقلیم سخن کے بجائے اقلیم نثر کے بادشاہ ہیں اور جو طرزِ خاص اُنکا ہے وہ کسی دوسرے مصنف کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص اُنکی تقلید میں دو چار صفحے لکھدے لیکن کتاب کی کتاب لکھ دینا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ قدرت نے اُنکے انداز تحریر میں وہ دلکشی پیدا کی ہے کہ دوسرے مصنف کو یہ بات مشکل سے نصیب ہوگی۔ البتہ اُن کا قلم جنبہ داری ضرور لیے ہوتا ہے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے معاملات میں بے تعصب سہی اور اکثر صاحب قلم اہل ہنود اسکا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ کے معاملہ میں ضرور اُنھوں نے لکھنؤ کے بعض باکمال اصحاب کو اپنی کتاب آبحیات میں نظر انداز کر دیا ہے۔ مولوی عبد الحلیم شرر نے اپنے ایک مضمون اُردو نظم و نثر میں اسکی سخت شکایت کی ہے، اور ایک حد تک صحیح ہے۔ اسی آبحیات میں آزاد نے اپنے اُستاد ذوق کو کس قدر آسمان پر چڑھایا ہے اور جا و بیجا اُنکی مدح سرائی کی ہے۔ حالانکہ آج زمانہ نے ورق اُلٹ کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہرگز اُس تعریف کے قابل نہ تھے جسکی بوچھار اُن پر کی گئی ہے۔ الحاصل آزاد فن تنقید سے دراصل ناآشنا نہ تھے لیکن اپنے محسن اُستاد کی تعریف میں رطب اللسان ہونا ہی وہ جوہر شرافت جانتے تھے۔ اور یہ نہ سمجھتے تھے کہ اپنے ممدوح کو فرشتہ بنا دینا آسان ضرور ہے لیکن وہ جوہر بشریت سے معرّیٰ ہوا جاتا ہے اور اُسکے تمام محامد اسکو انسانیت سے خارج کیے دیتے ہیں۔

آزاد کو اگر ہم کسی انگریزی مصنف سے تشبیہ دیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے لارڈ میکالے تھے اور اگر اُردو زبان کی بے بضاعتی پر خیال کریں تو بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اُنکی تصنیفات نے اُردو کے خالی خزانہ کو [illegible]

کر دیا۔ اور جب تک یہ زبان اور اسکے بولنے والے قائم رہیں گے "آبِ حیات" دربارِ اکبری اور نیرنگِ خیال زندہ رہیں گی اور اپنی دلفریبیوں سے سب کو اپنا گرویدہ کرتی رہیں گی "

ایک اور موقع پر لکھا ہے۔

آزاد کی بعض کتابوں پر رائے

نیرنگ خیال کی نثر ہزار نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ رنگیں بیانی کا ایک دلفریب مرقع ہے۔ اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا ایک سچتہ کار دستور العمل ہے۔ پند و نصائح کا ایک دفتر ہے۔ استعارے اور تمثیل میں وہ وہ مطلب کی باتیں بتا گئے ہیں کہ پڑھنے والا شستہ خیالات سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کتاب نے اُردو نثر کی نئی طرز قائم کی۔ اگرچہ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس کتاب میں زیادہ تر انگریزی روش کا پرتو ہے۔ جس میں مضمون نویسی کی جدید طرز کا چربہ اُتارا ہے۔

آب حیات طرز بیان، سلاست زبان، شستگیِ الفاظ، برجستگی، بے ساختگی اور روشن خیالی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ تذکرہ تمام تذکروں سے ہر طرح فائق و ممتاز ہے اس لیے کہ محققانہ طریقہ سے ہر ایک شاعر کا حال قلمبند کیا ہے۔ آزاد نے سیدھے سیدھے صاف اور سادہ بیان میں جا بجا رنگینیِ طبع کی ایسی جدولیں کھینچی ہیں کہ واہ وا۔ بعض اوقات وہ سیدھی بات کو پیچدار الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں مگر کیا مقدور کہ پڑھنے والے کو مطلب سمجھنے میں ذرا بھی دقت یا رکاوٹ ہو۔ حضرت آزاد نے اُردو نثر کے باغ میں نئے گل بوٹے لگائے نئی کیاریاں اور نئی روشیں نکالیں اور اسکے بوسیدہ جسم میں نئی روح پھونکی۔ ایجاد اور نوآئینی اسے کہتے ہیں کہ انہدام کے ساتھ تعمیر بھی ہو، سادگی کے ساتھ رنگ آمیزی بھی ہو۔ پر اسنے ملبہ میں ایک اینٹ بھی کام کی ہوئی تو اُٹھائی اور نئے چونے سے نئی عمارت میں چن دی۔ ماضی کی عزت، حال پر شفقت مستقبل کی فکر، یہ طرز عمل اس ادبی مصلح کا رہا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اُردو ادب میں یہ اختراع و اصلاح کرکے مولانا آزاد نے زبان دانان ملک کے لیے ایک شاہراہ بنا دی ہے۔ خواہ کوئی اُس پر چلے یا نہ چلے۔

آزاد نے آب حیات لکھ کر احیائے قدامت کیا ہے، اُردو نثر کو نظم کا ہمپایہ بنا دیا ہے اور اُردو زبان کو تاریخی حیثیت بخشی ہے۔ پہلے شعرا یا نثار کے کلام پر تقریظیں یا تعریفیں ہوتی تھیں۔ آزاد نے کسی قدر تنقید سے بھی کام لیا ہے لیکن جو تنقید کا حق تھا اُسے وہ ادا نہیں کر سکے۔ یا تو اُن بزرگوں کی عزت دل پر اس قدر احاطہ کیے ہوئے تھی (جنکا حال اُنھوں نے قلمبند کیا ہے) کہ کھل کر اُنپر حرف گیری کرنا اُنکے بس میں نہ تھا۔ یا زمانہ ان کڑوی مگر سچی باتوں کے گھونٹ اپنی حلق سے اُتارنے کے لیے آمادہ نہ تھا اور اس لیے

اُنھوں نے استعارات و تشبیہات کی قند ملا کر انکو لوگوں کے گلے سے اُتارا
دربار اکبری بھی اپنی عبارت کی رنگینی کے اعتبار سے اُنکی بہترین تصنیفات میں سے ہے - اگرچہ یہ کتاب وہ خود ترتیب و نظر ثانی کے بعد نہ چھپوا سکے کیونکہ عرصہ سے وہ پیرانہ سالی اور بعض امراض میں مبتلا تھے اور انکے دماغ کی حالت خراب ہوگئی تھی تاہم کتاب کے دلاویز ہونے میں کوئی شک نہیں - دربار اکبری کی عبارت دیکھکر انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کو ضرور لارڈ میکالے کی تاریخ نویسی یاد آجاتی ہے - جو لطف انگریزی میں لارڈ موصوف کی تحریر سے پیدا ہوتا ہے بعینہٖ آزاد کی تحریر اردو میں دل پر وہی اثر کرتی ہے - اور جس طرح لارڈ میکالے کی تاریخ انگلستان ناقابل اعتماد ہے بعینہٖ یہی حال ایک حد تک دربار اکبری کا ہے "
جن جن جملوں پر میں نے لکیر کھینچدی ہے وہ اصل کتاب میں نہیں ہے - میرا خیال ہے کہ مولوی محمد مسلم صاحب اِن جملوں کو خصوصاً ناپسند کریں گے - اِس لیے میں نے اُنکو زیادہ واضح کردیا ہے تاکہ مولوی صاحب کی نظر غائر کو تکلیف نہ اُٹھانی پڑے -
اب سوال یہ ہے کہ "کیا آزاد کی کتابیں تحقیق و تدقیق، درایت، وجدت وغیرہ سے خالی ہیں؟" مولوی صاحب جدت وغیرہ کے تو خود قائل ہیں لہذا اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں - اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ آزاد نے تحقیق و تدقیق اور درایت سے بھی کام لیا ہے یا نہیں؟
مولوی صاحب نے اپنے مضمون میں سخندان فارس کا حوالہ دیا ہے - لہذا پہلے اسی کتاب پر نظر ڈالنی چاہیے - کیا یہ کتاب تحقیق و تدقیق اور درایت سے خالی ہے؟

فارس کی زبان مروجہ میں دوسرا انقلاب

(صفحات ۶۷ - ۶۹)

متن - فارس کی زبان اپنے فرزندوں کے لیے سلیس اور فصیح قالب ڈھال رہی تھی - ایجادی قوتیں خیالات کی ہوا میں پاک روحوں کی طرح اُڑتی پھرتی تھیں اور ظہور کے موقع ڈھونڈتی تھیں - اِس عالم میں ترکان چنگیزی کا قبضہ ملک پر ہوگیا تھا - زبان کے لیے بڑا خطرہ تھا - خوش نصیبی تھی کہ سر لاکھوں کٹ گئے مگر زبان بچ گئی - وہ خونریز جاہل تھے - زبان تاتاری تھی اور چینیوں سے ملتی جلتی - لکیریں حرفوں کی بھی کھینچتے تھے آج اُنکی تحریروں کے نمونے چاہو تو معدوم ہیں - چنگیز کی طبیعت میں قاعدہ و قانون کے ایجاد کی قوی طاقت تھی -

تورهٔ چنگیز خانی کے کچھ کچھ ترجمے ہیں۔ فتحیاب لڑکے صاحبِ ملک اور صاحبِ زبان تھے۔ اُنکی حب الوطنی اور بلند نظری فارس کی زبان کو مخالفت کے کانوں سے سنتی تو عجب نہ تھا لیکن اُنکی زبان کے لیے نہ مذہبی رعایت تھی نہ علمی طاقت تھی، اس لیے ملک کی زبان کو روک نہ سکی۔

چنگیز خود ایک ملک گیر بادشاہ تھا، اولاد کو ملک داری بھی کرنی پڑی۔ بلند ہمتیں ایران میں اپنی ناموری کے ایوان سجا رہی تھیں۔ نہیں! بلکہ سلطنت کی بنیاد کو مضبوط کرتی تھیں۔ وہ اس وقت ایران کے علوم و فنون کو سلطنت کا مؤید سمجھ کر ایرانی عالموں اور کاردانوں کی پرورش کرنے لگے۔ چنگیز کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔ اسکی علمیت نصیر الدین محقق طوسی کے دامن میں پلی تھی۔ اس لیے علوم و فنون کا تربیت اور پرورش کرنے والا تھا۔ اسکے عہد میں ہر فن کے فاضل اور ماہر مصنف جمع ہوئے۔ مراغہ میں رصد خانہ تعمیر ہوا۔ زیچ لکھی گئی۔ منطق، فلسفہ اور اُسکی تمام شاخیں عرب سے آکر فارس کی خاک میں سرسبز ہوئیں اور اکثر چنگیزی نسل کے دماغ انہی خیالات سے روشن رہے

اقبال مندوں کے دربار میں علوم و فنون کے ساتھ انشا پردازی بھی اُمیدوار آئی۔ انھوں نے فقط اُمید کا پیٹ نہ بھرا بلکہ ذوق شوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوا دیے۔ اس سے اقلیم سخن میں انقلاب عظیم نمودار ہوا۔ زمین آسمان اور آسمان زمین ہو گیا۔ عالم صورت کے تماشبین اسے زبان فارسی کا نوروز کہیں گے کیونکہ استعارہ اور تشبیہ کی گلکاری اور خیالات بہاری۔ گل، بلبل، نغمہ، چمن، گلشن، سبزہ، شبنم، مے، جام، صراحی وغیرہ وغیرہ سے کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں۔ مگر آزاد قسم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں۔ درحقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں۔" سرسری طور پر ایک جگہ سے عبارت متذکرہ بالا نقل کر دی ہے۔ اس میں تحقیق و تدقیق اور روایت و درایت تینوں باتیں موجود ہیں۔ میری رائے ناقص میں کتاب کی کتاب تحقیق و تدقیق اور درایت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بیشک جیسا کہ مولوی صاحب نے اپنے مضمون میں حوالہ دیا ہے آزاد نے اُسی مقام پہ غلطی کی ہے۔ مگر یہ غلطی درایت کی غلطی ہے۔ آزاد نے اس موقع پر قیاس سے کام لیا ہے۔ کہتا ہے "خانہ بربادوں کے ہاں بھی تاریخ، اخلاق، افسانے، نظم و نثر سب کچھ ہوں گے۔" یعنی اُسکو خود یقین نہیں کہ تھے بھی یا نہیں۔ مگر یہ نتیجہ غلط اخذ کیا کہ آتش خانوں کے ساتھ ساتھ دینی و دنیاوی کتابیں بھی ورق ورق اُڑیں اور جل کر خاک در خاک ہو گئیں۔ بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ آزاد بھی آخر انسان تھا اور الانسان مرکب من الخطاء و النسیان۔ پس اُس سے اگر کہیں کہیں غلطی بھی ہو گئی تو یہ بڑا ظلم ہے کہ ہم اُسکی

تمام کتاب کو لغو قرار دیں اور ناقابل اعتماد کہدیں۔ علاوہ ازیں روز بروز نئی نئی تحقیقات اور نئی نئی کتابوں کی اشاعت سے انسانی علم میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کتاب کو چھپے ہوئے تقریباً ۳۶-۳۷ سال ہو گئے ہیں۔ اور اسوقت کی معلومات میں اور آجکل کی واقفیت میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ جو کچھ آزاد کے پاس مسالہ تھا اُس نے اُس سے کام لیا۔ اب اگر ایک جگہ غلطی بھی ہو گئی تو کیا کیا جائے؟ اسی طرح دربار اکبری میں بھی بعض مقامات پر اُن سے غلطی ہوئی ہے۔ لیکن میں پھر بھی عرض کروں گا کہ انھوں نے اپنی طرف سے تحقیق و تلاش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولانا شبلی کی تصنیفات پر بھی اعتراضات کیے جاتے ہیں اور انکی غلطیاں طشت از بام کی جاتی ہیں۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے میں ہرگز یہ نہ کہوں گا کہ مولانا شبلی نے تحقیق و تدقیق اور جستجو سے کام نہیں لیا۔ غلطیاں ہوا کریں۔ ہمیشہ ہوتی آئی ہیں۔ ہر مصنف کے یہاں کم و بیش پائی جائیں گی۔ بے شک مولوی صاحب کا یہ مشورہ درست ہے کہ آزاد کی سندوں پر بھی بلا تحقیق و تصدیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور آزاد ہی پر کیا منحصر ہے، ہمکو چاہیے کہ بلا تحقیق و تصدیق کسی پر بھی اعتماد نہ کریں۔ پس میں اپنی اس رائے کو بدلنے کے لیے کافی وجوہ نہیں دیکھتا کہ "آزاد کی کتابیں تحقیق و تدقیق، درایت وجدت وغیرہ سے پُر ہیں"۔

آبِ حیات سے میں نے دورِ سوم کے مصنفین کے حالات لکھنے میں کوئی استفادہ نہیں کیا اور نہ کیا جا سکتا تھا۔ دَورِ اول اور دَورِ دوم میری کتاب کی جلد اول میں لکھا جا چکا ہے اور جلد اول شایع ہو چکی ہے۔ اب اگر مولوی صاحب کچھ حالات کے اقتباسات کے بارے میں جو میں نے آبِ حیات سے جلد اول میں کیے ہیں غلطیاں ظاہر فرمائیں گے تو انشاء اللہ العزیز طبع دوم میں اُنکے دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نہایت خوش ہوں گا اگر مولوی صاحب موصوف سیر المصنفین جلد اول پر اپنا تبصرہ تحریر فرمائیں گے۔

مجھے یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ میں نے تیسرے دور کے مصنفین کا موازنہ نہیں کیا۔ صرف تاریخ نویسی کے اعتبار سے مولوی ذکاءاللہ، علامہ شبلی اور آزاد کا موازنہ کر دیا ہے وہ مولوی صاحب الناظر کے اوراق میں دیکھ چکے ہیں اور انھوں نے اس پر کچھ اعتراض بھی نہیں کیا۔ جسکے یہ معنی ہیں کہ اس بارے میں مولوی صاحب میرے ہمخیال ہیں۔

مضمون طویل ہو گیا ہے۔ اس قدر لکھنے کا ارادہ نہ تھا۔ تاہم میر تقی کی بد دماغی کو ظاہر کیے بغیر میں بھی یہ مضمون ختم نہ کروں گا۔

نہیں معلوم مولوی صاحب کو یہ کیسے خیال ہوا کہ میر تقی میر کی بد دماغی کے لیے آزاد نے نکات الشعراء کی سند پیش کی ہے۔ آب حیات میں تو کہیں اِس قسم کی سند کا پتہ نہیں۔ بے شک وؔلی کے بارے میں نکات الشعراء کا حوالہ دیتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

وؔلی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اُسکے حق میں فرماتے ہیں "وے شاعریست از شیطان مشہورتر"

بدقسمتی سے میں نے نکات الشعراء کو نہیں دیکھا۔ اگر یہ قول مولوی صاحب اُس میں میر صاحب کے یہ الفاظ وؔلی کی نسبت نہ موجود ہوں تو میؔر کی بد دماغی اسی پر منحصر نہیں ہے اور بہت سی باتیں ہیں۔ مولوی صاحب کس کس کی تردید کریں گے:۔

(۱) میر صاحب دہلی سے لکھنؤ کو روانہ ہوتے ہیں۔ ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہیں۔ ایک شخص کے شریک ہوتے ہیں۔ وہ کچھ دُور چل کر میر صاحب سے بات کرتا ہے۔ میر صاحب مُنہ پھیر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ بے غیرت پھر بات کرتا ہے۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں "صاحب قبلہ۔ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بے شک گاڑی میں بیٹھیے مگر باتوں سے کیا تعلق؟" اُس نے کہا "حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے" میر صاحب بگڑ کر فرماتے ہیں "خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے"

کیا کوئی شخص اس حکایت سے انکار کر سکتا ہے؟ جبکہ میر صاحب اپنے ہمعصر اور اُستاد مرزا رفیع سوؔدا کی نسبت یہ گوہر فشانی فرماتے ہیں:۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یوں ہی سوؔدا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

برعکس اسکے سوؔدا حالانکہ ایک مشہور ہجو گو شاعر ہے لیکن بے شک یا تعلی اس طرح کرتا ہے:۔

نہ پڑھیو یہ غزل سوؔدا تو ہرگز میؔر کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

سوؔدا تو اِس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میؔر سے اُستاد کی طرف

اہل نظر خود انصاف کر سکتے ہیں کہ میر صاحب نے جاہل کا لفظ سوؔدا کے لیے استعمال کیا تو درحقیقت یہ اُنکی خود پرستی تھی۔ اس پر کسی مزید حاشیے کی ضرورت نہیں۔ خود اُن کا کلام موجود ہے۔ پس معمولی شخص کے ساتھ جو اُن کا ہمسفر تھا اگر میر صاحب اس طرح پیش آئے ہوں جسکا ذکر کیا گیا تو کیا کوئی تعجب کی بات ہے۔ بلکہ یقین ہوتا ہے کہ وہ ضرور اُس غریب کے ساتھ اسی طرح پیش آئے۔

(۲) لکھنؤ کے مشاعرہ میں جب پہلی بار میر صاحب شریک ہوئے ہیں تو ظاہر ہے کہ اہل لکھنؤ کو کس حقارت سے میر صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ اُنکے اشعار حسب ذیل ہیں جو مشاعرہ میں فی البدیہہ کہکر غزل طرحی میں داخل کیے گیے تھے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُسکو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا　　ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

پورب کے ساکنو، کس حقارت سے مخاطب کیا ہے؟

(۳) نواب آصف الدولہ کا غزل کی فرمایش کرنا، دوسرے تیسرے دن میر صاحب کا جانا، نواب کا دریافت کرنا کہ "میر صاحب! ہماری غزل لائے؟" میر صاحب کا تیوری بدل کر کہنا "جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمایش کی آج غزل حاضر کر دے"۔

کیا اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے؟ میر صاحب کی خصلت و عادت کو دیکھتے ہوئے اور نواب آصف الدولہ کی بُردباری کا خیال کرتے ہوئے ہرگز اس واقعہ میں شک کی گنجایش نہیں۔

(۴) نواب آصف الدولہ کا حوض کی مچھلیوں سے کھیلنا اور میر صاحب کا غزل پڑھتے پڑھتے رُک جانا، اور نواب کا یہ کہدینا "جو شعر ہوگا آپ متوجہ کر لے گا" قرین قیاس ہے اور ہرگز غلط نہیں ہو سکتا اور میر صاحب کا جیب میں غزل ڈالکر گھر کو چلے آنا اور پھر جانا چھوڑ دینا بالکل ایسا ہے کہ ضرور عمل میں آیا۔ پھر چند روز کے بعد میر صاحب کا بازار میں نواب کی سواری کے سامنے سے گذرنا اور نواب صاحب کا محبت سے یہ کہنا کہ "میر صاحب آپ نے ہمیں بالکل چھوڑ دیا! کبھی تشریف بھی نہیں لاتے" اور میر صاحب کا یہ جواب دینا کہ "بازار میں باتیں کرنا وضعِ شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے"۔ ایسا ہے کہ ایسے شخص سے یہی توقع کی جا سکتی تھی۔

یہ تو مولوی صاحب بھی تسلیم کریں گے کہ وہ اُمرا کی خوشامد لغو سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

مجھکو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں　　میں جوں نسیم بادفروشِ چمن نہیں

یہ شعر خود میر صاحب کے اوصاف ظاہر کر رہا ہے، کسی مزید حوالہ کا محتاج نہیں۔ جو شخص اُس زمانہ میں جبکہ تمام شعرا قصیدہ گوئی اور مدح سرائی اپنا شعار کیے ہوئے تھے، اپنے آپ کو سب سے الگ رکھتا تھا تو

تو کیا تعجب کا مقام ہے اگر میر صاحب نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا ہو اور نوابوں اور امیروں کو لعن طعن کرنا بھی فخر سمجھا ہو۔

(۵) الف - میر صاحب کا میر قمرالدین منّت کو شاگرد نہ بنانا اور یہ کہہ دینا کہ "اُردوئے معلّٰی خاص دلّی کی زبان ہے - آپ اس میں تکلیف نہ کیجیے، اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجیے۔"

(ب) سعادت یار خاں رنگیں سے یہ کہہ دینا کہ "صاحبزادے! آپ خود امیر ہیں اور امیرزادے ہیں نیزہ بازی، تیراندازی کی کثرت کیجیے، شہسواری کی مشق فرمائیے، شاعری دلخراشی و جگرسوزی کا کام ہے" اور رنگین کے زیادہ اصرار پر یہ فرمانا کہ "آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں، یہ آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضرور ہے۔"

(ج) اور یہی معاملہ شیخ ناسخ کے ساتھ گذرنا۔

ہرگز تعجب خیز نہیں - اور میر صاحب جس قدر کہ اپنے کمال کے خود والہ و شیفتہ تھے اُس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ضرور یہ واقعات صحیح ہیں -

(۶) اژدرنامہ یا اجگرنامہ موجود ہے جس میں میر صاحب نے تمام شاعروں کو اپنے سامنے ہیچ قرار دیا ہے - کیا اس میں بھی کوئی شک ہے؟ اور نثار کا یہ شعر پڑھنا میر صاحب کی تعلّی و خود بینی کے خلاف ہرگز بیجا نہیں کہا جا سکتا -

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار — ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

(۷) پونے تین شاعر کا واقعہ مشہور ہے - اگر میر صاحب نے درد کو آدھا اور سوز کو پونا شاعر کہہ دیا ہے تو کیا اُن سے کوئی تعجب کا مقام ہے -

(۸) میر صاحب کی شائقین کلام کے ساتھ بے دماغی ایک معمولی بات ہے - پس اگر لکھنؤ کے عمائد اور اراکین کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا گیا ہو تو ہرگز خلافِ واقعہ نہیں کہا جا سکتا - میر صاحب اپنے آپ کو نہ صرف اہل کمال بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ سمجھتے تھے - بلا شبہہ مولوی صاحب اور یہ خاکسار اس امر میں میر صاحب کے ہمخیال ہیں - لیکن میر صاحب کا یہ انداز ہرگز پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا -

میر صاحب کا شائقین حضرات کو اول کچھ ٹالنا، پھر صاف جواب دے دینا اور کہنا کہ "صاحب قبلہ! میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے" - لیکن ان شائقین بلکہ عاشقانِ سخن کا اپنی نارسائی طبع کا

اقرار کرنا اور پھر درخواست کرنا اور میر صاحب کا پھر انکار کرنا اُنکے گراں خاطر ہونے کے لیے کافی تھا چنانچہ انھوں نے کہا کہ "حضرت! انوری و خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں، آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے۔" میر صاحب پھر بھی نہ پسیجے اور فرمایا "یہ درست ہے مگر اُنکی شرحیں، مصطلحات، فرہنگیں موجود ہیں اور میرے کلام کے لیے فقط محاورۂ اہل اُردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں، اور اس سے آپ محروم" یہ کہکر ایک شعر پڑھا:

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا　　دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہا آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی ی کو ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے کہ ی تقطیع میں گرتی ہے۔ مگر یہاں اِسکے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے۔

شعر اچھا بلکہ بہت اچھا ہے، لیکن جو اعتراض میر صاحب نے اتنے دنوں پہلے سوچا تھا اب بھی وارد ہوتا ہے۔ اور مشکل یہ ہے کہ آج جامع مسجد کی سیڑھیوں کا بھی حوالہ دینے سے گلو خلاصی نہیں ہو سکتی کیونکہ بقول مرزا غالب

"اے میر مہدی! تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے، ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں، اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں، یا پنجابی یا گورے ہیں، ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا، ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں .... اللہ اللہ! دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا۔ اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں، دلّی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاونی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر...."

پس بجز اسکے کہ میر صاحب کی اُستادی کے لیے ہم یہ تصرف جائز سمجھیں اور آیندہ کے لیے اسے متروک خیال کریں اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ غرض یہ واقعہ بھی ایسا نہیں جو قابل اعتماد سمجھا جائے!

(۹) سب سے بہتر ثبوت میر صاحب کی بد دماغی کا خود اُن کا مخمس شہر آشوب کا مقطع ہے۔ نکات الشعراء خود انکی تصنیف ہے اور وہ خود اپنے لیے اپنی عادت و خصلت کو بُرا ظاہر نہیں کر سکتے تھے، بلکہ ہر انسان اپنی عادتوں کو بُرا نہیں سمجھتا، میر صاحب ہی پر کیا موقوف ہے۔ پس اپنے مقطع میں وہ اور اعدا لوگوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ مجھکو بد دماغ سمجھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اُسوقت میر صاحب کی نسبت عام رائے

انکی کتابوں میں تمبا کو کا ذکر ہے اور سنسکرت میں تمباکو کو تمال پترم کہتے ہیں - اگر تمباکو ہندوؤں کے زمانہ میں یہاں رائج نہ ہوتا تو سنسکرت میں اُس کا نام بھی نہ ہوتا -

بایں ہمہ اس زہر کو جو آزاد نے اُگلا ہے میں اس وجہ سے باور نہیں کرتا کہ امیر خسرو کی یہ شان نہ تھی کہ وہ ایک ساقن کی دوکان پر حقہ پیئے - آج اگر زمانہ کا فیشن بدل گیا ہو اور بازار میں کھانا پینا معیوب نہ سمجھا جاتا ہو، لیکن غدر سے بہت بعد تک شرفا اس قسم کی باتیں معیوب خیال کرتے تھے - اور جبکہ ہماری شریعت تو بازار میں کھانے پینے کو معیوب سمجھتی ہے، اور گواہی ایسے شخص کی جو بازار میں کھاتا پیتا ہو معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو ہرگز یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ امیر خسرو محض دلشکنی کے خیال سے شریعت کی پابندی ہی نہ کریں -

مجھے مضمون کی طوالت کا افسوس ہے - لیکن میں آخر میں مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کرونگا کہ میرا خیال آزاد کی نسبت جو کچھ ہے وہ تمام و کمال پڑھ کر مجھے مطلع کریں کہ آیا انکی رائے میں یہ صحیح ہے یا نہیں اور اگر اب بھی وہ مجھ سے اختلاف کریں تو انگریزی مثل کے مطابق ہم کو اختلاف کرنے میں موافقت کر لینی چاہیے -

محمد یحیی تنہا



کس نے جلوہ یہ دکھایا شب تنہائی میں | تجلی اک کوند گئی قلب تمنائی میں
لوٹ جاتی ہے نظر دیکھکے جلوہ تیرا | کون سے ناز ہیں پنہاں تری رعنائی میں
آنے والا ہے کوئی دم میں وہ رشک محشر | فتنے مشغول ہیں کیا انجمن آرائی میں
لاکھ جانیں ہوں فدا تجھپہ خیالِ جاناں | جی بہل جاتا ہے تجھ سے شب تنہائی میں
جو نہ کرنا تھا کیا عشق کی خاطر ہم نے | جو نہ ہونا تھا ہوا عشق کی رسوائی میں
جو ہے سرکش اُسے ملتی ہے بلندی نصیب | گونجتی ہے یہ صدا گنبد مینائی میں

کاش وہ فاتحہ خوانی کو چلے آئیں یہاں
حسرتیں دفن ہیں اقدس دلِ شیدائی میں

محمد عباس اقدس حیدرآبادی تلمیذ حضرت حلیم پانی پتی

ساعت بساعت بسرعت فائقہ شرف وصعود یورپ وامریکہ کی علمی بصارت وبصیرت کو خیرہ کیے دیتا ہے تو شاید وضع الشئ فی محل غیرہ نہ ہوگا۔

موعودۂ بالا قسط انشاء اللہ آئندہ فرصت میں نذر ناظرین الناظر کرسکوں گا۔

سید رضا حیدر فاطمی

جذباتِ سلیم

درِ حق پہ جھکا سر۔ دل میں اطمینان پیدا کر — حوادث سے نہ جو پسپا ہو، وہ ایمان پیدا کر

مہیا کر وہ آنکھیں جن سے دیکھے جلوہ صانع کا — سنے فطرت کے نغمے چپکے تو۔ وہ کان پیدا کر

نظر کے سامنے جلوے نئے آنے کو ہیں اے دل — ذرا جنبش میں آ پھر اور نئے ارمان پیدا کر

تری ہستی کے ذرّے گر بکھر جائیں تو کیا پروا — لڑی خورشید سے آنکھیں رہیں وہ آن پیدا کر

دمِ خنجر پہ تیرے سینہ رکھدوں اپنا اے قاتل — مرے سینے میں وہ جذبہ۔ ترے قربان پیدا کر

گرا اے حسنِ بے پروا ہزاروں بجلیاں۔ لیکن — رہے مضطر جو شوقِ دید میں وہ جان پیدا کر

قیامت کا سماں گر دیکھنا ہے اے جواں تجھ کو — تو دل کے ولولوں میں شوق سے ہیجان پیدا کر

چھپا سر اگر آگے دیدۂ تر کے نہ کر پروا — نہ دانائی سے رسم و راہ لے نادان پیدا کر

فضائے زُہد ہے تنگ اے فضائے عشق کے غافل! — جہاں دوڑیں امنگیں دل کی وہ میدان پیدا کر

فلک کی گردشوں کی زد سے جائیگا نکل باہر — جنونِ عشق سے سر میں ذرا دوران پیدا کر

حقیقت کی کرن پڑتی نہیں باطل بھرے دل پہ — اندھیرا گھر میں ہے تو کوئی روشندان پیدا کر

غنیمت جان سلے محوِ تمنا عیشِ حاضر کو — نہ دل میں فکرِ فردا سے کوئی خلجان پیدا کر

مکرر یہ تماشے زندگی کے اے خدا کب تک؟

نئی دنیا بنا اب اور نئے انسان پیدا کر

وحید الدین سلیم

عباسیۂ بغداد

(مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخ الامۃ کا حصۂ پنجم)

کہتے ہیں کہ خزاں کی آمد بہار سے زیادہ دلکش ہے۔ شب ہجر کی سختی شام وصال سے زیادہ دلفریب ہے۔ مجلس ماتم عیش وطرب کے جلسہ سے زیادہ پُرلطف۔ موت کی تلخی زندگی کی شیرینی سے زیادہ حلاوت بخش اور آنسوؤں کا تار قہقہہ کے پھول سے زیادہ گراں قیمت ہے بلکہ گریۂ نیم شبی سے ہوآگاہ ہوا وہ مالک نیم روز ایک جو کے عوض میں خرید نہیں کرتا۔

ممکن ہے کہ ان شاعرانہ خیالات میں مبالغہ ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ درد وغم کی داستان عیش وشادمانی کے بیان سے بہت زیادہ سریع الاثر ہے۔ ایک سوز پر سیکڑوں ساز اور ایک آہ پہ ہزاروں واہ واہ قربان ہیں!!

کلیجہ تھام لوگے جب سنوگے ؏ سنوائے خدا شیون کسی کا

عرب کے ابتدائی فتوحات کا سیلاب حیرت خیز تھا۔ خلافتِ راشدہ کی حق پرستی اور وفاشعاری رشک بیز تھی۔ بنی امیہ کے کارنامے تعجب انگیز تھے۔ ہارون اور مامون کی معدلت گستری اور علم وفضل کی قدردانی دل آویز تھی۔ لیکن درد وتاثیر کے اعتبار سے ۲۵۵ھ میں رجب کی ستائیسویں یادرکھنے کے قابل ہے جبکہ ترکوں نے خلیفۂ بغداد کے قصر کو گھیر لیا۔ معتز اس وقت حرم سرا میں تھا۔ کہلا بھیجا کہ میں بیمار ہوں باہر آنے کے قابل نہیں۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو تم میں سے دو ایک آدمی مجھ سے مل جائیں۔ وہ لوگ اندر گھسے اور پاؤں پکڑ کے کھینچتے اور پیٹتے ہوئے اسکو باہر گھسیٹ لائے۔ اُس کا پیرہن پھٹ گیا تھا اور مونڈھوں پر خون کے نشانات تھے۔ گرمی کا موسم، دوپہر کا وقت، اور دھوپ میں تمازت تھی۔ اسی حالت میں اُسکو ننگے پاؤں صحن میں پتھر کے فرش پر لاکر کھڑا کردیا۔ وہ جلن سے جلد جلد ایک پاؤں اُٹھاتا تھا اور دوسرا رکھتا تھا۔ قاضی القضاۃ بُلایا گیا۔ اُس نے معتز کو خلافت سے دستبرداری

کا حکم دیا۔ جب اُس نے دستخط کر دیا تو اُسکو وہاں سے ترکوں نے قید خانہ میں لیجا کر بند کیا اور تین دن تک بھوکا پیاسا رکھا۔ آخری وقت میں ایک گھونٹ پانی مانگتا تھا لیکن کسی نے نہیں دیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔" (عباسیہ بغداد صفحہ ۴۷)

شوال سنہ ۳۲۰ھ کی اٹھائیسویں بھی خون کے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے جبکہ مغربی اور بربری خادموں نے خلیفہ مقتدر پر چڑھائی کی" اُن میں سے ایک نے خلیفہ پر وار کیا وہ زمین پر گر گیا۔ دوسرے نے اُس کا سر کاٹ کے نیزہ پر رکھ لیا اور اُس پر نفرین و لعنت کے آواز سے بلند کیے۔ بربریوں نے خلیفہ کے تمام کپڑے یہاں تک کہ پاجامہ بھی اُتار لیا۔ کسی شخص نے برہنہ دیکھ کر ستر پوشی کے لیے اوپر سے گھاس ڈال دی۔ پھر وہیں گڑھا کھود کر اُسکو دفن کر دیا۔" (عباسیہ بغداد صفحہ ۱۰۲)

جمادی الثانی ۳۳۴ھ کی بارھویں بھی عبرت انگیز ہے جبکہ دو دیلمی خلیفہ مستکفی کے پاس گئے" اُس نے خیال کیا کہ یہ میرے ہاتھ کا بوسہ دینا چاہتے ہیں اس لیے ہاتھ اُنکی طرف بڑھایا۔ اُنھوں نے اُسکو پکڑ کر تخت سے نیچے کھینچ لیا۔ اور اُس کا عمامہ گردن میں ڈال کر پاپیادہ معز الدولہ کے پاس لے گئے۔ وہاں قید کر دیا گیا۔ دیلمیوں نے قصرِ خلافت کو لوٹ لیا۔" (عباسیہ بغداد صفحہ ۱۲۶)

ہارون الرشید کا قیصر روم کو درشت پیام اور معتصم باللہ کا عموریہ سے سخت انتقام تو ہنس ہنس کر سنا تھا۔ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔

"۳۵۱ھ ہجری میں دمستق (قیصر روم) عین زربہ کی طرف حملہ آور ہوا۔ ۵۴۔ اسلامی قلعے فتح کر لیے' اور لاکھوں مسلمانوں کو بے خانماں کر دیا۔ اسکے بعد حلب کی جانب آیا سیف الدولہ نے شکست کھائی۔ اور اُسکے اکثر اقربا مقتول ہوئے۔ دمستق نے اس کا سارا مال و متاع لوٹ لیا۔ گھر کو بھی منہدم کرا دیا۔ نو روز تک شہر کو غارت کیا۔ جس قدر سامان لے جا سکتا تھا لے گیا بقیہ کو آگ لگا دی۔ اور مسلمانوں کے بارہ ہزار بچوں کو پکڑ کر لے گیا۔

. . . .

۳۵۴ھ میں قیصر نے مصیصہ کو فتح کر لیا۔ وہاں کے بہت سے مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالا

اور بقیہ کو اپنے ساتھ لے گیا جنکی تعداد تقریبًا دو لاکھ تھی۔ پھر طرطوس کا محاصرہ کیا۔ اہل طرطوس نے امان طلب کی جو اُس نے منظور کی۔ لیکن جب شہر کا دروازہ کھول دیا گیا تو حکم دیا کہ جو شخص جس قدر اپنا مال اُٹھا سکتا ہے لیکر یہاں سے نکل جائے۔ چنانچہ لوگ انطاکیہ کی طرف چلے گئے۔ اُس نے جامع مسجد کو توڑ دیا۔ اُس میں گھوڑے باندھے۔ بعض بعض مسلمانوں نے اس مصیبت میں عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ آنکھوں کے سامنے سرحد کے مسلمانوں پر یہ واقعات گذر رہے تھے لیکن مسلمان امرا اپنے اغراض کے لیے باہم گرم سے پیکار رہتے اور کوئی اس دشمن کی مدافعت کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا۔ ۳۵۸ھ میں قیصر شام میں آیا۔ طرابلس کو جلا دیا۔ قلعہ عرقہ کو فتح کیا۔ پھر حمص میں پہونچکر آگ لگا دی۔ اور ساحلی بستیوں کو غارت کرڈالا۔ مگر کوئی مقابلہ کے لیے نہ گیا۔

اس حملہ میں اُس نے جس قدر مسلمانوں کو لوٹا یا قتل کیا اُن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک لاکھ سے زیادہ اُن بچوں کی تعداد تھی جنکو پکڑ کر لے گیا۔ اور نوعمروں کے سوا کسی کو گرفتار بھی نہیں کرتا تھا۔ بالعموم جوانوں کو قتل اور بڈھوں کو نکال دیتا تھا

. . . .

. . . .

۳۶۱ھ میں رومیوں نے رہا کو دوبارہ لوٹا۔ پھر جزیرہ میں نصیبین کی طرف آئے۔ وہاں قتل وغارت کیا۔ اور بستیوں کو جلا دیا۔ دیار بکر کو بھی تاخت و تاراج کرڈالا۔ ان مقامات کے باشندے بغداد میں فریاد لیکر پہونچے اور جامع مسجد میں رومیوں کے مظالم بیان کرکے امداد کے خواہاں ہوئے۔ بختیار اسوقت شکار کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ اعیان بغداد رنج سے بھرے ہوئے اُسکے پاس گئے اور کہا کہ یہ وقت مسلمانوں کی حمایت کا ہے . . . . اسکے بعد بختیار نے خلیفہ مطیع سے مالی امداد طلب کی۔ اُس نے جواب دیا کہ جو شخص ممالک سے خراج وصول کرتا ہے اُسکے اوپر جنگ اور اُسکے اخراجات کا بار ہے۔ میں کچھ نہیں دے سکتا۔ بختیار نے دھمکی دے کر چار لاکھ درہم وصول کیے جسکے لیے خلیفہ کو حرم کے کپڑے، زیورات، یہاں تک کہ مکانات بھی بیچنے پڑے۔ یہ رقم جب مل گئی تو بختیار نے جنگ کا ارادہ ترک کرکے اُسکو اپنی عیاشی میں صرف کیا۔"

(عباسیہ بغداد صفحہ ۱۳۱ تا ۱۳۴)

ان سب سے زیادہ دردانگیز اور عبرت خیز وہ منظر ہے جبکہ "۱۵ محرم ۶۵۶ھ کو ہلاکو خاں نے جرار لشکر کو لیکر بغداد کی طرف آیا اور اُس کا محاصرہ کیا۔ خلیفہ کے پاس مدافعت کی طاقت کہاں تھی۔ دس روز کے اندر وہ شہر میں داخل ہوگیا۔ اسکی فوج نے قتل و غارتگری شروع کی اکثر باشندے مارے گئے اور وہ بغداد جو اسلامی عظمت کا گہوارہ، خلافت و امارت کا مرکز اور مشرقی ممالک کا تاج تھا ویران ہوکر اُن متفرق جماعتوں کا مسکن ہوگیا جو ہلاکو کی فوج کے ساتھ آئی تھیں اور جن کا کوئی دین نہ تھا۔

خلیفہ پیشکش کے لیے ایک طبق جواہر لیکر حاضر ہوا۔ ہلاکو نے اُسکو اپنی فوج میں تقسیم کرادیا۔ ابوبکر بن مستعصم کو مع ایک جماعت کے پھانسی دی۔ اور خلیفہ اور اُسکے دوسرے بیٹوں اور خواجہ سراؤں کو ساتھ لیکر بغداد سے روانہ ہوا۔ پہلے ہی مرحلہ میں سب کو قتل کرادیا جس سے خلافت عباسیہ کا آفتاب جو ۵۲۴ سال سے تاباں تھا غروب ہوگیا" (عباسیہ بغداد صفحہ ۲۱۶)

قیصران روم بہ سر خاک و خاقاں بر زمیں | دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکت بیت الحرام
ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں | خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریختہ

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برآور دیں قیامت درمیان خلق بیں

یہ دردناک اقتباسات مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخ الامۃ حصہ پنجم سے نئے گئے ہیں جسمیں عہد متوکل خلیفہ دہم بنی عباس سے مستعصم باللہ آخری خلیفۂ بغداد کے قتل تک حالات درج ہیں اور جو ابھی حال میں مطبع جامعہ ملیہ علیگڈھ سے شایع ہوئی ہے۔

یہ چارسو برس کا عبرت انگیز زمانہ مسلمانوں کی عیش پرستی اور بغداد کی زوال و تباہی کا عہد ہے اور اُسکے ہر ایک ورق پر آنسو بہانے اور پتھر کے دل کو موم بنانے کا سامان مہیا ہے۔

اس دور میں سیف الدولہ حمدانی کے سے جانباز بہادر، الپ ارسلان اور ملک شاہ کے سے نامور فاتح، نورالدین زنگی اور صلاح الدین کے سے فدائے ملت، نظام الملک اور حسن بن صباح کے سے مدبر اور دانشمند بھی پیدا ہوئے بلکہ علم و فضل میں جو یہ طولی مسلمانوں نے اس پرآشوب عہد

میں حاصل کیا اور جیسے زبردست فقیہ، محدث، زاہد، صوفی، حکیم اور شاعر اس تباہی کے زمانہ میں نصیب ہوئے وہ عروج و ترقی کے وقت بھی میسر نہ آئے تھے لیکن انکی آب و تاب اندھیری رات میں جگنو کی چمک دمک یا گھنگھور گھٹا میں بجلی کی چمک چوندھ تھی جو تھوڑی دیر کے لیے اُجالا کر دیتی تھی اور پھر وہی اندھیرا گھپ ہو جاتا تھا۔ عیش و عشرت اور اُسکے لوازم امرت کے خمیر میں داخل ہو گئے تھے اور ہمدردی، قوم پرستی، وفاشعاری، اور صدق و خلوص کا وجود باقی نہ تھا۔

دولت کی وہ فراوانی تھی کہ مصر کے گورنر نے اپنی لڑکی کی شادی خلیفۂ وقت کے ساتھ کی تو وہ جہیز دیا جسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ "اُس کے بیٹھنے کے لیے سونے کا تخت بنوایا تھا جسکے چاروں گوشوں پر مرصع ستون تھے۔ اُن پر جالی دار طلائی قبہ تھا جسکے ہر ایک حلقہ میں ایک انمول موتی سونے کے تار میں لٹکتا تھا۔ جوڑوں کی قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ازار بند ایک ہزار ایسے دیے تھے کہ ہر ایک کا صرفہ بارہ ہزار دینار تھا۔

رخصتی کے وقت مصر سے بغداد تک ہر ہر منزل پر اپنے محل کے مشابہ ایک ایک قصر تعمیر کرا کے سازوسامان سے آراستہ کر دیا اور ہر قسم کی ضروریات ان میں مہیا کر دیں ۰۰۰۰ اسی طرح پر مصر سے بغداد تک گویا وہ برابر اپنے باپ کے گھر میں قیام کرتی چلی آئی (عباسیۂ بغداد صفحہ ۷۳)

یا عمرو بن لیث جب اسمٰعیل سامانی سے لڑنے چلا ہے تو" لوگوں نے کہا کہ اس وقت دریائے جیحوں جوش پر ہے اُترنا مشکل ہوگا۔ اُس نے کہا کہ میں چاہوں تو اسکو اشرفیوں سے پاٹ کر عبور کر سکتا ہوں "۔ (عباسیہ بغداد صفحہ ۱۷)

لیکن اسی کے ساتھ خلیفۂ اسلام اور نائب رسول کے محل میں صرف شراب اور شربت وغیرہ کا ماہواری صرف تین ہزار دینار تھا (صفحہ ۵۶) انصاف پرستی کا یہ زور شور تھا کہ امیر المومنین کا وزیر "ایکبار گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک فریادی نے عرضی پیش کی۔ رکاب سے پاؤں نکال کر اس زور سے اُسکے سینے پر مارا کہ وہ مر گیا"۔ (عباسیہ بغداد صفحہ ۲۰) - اور بوڑھی عورتوں کی یہ عزت کی جاتی تھی کہ خلیفہ مقتدر کی ماں جسکو مرض استسقا میں مبتلا تھی اُس سے قاہر نے کہا کہ "سلطنت کی ساری دولت تم نے جمع کر رکھی ہے وہ ہمارے حوالہ کردو۔ بولی کہ میرے پاس بجز سامان وغیرہ کے کچھ نہیں ہے۔ قاہر نے اُسکو پٹوایا۔ سخت بے حرمتی کی اور ایسی بدترین سزائیں

دیں جو لکھنے کے قابل نہیں ہیں لیکن اُسکے پاس کچھ نقدی پیدا نہیں ہوئی"۔ (عباسیہ صفحہ ۱۰۵)

نبی اُمّی کی معجز نما تعلیم نے مختلف اللون، مختلف الوطن، اور مختلف اللسان باشندوں کو ایک قوم بنا کر بھائی بھائی کر دکھایا تھا۔ اگر عمواس کے میدان میں شامیوں کو اذیت پہونچتی تو حجاز کے ریگستانی بدو اُس تکلیف کو اپنی مصیبت سمجھتے اور خیال کرتے تھے کہ ہزاروں کوس کے فاصلہ پر انکے ہم مذہبوں کی بے سروسامانی عین انکی پریشانی ہے

چو عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضوہا را نماند قرار

لیکن تیسری صدی ہجری کے بعد یہ خیالات داستانِ پارینہ ہوگئے تھے۔ مسلمانوں کو نہ مذہب کا پاس تھا نہ زبان کا لحاظ، اور نہ قوم کی ہمدردی۔ خلیفہ ناصر خوارزم شاہ کو تباہ کرنے کے لیے چنگیز خاں کو بلاتا ہے اور وزیر ابن علقمہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجانے کو ہلاکو سے سازش کرتا ہے۔!!

دمِ گفتار نالے حلق میں چھریاں چبھوتے ہیں
زباں تک ٹکڑے ہو ہو کر مرا افسانہ آتا ہے

مسلمانوں کی بدافعالی اور بے حمیتی نے اُنکی قوم کو چوتھی اور چھٹی صدی ہجری میں شائستہ دُنیا کے لیے قابل مضحکہ بنا دیا تھا۔ وہ خود ایک دوسرے کی عزت نہیں کرتے تھے تو غیر مذہب والے انکی آبرو کا پاس و لحاظ کیوں کرتے؟ مولانا اسلم نے "عباسیہ بغداد" کے آخری دس صفحے زوال دولت بنی عباس کے اسباب پر بحث کرنے میں صرف کیے ہیں لیکن انکی تباہی کا اصل راز جسکو مولانا نے صاف الفاظ میں ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مسلمانوں کی خود غرضی، نفس پرستی، اور اخوت دینی کا فقدان تھا!! ایران، عراق، عرب، اور شام کی سرزمین بڑے بڑے قابل، مدبر، اور شجاع پیدا کرتی ہے لیکن جماعت مسلمین کی خودغرضی کسی اصلاح کو مستحکم نہیں ہونے دیتی اور ہر ایک جدید ریاست دو نسلوں کے بعد ویسی ہی پراگندہ ہو جاتی ہے جیسی کہ اس کی پیشرو حکومتیں تھیں۔

بہرحال۔ تاریخ اسلام کا وہ غم و الم انجام عہد جو ۱۳۲ھ سے شروع ہو کر ۶۵۵ھ میں ختم ہوتا ہے۔ نہایت غور و تعمق سے پڑھنے کے قابل ہے اور اس عہد کی دردناک کہانی یقیناً خلافت راشدہ اور بنی امیہ کی داستان فتوحات سے بہت زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہے۔ طوائف الملوکی کا دور ہے۔ صوبہ صوبہ میں جداگانہ حکومتیں قائم ہیں اور نئی سلطنتیں اور جدید مذہب بنتے ہیں اور

دوسرے دن مٹ جاتی ہیں - خواجہ آتش نے گویا اسی زمانہ کی بابت لکھاہے کہ

خانہ تھا گنجفہ کا ہراک قصر شہر عشق گھر گھر تھیں بادشاہیاں گھر گھر وزارتیں

یہ خودمختاری اور سلطنت وجاہ کے ولولے جس طرح قومی ہمدردی کی معدومی ثابت کرتے ہیں، اُسی طرح مسلمانوں کی دماغی قابلیت اور شجاعت کے بھی گواہ ہیں - دولت وعشرت نے مذہب کو پژمردہ کردیا لیکن جو روح اُس نے پھونکی وہ ہنوز زندہ تھی اور ممکن تھا کہ مصائب اور پریشانیوں کا "فرشتۂ رحمت" جو بندہ کو آقا کے حضور میں کشاں کشاں واپس لاتا ہے دوبارہ اس مردہ قوم کی اصلاح کرتا اور پھر مہذب دنیا کے سامنے سر اُٹھانے کے قابل بنادیتا - ایسا ہوا یا نہیں ؟ اسکی تفصیل کا ابھی وقت نہیں آیا - تاریخ الامۃ کی جلد ششم وہفتم سے معلوم ہوگا!!

"اس عہد میں تمام دنیائے اسلام جو کسی وقت ایک نظام میں منسلک اور ایک مرکز سے وابستہ تھی بالکل ایک دوسرے سے الگ ہوگئی تھی اور ساری امت کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا -

(۱) اندلس میں بنی امیہ کی سلطنت تھی اور عبدالرحمٰن ناصر خلافت کا دعویدار تھا -

(۲) افریقہ میں ادارسہ اور اغالبہ کے کھنڈروں پر دولت فاطمیہ قائم ہوچکی تھی - یہ لوگ بھی خلافت کے مدعی تھے -

(۳) مصر میں دولت اخشیدی قائم تھی ......

(۴) حلب کا امیر سیف الدولہ علی بن عبداللہ بن حمدان تھا ......

(۵) جزیرۂ فراتیہ میں ناصرالدولہ حسن بن عبداللہ حمدانی کی حکومت تھی ....

(۶) عراق بنی بویہ کے قبضہ میں تھا ......

(۷) عمان - یمامہ - بحرین اور سواد بصرہ میں قرامطہ کا تسلط تھا ....

(۸) فارس اور اہواز میں خلیفۂ عباسی اُسکے بعد علی بن بویہ عمادالدولہ کا نام خطبہ میں ہوتا تھا -

(۹) بلاد جبل اور رے میں خلیفہ اور رکن الدولہ حسن بن بویہ کا نام لیا جاتا تھا -

(۱۰) جرجان اور طبرستان آل سامان اور دشمگیر کے باہمی منازعات کے جولاں گاہ تھے -

(۱۱) خراسان اور ماوراءالنہر جس کا صدر مقام بخارا تھا بنی سامان کے زیر حکومت تھے۔" (عباسیۂ بغداد - صفحہ ۱۲۴ و ۱۲۵)

یہ حالت ۶۴۲ھ میں تھی - جب اتابکوں کا زور ہوا تو اس سے بھی زیادہ ٹکڑے سلطنت کے ہوگئے - بغداد کی تباہی کے وقت اسلامی ممالک کی حسب ذیل حالت تھی :-

(۱) غرناطہ اندلس میں بنی نصر کی حکومت قائم ہوچکی تھی
(۲) شمالی افریقہ میں موحدین کی دولت تھی -
(۳) الجزائر میں دولت زیانیہ یغمراسن بن زیان نے قائم کرلی تھی -
(۴) تونس میں بنی حفص میں سے ابوعبداللہ امیر تھا -
(۵) مراقش میں دولت مرینیہ تھی اور حکمراں ابویوسف تھا -
(۶) مصر میں ممالیک بحری ایوبی حکومت پر قابض ہوگئے تھے اور نورالدین علی تخت پر تھا -
(۷) یمن میں دولت رسولی تھی اور مظفر بن یوسف برسر حکومت تھا -
(۸) صنعا میں ائمۂ زیدیہ میں سے متوکل شمس الدین امام تھا
(۹) روم میں سلاجقہ میں سے رکن الدین قزل ارسلان چہارم کا عہد تھا -
(۱۰) ماردین میں دولت ارتقیہ کے تخت پر نجم الدین غازی تھا -
(۱۱) فارس کے اتابکیہ سلغریہ میں سے ابوبکر بن سعد زنگی (شیخ سعدی کا ممدوح) تھا -
(۱۲) لورستان کے اتابکیۂ ہزار اسپیہ کا بادشاہ وگلہ تھا -
(۱۳) کرمان پر قتلغ خاتون کی حکومت تھی -
(۱۴) ہند میں ناصرالدین محمود دہلی کے تخت پر تھا " (عباسیہ بغداد صفحہ ۲۲۷ و ۲۲۸ تلخیص)

زوال و تباہی بغداد کے مورخ کو ان سب حکومتوں کے حالات مفصل لکھنا چاہیے تھے - مگر مولانا اسلم نے ان ریاستوں کا تذکرہ نہایت مجمل کیا ہے - سیف الدولہ - عضدالدولہ - الپ ارسلان نورالدین اور صلاح الدین اس سے بہت زیادہ توجہ کے مستحق تھے جتنی کہ ان کے حال پر "عباسیہ بغداد" میں کی گئی - عمر و خیام - امام غزالی اور نظامیہ یونیورسٹی کا تذکرہ اس عہد میں لازمی تھا جو تالیف زیر بحث میں نظر نہیں آتا - بیت المقدس کی مکرر فتح اس عہد کا ایک اہم بالشان واقعہ ہے - مگر مولانا اسکی تفصیل سے بھی خاموش ہیں - قیاس ہوتا ہے کہ وہ دول سلجوقیہ و ایوبیہ وغیرہ کے متعلق اپنی کتاب کے جداگانہ حصے مرتب کرنے والے ہیں ورنہ یہ خامیاں انکی تالیف میں دستیاب نہ ہوسکتیں

غرض "عباسیہ بغداد" مسلمانوں کی قوم کا ایک مرثیہ ہے اور جو کچھ اس میں لکھا ہے خوب لکھا ہے - اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں نقائص نہیں ہیں -

بیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ تالیف تازیانۂ عبرت ہے - کاش وہ اب بھی خوابِ غفلت سے بیدار ہوں اور اُنکے اسلاف نے شیرازۂ اسلامی کے بکھرنے سے جو مصائب برداشت کیے تھے اُن سے آشنا ہوکر آیندہ کے لیے نصیحت حاصل کریں

مہاتما گوتم کا قول ہے کہ طلب حق میں جب مرشد کامل کے پاس رسائی ہوئی تو سلوک کی پہلی منزل تمام ہو جاتی ہے - خدا کرے کہ بغداد کے اس دردناک مرثیہ کو پڑھ کر مسلمانان ہند کی اصلاح کا پہلا زینہ طے ہو جائے اور وہ اُن بُرائیوں کے ترک کرنے کا عہد کرلیں جو اس کتاب کے ہر ورق پر اُنکے بزرگوں کے دامن کو داغدار ثابت کرتی ہیں - کتاب کی قیمت صرف ۱۲؍ ہے اور "مولانا اسلم جیراج پوری - جامعہ ملیہ علیگڈھ" سے مل سکتی ہے -

امیر احمد علوی - شیخ چھاؤنی

انعامی مضمون

اصحاب ذیل کے مضامین وصول ہوے - اور شرائط مقابلہ کے بموجب ہونے کی بنا پر مجلس انتخاب میں جانچ کے لیے پیش کر دیے گئے :-

(۱) مولوی سید نجیب اشرف ندوی بی اے رفیق دار المصنفین اعظمگڈھ
(۲) منشی محمد عبد اللطیف صدیقی طالب علم ایف اے کلاس لکھنؤ
(۳) مولوی محمد یوسف متعلم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر
(۴) منشی محمد یحییٰ تنہا بی اے وکیل غازی آباد
(۵) مولوی محمد منظور، فاضل الہ آباد
(۶) مولوی محمد سعید انصاری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علیگڈھ

جناب حکیم سید شاہ انیس احمد قادری الرزاقی (داود نگر ضلع گیا) کا مضمون صرف ۱۶ صفحے کا تھا جو شرائط مقابلہ کے سراسر منافی ہے اور اس بنا پر خارج کرنا پڑا -

مولوی محمد جلال صاحب توفیق نے حیدرآباد سے مہلت طلب کی تھی اور انکو اطلاع بھی دیدی گئی تھی کہ وہ اپنا مضمون آخر ماہ جنوری تک ارسال فرمادیں مگر اُن کا مضمون وصول نہیں ہوا - واللہ اعلم کیا سبب ہے -

نتیجہ انشاءاللہ تعالیٰ آیندہ نمبر میں درج کیا جائے گا

ظفر الملک

مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب

بمبئی کے باؤلے تاجر کے قتل کے سلسلہ میں جس بازاری عورت کے ساتھ ایک ہندو والی ریاست کے ناجائز تعلقات کا چرچا آج کل اردو اور انگریزی اخباروں میں نہایت شدومد کے ساتھ ہو رہا ہے پنجاب کے ایک منہ پھٹ اور زبان دراز ہندو اخبار نے حال میں اسکی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں پر ایک نہایت سوقیانہ چوٹ کی جس کا پنجاب ہی کے ایک مسلمان اخبار نے دندان شکن جواب دیا اور "قدیم" اور "جدید" واقعات کے حوالوں سے اِس شیشے کے گنبد میں رہ کر کنکریاں پھینکنے والے ایڈیٹر کے گھر کو جو ایسی پتھراؤ سے چکنا چور کر دیا۔ کلوخ انداز را پاداش سنگ ست۔

ہندو اخبار نے ایسی بیہودہ بات کہہ کر جو خود اُسی کی طرف پلٹ آنے والی تھی اپنی تہی مغزی کا ثبوت دیا، لہذا وہ بات تو ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی سمجھدار آدمی اُسے توجہ سے سُنے اور سنجیدگی سے سوچے مگر جواب میں شاہان مغلیہ کا ذکر آ گیا تھا جس نے تاریخ کے طالب علم کو پھر بھولا سبق یاد دلا دیا اور سلسلۂ خیال کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

ہندوستان کی بادشاہی تیمور کے خاندان میں کم و بیش سوا تین سو برس رہی۔ مورخوں کا اتفاق ہے کہ بابر اور ہمایوں تو قصر سلطنت کی داغ بیل ڈالنے اور بنیاد رکھنے والے تھے اس عالی شان عمارت کو مکمل کر کے اُس میں جلال و جبروت کے ساتھ جلوس کرنے والے اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر تھے۔ عالمگیر اول کے بعد اس میں شکست و ریخت شروع ہوئی اور عالمگیر ثانی کے مرتے ہی ساری عزت زمین پر آ رہی۔ اسکے بعد جو ہوئے وہ مغلیہ سلطنت کے بادشاہ نہیں، مٹی تکیے کے شاہ جی تھے۔

زوال اور انحطاط کے اسباب ہر مورخ بلکہ ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق بیان کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اس کا سبب عالمگیر کا غیر مسلموں کے ساتھ ظلم و تعصب تھا۔ کوئی کہتا ہے تازہ دم قوموں یعنی سکھوں اور مرہٹوں کا عروج۔ کوئی کہتا ہے انگریزوں کی حکمت عملی۔ اصلی قوی سبب تاریخ کے صفحوں پر لکھا آنکھوں کے سامنے ہے مگر اُس پر نظر نہیں پڑتی اور پڑتی ہے تو اس بے پروائی سے کہ گویا وہ اصلی سبب ہے ہی نہیں۔

شمس العلما محمد حسین آزاد نے دربار اکبری کے اوراق پر الفاظ کا جو دربار سجایا ہے اُس میں اکبر کی

یلغاروں کا بیان بہت مزے سے لے کر لکھا ہے۔ اس بیان میں ایک لفظ سے خیال ہوا کہ شاید اصلی سبب وہ سمجھ گئے ہیں، مگر اگلے فقروں نے سمجھا دیا کہ کچھ نہ سمجھے اور سمجھے بھی تو سمجھانا نہیں چاہتے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"یہ یلغاریں بابری بلکہ تیموری و چنگیزی خون کے جوش تھے کہ اکبر پر ختم ہوگئے۔ اسکے بعد کسی بادشاہ کے دماغ میں ان باتوں کی بو بھی نہ رہی۔ بنیے تھے کہ گدی پر بیٹھے تھے۔ ان کی قسمتیں لڑتی تھیں اور امرا فوجیں لے کر مرتے پھرتے تھے۔ اس کا کیا سبب سمجھنا چاہیے؟ ہندوستان کی آرام طلب خاک، باوجود گرمی کے سرد مہر ہوا، اور بزدل پانی، روپے کی بہتات، سامان کی کثرت یہاں جو انکی اولاد ہوئی، ایک نئی مخلوق ہوئی" (ص ۲۰)

آزاد کی جادو نگاری اور طلسم کاری مسلّم۔ لیکن آرام طلب خاک، سرد مہر ہوا، بزدل پانی، روپے کی بہتات اور سامان کی کثرت تو آج بھی ویسی ہی بلکہ اُس سے بدرجہا زیادہ ہے جیسی اورنگزیب محمد شاہ پیا کے زمانہ میں تھی۔ پھر کیا بات ہے کہ موجودہ مغربی حکمراں قوم ابتدائی کمپنی کے زمانہ سے اب تک تین سو برس پورے کر لینے پر، روز افزوں طاقت کے ساتھ آج بھی باقی ہے اور بظاہر ابھی بہت دنوں رہیگی؟

تاریخ میں اکبر کے حالات پڑھو۔ چاہے وہ ابوالفضل کے قصیدہ نگار قلم کے بجائے بداؤنی کے واقعہ نویس قلم ہی کے لکھے ہوں۔ جہاں تم یہ دیکھو گے کہ اکبر جاہل تھا، بد مذہب تھا، دین الٰہی کا موجد تھا، وہیں یہ بھی دیکھو گے کہ وہ جری اور جفاکش سپاہی تھا کہ یلغاروں میں ہفتوں کی راہ دنوں میں طے کرتا تھا۔ بلند ہمت اور اولوالعزم فاتح تھا کہ برسوں میں تسخیر ہو سکنے والے ملکوں کو مہینوں میں فتح کر لیتا تھا۔ تجربہ کار اور صاحب تدبیر جنرل تھا کہ حملوں میں تھوڑی سی فوج سے ٹڈی دل لشکروں کو زیر و زبر کر دیتا تھا۔ باخبر اور رعایا پرور بادشاہ تھا کہ جن ملکوں کو فتح کرتا تھا وہاں کا قرار واقعی انتظام کرتا اور مختلف الاقوام رعایا کو غلام بنانے کی جگہ عاشق بنا لیتا تھا۔ وہ بہادر تھا، نڈر تھا، غیرتمند تھا۔

بارہ تیرہ ہی برس کا بچہ تھا کہ باپ کے مرنے پر، کھیل کود سے ہٹا کر بیرم خاں کی اتالیقی میں تخت[۵۲] پر بٹھا دیا گیا۔ بیرم خاں سمجھا تھا کہ لڑکے کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔ مگر لڑکے کی رگوں میں صاحبقران[۵۱] اور ژندہ پیل کا خون تھا۔ اُس نے چار ہی برس بعد بیرم کو رستہ بتا کر سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور تخت پر

---

۵۱ امیر تیمور گورگان صاحبقران۔ اکبر کے باپ ہمایوں کا مورث اعلیٰ۔

۵۲ شیخ الاسلام حضرت سید ژندہ پیل احمد جام نیشاپوری۔ اکبر کی ماں حمیدہ بانو کے مورث اعلیٰ۔

سنبھل کو بیٹھا۔ جانتے ہو اُس وقت اُسکی حکومت کی حد کہاں سے کہاں تک تھی؟ لاہور سے لے کر آگرہ کے
قرب وجوار تک! مگر بہادر اور مدبر نوجوان شاہ نے حدود کو وسعت دینی شروع کی اور عمر بھر کی محنت
اور کوشش سے ہندوستان کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو کہیں تلوار سے، کہیں تدبیر سے سمیٹ کر اپنی قلمرو میں
شامل کر لیا۔ یہاں تک کہ ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء میں جب مرا ہے تو، حال کی جغرافی اصطلاح میں احاطۂ مدراس،
ریاست حیدرآباد اور احاطۂ بمبئی کا جنوبی مغربی حصہ چھوڑ کر، ہندوستان کا کل برِ اعظم اور پورا
افغانستان اُسکے زیر نگیں تھا۔

اسکے بعد مروج الدین۔ عالی گہر۔ شاہ عالم کے حالات پڑھو۔ شہزادگی کے زمانے میں جبکہ تیس تیس
برس کے ادھیڑ تھے، ستر برس کے بڈھے باپ کو اکیلا دشمنوں میں گھرا چھوڑ کر وزیر کے ڈر سے گھر سے نکل بھاگے۔
سہارنپور۔ فرخ آباد۔ بدایوں۔ بریلی۔ لکھنؤ کی خاک چھانتے عظیم آباد پہونچے اور میر جعفر کے ناخواندہ مہمان
ہوئے۔ وہیں پڑے تھے کہ عماد الملک وزیر نے دلی میں بادشاہ کو قتل کر دیا۔ باپ کی موت کی خبر سن کر
جگہ سے نہ ہلے بلکہ ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء میں عظیم آباد ہی میں نام کی بادشاہی کے مالک بنے۔ شجاع الدولہ وزیر کے ساتھ ہو کر انگریزوں
سے لڑے۔ کمپنی کی فوج کے ہاتھوں بکسر کے میدان میں ایسی بری طرح شکست کھائی کہ بادشاہی کا رہا سہا
بھرم کھل گیا اور کمپنی کے اقتدار کا سکہ سارے ہندوستان میں بیٹھ گیا۔ شکست کے بعد ہی جنرل منرو
کو قلم خاص سے شقۂ تہنیت لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "میں خوشی سے نہیں لڑا، بلکہ وزیر کا قیدی ہوں
خدا کے لیے مجھے قید سے چھڑاؤ اور معاوضہ میں بزرگوں کی ہڈیاں جتنی چاہو لے لو"۔ اسکے بعد ہی فاتح
فوج کے پیچھے پیچھے الٰہ آباد پہونچے۔ یہاں ندی سے نکل کے کنوئیں میں گرے۔ یعنی شجاع الدولہ کی قید
سے چھوٹ کر جنرل اسمتھ کی قید میں پھنسے۔ اسی حالت میں وہ تین صوبے جن کی مردم شماری تین کرور
نفوس اور محاصل سالانہ چار کرور روپئے تھے اور جن کی تسخیر میں باپ دادوں کو برسیں لگی تھیں اُتنی دیر
میں، جتنی دیر میں بقول فارسی مورخ کے "خرید و فروختِ اسپ راہوار یا خر بار بردار ہم نمی تواند شد"
کمپنی کی نذر کر دیے۔ اور سلطنت کے تخت کے بجائے کھانے کی میز کے اوپر مسند آرا ہو کر سند عطائے دیوانی
بنگال وبہار و اڑیسہ پر مہر مبارک ثبت فرمادی۔ اسکے بعد کنوئیں سے بھی نکل کر بھاگے تھے کہ آگ میں
گر پڑے۔ یعنی کمپنی کی قید سے نکلے تھے کہ مرہٹوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے جو اُس وقت ہند کی سلطنت
کے مالک اور اکبر کے تخت پر قابض تھے۔ مرہٹوں کی ذرا آنکھ چوکی تھی کہ پٹھان چڑھ دوڑے اور خزانہ
کا روپیہ پیسہ بلکہ شہزادیوں کے ہاتھ گلے کا گہنا زیور تک ہتیا لے گئے اور جاتے جاتے غلام قادر خود بدولت

کو بینائی کی دولت تک سے محروم کر گیا۔ مدتوں اس عذاب میں گرفتار رہنے کے بعد انگریزوں کی ملکی مصلحت نے مرہٹوں کا استیصال کیا۔ جنرل لارڈ لیک نے کوٹھری سے نکالا اور تخت پر مرنے کے لیے بٹھا کر پھر تاج پہنایا گیا۔ ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء میں اس عیش پرست، تن پرور، پست ہمت، بدعقل، متلون مزاج، ڈرپوک اور بے غیرت زندگی کا خاتمہ ہوا۔

قلم کانپتا ہے کہ یہ الفاظ اُس شخص کی شان میں لکھنا پڑے جو مجاور بھی تھا مگر گورگانی اور صاحبقرانی جبروت کے مقبرے کا مجاور تھا۔ مگر کیا کیجیے پہلی تصویر سے مقابلہ کے لیے دوسری تصویر بھی اس طرح کھینچنی پڑی کہ سب خط و خال نمایاں ہو جائیں۔ اب غور سے دیکھو اور سچائی سے جواب دو۔ دونوں تصویروں میں کسی بات میں خفیف سی بھی مشابہت ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

کیا تم کہہ سکتے ہو کہ کمزور دل عالمگیر ثانی اور بزدل شاہ عالم کے جسموں میں بھی وہی تیموری خون تھا جو شیر دل بابر اور دلیر دل اکبر کی رگوں میں بجلی کی تیزی سے دوڑتا تھا؟ تم جواب نہیں دے سکتے۔ ذرا صبر کرو۔ اس کا جواب تاریخ کے معمل میں اکبر کے جانشینوں کے خون کے تجزیہ و تحلیل کیمیاوی کے بعد ابھی دیا جاتا ہے۔

پہلے تین باتیں ذہن نشین کر لو:۔

۱۔ انسان کے جسم میں خون کی مقدار طبی قاعدہ سے کتنی ہی ہو، حساب کی آسانی کے خیال سے اُسے دو سیر مانا گیا ہے۔

۲۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ بچہ کے جسم میں آدھا خون باپ کا اور آدھا ماں کا آتا ہے۔

۳۔ فرق دکھانے کے لیے ولایتی خون کو دودھ اور ہندی خون کو گنگا جل کا نام دیا گیا ہے۔

اب دیکھو:۔

نام بادشاہ	رگوں میں مادہ سیال کا وزن اور نام	نام رانی مع نام شہزادہ جو اُسکے بطن سے ہوا	رگوں میں مادہ سیال کا وزن اور نام
جلال الدین اکبر ابن ہمایوں	دو سیر دودھ	جے پوری رانی[1] دختر راجہ بہاری مل کچھواہہ والی ریاست جیپور اسکے بطن سے جہانگیر ہوا۔	دو سیر گنگا جل

[1] منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی مطبوعہ کلکتہ جلد ۲ صفحہ ۵۰۰ - مآثر الامرائے تیموری مطبوعہ کلکتہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۲ - بلیس اونیل بیاگرفیکل ڈکشنری لندن ص ۱۸۱ و ۱۹۱ و ۲۳۳ - امرائے ہنود ص ۷۷

نورالدین جہانگیر ابن اکبر	ایک سیر دودھ اور ایک سیر گنگا جل	جودھا بائی[۵۴] دختر مہاراجہ اودے سنگھ راٹھور والی ریاست جودھ پور　اسکے بطن سے شاہجہاں ہوا	دو سیر گنگا جل
شہاب الدین شاہجہاں ابن جہانگیر	آٹھ چھٹانک دودھ اور ایک سیر آٹھ چھٹانک گنگا جل	ارجمند بانو ممتاز محل دختر آصف خاں اسکے بطن سے عالمگیر ہوا	دو سیر دودھ
محی الدین عالمگیر ابن شاہجہاں	ایک سیر چار چھٹانک دودھ اور بارہ چھٹانک گنگا جل	نواب بائی[۵۵] دختر راجہ راجو والی ریاست راجوری کشمیر اسکے بطن سے بہادر شاہ ہوا	دو سیر گنگا جل
قطب الدین محمد معظم شاہ بہادر ابن عالمگیر	دس چھٹانک دودھ اور ایک سیر چھ چھٹانک گنگا جل۔	امام بائی[۵۶] لال کنور اسکے بطن سے جہاندار شاہ ہوا	دو سیر گنگا جل
معزالدین جہاندار شاہ ابن بہادر شاہ	پانچ چھٹانک دودھ اور ایک سیر گیارہ چھٹانک گنگا جل۔	انوپ بائی[۵۷] اسکے بطن سے عالمگیر ثانی ہوا	دو سیر گنگا جل
عزیزالدین عالمگیر ابن جہاندار شاہ	ڈھائی چھٹانک دودھ اور ایک سیر ساڑھے تیرہ چھٹانک گنگا جل	لال کنور[۵۸] اسکے بطن سے شاہ عالم ہوا	دو سیر گنگا جل
مروج الدین شاہ عالم ابن عالمگیر ثانی	سوا چھٹانک دودھ اور ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک گنگا جل		

تحلیل کیمیاوی کا نتیجہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا؟ کسی ایک واقعہ میں ذرا سی غلطی یا حساب میں ذرہ بھر فرق ہو تو کہو۔ سوا چھٹانک دودھ اور ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک گنگا جل! جل جلالہٗ!!

قصہ کہانی نہیں ہنسی مذاق نہیں۔ ٹھوس واقعہ اور ٹھیٹ سچائی ہے۔ تم اپنے طور پر ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک پانی میں سوا چھٹانک دودھ کی بوندیں ڈالو اور انصاف سے بتاؤ کہ تم اس مرکب کو کیا کہو گے۔ کیا یہ دودھ ہو گیا؟ کیا یہ پانی رہ گیا؟ کیا یہ دو سیر خالص دودھ کا کام دے سکتا ہے؟

---

[۵۴] بداؤنی ج ۲ ص ۳۳۱۔ مآثرالامرا ج ۲ ص ۱۸۱۔ بیل ص ۲۰۲ و ۳۶۳ و ۴۰۷۔ امرائے ہنود ص ۴۹۔

[۵۵] مآثر عالمگیری۔ مآثرالامرا۔ خافی خاں ج ۲ ص ۲۶۴ و ۵۹۴ و ۶۰۴۔ تاریخ اورنگ زیب جادو ناتھ سرکار جلد اول ص ۶۱۔

[۵۶] مآثر عالمگیری۔ بیل ص ۱۹۲ و ۳۰۰

[۵۷] بیل ص ۴۹ و ۴۷

[۵۸] بیل ص ۱۰۹ و ۳۶۱ و ۴۲۸

کیا یہ صاف پانی کی جگہ پینے یا نہانے دھونے میں استعمال ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر سمجھ لو کہ سوا چھٹانک تیموری خون، ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک مجہول ہندو خون میں مل جانے کے بعد اصلی اور صحیح تیموری خون کی حرارت۔ غیرت اور جرأت کیسے پیدا کر سکتا ہے!

ہم نے چھانٹ کر جن سات رانیوں کے نام گنائے وہ ایسی ہیں کہ اُن کے پتی بھی مکٹ دھاری تھے اور پُتر بھی مکٹ دھاری ہوئے۔ اور اس لیے نسب کا سلسلہ اوپر سے نیچے تک سیدھا چلا آیا جس سے خون کی مقدار کا صحیح حساب ہو سکا۔ ورنہ قلعہ میں تو ہندو رانیوں کی اتنی کثرت تھی کہ محل کو رنواسا کہنا زیادہ موزوں تھا۔

ذیل کی فہرست پر ایک نظر ڈالو۔ اگرچہ اسکے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے اب بھی بہت سی رانیوں کے نام رہ گئے ہوں مگر جتنے لکھے ہیں تاریخی ثبوت کے ساتھ لکھے ہیں:-

نام بادشاہ یا شہزادہ	نام رانی	تاریخی حوالہ
بادشاہ اکبر	۱۔ جے پوری رانی دختر راجہ بہاری مل کچھواہہ والی جے پور	بداونی ج ۲ ص ۵۰۔ ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۱۲۔ بیل ہسٹاریکل گزیٹیر ص ۱۰۸ و ۱۹۱ و ۴۴۳۔ امرائے ہنود ص ۷۷
	۲۔ دختر راجہ کلیان مل والی بیکانیر	بداونی ج ۲ ص ۱۳۳
	۳۔ دختر راجہ ڈونگر پور	ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۱۶۔ امرائے ہنود ص ۸۸۔
	۴۔ تارا رانی	بیل
	۵۔ من بھاوتی رانی	بیل
بادشاہ جہانگیر	۶۔ جے پوری رانی دختر راجہ بھگوان داس کچھواہہ والی جے پور	بداونی ج ۲ ص ۳۴۱۔ ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۳۰۔ خافی خاں ص ۲۴۵ بیل ۱۰۶ و ۲۲۰ و ۳۶۲۔ امرائے ہنود ص ۸۲
	۷۔ بال متی جودھا بائی۔ دختر راجہ اودے سنگھ راٹھور والی جودھ پور	بداونی ج ۲ ص ۱۳۳۔ ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۸۱۔ بیل ص ۲۶ و ۲۶۳ و ۴۰۷۔ امرائے ہنود ص ۴۹۔
	۸۔ دختر راجہ رائے سنگھ پسر راجہ کلیان مل راٹھور والی بیکانیر	بداونی ج ۲ ص ۳۵۲۔ ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۵۲۔ بیل ص ۳۲۹ امرائے ہنود ص ۲۱۴
	۹۔ دختر راول بھیم والی جیسلمیر	بیل ص ۲۳۷۔ امرائے ہنود ص ۲۸۵
	۱۰۔ دختر راجہ کیشو داس راٹھور پسر راجہ جے مل	بیل۔ ص ۲۱۰

	۱۱- دختر راجہ جگت سنگھ کچھواہہ پسر مرزا راجہ مان سنگھ	ماثرالامرا - ج ۲ ص ۱۷۵ - خافی خاں ص ۲۵۹ - امرائے ہنود - ص ۱۴۵ -
	۱۲- دختر راجہ رام چند بندیلہ والیِ اورچھا	ماثرالامرا - ج ۲ ص ۲۱۳ - امرائے ہنود - ص ۱۰۰ -
شہزادہ پرویز ابن جہانگیر	۱۳ - دختر راجہ سورج سنگھ راٹھور والی جودھپور	بیل - ص ۱۳۹
شہزادہ مراد بخش ابن شاہجہاں	۱۴- سرستی بائی	ماثرالامرا - ج ۲ ص ۲۸۵ - خافی خاں ج ۲ ص ۱۵۵ - جادوناتھ سرکار ج ۲ - ص ۹۰
شاہزادہ شجاع ابن شاہجہاں	۱۵ - دختر راجہ کنو سین کشتواری	امرائے ہنود - ص ۳۰۰
شہزادہ سلیمان شکوہ ولد داراشکوہ	۱۶ - دختر راجہ گج سنگھ راٹھور ولد راجہ سورج سنگھ	بیل ص ۱۳۹ - خافی خاں -
بادشاہ عالمگیر	۱۷ - نواب بائی دختر راجہ راجو والیِ ریاست کشتوار	ماثر عالمگیری - ماثرالامرا - خافی خاں ج ۲ ص ۲۶۴ و ۵۹۴ و ۶۰۴ - جادوناتھ سرکار ج ۱ - ص ۶۱
محمد اعظم ابن عالمگیر	۱۸ - دختر راجہ جے دھج سنگھ والی آسام و عزیز راجہ کوچ بہار	ماثر عالمگیری ص ۷۳
	۱۹ - بائی اُتم گیر	ماثر عالمگیری ص ۲۳۴
کام بخش ابن عالمگیر	۲۰ - کلیان کنور - منوہرپوری رائے دختر امر سنگھ زمیندار منوہرپور	خافی خاں ج ۲ ص ۵۱۰ - ماثر عالمگیری ص ۲۱۱
محمد سلطان ابن عالمگیر	۲۱ بائی بھوپ بائی دختر راجہ کشتوار	ماثر عالمگیری ص ۱۴۸
بادشاہ محمد معظم بہادر شاہ ابن عالمگیر	۲۲ - دختر راجہ روپ سنگھ راٹھور برادر عمزاد مہاراجہ جسونت سنگھ	ماثرالامرا ج ۲ ص ۲۷۰ - ماثر عالمگیری ص ۷۳ و ۴۹
	۲۳ - نظام بائی لال کنور	ماثر عالمگیری - بیل ص ۱۹۰ و ۳۰۰
بادشاہ جہاندار شاہ ابن بہادر شاہ	۲۴ - انوپ بائی	بیل ص ۴۹ و ۲۰۰
	۲۵ - لال کنور	بیل ص ۱۹۰ و ۲۲۶ - زبدۃ الاخبار قلمی ص ۱۰۴ و ۱۰۵
شہزادہ عظیم الشان ابن بہادر شاہ	۲۶ - دختر کیرت سنگھ یا کیسری سنگھ	ماثر عالمگیری ص ۱۶۷ و ۱۸۲
بادشاہ فرخ سیر	۲۷ - دختر مہاراجہ اجیت سنگھ پسر مہاراجہ جسونت سنگھ - جودھپور	بیل ص ۴۵ و ۱۳۰ - زبدۃ الاخبار قلمی ص ۱۰۹ - امرائے ہنود ص ۱۷ - یہ آخری راجپوتنی تھی جو مغلی حرم سرا میں آئی

بادشاہ		
بادشاہ محمد شاہ	۲۸- اودھم بائی	بیل ص ۴۲ و ۲۸۴ و ۳۰۸ و ۴۰۷ - عماد السعادت -
بادشاہ عالمگیر ثانی	۲۹- بلال کنور	بیل ص ۱۰۹ و ۳۶۱ و ۴۳۸
بادشاہ اکبر ثانی	۳۰- لال بائی	بیل ص ۹۵ - اسکے بطن سے خاتم السلاطین سراج الدین بہادر شاہ ظفر پیدا ہوئے

یہ راجکماریاں تیموری قلعہ میں آنے کے بعد اپنے دھرم کے مطابق پوجا پاٹ کرتی تھیں۔ ٹھاکر جی کو جل پھول چڑھاتی تھیں، تلک لگاتی تھیں، پرکرما کرتی تھیں، ہون کرتی تھیں[۱]۔

یہ بھی سنا ہے کہ ہندو رانیوں کا ڈولا لانے کے بعد، تیموریوں نے بہ استثنائے اورنگ زیب[۲] علی اللہ مقامہ کے، اسلامی سنّتِ ختان کو یک قلم اُٹھا دیا تھا تاکہ غیر جنسیت کا خیال تک نہ آنے پائے؟

جس نسل نے اپنے خون اور اپنے حالات کو یہاں تک بدل دیا ہو اسکے بقا کی تم کیا اُمید رکھ سکتے تھے! گنگا اور جمنی کے اوتار، مہابلی مہاراج اکبر نے "مسلم ہندو خون کے میل" کی جو رسم قائم کی اور جس پر (اور صرف اُسی پر) اُسکے جانشینوں نے آخری وقت تک[۳] عمل کیا اُس رسم نے اور صرف اُسی رسم نے تیموری نسل، تیموری خون، اور تیموری حمیت کو گنگا کی منجدھار میں ڈبو دیا!!

---

[۱] "قلعہ کے محل میں ایک طرف پرکھنا اور دوسری طرف مندر کے آثار اس وقت تک پائے جاتے ہیں۔ جس سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ محلات شاہی میں راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے مذہب کے رسوم اور عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔" امرائے ہنود - ص ۵۰

[۲] "سنت سنیۂ ختنۂ تازہ نہال حشمت محمد اکبر تبقدیم رسید۔" مآثر عالمگیری - ص ۲۸

"سنت ختان بادشاہزادہ محمد کام بخش زیب سرانجام وحسن اقتدام یافت۔" مآثر عالمگیری ص ۱۲۷

[۳] "اکبر کے سامنے ایک پراچین پتر پیش ہوا کہ الٰہ آباد میں مکند برہمچاری (جس نے اپنا سارا بدن کاٹ کاٹ کر ہون کر دیا تھا) اپنے چیلوں کے لیے ایک اشلوک لکھ کر رکھ گیا تھا کہ ہم عنقریب ایک بااقبال بادشاہ ہو کر آئیں گے اُس وقت تم بھی حاضر ہونا۔ بہت سے برہمن بھی اُس پتر کے ساتھ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ جب سے آج تک مہاراج پر دھیان گیان جمائے بیٹھے ہیں۔ حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اُس کے مرنے اور اکبر کے پیدا ہونے میں صرف تین چار مہینے کا فرق تھا۔" دربار اکبری ص ۸۴ - نیز دیکھو بداؤنی ج ۲ ص ۲۳۶ -

[۴] سب سے آخری بادشاہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر جس عورت سے پیدا ہوئے تھے اُس کا نام لال بائی تھا - دیکھو بیل ص ۹۵ -

میں کہتا ہوں کہ سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال کے اسباب بادشاہوں کی کاہلی، عیش پرستی، خود پسندی، بے ہمتی، بزدلی اور نالایقی تھے اور یہ اسباب پیدا ہوئے محض خون کی خرابی (اور اس لیے خیالات کی پستی) سے۔

میرے کہنے کا یقین نہ ہو تو ایک نہایت مستند رائے پیش کرتا ہوں: فرانس کے مشہور فلسفی، مستشرق، مورخ، مصنف ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی بیش بہا تصنیف 'تمدن عرب' میں عربوں کے تنزل کے اسباب گناتے ہوئے ایک قومی سبب اُن کا ادنیٰ قوموں کے ساتھ میل جول اور شادی بیاہ بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ان مختلف اقوام .... کے ازدواج و امتزاج کی وجہ سے عربی خون کی خاصیت بہت جلد بدل گئی" (ص ۵۴۹)

"ایک ہی ملک میں مختلف اقوام کا گھُل مل جانا ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ ..... حکومت قائم رکھنے کے لیے ...... نہایت ضروری ہے ..... کہ فاتح قوم مفتوح قوم سے ازدواج و امتزاج نہ کرے اور اُن میں گھُل مل نہ جائے۔ عربوں نے اس ..... کا کبھی خیال نہ کیا۔ رومیوں نے کچھ دنوں اس کا خیال رکھا اور اُن کا تنزل اُسی دن سے شروع ہوا جس دن سے اُنھوں نے اس امر کا لحاظ رکھنا چھوڑ دیا" (ص ۵۵۰)

"عرب برابر اُن اقوام سے جنکے ساتھ رہتے رہے ازدواج و امتزاج کرتے رہے ..... اس ازدواج و امتزاج سے اُنکے قومی خصائص کا تلف ہو جانا ایک لازمی امر تھا ...... محض یہ امتزاج اقوام ...... اُنکے تنزل کے لیے کافی تھا" (ص ۵۵۱)

فقیر مصئون العلی

لعبتِ ماضی

حالِ ما ہست نیوں، تار دسیہ مستقبل　　بادۂ از ماضی شیریں سخنے یاد کنم

بادہو افگنم از تارِ کہن در صحرا　　چمنے از ہمیں ویراق گل آباد کنم

لیک آں لعبت فرسودہ ترا نفرسید　　بہ چہ لے کودکِ دل خاطر تو شاد کنم

یم ما

شکستہ دل

شمشاد کے خصائل کے اس تجزیہ میں اُسکے اطوار و عادات کے اس انعکاس میں رنگ آمیزی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ فطرتِ انسانی کے مختلف اشکال میں یہ صورت مفقود تو نہیں مگر کمیاب ضرور ہے۔ میں اُن چند لوگوں میں سے ہوں جن کو اس کیرکٹر کے نکات کو نگاہِ تعمق سے معائنہ کرنے کے مواقع حاصل ہوئے ہیں، اس تحریر کا ایک ایک حرف ایک ربع صدی کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے کیونکہ ہم لوگوں کے اولین تعارف کو اتنا ہی عرصہ گذر چکا ہے۔ آہ! وہ بھی کیا ایامِ مسرت تھے جب کالج کے داخلہ پر ہم لوگ متعارف ہوئے، جسم میں خونِ شباب تھا اور دل میں آرزوؤں کا جوش، بلند خیالات کی فراوانی تھی، افکار سے مستغنی تھے، اب کیا ہے؟ نہ وہ سن و سال، نہ جسم کی وہ توانائی۔ میں اُس عہد کے صرف دو روز کے دوبارہ محظوظ ہونے کے لیے کیا کچھ دینے کے لیے طیار ہوں مگر اس سودے کا کرنے والا کون ہے؟ افسوس، کوئی نہیں!

عام لوگوں کی نگاہ میں شمشاد میں خوش مزاجی کا فقدان تھا۔ اور انکی رائے میں تندی، درشتی اور تلخی اُس کے مزاج کا جزو لاینفک ہیں۔ وہ اُس کی سادگی اور صاف گوئی کو ہدفِ ملامت بناتے اور اسکی ہر حرکت کے لیے موردِ الزام ٹھہراتے مگر جمہور کی ان مخالف رایوں نے اُسے کبھی اپنی تنقیہ کیلیے بھی متفکر نہیں کیا۔ اُن حضرات کو جو جمہور کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنا اپنا فرض اولیں خیال کرتے ہیں، وہ انکو پسندیدگی سے نہ دیکھتا تھا۔ وہ انکی اس رغبت کو طبیعت کے ضعف اور اخلاق کی کمزوری پر محمول کرتا اور کہتا کہ عام ہمیشہ اصلیت سے ناآشنا رہا ہے اس کی اس حقیقت ناآشنائی سے مرعوب ہو جانا کیا معنی؟ اس نظریہ کو پیشِ نظر رکھنے سے وہ جمہور کی اُن سرگوشیوں سے جن کا انحصار محض سطح النظری پر ہوتا ہے، متأثر نہیں ہوا۔ شمشاد طبعی طور پر سادہ حسنِ اخلاق کا دلدادہ تھا، تصنع سے اُسے فطرتاً نفرت تھی مگر چونکہ سوسائٹی کے ہر فرد کے اخلاق میں تصنع کی آمیزش موجودہ تہذیب میں ازبس ضروری ہے لوگ اسکے رویہ کو آدابِ محفل کے خلاف کہتے اور سرگوشیاں کرتے مگر انجام کیا ہوتا، کچھ نہیں!

اہلیانِ محفل کے وہ طالبِ خندہ لطائف جو اُن کی نظر میں تو مذاق و دلچسپی کے تمام تر پہلوؤں پر حاوی ہوتے مگر حقیقتاً ظرافت کا شائبہ تک نہیں رکھتے، اُسے ازراہِ اخلاق خنداں و متبسم نہ

پر مجبور نہ کر سکتے تھے۔ اسی طرح وہ کسی کے خلافِ فطرت بیانات پر کوئی کلمۂ تنقیص زبان پہ نہ لاتا اور بجائے اسکے کہ اکثریت کی فطرت کے مطابق تہذیب کو دخل دے کر انکو کراہیۃً تسلیم کرے، انکی صداقت کو مشکوک خیال کرتا اور انکو قبول کرنے سے صاف انکار۔ یہ صاف گوئیاں لوگوں کو چراغ پا کر دیتیں اور اُسے بداخلاقی کا مجرم قرار دیتیں۔ افراد مجھے بھی نظر استعجاب سے دیکھتے کہ کس طرح مجھ سے اور شمشاد سے اس قدر تعلقات ہیں مگر وہ غالباً اس حقیقت سے ناآشنا تھے کہ سمندر کی متلاطم امواج جو سطحِ آب پر طوفان برپا کر دیتی ہیں، عمیق تہوں میں اپنا ذرا بھی اثر نہیں رکھتیں۔ عظیم الشان جہاز کا ان لہروں کے غیظ و غضب سے پتہ نہیں چلتا کوئی شے ایسی حالت میں سطح پر متہیج ہوئے بغیر نہیں رہتی مگر پانی کے عمق میں کمزور سے کمزور چیز ان انقلابات سے متاثر نہیں ہوتی، وہ بجنسہ ساکت و خاموش رہتی ہے۔ بس اسی طرح اگر وہ شمشاد کی اس "بدتہذیبی" کو دانشمندانہ طریقے سے نظر انداز کرتے اور اُس کے پُر از خلوص دل کی گہرائیوں میں متلاشی ہوتے تو اُن پر حقیقت کا انکشاف ہوتا۔

سادگی کی اس پاسداری اور تصنع کی اس مخالفت کے سلسلہ میں یہ امر بھی قابل تحریر ہے کہ "حسن کامل" کی وہ متحرک تصاویر جو اپنی عشوہ طرازیوں سے ہر متنفس کو مثل دیوار مجسمۂ حیرت بنا دینا، اپنا حق تصور کرتی ہیں، اس کے سکون قلب میں کچھ بھی تغیر نہ پیدا کر سکتی تھیں۔ ایسے بتانِ ماہ رُو جلی بے محابا نگاہیں ناز و انداز سے متاعِ دل پر قابض ہو جانے کے ہنر سے خوب واقف تھیں، اُسکے خیالات میں ذرا بھی ہیجان نہ پیدا کر سکتے تھے۔ خوبصورت میا و جو اپنے فن میں شہرہ آفاق تھے اپنے تمام جالوں کو یہاں بیکار اور اپنے اسلحہ کو ناکارہ پاتے تھے۔ اُنکے خرام ناز کی وہ مستانہ لغزشیں جو ہر قدم پر صدہا فتنے برپا کر دیتی ہیں، اُس کی ایک نظر غائر کی بھی اہل نہ تھیں۔ "دزدیدہ نظریں" اُسکے لیے کشش کے بجائے گریز پائی کا موجب ہوتیں۔ وہ کہتا کہ انکی ہر ادا، ہر انداز میں آمیزشِ تصنع ہے، اُنکی نگاہوں کے عمیق پردوں میں وہ نورِ معصومیت جلوہ گر نہیں جو ایک دوشیزہ کی پاک ملکیت ہے، اُنکے حرکات میں وہ حیا و شرم کی دلفریبی نہیں جو قدرت صنف نازک کے معصوم طبقہ کو ودیعت کرتی ہے، اور اُنکی چال میں وہ معصومانہ سحر نہیں جو پاکباز ہستیوں کے لیے مخصوص ہے۔ بھولاپن اُسکے نزدیک حسن کی روح ہے اور اسکی تحلیل پر حسن حسن نہیں رہتا اور

حسین حسین نہیں رہتا - ایک پیکرِ دلفریبی اُس وقت تک قابلِ پرستش ہے جب تک اُسے اپنے حسین ہونے کا علم نہ ہو - اس رمز سے آشنا ہو جانا معصومیت کا خون ہے اور پھر تصنع اور خود نمائی کا اُسکا جانشیں ہو جانا ایک فطرتی امر !!

لٹریچر سے اُس کا خاص شغف اور خصوصاً شاعری سے اُس کی دلچسپی بھی لائقِ بیان ہے - وہ حقیقی معنوں میں شاعر تھا، اُسکی ہر نظم ایک وجدانی ذوق کی آئینہ دار ہوتی تھی، اُسکے اشعار میں 'خالِ سیہ' اور 'زلفِ شکیں' کی تعریف کی اُمید رکھنا لاحاصل تھا - اُسکے نزدیک گل و بلبل کے افسانے اپنی فرسودگی سے پریشان کن ہو چکے تھے - اب موزوں طبائع کو فطرت کی طرف اپنی عنان توجہ منعطف کرنا تھی - بندش کی سادگی، خیالات کی بلند پروازی، خوبیِ بیان، پاکیزگیِ نظم کے شواہد پیش کرتی تھیں اور فصاحت ان سب پر گویا چلا تھی - اُسکے کلام کا مطالعہ اس امر کا مظہر ہوتا تھا کہ شاعر کے دل میں دیگر شعرا کی طرح یاس و محرومی کے جذبات متہیج نہیں ہیں - ایسا معلوم ہوتا کہ وہ دل جو اپنی تلاش میں کامراں ہو چکا ہے، جو منزلِ مقصود پر پہونچ چکا ہے، جو حصولِ وصل سے مطمئن ہے، جو صرف اب کیفِ مسرت اور نشۂ آسودگی سے مخمور ہے گویا ہو رہا ہے - اور یہ حقیقت تھی کیونکہ مناظرِ قدرت اور نقوشِ فطرت ہر وقت جلوہ فرمائی میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی عنایات میں شخصیت کا لحاظ نہیں کرتے - حسنِ بشری جس کے خیالات کا تبدل عشاق کے سروں پر رنج و محن کی سیاہ گھٹائیں چھا سکتا ہے، اپنا پرتو مناظرِ قدرت پر نہیں ڈال سکتا - وہ نظم میں فارسی و عربی کے اُن ثقیل الفاظ کا بھی مخالف تھا جو تصنع کے وجود کے ذمہ دار ہوتے ہیں - استعارات سے خالی اور مبالغہ سے مبرا ہندی اشعار اُس پر ایک وجد طاری کر دیا کرتے تھے - زبان کی بیساختگی اُسکو مسحور کر دیتی تھی، وہ پڑھتا اور اُسکی دلگدازی سے بیتاب ہو ہو جاتا - حقیقتہً ہندی شاعری حسیات روح میں تموجات پیدا کرتی اور دل کی رگ رگ کو مضطرب کر دیتی ہے !!

میرے مطامحِ نظر شمشاد سے ایک صنف خیالات میں ہمیشہ مختلف رہے - وہ جب کبھی سویرا صبح کو میرے ساتھ چہل قدمی کے لیے جاتا، ایسے آرا کا اظہار کرتا جس کی تائید مجھ سے ناممکن ہوتی - مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ وہ فطرت کی دلفریبی میں محو ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ خوبصورتی کی اس سے بہتر نمایش کہیں اور نہیں ہو سکتی - اُس کا قول ہے کہ قدرت وہ سادہ رنگوں کی بہار دکھاتی ہے، وہ

وہ سینری وہ نظارے پیش نگاہ کرتی ہے کہ دل عشق عشق کرنے لگتا ہے۔ دیکھو یہ خوبصورت سبزہ، یہ دلکش سبزوادیاں، یہ درختوں پر مرغانِ چمن کے چہچہے، یہ فضا میں چھوٹی چڑیوں کا پیہم رقص، یہ تمام عالم پر مائل غروب آفتاب کی طلائی شعاعوں کی جلا، یہ قوس قزح کی رنگینیاں اور یہ کہکشاں کی جلوہ آرائیاں بس حسن و دلکشی میں نظیر نہیں رکھتیں۔ فطرت پر اتنا اظہار تعشق میں مبالغہ سے تعبیر کرتا ہوں میں نیچر کی دلکشی کا قائل ضرور ہوں، میری نظریں اُس سے سُرور و نور کی تحصیل ضرور کرتی ہیں مگر یہ سب کچھ ایک حد تک ہے۔ اسکے تسلیم کرنے کے ساتھ ہی میں اس اعتراف سے بھی گریز نہیں کرتا کہ نیچر کی خوبصورتی نا مکمل ہے، اُسکو دلفریبی کا معیار قرار دینا نادرست ہے، صنعت بشری مقابلۃً کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت کہ انسان جب کسی میدان یا صحرا میں پہونچتا ہے، اپنی شخصیت کو ذلیل خیال کرنے لگتا ہے، اُس میں اور دیگر مخلوقات میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ میرے احساس خودداری کو آتشیں اُنگلیوں سے ٹھیس لگاتی ہے۔ ایک عمارت انسان کی قابلیت کا ادنیٰ نمونہ ہے مگر اُسکے نظارہ سے اُسے اپنی قوت ولیاقت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ فطرت کی رنگ آمیزی انسان کی صنعت کے روبرو عرق انفعال سے نہا جاتی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ فطرت کی دسترس بڑے پیمانہ پر ہے انسان کی ایک مختصر دائرہ



چار سال کی موانست کے بعد دست قسمت نے ہم لوگوں کو علیحدہ کیا۔ اوائل فراق کے زمانے میں ہم لوگوں پر کیا گذری؟ یہ کچھ ہمارے دل ہی جانتے ہیں۔ بس اس عرصہ میں زخمہائے الفت کا اندمال اُس کی تحریر کا رہینِ منت رہا۔ اُسکے یہاں دولت کے تبسم کا انعکاس تھا مگر برخلاف اسکے مجھے ضروریات زندگی کے تمام افکار اور کسب معاش کی تمام پیچیدگیوں سے سابقہ۔ اتفاق وقت، وہ اپنے والد کے انتقال سے اپنے کاموں میں ایسا مصروف اور میں کشمکش حیات میں ایسا مبتلا ہوا کہ مسلسل دو سال تک ملاقات نہ ہو سکی۔ اب پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا اور آرزوئے ملاقات مدارجِ انتہا پر تھی۔ شمشاد سے اس عرصہ میں متواتر رقعاتِ دعوت بھی وصول ہو چکے تھے لہٰذا میں نے رخت سفر درست کیا۔

ریل منزل مقصود پر صبح سویرے پہونچی، وقت کی روح پروری سے دل باغ باغ تھا۔ قصبہ کے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر جھنڈی لیے کھڑے تھے۔ صورت سے مترشح تھا کہ ابھی ابھی خواب سے بیدار

بیدار ہوئے ہیں، ٹوپی کے نیچے پریشان بال ذرا ذرا نظر آرہے تھے، چہرہ پر بدحواسی کے آثار تھے میں نے اپنے پہونچنے کی تاریخ سے شمشاد کو اطلاع نہیں دی تھی۔ اُسوقت اسٹیشن سے شمشاد کے مکان تک کی ہوا خوری نہایت ہی مفرح ثابت ہوئی۔ نسیم سحری کے طراوت بخش جھونکے آرہے تھے۔ سرزمین کے گوشہ گوشہ میں فطرت کے فیاضانہ تبسم کا انعکاس تھا، ذرہ ذرہ نیچر کی طلعت ریزیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کھیتوں میں خوبصورت تیتری رقص پیہم کر رہی تھی، اور میں ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ عرصہ بعد گاڑی ایک کوٹھی کے سامنے رُک گئی۔ اس عمارت کے نظارہ نے میرے سکون قلب کو سکتہ میں ڈال کر یک بیک ایک پیہم اور دھڑکن پیدا کر دی۔ نوکر نے اطلاع دی کہ "سرکار اپنے باغ میں تشریف رکھتے ہیں، آپ تشریف رکھیے میں اطلاع کرتا ہوں"۔ مگر مجھے اتنا صبر کہاں تھا، میرے قدم ایک بے اختیارانہ انداز سے نوکر کا تعاقب کر رہے تھے۔ میں باغ کی چہار دیواری میں داخل ہوا۔ شمشاد ایک سبز خطہ پر اپنی عادت کے موافق خیالات میں مستغرق اور دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا، اُس کے انداز نشست و طریقۂ فکر میں ذرا بھی تبدیلی نہ تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مسرور و شادمان ہو کر اپنی جگہ سے اُچھل پڑا اور دوڑ کر بغلگیر ہوا۔ اُس وقت ہم لوگوں کی مسرت تمام حدود سے متجاوز تھی۔!!

جب اضطراری کیفیت ذرا دور ہوئی اور میں نے گرد و پیش نگاہ کی تو مجھے نیچر کی پرستش کے عجیب و غریب کرشمے نظر آئے۔ یہ "صحرائی باغ" طلوع آفتاب کی ہوار کرنوں کے زرد نور میں غرق تھا۔ معمول کے موافق دلپسند روشیں اور خوشنما کیاریاں یہاں نظر نہ آتی تھیں۔ پھولوں کے وہ پودے جو بغیر مدد انسانی نمو سے قاصر رہتے ہیں، وہاں موجود نہ تھے۔ پانی کے وہ حوض اور حوض کے وہ فوارے جو آج کل عام طور پر پارکوں کے باعث شان ہوتے ہیں، وہاں تعمیر نہیں کیے گئے تھے۔ یہاں باغ کی ترکیب ہی مختلف تھی۔ ہر چیز کو اس کی فطری راہ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک طرف ناہموار زمین پر بغیر ترتیب و تدوین خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جا بجا بڑے بڑے گھنے درخت سایہ فگن تھے، اُن کی پتیاں تمام حصہ زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ذرا ہموار زمین پر سبز مخمل کی چادر بچھی ہوئی تھی قریب ہی ایک چشمہ رواں تھا۔ درختوں کی لرزاں پتیاں اور متحرک شاخیں اُس میں منعکس ہو رہی تھیں۔ سطح آب پر پتیوں کا سکوت گویا اُن کا خواب تھا۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اِدھر اُدھر تیرتی پھرتی تھیں۔ ہرن اِدھر اُدھر چوکڑیاں بھر رہے تھے، خرگوش اپنی قلانچوں سے باغ کے عرض و

طول کی پیمایش میں مصروف تھے اور ان سب کو مرغانِ چمن نغمۂ آزادی سنا سنا کر اور بھی مست و مسرور بنا رہے تھے ـــــــــ شمشاد سے معلوم ہوا کہ اُس نے یہ باغ اپنے زیرِ اہتمام تعمیر کرایا ہے اور اُس میں اُن تمام تصنعات اور "اصولوں" کو نظر انداز کیا ہے جن سے نیچر کی اہانت ہوتی ہے!!

ہر چند کہ میرے خیالات اس وقت بغاوت و مخالفت پر تلے ہوئے تھے مگر میں اس قسم کا کوئی کلمہ زبان پر لانا مناسب نہیں خیال کرتا تھا۔ شمشاد بار بار اُس مسرت کا اظہار کرتا تھا جو ہم لوگوں کی ملاقات کا نتیجہ تھی۔ میں جو اِن دو سال کے عرصہ میں تنازع للبقا کی باریکیوں سے آشنا ہو چکا تھا، اپنے تجربات و مشاہدات کے بیان میں مصروف تھا۔ اب دنیا کی دوستی کے راز مجھ پر آشکارا تھے۔ "خلوص" و "خود غرضی" کے "معانی بین السطور" سے میں واقف تھا۔ وہ میری زبان سے احباب و اعزا کی بدعہدیوں کے افسانے سنتا تھا، میرے نوحۂ جاں گسل اور مرثیۂ روح فرسا پر آہ سرد بھرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ: مجھو میری والدہ کیسی صائب تھی کہ "اس دنیا میں صرف چند نفوس قابلِ اعتماد ملیں گے"!

تین سال چٹکی بجاتے گذر گئے، یہ زمانہ میرے صحیفۂ زندگی کے زریں اوراق سے تعلق رکھتا تھا، فراوانی راحت کے جملہ سامان کی فراہمی نے میرے مزاج میں استغنا کی تخم پاشی کر دی تھی۔ اس عرصہ شمشاد کا شوقِ سیاحت کشاں کشاں اُسے یورپ اور امریکہ لے گیا مگر جوامرہر اُسکے شمشاد کو انگشت بدنداں کر دیتا تھا وہ یہ تھا کہ شمشاد ولایت سے واپس آیا تو حقیقی آزادی وہیں چھوڑ کر آیا۔ متاہل زندگی کے اس آغاز میں یہ بات بھی نمایاں تھی کہ شرفِ انتخاب کسی معصوم ہندوستانی دوشیزہ کو حاصل ہونے کی بجائے ایک نیلگوں چشم والی لیڈی کو حاصل تھا، جس کے حسن کی دلاویزی آبکل بغیر آمیزشِ تصنع کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتی۔ اُسکے خطوط سے معلوم ہوا کہ وہ اس سلسلۂ جنبانی سے ایسے محبت بھرے دل کا مالک ہوا ہے جس میں "دکھاوے" کا شائبہ تک نہیں مگر میرا دل خود بخود اس بیان کی تردید کرتا تھا۔ آج واقعات سے روشن ہے کہ وہ تردید صداقت پر مبنی تھی!!

جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ مسز شمشاد میاں کے تمول سے مستفید ہو کر غائب ہو گئیں، میرے جذبات میں استعجاب کا ذرا بھی عنصر شامل نہ تھا۔ ہاں، اضطراب صرف اس بات کا تھا کہ شمشاد جسے معمولی دوستوں کی بیوفائی سخت رنج پہونچاتی تھی اب کتنا شکستہ دل ہو گا۔ اُسکے وطن سے تعلق

بہت متوحش خبریں وصول ہوئیں اور میرا دل ازراہ ہمدردی اُس کے دیکھنے کے لیے بیتاب ہوگیا ویسا ہی موسم تھا، مگر دل اُس سُرور سے معمور نہ تھا۔ وہی زمانہ تھا مگر وہ لطف مفقود تھا۔ نسیمِ سحری کے وہ جھونکے جو اُس وقت لطف اندوز ثابت ہوئے تھے، آج سائیں سائیں کرکے نکل جاتے تھے۔ فطرت نے گویا سرزمین قصبہ سے اپنی عنایات بھی واپس لے لی تھیں۔ شمشاد سے ملنے کے وقت میرے پیر تھر تھر کانپ رہے تھے، دل کی عجیب حالت تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے غم کا میرے دل میں پورا پورا عکس اُتر آیا ہے۔ مگر شمشاد کی کیا حالت ہے؟ آہ! جب وہ سین یاد آتا ہے تو سینہ میں ہوک اُٹھتی ہے۔ تازہ پھر دیکھے ایک ایسی محویت میں بیٹھا تھا کہ میرے پہونچنے کی بھی اُسے خبر نہ ہوئی۔ حرکات سے عیاں تھا کہ حواس میں فرق آگیا ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ پکارا "شمشاد! شمشاد" تو نظر اوپر اُٹھائی۔ افسوس! وہ بڑی بڑی آنکھیں جو حسن میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں، لاغری میں غائب ہوگئی تھیں، چہرہ کا سرخ و سپید رنگ زردی میں تبدیل ہوگیا تھا، جسم پوست و استخوان کا ڈھانچہ تھا۔ اُس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا، اُس نظر بھر کر دیکھنے میں خدا معلوم کیا کیا عبارتیں پنہاں تھیں!! کسی قسم کا معالجہ مفید نہ ثابت ہوا۔ ایک عرصہ تک وہ کرب و بےچینی کا شکار رہا۔ آخر کب تک؟ اب وہ اطمینان کی نیند سو رہا ہے مگر جب کبھی اُس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو دل پر گویا نشتر کے چرکے لگتے ہیں۔ اگرچہ اب اُس کی جدائی کو جو اپنا رشتہ روزِ آخرت سے لگا چکی ہے۔ ایک مدت گزر چکی ہے، میرے زخمہائے جگر کی وہی حالت ہے، خیالات پریشاں میں دل اُسی طرح گرفتار ہے اور حسیات مجروح اسی طرح تپش افروز ہیں۔ آخر زمانہ کی لکھی ہوئی شمشاد کی چند نظمیں غم و درد کی تصویریں ہیں، اُنکے پڑھنے سے دل بیقرار ہو جاتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ دُکھے ہوئے دل کی صدا کتنی موثر ہوتی ہے!! اس سانحہ نے صنفِ نازک کی بیوفائی میرے دل پر منقوش کر دی ہے، اب اُس کی جلوہ فرمائیاں میرے جمود دل پر ذرا بھی اثر نہیں کرتیں۔

اظہار علی عباسی (از الہ آباد)

*

ایشیا کا مستقبل

روشن تر تیوں کا اب آفتاب ہوگا — عالم میں ہو گی حرکت وہ انقلاب ہوگا

جذبات کے شرارے پھیلیں گے پھر فضا میں — دل حاسدوں کا جل کر مثلِ کباب ہوگا

اقبال کے نشے میں پھر چور ہو گا مُسلم — خونِ حمیت اُس کا مثلِ شراب ہوگا

پھر چین کی بجیگی بنسی ہمارے گھر میں — نغموں سے حُرّیت کے پھڑتا رَباب ہوگا

تحقیق علم و فن کے چشمے یہاں بہیں گے — بحرِ علومِ مغرب شکلِ سراب ہوگا

مغرب! اتری ادائیں ٹھنڈی پڑیں گی آخر — ق اک دن فنا یہ تیرا عہدِ شباب ہوگا

تو اپنی ہی فضا میں زندہ نہ رہ سکے گا — " مکر و فریب تیرا جب بےنقاب ہوگا

سطوت کے تیرے خیمے اکھڑینگے جا بجا سے — " ایوانِ جاہ و حشمت تیرا خراب ہوگا

یہ ظلم کا سمندر یا یہ تیری ناخدائی! — " جنگی یہ بیڑا تیرا سب غرقِ آب ہوگا

یہ خوگرِ تمدن جنگل میں جا بسیں گے — بیدا۔یوں کا حاصل غفلت کا خواب ہوگا

بدلیگا جس سے نقشہ دنیا وہ لیگی کروٹ — آقا بنیں گے خادم وہ انقلاب ہوگا

مغرب کے حکمراں سب آپس میں کٹ مرینگے — خود رائیوں کا اُنکی یوں سدِباب ہوگا

مشرق کے نیستاں میں گونجے گا شیرِ کابُل — ق ہیبت سے جسکی زہرہ دنیا کا آب ہوگا

اسکے کھنڈر جہاں کو عبرت کا درس دینگے — ہر ذرہ اس زمیں کا کھولے کتاب ہوگا

آئے گا یاد ہم کو گذرا ہوا زمانہ — چونکیں گے نیند سے ہم کافور خواب ہوگا

تعمیر ہم کریں گے پھر قوم کی عمارت — اینٹیں سروں کی ہونگی خوں اپنا آب ہوگا

رستہ بھٹکنے والے مرکز پہ آملیں گے
بے راہیوں کا اُنکی دور اب حجاب ہوگا

محمد امیر۔ (اورنگ آبادی) متعلم بی اے جامعہ عثمانیہ۔

غزلیات

نالہ سرمایۂ تسکین ہے جنوں کوش نہیں
جوشِ وحشت اثرِ نالۂ پرجوش نہیں

اے جنوں خیر ہے کیوں نالۂ پرجوش نہیں
شاید اب نالہ کشی کا بھی مجھے ہوش نہیں

بے ہُشی اور ہے وارفتگیِ عشق ہے اور
مجھکو دیکھو کہ میں بیخود تو ہوں بیہوش نہیں

وعدۂ وصل سے اچھا ہے کہیں وعدۂ مرگ
بحثِ امروز نہیں تذکرۂ دوش نہیں

لیکے دل سینۂ مجروح پہ ابتک ہے نظر
چشم سفاک ہے احسان فراموش نہیں

ہے تبسم میں کچھ اس شان کا ناز و تمکیں
کہ یہ بیگانۂ مُہرِ لب خاموش نہیں

دوست ہو کر اُسے وعدہ کا نہیں پاس امیر
موت دشمن ہے مگر وعدہ فراموش نہیں

امیر بدایونی

زندگی میری خواب کی سی ہے
نقش بر رُوئے آب کی سی ہے

آب ہر ایک شعر کی میرے
صاف دُرِ خوشاب کی سی ہے

باندھ رکھی ہے اک ہوا میں نے
میری ہستی حباب کی سی ہے

تیرے ہر ناز میں کرشمے ہیں
دلفریبی سراب کی سی ہے

مصحف رُخ پہ خال کی صورت
نقطۂ انتخاب کی سی ہے

اُس بتِ سیمتن کے گالوں پر
ساری سرخی گلاب کی سی ہے

میرے سینہ کے آتشستاں میں
دل کی حالت کباب کی سی ہے

آج ہر بات میر صاحب کی
مستِ جامِ شراب کی سی ہے

میر ولی اللہ

دل میں خیالِ جلوۂ جاناں لیے ہوئے
بیتاب ہوں میں شورشِ پنہاں لیے ہوئے

حسنِ چمن میں ہے کوئی محوِ خرامِ ناز
ہر سانس میں بہارِ گلستاں لیے ہوئے

انوارِ عشق آج ہیں رونق فزائے دل
انداز پردہ داریِ جانان لیے ہوئے

تاریکی نظر کا مری رہنما ہے آج
ہر ذرہ ایک شمعِ فروزاں لیے ہوئے

کھلنے لگا ہے مستیِ الفت کے ساتھ ساتھ
اک رازِ انقلاب کا ساماں لیے ہوئے

شبنم کا قطرہ قطرہ تملق سے بھر گئے
اُڑنے لگا بہارِ گلستاں لیے ہوئے

ذوقِ نظر ہے تجھکو تو کر غور عندلیب
ہر خار ہے بہارِ گلستاں لیے ہوئے

اک لغزشِ خیال میں بیٹھا ہے آج عشق
صد با نکاتِ پردۂ عرفاں لیے ہوئے

یہ پردۂ خیال ہے جو دیکھتے ہیں ہم
اک شانِ خاص اور ہے انساں لیے ہوئے

شارق گُلِ مراد سے محروم تا کجے
دل میں خیالِ تنگیِ داماں لیے ہوئے

صفدر علی شارق ایرایانی

زخم ہوں بات مجھے صرف یہی آتی ہے
پوچھتے کیا ہو کہ کیوں مجھکو ہنسی آتی ہے

مجھ سا دیوانہ بھی اللہ کسی کو نہ کرے
سب تو روتے ہیں مگر مجھکو ہنسی آتی ہے

تم جو ہنستے ہو تو یہ بات شکایت کی نہیں
اپنی حالت پہ مجھے آپ ہنسی آتی ہے

داستانِ دلِ پُر درد وہ سُنکر بولے
تم تو روتے ہو مگر ہمکو ہنسی آتی ہے

بے بلائے تری محفل میں چلا آیا ہوں
دل تو روتا ہے مگر مجھ کو ہنسی آتی ہے

صاف ظاہر ہے رُلانے کی مجھے یہ آخر
تیری محفل میں جو رہ رہ کے ہنسی آتی ہے

آج کیا بات ہے وہ گریۂ پیہم نہ رہا
آج کیا بات ہے رہ رہ کے ہنسی آتی ہے

فرطِ غم نے مجھے تصویر بنایا آخر
رونا آتا ہے مجھے اب نہ ہنسی آتی ہے

خوگرِ غم کو خوشی سے نہ ہو کیونکر نفرت
رونے لگتا ہوں جو بھولے سے ہنسی آتی ہے

داورِ حشر کے آگے نہ مجھے لے جاؤ
کہ مجھے اپنے گناہوں پہ ہنسی آتی ہے

اُڑ کر آتا ہے مجھے کون یہ دل ہی دل میں
وصل کی شب جو یہ رہ رہ کے ہنسی آتی ہے

جس نے محفل سے اُٹھایا تو میں ہنستا اُٹھا
اس ہنسی پر بھی مجھے اپنی ہنسی آتی ہے

میرے رونے کا سبب آپ نے پوچھا نہ کبھی
کیا کہوں آپ سے کیوں مجھ کو ہنسی آتی ہے

پہلے اس بات پہ ہنستا تھا کہ کیوں روتا ہوں
اب یہ رونا ہے کہ کیوں مجھکو ہنسی آتی ہے

آہ و زاری کا کبھی آیا نہ سلیقہ باسط
ایسا روتا ہوں کہ خود مجھ کو ہنسی آتی ہے

باسط بسوانی

نظرے خوش گذرے

"فیہ ما فیہ" کے کئی نوٹ اس دفعہ عدم گنجایش کی وجہ سے درج نہ ہو سکے۔ ایک جو زیادہ ضروری ہے یہاں درج کیا جاتا ہے :-

مبارک علیگڈھ پر خواہ مخواہ نکتہ چینی ہرگز کسی مسلمان کے لیے امر پسندیدہ نہیں ہو سکتی، بہر حال وہ بھی مسلمانوں کی قائم کی ہوئی ایک مرکزی یادگار ہے۔ بہت سے نیک نیت مخلص مسلمان اس میں پہلے بھی شریک رہے اور اب بھی ہیں۔ البتہ جو غیر اسلامی عناصر اسکی فضا میں دروازوں سے داخل ہو گئے ہیں، انکی بیخ کنی کی کوشش کرتے رہنا بھی ہر پختہ مسلمان کا فرض ہونا چاہیے۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اسکا احساس اب الحمدللہ خود علیگڈھ والوں کو پیدا ہو چلا ہے، ضرورت صرف اسکی ہے کہ اس احساس کو زیادہ قوی اور تیز کیا جائے۔ صاحبزادہ صاحب اپنی بصیرت کے مطابق اس باب میں جو کچھ کوشش کر رہے ہیں وہ بہت غنیمت ہے۔ حال میں وہیں کے مشہور پروفیسر فیروز الدین مراد صاحب کا ایک مضمون جو یونیورسٹی گزٹ میں وحدہ باری کے متعلق انگریزی میں شائع ہوا ہے، اس پر مخلصانہ مبارکباد یونیورسٹی کے اہل حل وعقد کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ راقم مضمون اور گزٹ نے خدا معلوم اسکو اردو میں شائع کرنا کیوں نہ پسند فرمایا۔ بہر حال اگر علیگڈھ کے اساتذہ میں اس قدر اسلامیت پھیل جائے، جتنی کہ مضمون مذکور کے لکھنے والے کے قلب میں معلوم ہو رہی ہے، تو علیگڈھ کی فضا دیکھتے دیکھتے بدل سکتی ہے اور اس سے بڑھ کر مسرت واطمینان کا موقع ہم سب مسلمانوں کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔

مکرمی جناب قاضی غلام امیر آسیر بدایونی تحریر فرماتے ہیں کہ دسمبر ۳۲ء کے الناظر میں جناب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی جو نظم "مسلم جوانمردے خطاب" چھپی ہے اسکا قافیہ مقید آذری۔ سرسری۔ پیمبری ہے۔ انھیں قوافی میں جوش صاحب نے سحر سامری اور فسردہ خاطری کو بھی نظم فرمایا ہے۔ کیا اس تقئید کی صورت میں آذری کا قافیہ سامری یا خاطری کسی طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ امید ہے کہ الناظر کی معرفت جوش صاحب یا اور کوئی دوسرے شخص جو ایسے قوافی کو صحیح سمجھتے ہوں میرے شبہہ کو رفع فرما دینگے۔"

انجمن اردو کا سالانہ جلسہ یکم مارچ کو منعقد کیا جا رہا ہے جسمیں انجمن کی سالانہ رپورٹ اور حسابات پیش ہوں گے، دستور العمل میں ترمیم کی جائیگی اور عہدہ داروں اور مجلس انتظامیہ کا جدید انتخاب ہوگا۔ ادبی نمائش اور اسکے ساتھ ایک ادبی جلسہ ۲۲ مارچ کو ہوگا۔

کرتے تو مخالف لاجواب ہو جاتا تھا - وہ اظہارِ جذبات میں صادق البیان تھے اور یقین کامل رکھتے تھے کہ جن عقائد کی وہ تلقین کرتے ہیں ضرور سچے ہیں - اور اُنکی تبلیغ ایک منصبی فرض ہے - اُنکی بھرائی ہوئی آواز ایک عجیب ہیبت و جلال کا مظہر بنجاتی تھی جو جادو کی طرح ہر ایک بحث کرنے والے کو ہمزبان بنالیتی تھی -

چند ہی روز میں بنارس کا "دشت غزالاں" جو غالبًا زمانۂ حال کے ریلوے اسٹیشن سارناتھ کے قریب تھا شریعتِ جدید کا درسگاہ بن گیا اور اُسکے معتقدوں کی تعداد اُس کثیر جماعت کو چھوڑ کر جو شہر میں قیام پذیر تھی جنگل میں ساٹھ تک پہونچ گئی -

مبارک ہیں غربا کہ دنیا کا ہر شایستہ مذہب پہلے اُنھیں سے شروع ہوتا ہے - گوتم کے مرید بھی اب تک صرف غریب ہی تھے - اتفاق سے ایک دولتمند یشش نام اپنے عزیزوں سے خائف ہو کر گھر سے بھاگا اور تقدیر ازل کشاں کشاں جنگل میں مہاتما کے سامنے لائی - آیا اور منڈ گیا!! سب چیلے زرد رنگ کی کفنی پہنتے تھے یہ بھی زرد پوش ہو گیا!! اُسکی ماں اور بیوی کو خبر ہوئی وہ بھی بھاگ کر آئیں اور مہاتما کی مُرید ہوئیں - یہ دونوں پہلی عورتیں تھیں جو شاکیہ مُنی پر ایمان لائیں

برسات کا موسم اسی جنگل میں بسر ہوا - جب سردی شروع ہوئی تو مہاتما نے اپنے ہر ایک چیلے کو جدا جدا ممالک میں اشاعتِ مذہب کے لیے روانہ کیا اور خود اروِلوا کی طرف چلا - راہ میں دو سوداگر ملے جو کپل واستو کی طرف جاتے تھے - اُن سے بات چیت ہوئی تو وطن کا خیال آیا - باپ کو اپنی خیریت کی خبر بھیجی اور منزل مقصود کی راہ لی -

راستہ میں سینا نام ایک گانوں تھا جہاں تین بھائی علم و فضل میں شہرت عام رکھتے تھے - اور مذہبًا آتش پرست تھے - گوتم نے اُنکے آتشکدہ کی عمارت میں ایک رات بسر کرنے کی اجازت چاہی مگر کشپ جو اُن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا مانع ہوا اور عذر کیا کہ آتش خانہ کے قریب ایک زہریلا سانپ رہتا ہے جو رات کو باہر نکلتا اور سونے والوں کو ڈس جاتا ہے - مہاتما پر عشقِ حقیقی کا زہر چڑھا ہوا تھا وہ سانپ سے کیا ڈرتے - اپنے اصرار پر قائم رہے اور کشپ کو بھی مسافر مہمان کی خاطر سے اجازت دینا پڑی - رات ہوئی تو سانپ حسب دستور باہر نکلا مگر گوتم سے متعرض نہ ہوا جب صبح کو یہ آتشکدہ میں زندہ و سلامت پائے گئے تو انکی کرامت کا غل مچ گیا - اُسی دن اتفاق

سے ایک بڑا میلہ گانوں میں ہونے والا تھا جس میں گرد و نواح سے جاتری آتے اور کشپ کی تقریر سنا کرتے تھے۔ اب اُسکو خوف ہوا کہ اس مجمع نے گوتم کو دیکھا تو آتش پرستی کا بازار سرد ہو جائیگا مگر مہمان کو گھر سے نکالنا اتنا سخت اخلاقی جرم تھا کہ اس کا وہ مرتکب نہ ہو سکتا تھا۔ مہاتما کو اس خطرہ کی خبر ہو گئی اور وہ کسی کو اطلاع کیے بغیر اُسی دن گانوں سے باہر چلے گئے اور میلہ کے پاس نہ آئے۔ جب شام کو واپس ہوئے تو کشپ نے دریافت کیا کہ شام کو کہاں گئے تھے۔ جواب دیا کہ تمہاری فکر دُور کرنے کے لیے روپوش ہو گیا تھا۔ کشپ قدموں پر گر پڑا اور اپنی تمام جماعت کے ساتھ ایمان لایا۔

اب مہاتما بڑی شان و شوکت کے ساتھ راجگڈھ میں داخل ہوئے جہاں بارہ سال گذرے نہایت شکستہ حال گھر سے بھاگ کر پہونچے تھے۔ راجہ بمبا رہنوز تخت سلطنت پر جلوہ فرما تھا۔ اس نے پیشوائی کی اور کشپ کو گوتم کے ہمراہ دیکھ کر متعجب ہوا۔ خلقت نے گمان کیا کہ شاید گوتم بھی آتش پرست کشپ کا چیلہ ہو گیا۔ مگر جب نیازمند شاگرد گوتم کے حضور میں بندگی کے لیے خم ہوا تو راجگڈھ والوں کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ راجہ نے بڑے دھوم سے ان فقیروں کی دعوت کی اور ویلوانا نام ایک بانس کا باغ انکے قیام اور آسایش کے لیے وقف کیا۔ اس تاریخی باغ میں مہاتما نے بہت سی برسائیں گذاریں۔ اور یہ قاعدہ مقرر کیا کہ جاڑوں کے موسم میں ممالک کا دورہ کرتے تھے اور بارش کے ایام اسی باغ میں بسر فرماتے تھے۔ دُور دور دراز مقامات سے مریدین یہاں آتے اور اپنے مقدس بانی مذہب سے ضروری مسائل حل کرتے تھے۔

اب شاکیہ مُنی کی شہرت آریہ ورت کے قریب قریب کُل حصوں میں پہونچ چکی تھی۔ راجہ شدھودن کو بھی خبر ملی کہ اُسکے گھر کا اُجالا راجگڈھ میں چمک رہا ہے۔ بڑے اصرار سے فرزند کو بُلوایا اور پُرانی شفقت و محبت کی باتیں یاد دلا کر تقاضا کیا کہ بوڑھے باپ کو اُسکی موت سے پہلے ایکبار اپنے دیدار کا موقع دے۔

والدین کے احکام کی اطاعت نکوکاروں کا پہلا فرض ہے۔ گوتم نے فوراً سفر کی تیاری کی۔ مریدین کا جم غفیر ہمراہ چلا اور وہ منزل بمنزل طالبان ہدایت کو فیضیاب کرتا کپل وستو کے قریب پہونچا۔ رت کے بعد کوہ ہمالیہ کا دامن، نیپال کی ترائی، پُر فضا گھاٹیاں، اور راج محل کا خوبصورت

منظر آنکھوں کے سامنے آیا تو مہاتما کے دل پر کیا گذری؟ اسکی کیفیت وہ بیان کرے جو قوس قزح کی صحیح تصویر اُتار سکتا ہو! وطن کا کانٹا پردیس کے گلاب سے بہتر اور کنعاں کی گدائی مصر کی بادشاہی سے خوشتر بتائی جاتی ہے لیکن مہاتما نے اپنے مقرر کردہ اصول کو اس موقع پر بھی ترک نہیں کیا۔ بجائے شہر میں داخل ہونے کے بستی سے دُور ایک باغ میں مقیم ہوئے اور اُسی جگہ رات بسر کرکے دوسرے دن کشکول گدائی ہاتھ میں لے کر بھیک مانگنے کے لیے کپل واستو میں قدم رکھا۔

دستور تھا کہ فقیروں کی یہ جماعت امرا سے امداد کی طلبگار نہیں ہوتی تھی بلکہ غربا کے دروازوں پر بھی خاموش کھڑی رہتی تھی اور زبان سے سوال نہیں کرتی تھی۔ اگر کچھ مل گیا تو لیا ورنہ آگے بڑھے۔ اسی رسم کی پابندی کے لیے کپل واستو میں بھی راج محل کو چھوڑ کر غریبوں کی جھونپڑیوں کی طرف گدائی کو چلی۔

راجہ کو خبر ہوئی تو وہ حکومت کا دبدبہ فراموش کرکے بیتابی کے ساتھ بیٹے کے پاس پہونچا اور شکایت کی کہ رعایا سے بھیک مانگ کر باپ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانا مناسب نہ تھا۔ گوتم نے جواب دیا کہ "مہاراج! آپ اور آپ کے گھر والے سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں اور راجوں کی اولاد ہیں۔ میں اگلے وقتوں کے رشیوں اور دانشمندوں کا وارث ہوں۔ آپ کے لیے محلوں کا رہنا زیبا ہے، مگر مجھ کو وہی مناسب ہے جو انبیائے سلف ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں۔ راج کی نعمتوں سے مجھکو کیا سروکار۔ میرا موروثی پیشہ تو بھیک مانگ کر کھانا ہے۔"

باپ نے یہ منطق نہ مانی اور زبردستی کھینچکر بیٹے کو محل شاہی کی طرف لے گیا۔ گھر میں قدم رکھا تو ہر طرف سے عزیزوں اور رشتہ داروں نے ہجوم کیا اور سارا قلعہ اُسی کمرہ کے اندر آگیا جس میں مہاتما کے چرن آئے تھے۔

دیدارِ جمال اور دریافت خیریت کے لیے سب ہوا خواہ اُمنڈ آئے مگر غم نصیب جسودھرا اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

وہ قیامت کی رات جب انتہائی مسرت کے دن مصیبت کا پہاڑ اُس پر ٹوٹ پڑا۔ اور جان سے زیادہ عزیز شوہر کوئی خطا تقصیر بتائے بغیر کسی طرف چلا گیا اُسکو آج تک یاد تھی۔ جس وقت سے چنا رتھبان نے راجکمار کے جوگ اختیار کرنے کی خبر پہونچائی دُنیا کی عیش و راحت اُسکے لیے ختم ہوگئی۔

سنگار چھوڑا، سہاگ بڑھایا، بروگنوں کی طرح زمین پر سوتی - جوگنوں کی سی کفنی پہنتی اور رانڈوں کی طرح گن گن کر لقمے کھاتی تھی - گلاب کے پھول کھلا گئے - کندن تانبا بن گیا - اور بلّور میں زنگ آگیا!!
آج لگا نہ دیگانہ راجکمار کے درشن کے لیے دوڑا لیکن دردِ فراق کی ماری جسودھرا اپنے کمرہ میں سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی اور مچلے ہوئے دل کو یوں سمجھاتی تھی کہ "پران پتی نے جوانی کے وقت مجھکو چھوڑا تو اب بارہ تیرہ برس کے بعد اپنی بگڑی ہوئی صورت دکھا کر اُنکی آنکھوں میں ذلیل ہونا کیا ضرور ہے"۔

بیکسوں کے فریادرس کو اُس کی شکستہ دلی پر رحم آیا - مہاتما کو جسودھرا یاد آئی - اور رشتہ داروں کے مجمع میں اُسکی بیتاب نگاہیں کسی کو ڈھونڈھنے لگیں - جب کسی طرف نظر نہ آئی تو پوچھا کہ "جسودھرا زندہ ہے؟" جواب ملا کہ زندہ تو ہے مگر مردہ سے بدتر - دل پر چوٹ لگی اور دریافت حال کے لیے خود اُسکے کمرہ کی طرف تشریف لے گئے۔

جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاء اللہ کچے دھاگے میں چلے آئینگے سرکار بندھے

جان و ایمان کا مالک یکایک نظر کے سامنے آگیا تو جسودھرا بے قابو ہو کر قدموں پر گر پڑی اور شوہر کے پاؤں آنکھوں سے لگا کر زار زار رونے لگی - پھر یہ سوچ کر کہ خاوند جوگی ہیں اور اُنکو عورت کا بدن چھونا جائز نہیں، سہمی، ڈری، ہٹی، اور الگ کھڑی ہوگئی - راجہ نے بہو کی سفارش کی اور اُسکی نفس کُشی کا حال دوہرایا - گوتم کو قلق ہوا لیکن اپنے عہد تجرد سے مجبور تھے اور سوائے تلقین صبر کے تسلی دینے کی کوئی صورت نہ تھی۔

عاشق مہجور نے ڈرتے ڈرتے آرزو کی کہ اُسکو بھی چیلوں کے گروہ میں شامل کر لیا جائے - مگر یہ عرض بھی قبول نہ ہوئی اور ارشاد ہوا کہ فقیروں کی منڈلی میں عورت کا ساتھ رکھنا خطرناک ہے - ستم رسیدہ بیوی مایوس ہوئی اور مہاتما محل سے رخصت ہوگئے - دوسرے دن گوتم کے سوتیلے بھائی نند کی شادی کا جلسہ تھا - مجلس عیش و نشاط مرتب تھی کہ مہاتما اُس محفل میں تشریف لائے اور معلوم نہیں نند کو آہستہ آہستہ کیا بتا دیا کہ اُس نے شادی کا لباس نوچ ڈالا اور کشکول ہاتھ میں لیکر بھائی کے ساتھ نگرودہ باغ کی طرف چلا گیا جو اِن جوگیوں کا قیامگاہ تھا۔

اب یہ معمول ہو گیا کہ مہاتما روزانہ بھوجن کے لیے قلعہ میں آتے تھے اور محل خاص سے کسی قدر فاصلہ

پر اپنے چیلوں کے ساتھ خاصہ تناول فرماتے اور پھر فرودگاہ کو واپس جاتے تھے۔ ایک دن حسب
دستور کھانا تناول فرما رہے تھے اور شربت دیدار کی پیاسی جسودھرا دور سے جمال جہاں آرا کی
زیارت کر رہی تھی کہ اُس کا لڑکا راہل سامنے آ گیا۔ ماں نے بیٹے کو اچھے کپڑے پہنائے اور کہا کہ
تم اپنے باپ کے پاس جا کر اپنی میراث کا دعویٰ کرو۔

لڑکا چند گھنٹوں کا تھا کہ باپ نے دنیا چھوڑی۔ دادا نے پرورش کی اور وہ دادا ہی کو باپ
جانتا تھا۔ ماں نے اشارہ سے بتلایا کہ تیرا باپ وہ بیوفا جوگی ہے جو سامنے فقیروں کی منڈلی میں
آفتاب کی طرح چمک رہا ہے۔

بھولا لڑکا خوش خوش باپ کے پاس گیا اور مہاتما سے عرض کیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں اور
اپنی میراث مانگنے آیا ہوں۔ گوتم نے آہستہ سے اُسکو دعا دی مگر سوال کا جواب عنایت نہ ہوا۔ وہ
میراث میراث رٹتا باپ کے ساتھ ہو لیا۔ مگر وہ باغ میں پہنچا تو دولت عطا ہوئی یعنی "سنگھ"
میں شریک کر لیا گیا۔!!

راجہ شدھودن کا نابالغ پوتا بھی تارک الدنیا ہو گیا تو اسکو سخت صدمہ ہوا لیکن تیر کمان سے
نکل چکا تھا اور اُسکا واپس آنا محال تھا!! البتہ گوتم سے یہ عہد و پیمان لیا گیا کہ آیندہ سے کوئی
لڑکا اپنے والدین کی اجازت کے بغیر ترک دنیا کی طرف مائل نہ کیا جائے گا۔ گوتم نے اس شرط کو
عمر بھر نباہا اور کپل وستو سے راجگڑھ کے لیے رخصت ہو گیا۔ سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اسوقت
مہاتما کے حصول کمال سے اٹھارہ مہینے گذرے تھے۔

اسکے بعد مہاتما مدت تک زندہ رہے لیکن کپل وستو کو انکی زیارت صرف ایک ہی بار اور نصیب
ہوئی۔ یہ دوسرا موقع وہ حسرتناک دن تھا کہ راجہ شدھودن مرض الموت میں مبتلا تھے اور اُن کا
عزیز بیٹا آخری دیدار کے لیے بلایا گیا۔ مہاتما عین وقت پر پہونچے اور جب اس مصیبت اور رنج
کی دنیا میں آخری سانس راجہ شدھودن کو نصیب ہوئی تو اُسکے شوق بھری آنکھ گوتم کے نورانی
چہرہ کی طرف تھی اور اس کا سر انکی گود میں!!

اب جسودھرا کی دیکھ بھال اور تنہائی کا خبرگیراں کوئی نہ رہا۔ اُس نے راج محل کو چھوڑ کر جنگل میں
پھرنے۔ جوگیوں کے برتن مانجنے۔ اور فقیروں کے لیے پانی بھرنے کی خدمت قبول کرنے کا ارادہ کیا۔

یہ عجز و انکسار عمل لایا۔ گوتم نے عورتوں کو رہبانیت کی زندگی بسر کرنے "سنگ" میں شریک ہونے کی اجازت دی اور جسودھرا پہلی راہبہ تھی جو اُسکی خانقاہ میں داخل ہوئی۔

مہاتما کی زندگی کے آخری تیس سال اشاعت مذہب، تبلیغ شریعت، اور ترتیب قوانین میں صرف ہوئے۔ اس زمانہ کے اقوال و افعال جو بودھ مذہب کی کتابوں میں محفوظ ہیں اگر نقل کیے جائیں تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوں لیکن یہ واقعات تاریخی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے صرف چند حکایتیں اُس عہد کی بطور مشتے نمونہ از خروارے درج کی جاتی ہیں:-

(۱) کیسا گوتامی نام ایک عورت اپنے اکلوتے بیٹے کی عاشق زار تھی۔ وہ بچہ اتفاق سے مرگیا تو وہ اُسکی نعش لیے گھومتی اور ہر ایک سے اُسکے زندہ کرنے کی دوا پوچھتی تھی۔ جب کوئی نصیحت و فہمائش کارگر نہ ہوئی تو لوگوں نے بتایا کہ شاکیہ مُنی کو مردہ جلانے کی تدبیر معلوم ہے۔ عورت دوڑتی ہوئی مہاتما کی خدمت میں آئی۔ آپ نے فرمایا کہ بچہ کا زندہ کرنا ممکن ہے بشرطیکہ مُٹھی بھر رائی مل جائے۔ اور وہ ایسے گھر سے مانگ کر آوے جہاں کوئی بیٹا، شوہر، باپ یا غلام نہ مرا ہو۔ عورت سارے شہر میں ماری ماری پھری مگر کوئی گھر ایسا نہ ملا جہاں کوئی موت نہ واقع ہوئی ہو۔ اُسکی آنکھیں کُھل گئیں۔ خود بخود غم کی تسلی ہوئی اور وہ بھی مہاتما کی خانقاہ میں ایک راہبہ بن گئی۔

(۲) امبا پالی ایک مشہور کسبی تھی۔ اُس نے مہاتما کی دعوت کرنا چاہی۔ کسی کو خیال نہ تھا کہ مُنی اُس کا ناپاک کھانا قبول کریں گے۔ فقرہ بازوں کی لعن طعن سے وہ عورت بہت دل شکستہ ہو گئی۔ یکایک مہاتما اُسکے گھر پہونچے اور خاصہ تناول فرمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی بدکاریوں سے تائب ہوئی اور "سنگ" میں شریک کرلی گئی۔

(۳) سراوستی شہر کے پاس انتھ پنڈ کے باغ میں مہاتما مقیم تھے۔ اُن کا عزیز چیلا انندا شہر میں بھیک مانگنے گیا تھا۔ وہاں پیاس نے ستایا تو ایک کنوئیں کے پاس پانی کی تلاش میں پہونچا ایک چنڈال چھوکری پراکرتی نام ڈول کھینچ رہی تھی۔ نندا نے اُس سے پانی مانگا۔ لڑکی نے جواب دیا کہ وہ چنڈالنی ہے اُسکے ہاتھ کا پانی کوئی نہیں پی سکتا۔ نندا نے کہا کہ بہن تیری ذات پات میں نہیں پوچھتا۔ اگر پانی پلا سکتی ہو تو پلا دے۔ لڑکی اس جواب پر فریفتہ ہوگئی۔ اُس نے پانی پلایا اور اس کوشش میں مصروف ہوئی کہ کسی طرح نند کے ساتھ ہی رہنا نصیب ہو۔ اُس نے

نند کو دام تزویر میں لانے کی ہر ایک سعی کی لیکن کامیاب نہ ہوئی - ایک روز نند کے تعاقب میں وہ مہاتما کے حضور تک پہونچی - باتوں باتوں میں اُس کا چوٹ کھایا ہوا دل دنیا سے پھیر دیا گیا اور وہ بھی راہبہ ہوگئی

چنڈالنی کا "سنگ" میں شریک ہونا برہمنوں کو بہت ناگوار ہوا - کیونکہ اس فرمان سے ذات کی قیود کا خاتمہ ہوگیا تھا اور انھوں نے گوتم کو طرح طرح سے اذیت پہونچانا چاہی لیکن خدا کی قدرت سے انکی ہر برائی بھلائی ہو جاتی تھی اور جس راجہ کو وہ گوتم کے خلاف بناتے تھے چند روز میں وہی اُس کا مُرید ہو جاتا تھا -

(۴) نلندا نام ایک خوشحال اور با اثر رئیس تھا - اُسکے ایک خادم نے جو بودھ کا معتقد کیش تھا مہاتما سے عرض کی کہ آپ اس حاکم کو کوئی عجیب و غریب معجزہ دکھائیں تاکہ وہ ایمان لائے اور اُسکے راہِ راست پر آنے سے شریعت کو تقویت ہو - گوتم نے درخواست منظور نہ کی اور کہا کہ جنکے دلوں پر مُہر ہے وہ معجزوں سے بھی ایمان نہیں لا سکتے - خرق عادت سے مجھ کو شرم آتی ہے!

(۵) سوپیا نام ایک فقیر مہاتما کی بدگوئی کرتا تھا اور اُسکے اصول و قواعد پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا - اُس کا شاگرد برہم دت گوتم کا معتقد تھا اور اپنے اُستاد سے نزاع کیا کرتا تھا - مہاتما کے چیلے سوپیا کو بُرا بھلا کہتے تھے - شدہ شدہ یہ خبر گوتم تک پہونچی - آپنے چیلوں کو نکتہ چینی پر ناراض ہونے سے منع کیا اور سمجھایا کہ بدگوئی سے سلوک کی ترقی میں فرق آتا ہے - نفرت نفرت سے دُور نہیں ہو سکتی بلکہ اس زہر کا تریاق محبت ہے!!

(۶) ایک کسان کی طرف گذر ہوا جو کھیت میں ہل چلا رہا تھا - اُس نے فقیروں کی بھیڑ دیکھ کر کہا کہ تم لوگ کچھ کمائی نہیں کرتے اور پرایا مال کھاتے ہو - مہاتما نے جواب دیا کہ "میں بھی کھیتی کرتا ہوں - ایمان بیج ہے، نفس کُشی پانی ہے، بُری خواہشیں جھاڑ جھنکار ہیں جنکی نکائی کرتا ہوں عقل ہل ہے، شرم جُوا ہے، استقلال ہل چلاتا ہے اور میں اپنے دل سے استقلال کی لگام تھامتا ہوں - میرا کھیت مذہب اور قانون ہے - اور پیداوار جو حاصل ہوتی ہے اُسکا نام "نروان" ہے" کسان قلبہ رانی بھول گیا اور قلب صنوبری کی صفائی کرنے لگا!!

(۷) ایک شب مہاتما اپنے عزیز شاگرد انند اکے ساتھ چیلوں کی خبرگیری کو نکلے۔ دیکھا کہ ایک بیمار مُرید نجاست میں لتھڑا زمین پر پڑا ہے اور ضعف کی شدت سے حرکت نہیں کر سکتا۔ آپ نے انندا سے پانی منگوایا اور اپنے مبارک ہاتھوں سے مریض کا بدن صاف کرکے اُسکو بستر پر لٹایا۔ پھر سب مُریدوں کو جمع کرکے تنبیہ کی کہ "سنگ" والوں کے نہ ماں باپ ہیں نہ بیوی بیٹے۔ اگر تم لوگ ایک دوسرے کی مدد نہ کروگے تو انکی عیادت اور تیمارداری کو کون آئے گا۔ جو شخص میری خدمت کرنا چاہتا ہو اُسکو لازم ہے کہ بیمار کی خدمت کرے۔ مریض کی تیمارداری عین میری خدمت ہے!!

غرض اسی طرح مسلسل وعظ و تلقین میں مہاتما نے اپنی زندگی کے آخری سال گذارے اور اسّی برس کی عمر تھی جب آپ نے کوسی نگلا جانے کا قصد کیا جو زمانۂ حال میں کسیا کے نام سے مشہور ہے اور گورکھپور کے ضلع میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ اُس زمانہ میں یہاں ملّا قوم کا راج تھا۔ جسکی ایک شاخ کا دارالسلطنت پاوا اور دوسری کا کوسی نگلا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پٹنہ کے ضلع میں بہار شریف کے پاس پاوا پوری جو مشہور تیرتھ کی جگہ ہے یہی قدیم زمانہ کا پاوا تھا لیکن یہ مقام کسیا ضلع گورکھپور سے تقریباً ۶۰ کوس کے فاصلہ پر ہے اور اس لیے تعجب ہوتا ہے کہ مہاتما نے بیماری کی شدت میں جس کا عنقریب تذکرہ آتا ہے اس قدر طویل مسافت کیونکر طے کی ہوگی۔

بہرحال یہ مسلّم ہے کہ مہاتما ملّا قوم کی حکومت میں دورہ کرتے ہوئے پانچ سو چیلوں کے ساتھ پاوا میں تشریف لائے اور چند ٹھٹھیرے کے باغ میں فروکش ہوئے۔ یہاں کے رئیسوں نے ایک "سنت گھر" یا ٹاؤن ہال جدید تیار کرایا تھا اور انھوں نے خواہش کی کہ اس عمارت کی رسم افتتاح گوتم کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں لائی جائے۔ مہاتما نے منظور کیا اور جماعت خانہ میں تشریف لیجا کر ایک پُر اثر وعظ دیا۔ دوسرے روز چند نے دعوت کی اور فقیروں کو چاول اور "سُکر مدھوا" کھلایا۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں یورپ پہونچکر اس "سُکر مدھوا" نے عجب ستم ظریفی دکھلائی۔ سیحی مترجموں نے اس لفظ کے معنی "سؤر کا گوشت" سمجھ لیے اور عام طور پر تحریر کیا جانے لگا کہ مذہب بودھ کے مقدس بانی نے دُنیا میں جو آخری غذا کھائی وہ لحم الخنزیر تھا۔ لیکن حال میں تحقیق سے ثابت ہوا کہ "سُکر مدھوا" سؤر کے گوشت کو نہیں بلکہ شکر قند کو کہتے ہیں!!![۱]

---

[۱] ماڈرن ریویو۔ بابت ستمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۲۷۰۔

کلام حالی

مولانا حالی کی متفرق نظمیں جو بیحد مقبول ہیں

شکوہ ہند۔ بیوہ کی مناجات۔ عرض حال

مسدس۔ ثنائے خدمت۔ مناظرہ رحم و انصاف

حب وطن۔ بچوں اور لیکے کا مناظرہ

(خریداران الناظر کے لیے تین چوتھائی قیمت پر)

مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر و انشا پرداز و فلسفی مرزا محمد ہادی رسوا بی۔اے کی لاجواب نظم جسے اردو میں اعلیٰ درجے کے فلسفیانہ خیالات کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا۔ قیمت ۴ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

کلام اقبال

ڈاکٹر اقبال کی مقبول عام نظمیں:-

شکوہ ۔ جواب شکوہ ۔ شمع و شاعر

بلال ۔ فریاد امت ۔ تصویر درد

(خریداران رسالہ کو تین چوتھائی قیمت پر)

مسلمانان اندلس

نامور مورخ اسٹینلی لین پول کی کتاب "مورس ان اسپین" کا اردو ترجمہ از مولوی سید عبدالغنی وارثی قیمت عہ

(خریداران رسالہ سے ۸ر)

خوان دعوت

لڑکیوں کو کھانا پکانا سکھانے کیلیے م ب صاحب لکھنوی نے افسانے کے دلکش پیرایہ میں یہ کتاب مرتب کی ہے جسمیں باورچی خانہ کے ضروری انتظامات اور عمدہ و لذیذ کھانوں کی مجرب ترکیبیں ذاتی تجربہ کی بنا پر تحریر کی ہیں۔

قیمت ۸ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۶ر)

تذکرہ حزیں

مشہور شاعر شیخ علی حزیں۔ جو ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے انکی دلچسپ سوانحعمری قیمت ۴ر

(خریداران رسالہ سے ۳ر)

دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خدا پرست اور دنیا دار کی کہانی ار ۔ مساوات ۔ از مسٹر سلطان حیدر جوش ار اتفاقات زمانہ ،،

(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

حیات نظامی

مشہور شاعر حضرت نظامی گنجوی کی سوانحعمری ۔

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

جمیل و بثینہ

عرب کے حسن و عشق کا دلچسپ افسانہ

قیمت ۳ر

(خریداران الناظر کے لیے ۲ر)

عورتوں کی انشا

خواتین اور انکی صاحبزادیوں کو خطوط نویسی سکھلانے والی کتاب بمصنفہ بیگم صغریٰ علی صاحبہ ۔ قیمت ۸ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۶ر)

مصنوعی شوہر

انقلاب ایران کی ایک ظریفانہ داستان ہنستے ہنستے لوٹ جائیے گا۔

قیمت ۱ر

(خریداران الناظر کے لیے ۱۰ر)

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مسلمانوں کی تہذیب

یعنی مسلمانوں کی تمدنی ترقی کے
متعلق نواب محسن الملک مرحوم
کا ایک فاضلانہ لکچر۔ ۴ر

قیمت ۶ر

(خریداران الناظر سے ۵ر)

میلاد النبی

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ
علیہ کے اصل عربی متن کے مقابل اس کا
نہایت فصیح اردو ترجمہ۔

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم
جس میں لفظ صوفی کی تحقیق تصوف کی ابتدا
اور اسکی درجہ بدرجہ ترقیوں کا ذکر ہے اور آخر
میں تصوف کے تمام شعبوں کو اسلام سے تطبیق دی گئی ہے

قیمت ۸ر (خریداران رسالہ کے لیے ۵ر)

مقدمۂ شعر و شاعری

مولانا حالی نے اپنے دیوان کے شروع میں جو لاجواب مقدمہ لکھا تھا وہ دوسرے ایڈیشن کے وقت
ایڈیٹر الناظر نے دیوان سے علیحدہ کرکے چھاپا۔ اسمیں شعر کی حقیقت ماہیت اور شاعری کے اصول و
اساس پر بحث کی گئی ہے۔ اور شاعری پر ایک بسیط تبصرہ لکھا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر (خریداران رسالہ سے ۱۰ر)

خطاب

(از "ملا" جی)

سرکاری خطابات کے آرزومند کوشش
کرنے سے پہلے اسکو ملاحظہ فرمالیں ۴ر
(خریداران الناظر کیلئے ۳ر)

ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار تاریخ
مولفہ مسٹر عنایت اللہ بی اے رجسٹرار
عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۴ر
(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

وکرم اروسی

مترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم۔ یہ کالی داس کے مشہور و معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ
ہے جس میں لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ اضافہ کیا ہے اور ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر
بحث کی اور کالی داس کا موازنہ شیکسپیر اور میرانیس وغیرہ سے کیا ہے۔ قیمت ۱۲ر خریداران الناظر سے ۱۰ر

تسخیر فرانس

شکسپیر کے لاجواب ڈرامہ ہنری دی
ففتھ کا اردو ترجمہ از منشی تفضل حسین
صاحب ناظر۔ قیمت ۸ر
(خریداران الناظر کے لیے ۶ر)

سفرنامہ مصر و شام و روم

مولانا شبلی کا مشہور سفرنامہ جو ان ممالک
کے متعلق بہترین تاریخی علمی معاشرتی و تمدنی معلومات
فراہم کرتا ہے۔ قیمت ۱۲ر
(خریداران الناظر کے لیے ۱۰ر)

میکفرن اور لوسی

حضرت شوق قدوائی کا لاجواب
ڈراما

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

باسمہ

رجسٹرڈ نمبر لے ۸۷۴

رسالۂ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ر مع محصول

فی جلد ۳

فی پرچہ

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

مطبوعات الناظر پریس لکھنؤ

تاریخ عرب

مصنفہ

موسیو سیدیو فرانسیسی

عربوں کے متعلق یہ کتاب اُن تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے
جو یورپ ایشیا کے کتبخانوں کی زینت ہیں مسلمانوں
کی ترقیات اور عربوں کے کمالات کا یہ آئینہ ہے
اور یورپ کے افترا و کذب کا بہترین جواب

قیمت مجلد چرمی عہ مجلد پارچہ صہ

اسلام

نواب محسن الملک کا قابل دید مضمون

قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

طالب علم کی زندگی کا مقصد

خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نہایت سبق آموز و مفید لکچر

قیمت ۱ر (خریداران الناظر سے ۲ر)

قواعد المنتخب

جلال لکھنوی کا لاجواب رسالہ - جو
زبان کے متعلق بہترین تحقیقات سے لبریز ہے

قیمت ۴ر (خریداران الناظر سے ۳ر)

موازنہ انیسؔ و دبیرؔ

مولفۂ

مولانا شبلی مرحوم

جس میں میر انیس کی شاعری پر تفصیلی
ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا
موازنہ کیا گیا ہے۔

قیمت ے ر

(خریداران رسالہ کے لیے ؏)

مثنوی صبح امید

مولانا شبلی کی سب سے پہلی مطبوعہ نظم

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

ترقی زبان بذریعہ تراجم

پروفیسر گھوشال ایم اے کا وہ قیمتی
لکچر جو لکھنؤ کی اردو کانفرنس میں پڑھا گیا

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

شوکیہ اور دو مظلوم بہنیں

قیصر بھوپالی کے دو مختصر افسانے

قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

مولانا شبلی کے متفرق مضامین

زیب النسا	۱ر
جہانگیر اور تزک جہانگیری	۲ر
اسلامی حکومت	۲ر
اسلامی مدارس	۴ر

(خریداران الناظر سے ¾ قیمت)

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ مارچ ۱۹۲۵ء

نمبر ۱۶۵ — جلد ۲۸

مطبوعات جدیدہ

سیر الصحابیہ (جلد اول جزو المہاجرین) اس میں فن روایت و رجال کے ارتقاء تاریخی اور نقد و تبصرہ پر ایک بسیط مقدمہ ہے اور کتب حدیث سے اخذ کر کے مہاجرین اولین میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی مفصل سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ مولفہ مولوی سعید انصاری سابق رفیق دار المصنفین حجم ۵۰۶ صفحے کاغذ کتابت طباعت درجہ اعلیٰ۔ قیمت عہ

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کیجیے

کافوری جنتری ۱۹۲۵ء کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کے کارخانہ کی یہ کارآمد و مفید جنتری اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپی ہے اور درخواست پر مفت بھیجی جاتی ہے۔

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی

مقوی باہ کی گولیاں

۲۵ برس سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو رہی ہیں۔ طاقت دینے والی مشہور دوائیں فاسفورس و اشکلنیا وغیرہ سے یہ گولیاں بنی ہیں اسلیے مغز ریڑھ رگ اور خون کو طاقت دینے کا خاص گوئے رکھتی ہیں۔ زیادہ محنت جوانی کی خرابی و بداعتدالی خواہ کسی وجہ سے ہو ان گولیوں کے استعمال سے اول ہی روز سے فائدہ ظہور میں آتا ہے۔ بدن میں قوت، مزاج میں گرمی معلوم ہونے لگتی ہے۔ چہرہ پر رونق جوانی میں ضعیفی کی سی حالت ٹوٹے ہوئے جسم میں دوبارہ جوش لاتی ہے۔ قیمت ۴۰ گولیوں کی شیشی ایک روپیہ چار آنہ (عہ) محصولڈاک ایک سے دو شیشی تک چھ آنہ (۶)

مکردھج یعنی خالص سونے کا کشتہ

مریض اور تندرست دونوں کیلیے یکساں مفید۔ کون ہے جو سونے کے کشتہ کے فوائد سے واقف نہیں۔ فقط حکیم اور وید ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے ڈاکٹر بھی اسکے مداح ہیں۔ یہ سونے کا کشتہ خاص ہمارے کیمیا خانہ میں تیار کیا گیا ہے اور احتلام۔ دمہ۔ بدہضمی و دیگر امراض کیلیے نہایت درجہ مفید ہے۔ قیمت سات خوراک (عہ) محصولڈاک سات خوراک سے ۲۱ خوراک تک چھ آنہ (۶)

دمہ کی دوا

یوں تو کوئی بھی ایسا مرض نہیں جسکی تکلیف سے مریض نالاں و پریشان نہ ہو لیکن افسوس بدقسمتی سے دمہ کے مریض خاصکر ناقابل برداشت تکلیف دمہ سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں اور رات دن سانس پھولنے کی وجہ سے دم نکلے جاتے ہیں اور نیند تک حرام ہو جاتی ہے۔ دیکھیے آج انکو کسقدر تکلیف ہے۔ لیکن افسوس کہ اسکا علاج مرض کی بازاری دوا جو زیادہ تر نشیلی اشیاء دھتورہ، بھنگ، بلاڈونا، پوٹاس، اور وانڈ وغیرہ سے بنتی ہیں۔ اس سے فائدہ ہونا تو درکنار مریض بموت مارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی کیمیائی اصول سے بنی ہوئی دمہ کی دوا ایک انمول جوہر ہے۔ یہ صرف ہماری ہی بات نہیں ہے بلکہ ہزاروں مریض اس سے شفا پاکر اسکے مداح ہیں۔ آپنے بہت کچھ خرچ کیا ہوگا لیکن ایکمرتبہ اسے بھی آزما کر دیکھیے اسمیں کسی قسم کا نقصان نہیں ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ (۱۸) محصولڈاک چھ آنہ (۶) اس کے دو خاص فوائد ہیں (۱) ایک ہی خوراک سے دمہ دب جاتا ہے (۲) کچھ روز کے برابر استعمال سے جڑ سے جاتا رہتا ہے اور جب تک استعمال میں رہے دورہ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر ایس کے برمن پوسٹ بکس نمبر ۵۴۲ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ: ڈاکٹر گنگارام جیتلی۔ چوک لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۵ جلد ۲۸ — مارچ سنہ ۱۹۲۵ء

فیہ ما فیہ

(اثر خامہ: چلبی)

کہتے کیا تھے!

"اب سوال یہ ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی کے قائم کرنے سے ہمارا اصلی مقصد کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم کو ایک ایسے دار العلوم کی ضرورت ہے، جس میں اس ملک کے سات کروڑ مسلمانوں کے لیے سچے مذہبی جوش ... پیدا کرنے کا سامان موجود ہو" صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (رسالہ کانفرنس نمبر ۵ بابت مجوزہ محمڈن یونیورسٹی صفحہ ۱)

"سب سے اول ہماری تعلیمی ضرورت مذہبی تعلیم ہے۔ ماہران مسئلہ تعلیم کا اب اس پر اتفاق ہے کہ کوئی نظام تعلیم بغیر مذہبی تعلیم کے مکمل نہیں ہو سکتا ...... اعلیٰ تعلیم سے دماغ کا صیقل اور معلومات کا خزانہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو جائے، لیکن جب تک طالب علم کو ابتدا ہی سے اپنی عبدیت کا پورا احساس اور اندازہ نہ ہو، اسوقت تک اس زندگی کے متعلق اسکے تمام اندازے غلط بنیاد پر قائم رہیں گے۔" (ایضاً، صفحہ ۱۵)

"مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار بہت کچھ حقیقی مذہبی تعلیم پر ہے ...... ہماری قوم موجودہ زمانہ کی ٹکر اور کشمکش کا مقابلہ ہرگز نہ کر سکے گی، تا وقتیکہ مذہبی روح اس میں برقی قوت پیدا کر کے اسکی سرگرمی اور جوش کو بڑے درجہ اور پیمانہ پر نہ پہونچا دے۔ یہ تب ہی ممکن ہے کہ قوم کے نونہال اور ہونہار بچوں کے

دل و دماغ میں ابتداء سے اصول عبدیت اور نیابت الٰہی راسخ ہو کر از سر نو زندگی کے وہ نمونے پیدا کریں جن میں رسول پاک صلعم اور خلفاء راشدین اور قرن اول کے مسلمانوں کے اوصاف کی جھلک نظر آنے لگے۔" (ایضاً، ص۱۵)

"آپ اُس رسول کریم (صلعم) کی امت ہیں جن کی نگاہ میں روئے زمین کی سلطنت اور سونے چاندی کے پہاڑ اور ہیرے جواہرات کی کانیں ایک تنکے کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی تھیں... اپنے مالک و خالق کی رضا جوئی ان کا اصلی نصب العین تھا۔" صاحبزادہ صاحب (رسالہ کانفرنس نمبر ۲ ص۲)

"وہ (رسول خدا صلعم) اپنی امت کی کامیابی کا معیار اسکو نہیں قرار دیتے تھے کہ ان میں کس قدر حکمراں ہیں، کتنے دولتمند ہیں، اور کس قدر ذی جاہ صاحب جلال ہیں۔ وہ تو یہ دیکھتے تھے کہ انکی امت میں عبدیت کی کس قدر مقدار ہے، تقویٰ کس قدر ہے، خدا ترسی میں کیا درجے انہوں نے حاصل کیے ہیں۔" (ایضاً)

"پس آج بھی اگر مسلمان حقیقی طور پر ترقی کرنا چاہتے ہیں، تو انکو لازم ہے کہ اپنے خیالات اور امنگوں کو محدود دائروں سے نکال کر اخلاق فاضلہ کی دولت کو اپنا نصب العین قرار دے لیں قومی ترقی کا معیار اسکو نہ تصور کریں کہ ان میں کتنے ڈپٹی کلکٹر ہیں، کتنے جج ہیں، کتنے دولتمند ہیں، کتنے بی اے ہیں اور کتنے ایم اے" (ایضاً، ص۲۵)

"اس کا طریقہ صرف یہی ہے کہ ہماری قوم اپنے گمشدہ اخلاق تمدن کی دولت کو از سر نو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جو عملی تجویز اس مقصد اعظم کو پورا کرنے کے لیے قوم کے سامنے پیش کیا گیا ہے اسی کا نام مسلم یونیورسٹی ہے۔" (ایضاً، ص۲۶)

(اپنی ضرورتوں میں) "سب سے اول میں نے مذہبی تعلیم کو رکھا ہے.... سرکاری یونیورسٹیوں کی تعلیم میں جو نقائص ہیں ان کا بڑا سبب یہی ہے کہ ان تعلیم گاہوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں.... جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ مذہبی تعلیم ہماری ضرورت اعظم ہے۔" (ایضاً، ص۳۱)

"ہماری قوم کی تعلیم کا جو پروگرام ہے اس کا سب سے مقدم جزو مذہبی تعلیم ہے..... ایسی حالت میں جبکہ سرکاری یونیورسٹیوں میں یہ چیز ہم کو نہ حاصل ہے اور نہ ہو سکتی ہے، تو سوا اسکے اور چارہ کیا ہے کہ ہم اپنے لیے خود انتظام کریں۔ یہی ضرورت ہے مسلم یونیورسٹی کی ہے۔" (ایضاً، ص۳۴)

"جب تک مذہبی تعلیم اور دینیات کے مضمون کو کم از کم اُس قدر عظمت اور وزن نہ دیا جائے جس قدر کالجوں کی تعلیم کے اُن مضامین کو حاصل ہے، جو ڈگری کے امتحان کے لیے طلبہ کو لازمی طور پر پڑھنے پڑتے ہیں، تو آپ کیسے یہ توقع کرسکتے ہیں کہ نو عمر طلبہ کے دلوں میں مذہب کی وقعت قائم ہوسکتی ہے؟" (صاحبزادہ صاحب، رسالہ مذکور، ص ۲۶)

"جب تک یہ نہ ہوگا، ہمارا مقصد ہرگز حاصل نہ ہوگا۔ اور اس زمانہ کے تعلیم یافتہ گروہ میں مذہب کا وقعت نہ ہوگا۔ مگر یہ تب ہی ممکن ہے کہ ہماری اپنی یونیورسٹی ہو" (ایضاً)

"ہر مسلمان کی تربیت کے لیے، مذہبی ارکان کی پابندی لازمی جزو ہونا چاہیے۔ ضرورت اسکی ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ گروہ نہ صرف ارکان دین ادا کرنے کا عادی ہو جائے، بلکہ اُسکے دل میں اس طرز عمل کی وقعت ہو" (ایضاً، ص ۲۷)

"اُسکے لیے ضرورت ہے، کہ ارکان دین کی تعلیم ایسے علما کے سپرد ہو جن کی زندگی مذہبی طرز میں قابل نمونہ ہو، نہ صرف یہ کہ وہ خود ارکان دین کے پابند ہوں، بلکہ عبدیت و نیابت الٰہی کی جھلک اُنکے طرز زندگی میں پائی جائے ...... لیکن ایسے علما اگر دستیاب بھی ہو جائیں، تو وہ محض نقدسا ونپر ایسی خدمت تعلیمی قبول نہ کرسکیں گے، تا وقتیکہ اُنکے درجہ کے مطابق اُنکی عزت اور وقعت نہ ہو ...... جس دار العلوم کو ہم اسی غرض سے لیے قائم کرنا چاہتے ہیں اُسی کا نام مسلم یونیورسٹی ہے"۔ (ایضاً، ص ۲۸)

"اصلی مرض قحط الرجال ہے، جس کا سبب اخلاقی و علمی دولت کا سلب ہو جانا ہے، اس مرض کا علاج افراد کی کمی کا ازسرنو پیدا ہونا ہے، جسکا ذریعہ سوا اسکے اور کچھ نہیں، کہ ہمارا اپنا دار العلوم ہو" (ایضاً، ص ۳۰)

"عام تعلیم کے لیے مذہبی تعلیم ایک ضروری چیز ہے، اسکی عمدہ تعلیم کا انتظام اُسوقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک نصاب تعلیم ہمارے ہاتھ میں نہ ہو" ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (در کانفرنس ۱۹۰۸ء بمقام امرتسر)

"اُن علوم کی جو خاص طور پر مسلمانوں سے منسوب ہیں، مثل علم کلام، و تاریخ اسلام وغیرہ کے، اور جو اسوقت زوال کی حالت میں ہیں، ترقی بلا اسلامی یونیورسٹی قائم کیے نہیں ہوسکتی"۔ (ایضاً)

"یونیورسٹی ایسا مرکز ہوگا جس پر نہ صرف ہماری مادی ترقی کا دار و مدار ہوگا، بلکہ ہمارا اخلاق ہماری تربیت، ہمارا دین، اور ہمارا مذہب، غرض تمام خوبیاں اسی سے وابستہ ہونگی۔ اگر کالج پُرخطر راستہ دکھاتا ہے، تو یونیورسٹی گم شدگان کو راہ پر لائے گی۔ (سر علی امام در کانفرنس ۱۹۰۸ء بمقام امرتسر)

"کالج اور ندوہ دو جداگانہ راہیں قومی ترقی کے لیے ہیں، ان دونوں راہوں کو ملانا ہے۔

ہماری بہبودی اسی میں ہے کہ دونوں کو ملا دیں، اور یہ صرف یونیورسٹی کی بدولت ممکن ہے" (ایضاً)

"ہم کو اسلامی فلسفہ اور دینی علوم کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے اور تعلیم انگریزی کے ساتھ ابتداء سے مذہبی کورس بھی ضروری ہے، جس سے ہمارے بچے مسلمانیت سے خارج نہ ہوں .... جب ہماری یونیورسٹی قائم ہوگی، اُسوقت ہم اپنی دینی و دنیوی ضرورتوں کے موافق کورس تیار کرسکیں گے اور نہایت آسانی سے حسب منشاء عقائد اسلام بچوں کو تعلیم دلا سکیں گے" (نواب صاحب ڈھاکہ، صدر کانفرنس ۱۹۰۸ء بمقام امرتسر)

"ہم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ہمارا پہلا فرض ہے، کہ ہم اسلامی روح کو زندہ اور تروتازہ رکھیں۔ ہم کو ہمیشہ اپنے اسلاف کی پاک مثالوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اسلام کا سچا اور اصلی جوہر اسکی پاک تعلیمات، عمل کی سچائی اور روحانی تعلیم ہے" (سر آغا خاں، صدر کانفرنس ۱۹۱۰ء بمقام دہلی)

"ہمارا مقصد یہ ہے، کہ ہم علی گڈھ کو علم کا مرکز بنا دیں ..... اور دنیا کے سرمایۂ علم میں مسلمان علماء کے ذریعہ سے اُن اسلامی علوم و فنون کا بھی اضافہ کریں، جو اسوقت رو بہ تنزل ہیں۔ (راجہ صاحب محمود آباد، صدر کانفرنس ۱۹۰۹ء بمقام رنگون)

"میں اپنی ایک تحریر میں ٹرسٹی صاحبان کی خدمت میں اس مسئلہ کے متعلق لکھ چکا ہوں، کہ قائلان کلمۂ طیبہ سے عربی، اور عربی سے اہل اسلام کسی طرح جدا نہیں ہوسکتے۔ کلمۂ طیبہ کی تصدیق قلبی اور قرآن مجید کو کلام اللہ سمجھنا اُسی حالت میں ہو سکتا ہے جب مسلمان عربی کو جانتے ہوں۔ عربی کا جاننا اہل اسلام کے لیے بمنزلۂ ان کی روح و زندگانی کے ہے۔ جسد بے روح سے کوئی کیا اُمید کرسکتا ہے"

(خلیفہ محمد حسین، صدر کانفرنس ۱۹۰۵ء بمقام علیگڈھ)

"مجھ کو اس بات کا پورا خیال ہے کہ مدرسۃ العلوم میں مذہبی تعلیم پورے طور سے ہو، اور اسکے متعلق ایسی تجاویز کا جن سے مذہبی تعلیم کے ذمہ داروں کو مدد ملے، میں دل سے خیر مقدم کروں گا" (پرنسپل آرچ بولڈ، در ۱۹۰۵ء)

"مسلمانوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے، اور میری رائے میں وہ حق بجانب ہیں، کہ یونیورسٹی کی کل اسکیم میں مذہبی تعلیم کا داخل ہونا ضروری ہے ...... یہ دشواری مجوزہ بالا محمڈن یونیورسٹی کے قائم ہونے سے جاتی رہے گی۔ (پرنسپل ماریسن، در ۱۸۹۵ء)

"لارڈ کرزن کا قول ہے، کہ کوئی تعلیم جو مذہب پر مبنی نہیں، کامل نہیں ہوسکتی۔ اس مقولہ کی صداقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ...... اہل اسلام ابتدائی مذہبی تعلیم کو زیادہ ضروری جانتے ہیں، ان کا یہ خیال

صحیح ہے ..... میں وثوق کے ساتھ رائے دیتا ہوں کہ دینی اور دنیوی تعلیم پہلو بہ پہلو ہونا چاہیے تاکہ ایک دوسرے کے مزاحم نہ ہو۔" (جسٹس باڈم، صدر کانفرنس سنہ ۱۹۰۱ء بمقام مدراس)

"مقصود از بنا نہادن مدرسہ مخصوص از برائے مسلمانان ایں بود کہ ہم علوم متداولہ انگریزی را بیاموزند تا سررشتہ کیش و مذہب اسلام ہم از دست نہ رود، و ہم علوم مذہبی را آں قدر فراگیرند کہ از جہات و ضروریات مسائل بہرہ وافی اندوختہ باشند۔" (ایڈریس ٹرسٹیان کالج، بخدمت امیر افغانستان، در سنہ ۱۹۰۷ء)

(سرکاری یونیورسٹیوں کے موجودہ) "نظام تعلیم میں ایک بڑا ناقابل برداشت عیب یہ ہے، کہ اپنے مذہبی عقائد و مسائل اور اپنی ملت کی مقدس تاریخ سے ہمارے نوجوان گویا بالکل اجنبی رہ جاتے ہیں .... ہم اپنی یونیورسٹی سے وہ نہایت مہتم بالشان غرضیں پوری کرانا چاہتے ہیں، جن میں سب اول یہ ہے کہ کوئی مسلمان لڑکا اپنے مذہبی عقائد و مسائل سے ناواقف نہ رہے، اور اپنے بزرگان دین کی تہذیب و اخلاق سے عاری نہ ہو۔" (نواب عماد الملک، صدر کانفرنس سنہ ۱۹۱۰ء بمقام رامپور)

"سب سے پہلی چیز جسکی ہم کو ضرورت ہے، یہ ہے، کہ ایمان و عقائد کی تعلیم کا پورا تشفی بخش بندوبست ہونا چاہیے، اور اسکے واسطے نہ فقط معلم اور مدرس مقرر ہوں، بلکہ سخت نگرانی کے ساتھ عملی طور پر اسکو نافذ کیا جائے" (ایضاً، صدر کانفرنس سنہ ۱۸۹۶ء بمقام میرٹھ)

"حدیث پاک میں جو آپ سے یہ کہا گیا ہے، کہ اگر ضرورت ہو، تو علم کی تلاش میں چین تک جاؤ۔ تو یہ بات اس میں مفروض ہے کہ اگر آپ اپنے مذہب کی حفاظت کر سکیں! تو اسکی تلاش میں انگلستان، جرمنی، اور امریکہ کو جائیے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو بمبئی تک ضرور جائیے، لیکن اتنا ضرور کہوں گا، کہ اپنے منصوبوں کو منصفیوں اور ڈپٹی کلکٹریوں سے موڑیے" (میجر سید حسن بلگرامی صدر کانفرنس سنہ ۱۹۰۲ء بمقام لکھنؤ)

"دینیات کے اس اعلیٰ معیار کے ساتھ ایک اس سے ہلکا اور زیادہ عملی پیمانہ مذہبی تعلیم کا محدود میں ہونا ضرور ہے، جسکو مسلم یونیورسٹی کے ہر مسلمان طالب علم کے لیے لابد ہونا چاہیے" (ایضاً)

"مسلمانوں کی تعلیم اور انکے مذہبی تحفظ کے لحاظ سے اس امر کی نہایت ضرورت ہے کہ ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کی جائے...... مدرسوں میں درستیِ اخلاق، درستیِ اطوار، اور تربیت اسلامی کا کوئی انتظام طالبعلموں کے واسطے نہیں ہوتا۔ لیکن ایسی یونیورسٹی میں جہاں طالبعلم تعلیم مذہبی پائیں ..... تربیت و درستیِ اخلاق کا ہر ایک سامان کافی و وافی ہوتا ہے۔" (پرنسپل مارسین، صدر کانفرنس سنہ ۱۹۰۰ء بمقام رامپور)

کرتے کیا ہیں!

"آپ جبکہ یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے، ہمارے مواقع عمل اور ہماری ذمہ داریاں کہیں

بڑھ گئی ہیں، میرے ناظرین معاف کریں اگر میں وہ بیان کروں، جو میں محسوس کرتا ہوں، اور جسے میں واقعہ سمجھ رہا ہوں۔ لمبند آہنگی کے ساتھ دعویٰ کرنا، اور کام کچھ نہ کرنا، یہ شے ہم کو بہت ہی افسوسناک پست مرتبہ تک، تاریکی ہے۔ اگر ہم اپنے ہاں کی مذہبی تعلیم کو دیکھیں، تو ہمیں شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑیگا، کہ آج تک اس کا وجود ہمارے نظام عمل میں محض ایک رسمی حیثیت سے برقرار رہا ہے اور بس۔ حالانکہ اگر ہم اپنی کالج کی دیانت تقلید کرتے، تو اسوقت ملک کی مذہبی رہنمائی کرتے ہوتے۔ ہمارے کارکنوں کو، خواہ وہ مشاہرہ پاتے ہوں یا اعزازی، جب تک انکا تعلق مسلم یونیورسٹی سے قائم ہے قوم کی خواہشات کا نظرانداز کرنا ہرگز زیبا نہیں ...... ہمارے ہاں اردو، علوم مشرقیہ، و علوم اسلامیہ کے شعبے موجود ہیں اگر ان شعبوں کو صحیح طور پر اور ہمدردی کے ساتھ چلایا جائے، تو یہ ہماری یونیورسٹی اور ہماری قوم دونوں کی عظمت کے سرچشمہ قرار پا سکتے ہیں۔" (پروفیسر عبدالمجید قریشی در علیگڈھ میگزین بابت دسمبر ۱۹۲۱ء، حصہ انگریزی صفحہ ۵ و ۶)

"اگر کسی جلسہ میں ایک ہی موضوع پر دو تقریریں کی جائیں، ایک میں مغز بالکل نادارد ہو مگر انگریزی میں ہو، دوسری پُرمغز ہو، مگر معمولی اُردو میں ہو، تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عموماً اول الذکر ہی پسند کی جائے گی۔" (ڈاکٹر سر ضیاءالدین مراد، در علیگڈھ میگزین بابت دسمبر ۱۹۲۱ء حصہ انگریزی صفحہ ۶۶)

"کس قدر تاسف کا مقام ہے، کہ سرسید کی اعلیٰ روایات خدمت اُردو کے ہوتے ہوئے ہم لوگ جو اُنکے وارث و جانشین ہیں، اُردو کی طرف سے اس قدر بے اعتنائی برت رہے ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۶۷)

"علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی ایک دفعہ کی رو سے، جو پندرہ شعبے مضامین تعلیم کے فوراً قائم ہونے چاہئیں، ان میں سے ایک شعبہ اُردو بھی ہے۔ لیکن اب تک یونیورسٹی کے کارکنوں نے اس کا کھولنا ضروری نہیں سمجھا ہے۔ البتہ قانونی دفعہ کی تکمیل کے لیے رجسٹرار ہی کو اُردو کا اعزازی ریڈر مقرر کردیا ہے جنکے سپرد تعلیم کا کوئی کام نہیں۔" (ایضاً صفحہ ۶۸)

"اُردو کی طرف سے ہم جو بے التفاتی برت رہے ہیں، اسکی مثال کے طور پر ان واقعات کو دیکھنا چاہیے ......" (ایضاً)

"اگر واقعی نتائج کی روشنی میں دیکھا جائے، تو عبرت کا عنصر اس تعلیم گاہ کے پیداواروں کی زندگی و اخلاق میں کماحقہ نہیں ہے۔ مُسرفانہ انگریزی طرز معاشرت اختیار کرکے ہم نے یورپین تہذیب و تمدن کا وہ حصہ انتخاب کرلیا ہے، جو مطلق ضروری نہیں ہے، بلکہ اُس سے حظ نفس کی کمزوری کو مختلف شکلوں اور صورتوں میں تقویت حاصل ہوتی ہے۔" (صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب، صدر کانفرنس ۱۹۲۱ء بمقام علیگڈھ)

" فضولخرچی کی عادت ہماری قومی بد اخلاقی کی بہنے بھی حد سے زیادہ ناگوار خصوصیت تھی لیکن اسکی موجودہ شکل تو سراسر تباہ کن ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے وقت، توجہ، اور آمدنی کا اتنا بڑا حصہ ایسے مذاق اور عادات کی نذر ہو جاتا ہے، جن کو ضرورت سے بڑے بڑے مکانوں کی، بیش قیمت سامانوں کی، وضعدار لباسوں کی، پُر تکلف کھانوں کی، پارٹیوں اور تفریحوں اور زنانۂ مال کی دیگر فضولخرچیوں کی۔ ان سب کو ضروریات زندگی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اُن کمالات کے لیے کیا رہ سکتا ہے، جنکے بغیر ہم اس زمین پر نائب اللہ کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے ؟" (ایضاً)

" مسلم یونیورسٹی میں اسوقت ۱۵ شعبہ جات تعلیم قائم ہیں۔ اساتذہ کی مجموعی تعداد حسب ذیل ہے

پروفیسر	ریڈر	لکچرر
۱۵	۹	۱۶

اس اجمال کی تفصیل چند شعبوں کے متعلق حسب ذیل ہے:-

نام شعبہ	پروفیسر	ریڈر	لکچرر	ڈیمانسٹریٹر
انگریزی	۲	[illegible]	۱	-
تاریخ	۲	-	۲	-
طبعیات	۱	[illegible]	۱	۱
کیمیات	۲		[illegible]	۱
نباتات و حیوانیات	-	۱	-	[illegible]
طبیعات	-	-	۲	-
فنون	-	۲	۱	
فلسفہ	۲	-	۱	-

ان شعبوں کے مقابلہ میں دو اور شعبوں کے اساتذہ کی تعداد بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ ان میں سے ایک شعبہ علوم اسلامیہ ہے، جس میں پروفیسر ایک بھی نہیں، لکچرر ایک بھی نہیں، ریڈر صرف ایک! دوسرا شعبۂ اُردو ہے، پروفیسر کوئی نہیں، ریڈر کوئی نہیں، لکچرر صرف ایک!

یہ تعداد اساتذہ کی تھی۔ طلبہ کے اعداد اور زیادہ سبق آموز ثابت ہوں گے:

نام شعبہ	تعداد طلبہ
انگریزی	۴۶۷
تاریخ	۳۰۰
معاشیات	۲۰۲
قانون	۲۴۱
فلسفہ	۵۹
ریاضیات	۵۲
کیمیائیات	۱۰۶
طبعیات	۶۲

انکے مقابلہ میں شعبۂ بی ٹی میں طلبہ کی "عظیم الشان" تعداد ۳۵ ہے! سب سے زیادہ دلچسپ اور عبرت انگیز حالت شعبۂ علوم اسلامیہ کی رہی، جس میں خیر سے ایک طالب علم بھی نہیں!!

اعداد کی خاموش گویائی کے ساتھ وایس چانسلر بہادر (جناب صاحبزادہ صاحب) کا شعبۂ علوم اسلامیہ کے متعلق اپنی سالانہ رپورٹ میں حسب ذیل تبصرہ بھی قابل مطالعہ ہے:-

"شعبۂ علوم اسلامیہ کی حالت خاص توجہ و تبصرہ کی محتاج ہے، اس شعبہ میں نہ اسوقت کوئی طالب علم ہے، نہ اب تک کبھی رہا ہے۔ کہا جاتا ہے، کہ اس شعبہ کے ذمہ دار ارکان نے اب تک "علوم اسلامیہ" کا کوئی مفہوم ہی نہیں متعین کیا، اس لیے اسوقت تک نہ نصاب تیار ہوسکا، نہ تعلیم شروع ہوسکی۔" (رپورٹ سالانہ، وایس چانسلر مسلم یونیورسٹی بابت ۲۷-۱۹۲۶ء)

سنتے ہیں کہ سعدی کی زبان سے ایک مشہور "مکتب" اور مشہور "ملا" کے "کار طفلاں" کا انجام سن کر اس دانشگاہ کے بعض دانش آموزوں نے سرے سے طلبہ کا وجود ہی نہ رکھا، کہ نہ وجود "طفلاں" ہوگا، اور نہ انکے "تمام کار" کی نوبت آئے گی!

بہرحال "قول" اور "عمل" "وعدہ" اور "ایفاء وعدہ" کے تطابق کے یہ دلربایانہ نمونے دنیا کے سامنے ہیں، انکے بعد کچھ عرض و معروض کرنا، یقیناً سوء ادب ہوگا۔ استاد داغ آخر کچھ سوچ ہی کر کسی کے "پاس نزاکت" کی تعلیم دے گئے ہیں، اور خود تو اپنی تعلیم پر یہاں تک عامل تھے، کہ باوجود "دل ناشاد" رکھنے کے، عمر بھر

نالہ رُکتا ہوا، تھمتی ہوئی فریاد رہے

پر عامل رہے۔

اب کسے رہنما کرے کوئی!

علیگڑھ کے مشہور تارک موالات خواجہ عبد المجید صاحب نے تمام قومی مجلسوں سے قطع تعلق کرلیا۔ اس پر ایڈیٹر صاحب ہمدم لکھنؤ ناخوش ہیں، کہ سید ظہور احمد کی طرح الہ آباد کی بیرسٹری کیوں نہ شروع کردی، ایچ پیچ سے کام لینے، اور حلیہ جوئی کرنے سے کیا نتیجہ ہوا؟ لیکن ہمارے خیال میں یہ موقع خفگی اور ناخوشی کا نہیں، عبرت و تاسف کا ہے۔ خواجہ صاحب سے جو شخص واقفیت رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ انکی خدمات کی بنا پر انکی ذات سے کس قدر تحریک ترک موالات کے علمبرداروں کو تقویت تھی، اور انکی شخصیت کن غیر معمولی خوبیوں کی جامع تھی۔ لیکن بہرحال خدا کے کام اشخاص کے بھروسہ پر نہیں چلتے۔ خدا کو جس کام کو چلانا مقصود ہوتا ہے، وہ خود اسکے لیے اشخاص پیدا کردیتا ہے، وہ غنی مطلق اپنے بندوں کی بڑی سے بڑی شخصیتوں سے بے نیاز ہے۔ وہ جب چاہتا ہے، تو اپنے سب سے محبوب اور سب سے برگزیدہ بندہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو عین معرکۂ جنگ میں اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی کرادیتا ہے۔ جب چاہتا ہے، تو سید الشہداء امیر حمزہ جیسے مخلص کو دشمنوں کے ہاتھ سے انتہائی بے دردی و شقاوت کے ساتھ قتل کرادیتا ہے، اور جب چاہتا ہے، تو اپنی ہی فوج کے تین تین سرداروں (زید، جعفر طیار، عبد اللہ بن رواحہ) کو پے درپے جام شہادت پلادیتا ہے۔ اسکی شان استغنا اس سے کہیں ارفع ہے کہ اسکے کسی بندہ کی بڑی سے بڑی خدمت کو بھی اسکے سامنے "بطور حق" کے پیش کیا جاسکے! خیر اگر اسکی یہی مرضی تھی کہ لشکر حق کا ایک پرجوش و جاں باز سپاہی، عین معرکۂ جنگ میں ہتھیار رکھدے، تو بجز صبر و شکر کے کیا چارہ ہے، البتہ یہ دعا بھی ضرور ہے، کہ خدا اس لغزش کرنے والے بھائی کو پھر از سر نو ہدایت و استقامت نصیب کرے۔ باقی اگر تحریک کی بنیاد فی الحقیقت تقویٰ پر ہے (تقویٰ بری باتوں سے بچنے اور پرہیز رکھنے کو کہتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ لفظ 'ترک موالات' سے بہتر ہے) تو کارساز فطرت اس جنگ کو ہر نوع و ہر صورت جاری رکھے گا، خواہ بڑی سے بڑی شخصیتیں بھی اس کا ساتھ چھوڑدیں جیسا کہ اسوقت ہو رہا ہے

دین خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے　　دنیا اٹھی ہے اپنی تعلی کے واسطے
عارف جو ہیں رہینگے وہ اللہ ہی کے ساتھ　　اللہ بس ہے انکی تسلی کے واسطے

کجا می تا ید کجا می زند!

گاندھی جی نے کچھ روز ہوئے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں قتل مرتد پر اظہار خیال کے سلسلہ میں لکھا تھا، کہ ایسی تعلیم اگر قرآن میں موجود ہو، تو بھی اس دَورِ دانش میں اسکی تائید محض اس بنا پر کہ وہ قرآن میں درج ہے، نہیں کی جا سکتی۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اپنے اخبار زمیندار میں اسکے جواب میں قلم اُٹھانے کا ارادہ کیا، لیکن قلم اُٹھاتے ہی حملہ کا رُخ بدل گیا، یعنی بجائے گاندھی جی کے مذکورہ بالا دعوی کی تردید کے، سارا زور مولانا محمد علی کے اس دعوے کے جواب میں صرف ہونے لگا کہ قتل مرتد از روے شریعتِ اسلام جائز نہیں۔ کمان جب چڑھائی تھی، تو زد پر گاندھی جی تھے، لیکن جب تیروں کی بارش شروع ہوئی، تو بجائے گاندھی جی کے، مولانا محمد علی کا سینہ ہدف بنا ہوا تھا!

لوگ کہتے ہیں کہ ابھی قید فرنگ کے زمانہ میں مولوی ظفر علی خاں صاحب کلیات خسرو کے ایک قلمی نسخہ کو بہت عزیز رکھتے تھے، اور ایک غزل اکثر گنگناتے رہتے تھے۔ جس کا یہ شعر مشہور ہے

زہے غمزہ کز شوخی و چابکی　　　کجا می نہا ید کجا می زند

ایک مسلمان کی وفات

خورجہ کے قومی شاعر جناب تپش جن کی نظمیں اکثر اخبارات و رسائل میں اسلامی عنوانات پر نکلتی رہتی تھیں، افسوس ہے کہ مرض طاعون کے شکار ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم کوئی بڑے درجہ کے شاعر نہ تھے، لیکن دل میں اسلام کا درد رکھتے تھے۔ انکی نظموں میں گو شاعرانہ سقم ہوتے تھے، لیکن اسلامی جذبات کی تڑپ انکے کفارہ کے لیے کافی سے کہیں زائد تھی۔ آج اُن سے سوال اس کا نہ ہو رہا ہوگا، کہ فلاں غلط محاورہ یا ترکیب کو کیوں نظم کیا، بلکہ جو جذبات اسلام انکے قلم سے بن پڑیں، اُن کا اجر اُنھیں مل رہا ہوگا۔ خدا ہر کلمہ گو کو یہ اجر نصیب کرے۔ اور مرنے والے تپش کی روح کو اپنے سایۂ مغفرت میں جگہ دے۔

اعلان

توقع بدعد اب طبع ہو گیا ہے۔ کچھ نسخے زائد بھی چھاپ لیے گئے ہیں جو صاحب چاہیں طلب فرمالیں۔ قیمت ۴ر
جو ناظرین الناظر اپنے اوراق کو کتابی صورت میں رکھنا چاہتے ہوں وہ فوراً اطلاع دیں تاکہ سرورق رسالہ خدمت کیا جائے

منیجر الناظر لکھنؤ

دیوان غالب کی شرحوں پر ایک سرسری نظر

(از محمود مہانی)

بیا اے عشق رسوائے جہانم کن کہ پیچیدے
نصیحتہائے بے درداں شنیدن آرزو دارم

اُردو شاعری کے آدم اول ہیں حضرت امیر خسرو دہلوی اور آدم ثانی ہیں (بر بنائے شہرت عام) حضرت ولی دکنی۔ متقدمین میں اقلیم سخن کا نظم و نسق میر تقی میر اور میرزا رفیع سودا کے ہاتھوں میں دیا گیا اور متاخرین میں تاجِ دارائی میرزا غالب کے سر پر جلوہ فگن ہوا

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

شعرائے اُردو کے تذکروں پر بالاستیعاب نظر کرنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ میر و سودا و غالب وغیرہ کے کوس لمن الملکی بجانے کا اعتراف اُن باکمال ہستیوں کو ہے جن کا قول قول جنکا فیصلہ فیصلہ تھا جنکی تعریف تمغائے افتخار و طغرائے اعتبار تھی۔ اور آج ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر جو ان حضرات کی یکتائی کا ترانہ ہے وہ حقیقت میں سخن سنجان ماضی و حالِ کے فیصلہ کی صدائے بازگشت ہے۔ ساحریان سحر حلال (اساتذہ سخن) کے مرتبہ کا ادراک طبقہ عوام کو ہونے سے رہا۔ اُن سے ایسی امید رکھنا کفر کے ایمان اور ایمان کے کفر بنجانے کی اُمید ہے۔ اور بہرحال دلیل سبکسری ان یگانۂ دہر ہستیوں کی معراج جلالت کی حقیقی معرفت اُسوقت تک محال ہے جب تک اہل ذوق اساتذۂ ایران کی معجزہ آرائیوں پر ایمان نہ لا چکے ہوں اور اُنکی بیجزاں بہار سے نگاہ کا دامن گلچیں کا دامن نہ بن چکا ہو۔ خاصکر مرزا غالب کی قوت پرواز و قدرت ابداع و اختراع مضمون بلکہ انتخاب الفاظ و طرز ادا کی داد اُسوقت تک دی ہی نہیں جا سکتی جب تک عرفی شیرازی نظیری نیشاپوری۔ کلیم ہمدانی۔ طالب آملی۔ شوکت بخارائی۔ فغانی شیرازی۔ بیدل عظیم آبادی۔ ظہوری ترشیزی۔ میر اکبرآبادی۔ سودائے دہلوی کا کلام پیش نظر نہ رہ چکا ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا نے فارسی میں وہ کچھ کر دکھایا ہے جو انھیں کا

حق تھا۔ عرفی وہ ظالم ہے کہ زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتا۔ نظیری کی غزل ترانہ باربدی کا جواب ہے بیدل کی فکر آسماں سیر ہے۔ ظہوری کا کلام جانِ معنی و جہانِ معنی ہے۔ مرزا جب ان کا جواب لکھتا ہے تو خود وجد کرتا ہے اور نکتہ سنجوں کو سجدہ ریزی کی تعلیم۔ ان اُستادوں کی غزل پر غزل کہنے کا سہرا متاخرین میں اگر ہے تو مرزا ہی کے سر ہے۔ پھر غزل بھی ایسی کہ اُس سے بالاتر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اب رہا دیوانِ اُردو۔ وہ جہاں مختصر ہے وہاں منتخب بھی ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

یہ دیوان بھی مرزا کے کلام فارسی کے خصوصیات سے مالامال ہے۔ میں اس وقت غالب باکمال کی صرف ایک خصوصیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مرزا اکثر جس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں اُسے معراج کو پہونچا دیتے ہیں۔ ہر پہلو پر نظر رہتی ہے اور کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اُس کا جواب کہتے وقت نظر کرد گانِ قدرت ایجاد سپر انداختہ نظر آتے ہیں۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑتا ہے۔ اجزائے شعور بکھرنے لگتے ہیں۔ مثلاً

حد شوق میکشی گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
حد لذت تقریر دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
حد نا امیدی منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اُسکی دیکھا چاہیے
بے اعتباری اہل دنیا کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی

مرزا کو مبدأ فیاض سے صرف فلسفی کا دماغ اور شاعر کا قلم ہی نہیں عطا ہوا تھا بلکہ الہام نصیب کا دل بھی۔ جو اَوروں کا آسمان ہے وہ مرزا کی زمین ہے۔ مرزا کے خیالات و جذبات و اخلاق کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ جو اُنکے بدیہیات ہیں وہ اوروں کے نظریات بھی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرات مرزا کے واردات قلب سے اس حد تک متاثر نہیں ہوتے جس حد کا اثر مرزا کی معجز بیانی نے اُن اشعار میں ودیعت رکھا ہے۔ مرزا کے اکثر اشعار وہ آئینۂ تصویر نما ہیں جن میں مرزا اپنے دل پر گذرنے والے کیفیات کا مرقع بنکر اپنا عکس ڈال چکا ہے۔ جن لوگوں پہ وہی گزری یا گزر رہی ہے وہ ایسے اشعار پر نظر پڑتے ہی دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔ مرزا کے پہچاننے والے کم تھے۔ کم ہیں۔

اور کم رہیں گے۔ ہر شخص مرزا کے کلام سے بقدر فہم لذت یاب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد کام یاروں کا بقدر لبؔ و دنداں نکلا

مرزا ایک ہی وقت میں خوش نصیب بھی تھا بدنصیب بھی تھا۔ اُسکے واردات کی دنیا الگ تھی اُس زمانہ کی دلّی اہل کمال کی سجی سجائی محفل ضرور تھی مگر مرزا کی نگاہیں جن مناظر لاجواب کے مزے لوٹتی تھیں دورباش ادب کی ہیبت آفرینیاں اُن تک دوسری نگاہوں کو قدم نہ بڑھانے دیتی تھیں اور مرزا غریب اس اعتبار سے مسافر در وطن تھا۔ آخر اپنے جذبات سے مجبور ہو کر حسرت بھرے لہجہ میں فریاد کر اُٹھا

بیا ورید اگر اینجا بود زبانداۓ غریب شہر سخنہاۓ گفتنی دارد

تا زدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن این مے از قحط خریدارے کہن خواہد شدن

ہندوستان کی بدنصیبی پر کہاں تک روئیے رہا سہا ادبی مذاق تک چل بسا۔ مرزا کیسی اُستاد کے جگر پاروں کو کلیجہ سے کون لگائے۔ فارسی برائے نام کالجوں کے نصاب میں داخل تو ضرور ہے مگر اکثر جس طرح پڑھائی اور پڑھی جاتی ہے وہ اہل خبر سے پوشیدہ نہیں۔ اس طرح کے پڑھنے والے (باستثنا بعض) اپنے نصاب ہی کو خوب سمجھتے ہیں۔ پھر مرزا کی بلند پروازیوں کی داد کو پہونچنا اُن کے بس کی بات کہاں۔ کتابیں یوں دیکھی جاتی ہیں جس طرح زچہ تارے گنتی ہے۔ مگر اب زمانہ کروٹ بدل رہا ہے اور شکسپیر پرستان ہندی نژاد اپنے اُجڑے ہوئے گھروں اور بھولے ہوئے خزانوں کی دیکھ بھال کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ اور یہ ایسا انقلاب ہے جس پر سجدۂ شکر واجب ہے اور ارباب حل و عقد نے اب اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے کہ جب تک اپنی زبان پر قدرت نہ ہو اور زبانوں کے خزانے اپنی زبان میں منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ ہر یونیورسٹی میں اُردو کی تعلیم ضروری قرار پاتی نظر آتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مرزا کے دیوان کی شرح ایسی لکھی جائے کہ دیوان خود بہ زبان حال پکار اُٹھے کہ حق شرح ادا ہوگیا۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ کہ میں نے ایسی شرح لکھ دی۔ میں اپنی کور سوادی کا معترف ہوں مگر جب دنیا اظہار خیال کے لیے آزاد ہے تو مجھے بھی جو کچھ کہنا تھا کہ گذرا۔

سخن فہم ہمیشہ کم تھے اور اب تو زمانہ کج راہ رو کی بیداد سے نایاب ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں۔ اب رہے متوسطین و عوام وہ مرزا کا کلام خود تو کہیں کہیں سمجھتے ہیں باقی کے لیے ان کو موجودہ شرحوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے جن میں احباب نکتہ پرور نے بقدر قدرت دادِ سخن فہمی دی ہے۔ اس وقت دیوان غالب کی مندرجہ ذیل کامل یا ناقص شرحیں موجود ہیں۔ (۱) وثوق صراحت از والہ دکنی مغفور (۲) شرح مجدد السنۂ مشرقیہ حضرت شوکت میرٹھی مرحوم (۳) شرح مولانا حسرت موہانی زاد مجدہٗ (۴) شرح جناب نظامی بدایونی زاد مجدہٗ (۵) شرح جناب سید علی حیدر صاحب حیدر و نظم طباطبائی لکھنوی زاد مجدہٗ (۶) یادگار غالب از حضرت حالی مرحوم (۷) شرح جناب مولوی عبدالباری صاحب آسی زاد مجدہٗ (۸) شرح جناب سہا زاد مجدہٗ (۹) شرح جناب واحد دکنی۔ (۱۰) شرح حضرت سہا۔

یہ وہ شرحیں ہیں جنمیں جہاں کہیں کہیں داد سخن فہمی دی گئی ہے، ہیں بعض بعض اشعار کی شرح خواب بے تعبیر بن کر رہ گئی ہے اور جو شخص خود نہ سمجھتا ہو اُسکے دل میں (خاکم بدہن) مرزا کی طرف سے سوء ظن پیدا ہوتا ہے۔ انشاء اللہ میری شرح کے مقدمہ میں جہاں کلام مرزا کی تنقید ہوگی وہیں ان شرحوں پر بھی مبسوط تبصرہ ہو جائے گا۔

۱ (وثوق صراحت) مختصر سے مختصر اشارات کا مجموعہ ہے اور اس سے کام لینا نہایت مشکل ہے۔

۲ (شرح مولانا حسرت)۔ میرے خیال میں مولانا کی شرح اس قدر مختصر ہے کہ اُس پر اشارات کی لفظ صادق آتی ہے۔ مبتدی اُس سے معتدبہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ بعض مقامات پر سحیرن کی سی رفتار ہی جیسی اور شرحوں میں بھی نظر آتی ہے۔ اور یہ مکمل شرح بھی نہیں ہے۔ یہ شرح مولانا نے آغاز شباب میں لکھی تھی۔ جب خرد و خردہ کار کے شباب کا زمانہ آیا تو شاہد سیاسیات کی پرستش جزو ایمان بلکہ ایمان ہو گئی۔ اب جیسی نظر ثانی کی ضرورت ہے ویسی فرصت کہاں۔ ؎

ز ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

(۳) (شرح جناب شوکت)۔ مجدد السنۂ مشرقیہ کی شرح کے متعلق بصد ادب اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ آپ وہ پہلے شخص ہیں جس نے اس عقدہ لاینحل کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شرح اکثر مقامات پر کافرماجرائیوں کا طلسم ہے۔ اشعار کہیں کہیں تہ ہو گئے ہیں۔ اگر کہیں کہیں

تحریفِ کاتب کا بھی ایسا علاج کیا ہے کہ باید و شاید۔ سب اشعار اس شرح میں بھی نہیں۔ کہیں کہیں اعتراض بھی فرمائے ہیں انکی تنقید کا انتظار کیا جائے۔

(۴) شرح جناب نظامی بدایونی۔ اسکے متعلق اتنا ہی کافی ہے کہ یہ شرح بعض شرحوں کی عکسی تصویر یا صدا نُما (گراموفون) کا نغمہ ہے۔ اس سے تعرض مناسب نہیں۔

(۵) یادگار غالب۔ از حالی مغفور۔ اس میں بعض بعض اشعار کا خلاصہ مطلب ہے وہ بھی کسی خاص مطلب کے اظہار یا ثبوت کے لیے اور بس۔ اس سے بھی فی الحال تعرض مناسب نہیں۔

(۶) شرح جناب طباطبائی۔ اس شرح کو دیکھ کر ایک آتش مزاج ناظر کی زبان پر یہی آتا ہے کہ اگرچہ عوام میں یہ کتاب لاجواب مشہور ہے مگر میں اظہار حق میں سکوت کرنا حرام سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہی وہ شرح ہے جس نے ہر کس و ناکس کو جناب غالب کی جناب میں دریدہ دہنی کا سبق دیا۔ یہی وہ شرح ہے جس سے غالب بالکمال قبر میں تڑپ اُٹھا ہو تو جائے حیرت نہیں۔ اور یہی وہ شرح ہے جس کی بے گناہ کُشی سے اشعار غالب سیاہ پوش نظر آرہے ہیں اور دیکھیے اس گھر سے یہ ماتم کب نکلتا ہے۔ افقا حیہ مطلع کے متعلق مہمل ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا گیا اور تا حدامکان تمام شرح میں اصلاح فرمانے اور درست رکھنے کی سعی بلیغ سے نکتہ سنج شارح کہیں غافل نہیں رہا۔ کہیں تشبیہ مہمل بتائی گئی کہیں تمثیل لایعنی دکھائی گئی کہیں انتخاب الفاظ کے گلے پر چھری پھرائی گئی کہیں طرز ادا کے خرمن پر بجلی گرائی گئی۔ اہل دل جب اس شرح پر نظر ڈالتے ہیں تو بیساختہ علامہ فیضی علیہ الرحمہ کا یہ شعر انکی زبان پر آجاتا ہے

خوے عتاب آمیز را با لطف پیوندے بدہ　　ہم غمزہ را مغزے بکن ہم عشوہ را پندے بدہ

اور مزہ یہ ہے کہ نا آشنایان رموز نکتہ سنجی و محرومان ذوق سلیم بعض اشعار کی شرح میں شارح کو جی کھول کر داد دیتے ہوئے دیکھ کر گمان کرتے ہیں کہ حق تنقید ادا کیا جا رہا ہے۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ اگر تنقید کلام یہی ہے تو تنقیص کمال کسے کہتے ہیں۔ قصہ مختصر اس شرح میں انانیت و پندار کے بادل جھوم جھوم کے اُٹھے ہیں اور ٹوٹ ٹوٹ کے برسے ہیں۔

مگر بجز نا شاد نے جہاں تک اس شرح پر نظر ڈالی ہے اُسے تو یہ کہنا مناسب نظر آتا ہے کہ سادگی مزاج و جوش طبیعت مزاج شارح کے خاص جوہر ہیں اُس نے ہر جگہ اپنے دل کی ترجمانی کی ہے

وہ جہاں برس پڑنے میں طوفان ہے وہاں داد دینے میں آندھی ہے۔ اگر کچھ شکایت فاضل شارح سے کی جا سکتی ہے تو اتنی کہ زیادہ نہ سہی غالب کو اپنا ہی سا نکتہ شناس و محقق سمجھا ہوتا اور ایراد و اعتراض کو شک یا سوال کے قالب میں ڈھال دیا ہوتا۔ میری رسالے میں جہاں نکتہ سنج شارح نے دقتِ نظر سے کام لیا ہے وہاں نکتہ رسی کا حق ادا کر دیا ہے اور اُن مقامات کی داد نہ دینا مشربِ انصاف میں کفر ہے۔ مثلاً

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا میں غریب اور تو غریب نواز

ہاں جن مقامات پر سرسری نظر ڈالی ہے اور جہاں غالب باکمال کی شان فراموش ہو گئی ہے وہاں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے بہت سے اشعار کی شرح اُتنی ہی مشکل ہے جتنا شعر۔ کہیں کہیں بے پناہ شعر صرف داد دے کر چھوڑ دیے گئے ہیں اور ایراد کرتے وقت مرزا غالب کی جلالت قدر کا واجبی احترام نہیں کیا گیا۔

میں ادب الکاتب والشاعر و ساقی نامہ شقشقیہ کے مصنف (سید علی حیدر صاحب حیدر نظم طباطبائی) کی قابلیت علمی کو ورائے اہمیت سمجھتا ہوں اُنکی عروض دانی کا معترف اور پروفیسر نظام کالج حیدرآباد کی حیثیت سے اُنکی جلالت قدر کا معترف ہوں مگر کروں کیا کہ اس محل پر جناب طباطبائی کے احترام کے خیال سے ساکت رہنے کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ مرزا نوشہ سے یگانۂ دہر کی تنقیص کمال مجھے منظور ہے۔ اور یہی وہ خیال ہے جس کی بنا پر میرا ایمان خاموشی کو گناہ قرار دیتا ہے اور گناہ بھی ایسا جس کا کفارہ نہ ہو سکے۔ باقی شرحوں کے متعلق مجھے اسوقت کچھ کہنا نہیں ہے۔ میرے احباب کو مطمئن رہنا چاہیے۔ میں انشاء اللہ جادۂ انصاف سے نہ ہٹوں گا۔ غلط اعتراض کے اُٹھانے کی کوشش کروں گا اور صحیح ایراد پر سر تسلیم خم کروں گا۔ دنیا مجھے اپنی صحیح رائے کے سامنے سربسجدہ پائیگی میں مدت سے شرح کی داغ بیل ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ہمیشہ مجھے اپنی ناتندرستیوں اور مجبوریوں کا احترام سکوت پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ لیکن جب سے یہ سمجھ میں آیا کہ میری زندگی نام ہے ناکامی اور پیوند کا میری زندگی نام ہے ناتندرستیوں کے سلسلہ' ناتمامی کا بقول مخلص مولانا رعب الہی ادام اللہ مقامہٗ سے

میرا فسانۂ غم مصداقِ نا تمامی میری شبِ مصیبت مفہوم لاتناہی
میں نے خدا کا نام لیکر کشتی دھارے پر چھوڑ دی۔ ۶۔ ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم۔ الحمدللہ کہ اب شرح دیوان تمام ہوگئی ہے۔ میں اب ایک غزل کا حل لکھتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ موجودہ شرحوں کی تنقید بھی کرتا جاؤں گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے داغ دل بے درد نظرگاہِ حیا ہے

جناب شوکت مغفور۔ لالہ پر جو شبنم ہے وہ ادا سے خالی نہیں۔ بیدرد کا داغ اُسکی حیا کا نظرگاہ ہے یعنی لالہ کو شبنم حیا کی نظر سے دیکھ رہی ہے کہ میں تو تھوڑی دیر میں مٹ جاتی ہوں اور لالہ کا داغ نہیں مٹتا۔ یہ بات از حد قابل شرم ہے۔

تنقید۔ کاش فاضل شارح نے شعر کی نثر ہی پر اکتفا فرمائی ہوتی۔ اس فقرہ سے کہ یہ بات از حد قابل شرم ہے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ لالہ کیلیے قابل شرم ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شبنم کے لیے۔ گمان بس سی کوئی بات بھی الفاظ شعر کو مدنظر رکھتے ہوئی سمجھائی نہیں جا سکتی شعر سے زیادہ شرح کا سمجھنا مشکل ہے

جناب حسرت موہانی۔ گل لالہ پر شبنم کے قطرے نہیں ہیں بلکہ عرق شرم ہے۔ شرم اس بات کی کہ لالہ کے دل میں داغ تو ہے لیکن درد نہیں ہے۔

حاشیہ۔ جناب حسرت وہی فرماتے ہیں جو جناب طباطبائی۔ اس لیے تنقید بھی وہیں ہو رہے گی۔

جناب طباطبائی۔ گل لالہ پر اوس کی بوندیں ایک مطلب ادا کر رہی ہیں وہ یہ کہ جس دل میں درد نہ ہو اور داغ ہو وہ جائے شرم ہے۔ یعنی لالہ کے داغ تو ہے مگر درد عشق سے خالی ہے یہ بات اُسکے لیے باعث شرم ہے اور اسی شرمندگی سے اُسے عرق شرم آگیا ہے۔ مصرع میں ہے کے ساتھ نہ خلاف محاورہ ہے (نہ ہے) کے بدلے (نہیں) کہنا چاہیے۔

تنقید۔ بے دردگار ایہ داغ ہوا اور درد نہ ہو کیا بلا ہے۔ اگر اس شعر کا یہ مطلب کہا جائے تو یہی سمجھ میں آئے گا کہ شاعر نے لالہ میں داغ بھی دیکھا اور شبنم بھی۔ سوال پیدا ہوا کہ ایسا ہے کیوں۔ پھر اُنکی تُہور طبیعت نے خود وہی جواب دیا جو جناب طباطبائی کے حل میں مذکور ہے۔ مگر اس پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیکھنے والے نے یہی کیوں نہ سمجھ لیا کہ دل میں داغ ہو تو نہ رونا کیا معنی۔ یعنی جو داغ اُٹھائے گا

وہ ضرور روئے گا - اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ شاعر شاہراہ عامہ سے الگ جاتا ہے - اس حالت میں داغ کے ہوتے ہوئے درد کا ہونا ادعائے محض ٹھہرتا ہے - یہ صحیح ہے کہ ادعا شاعری میں ممنوع نہیں مگر جب تک لطیف و متین مطلب بے تکلف نکل آئے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے -

آگے بڑھ کر ارشاد ہوتا ہے کہ پہلے مصرعہ میں "ہے" کے ساتھ "نہ" خلاف محاورہ ہے - مگر میں با دب عرض کروں گا کہ یوں نہ کہنا تو کیا یوں کہنا "شبنم بگل لالہ نہ خالی ز ادا ہے" اس صورت میں اہلِ ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ "شبنم" پھر "بگل لالہ" کے بعد "خالی از ادا نہیں ہے" کہنا شعر کو ہیولیٰ بنائے دیتا ہے روابط کے سوا تمام شعر فارسی کے قالب میں ڈھلا ہوا ہے صرف "ہے" کو "ہست" سے بدل دیں تو شعر کا شعر فارسی ہوا جاتا ہے اور مصرع موزوں وہیں پہ خوب ہے جو شئے جہاں کی ہے -

ہجو و موہانی - حالی - بیدرد - سنگدل جیسے دوسروں کی مصیبت پر ترس نہ آئے - نظرگاہ - اُمیدگاہ - مرزا نوشہ فرماتے ہیں کہ لالہ پر اوس کی بوندیں یہ مطلب ادا کر رہی ہیں کہ بیدردوں کے داغ ہی سے حیا کی اُمیدیں وابستہ ہیں یعنی جب اہلِ دل یہ منظر دیکھتے ہیں تو اُن کا خیال بیدردوں کی ایک حالتِ خاص کی طرف منتقل ہو جاتا ہے - جب بے رحموں (خواہ معشوق مراد ہو یا کوئی ظالم) کا دل خود کوئی صدمہ اُٹھاتا ہے - مثلاً کسی پہ عاشق ہو جانا - مبتلائے فراق ہونا - کسی مصیبت میں پڑ جانا - کسی عزیز کا مر جانا - تو اُنکو عاشقوں یا مظلوموں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور یہی احساس اُنکو اپنے گذشتہ بیدردانہ طرزِ عمل پہ شرمندہ کرتا ہے اور اُنکی آنکھوں میں اشکِ ندامت چھلک آتے ہیں یا جوشِ پشیمانی سے پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے - اور اُنکی یہی وہ ادا ہے کہ اہلِ دل اُسکے صلہ میں اُنکی تمام برائیوں پر خاک ڈال دیتے ہیں اور اُنکو اُس پشیمان ظالم پر پیار آنے لگتا ہے - اس شعر سے تو بڑی حقیقت پر چھانوں پڑتی ہے اور مرزا کے اخلاق کریمانہ کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے - مصیبت بے رحموں کے لیے رحمت ہے اس لیے کہ رقتِ قلب پیدا کرتی ہے - مرزا نے فارسی میں بھی ایسا ہی کچھ کہا ہے -

نازنیناں کہ بانداز چہ جفا نیز کنند تو وفا بین کہ نکردند حیا نیز کنند

دل خوں شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

مولانا شوکت - دل کشمکشِ حسرتِ دیدار سے بتِ بدمست حنا کے ہاتھ میں آئینہ بنا ہوا ہے یعنی اُسکے

تغافل کو کھول رہا ہے کہ وہ حنا تو لگانے کے شوق میں بدست ہے اور یہاں حسرتِ دیدار میں دل کا کس قدر خون ہو رہا ہے ۔ بدستِ حنا بت کی صفت ہے ۔

تنقید ۔ جناب شارح نے خیال نہیں فرمایا کہ اس طرح مطلب لکھنے میں شعر کا مفہوم گونگے کا خواب ہو جاتا ہے۔ جناب حسرت موہانی مد دل اور آئینہ کی رسائی قسمت کا مقابلہ کرتا ہے کہ ایک ہمارا دل ہے جو خون شدۂ کشمکش حسرتِ دیدار ہے اور ایک آئینہ ہے جو اُس بدستِ حنا کے ہاتھ میں ہے ۔

۲ ۔ دل حسرتِ دیدار میں خون ہو کر بصورتِ حنا اُسکے ہاتھ میں آئینہ بن گیا ہے ۔

تنقید ۔ مطلب اول ظاہر میں تو دل کو لگتی ہوئی بات ہے مگر اس میں مصیبت یہ ہے کہ لفظ "حنا" حشوِ محض ٹھہرتا ہے ۔ حالانکہ مرزا کے یہاں زوائد ہوں گے بھی تو دفعِ نظرِ بد کے لیے ۔ علاوہ بریں بدستِ حنا یہاں بالاضافت نہیں ہے

۳ ۔ مطلب ثانی وہی ہے جو جناب شوکت نے لکھا ہے ۔

جناب طباطبائی ۔ آئینۂ دل مہندی بن گیا ہے یعنی حسرتِ دیدار نے اُسے پیس ڈالا اور اُسکے جگر کو لہو کر دیا۔ دل کو آئینہ بنا کر پھر اُسے حنا بنا دیا بہت ہی تصنع ہے اور بے لطف ۔

تنقید ۔ جناب طباطبائی کی شرح پر ناطقہ سر بگریباں ہے تو خامہ انگشت بدنداں ۔ رہی تنقید وہ دل لیے دیتی ہے ۔ دونوں کی حقیقت حل میں آئینہ ہوتی جاتی ہے ۔

تمہید ۔ ہے یوں کہ مرزا کا یہ شعر معشوق کی خود پرستی و محویتِ جمال کے متعلق جواب نہیں رکھتا مطلب واقف ہے گر تغافل کوں کرے ۔ بعض حضرات کو سمجھنے سمجھانے میں اس لیے وقت پیش آئی کہ اُنھوں نے بدستِ حنا کو اضافت سے پڑھا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس شعر میں تشابہات بھی جمع ہو گئے ہیں ۔ مثلاً دل اور آئینہ کی تشبیہ عام ہے ۔ دل خون شدہ اور حنا میں تشبیہ موجود ہے ۔

حل از بیخود موہانی ۔ دل حسرتِ دیدار کی کشمکش سے خون ہے آئینہ بت بدست کے ہاتھ میں حنا ہے ۔ یعنی دلِ پاک و صاف عاشق اس قابل نہ تھا کہ معشوق اُسے اپنا جلوہ زار بناتا اور آئینہ کا کام لیتا ۔ مگر بُرا ہو بدمستی کا کہ اس ظالم نے اُس سے حنا کا کام لیا ۔ مختصر یہ کہ اُس نے دل کو اتنا ترسایا کہ لہو ہو گیا۔ اس شعر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا نہ کرے کہ کوئی دنیا میں قدر چیز کسی قدر ناشناس کے ہاتھ پڑے ۔

حل بیخود موہانی ۔ معشوق اپنے جمال کی دلربائیوں کے تماشا میں ایسا محو و بیخود ۔ مست و مدہوش

ہو رہا ہے کہ آئینہ اُسکے ہاتھ میں یوں بے حس و حرکت قائم ہے جیسے رنگِ حنا کفِ دست پر۔ اور حسرت دیدار کی کشمکش نے عشاق کے دلوں کو لہو کر رکھا ہے یعنی معشوق خود اپنا فریفتہ ہے اُسے اپنی بھی خبر نہیں وہ کیا جانے کہ کوئی مشتاق دید بھی ہے اور ہے تو اُسپر کیا بن رہی ہے۔

۳۔ معشوق اپنے مہندی رچے ہوئے ہاتھوں کو اس محویت سے دیکھ رہا ہے جس محویت سے خود پرست آئینہ دیکھتے ہیں۔ اور عشاق کا دل حسرتِ دیدار لہو کیے دیتی ہے۔

۴۔ کشمکش حسرت دیدار مشتاقان دید کے دل لہو کیے دیتی ہے اور معشوق کو خود آرائی (سنگار) کا اس قدر شوق ہے کہ آئینہ اُسکے ہاتھ میں مہندی بنکر رہ گیا ہے یعنی کسی وقت آئینہ اُسکے ہاتھ سے چھوٹتا ہی نہیں۔ ایسا ہی کچھ اور ایک جگہ فرماتے ہیں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

فریفتگی معشوق کے متعلق مزید توثیق و ضیافت طبع ناظرین کے لیے دو چار شعر اور لکھے جاتے ہیں۔

لا ادری

با صد کرشمہ آں بتِ خویش مست میرود خود میکند خرام و خود از دست میرود

غالب

بخود رسیدنش از ناز بسکہ دشوار است چو ما بدام تمنائے خود گرفتار است

حالی

صید نا افگندہ محو دست و بازوے خود است ایں جواں روزے شکارِ خویشتن خواہد شدن

۵۔ حنا اُس بدمست کے ہاتھ میں آئینہ بنی ہوئی ہے۔ یعنی صاف ظاہر کر رہی ہے کہ عشاق کے دل کشمکش حسرت دیدار سے لہو ہو رہے ہیں۔ یعنی آہ وہ اپنے غرورِ حسن سے بدمست ہو رہا ہے نہیں تو رنگ حنا جو خون کا ہمرنگ ہے اُس پر ظاہر کر دیتا کہ عذر حنا کرنے سے مشتاقان دید کے دل لہو ہوے جاتے ہیں۔

حاشیہ۔ آئینہ کو باعتبار عدم حرکت حنا کہنا یا حنا کو باعتبارِ محویتِ معشوق آئینہ قرار دینا وہ داب تکلم ہے جو وہی شاعروں کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ شعر کے الفاظ نہیں شاعر نے سمجھ کر بھرے ڈالدیے ہیں۔ ایک لفظ سے دوسرے لفظ کو زور پہونچ رہا ہے۔ لفظ کشمکش سے دل کے لہو ہونے کی تصویر

آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ کشمکش یہ ہے کہ محویتِ معشوق کا تقاضا ہے کہ اس تماشے سے درگذر و اور اور حسرتِ دید کہتی ہے کہ بے دیکھے پلٹنا حرام ہے۔

شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی　　　　جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

اس شعر کے حل میں مجھے زیادہ اختلاف نہیں۔ میں جناب طباطبائی کا ایراد نقل کرکے جواب دیے دیتا ہوں۔

جناب طباطبائی۔ فرماتے ہیں "جی جلنا" اُردو کے محاورہ میں ناگوار ہونے کے معنی پر ہے۔ یہاں یہ معنی مقصود نہیں بلکہ جی کُڑھنا مقصود ہے۔ مصنف نے اپنی عادت کے موافق دل سوختن کا ترجمہ کرلیا ہے۔ فارسی میں کہیں گے کہ بر بے برگیش دلم می سوزد۔ لیکن اردو میں یہ کہنا کہ اسکی بیکسی پر دل جلتا ہے اچھا نہیں ہے۔ افسردگیِ دل سے اُس کا شعلۂ عشق سے خالی ہونا مراد ہے"

تنقید۔ جناب شارح نے غور نہیں فرمایا۔ مرزا "جی جلنا" غصہ آنے ہی کے معنی پر فرما رہے ہیں۔ "بیکسی پر دل جلنا" یہ مثال قیاس مع الفارق کے حکم میں ہے۔ کجا بیکسی کجا پست ہمتی۔ کسی کی بیکسی پر غصہ آتا ہے بے رحموں اور بودوں کو۔ اور اپنی کم جرأتی پر غصہ آتا ہے اہل دل کو۔ ۲ ہاں مرزا مجتہدین فن خصوصاً میر تقی میر و مرزا رفیع سودا کی طرح فارسی محاوروں کا ترجمہ جائز ہی نہیں ضروری سمجھتے ہیں ۳ دل کی افسردگی سے شعلۂ عشق سے خالی ہونا ہی مراد نہیں بلکہ پست ہمتی مراد ہے۔ جیسے اصطلاح علم اخلاق میں بیدلی کہتے ہیں۔ دل جلنا دل کُڑھنے کے معنوں پر بھی ہے۔ مرزا رفیع سودا فرماتے ہیں ؎

بیکس کوئی موے تو جلے اُسپہ دل مرا　　　　گویا ہے یہ چراغ غریباں کی گور کا

حل شعر غالب از بیخود۔ دل کی بیہمتی و بے حوصلگی پر حد کا غصہ آتا ہے جسکے ہاتھوں دل کی ایسی بربادی ہوئی کہ عشق کے چلتے نہ ہوتی۔ کوئی اُستاد کہتا ہے ؎

نہ زخمِ تازہ می خاردنہ داغ کہنہ می کاود　　　　بدہ یارب دلے کایں صورتِ بیجاں نمیخواہم

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق　　　　آئینہ باندازِ گُل آغوش کشا ہے

جناب حسرت و شوکت و طباطبائی نے پورے طور پر حق شرح ادا نہیں کیا۔ میں صرف جناب طباطبائی

کی عبارت نقل کیے دیتا ہوں۔ اس لیے کہ عبارت واضح نہیں۔

جناب طباطبائی ارشاد فرماتے ہیں کہ تیرے عکس عارض کا رنگ ایسا شوخ ہے یا تمام تمثال میں ایسی شوخی بھری ہے کہ آغوش آئینہ آغوش گل بن گیا ہے اور تیرا عکس آئینہ کو گل کی طرح شگفتہ کرکے نسیم کی طرح اسکے آغوش سے نکل گیا۔ یہاں عکس کی شوخی بیان کرنے سے خود معشوق کا چنچل پن اور شوخ ہونا بالالتزام ظاہر ہوا۔

تنقید۔ جناب غالب نے آئینہ کی آغوش کشائی کو گل کی آغوش کشائی ... سے تشبیہ دی تھی جس نے جناب شارح کو اپنی شرح میں عکس کو نسیم سے تشبیہ دینے پر ابھارا اور اس میں اتنی محویت ہوئی کہ مطلب کے ادا نہ ہونے کی طرف توجہ فرمانے کا موقع نہ ملا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ مرزا تشبیہ پر تشبیہ دیتا چلا جاتا ہے بلکہ اس تشبیہ سے مرزا کا خاص مطلب ہے جو حل میں بیان کیا جائے گا۔ یہ مدنظر رہے کہ پھول کھلنے کے بعد پھر کلی نہیں بن سکتا۔ ہاں جناب طباطبائی کا یہ ارشاد ضرور صحیح ہے کہ یہاں عکس کی شوخی بیان کرنے سے معشوق کا چنچل ہونا بالالتزام ظاہر ہوا۔

حل تجوید۔ تمثال عکس۔ تصویر۔

۱ آئینہ میں جو کچھ ہوتا ہی ہے مگر عاشق کو چنچل معشوق کی شوخیوں سے متاثر ہونے کی حالت میں ایسا نظر آرہا ہے کہ اسکے عکس میں ایسی شوخی ہے کہ جسکے اثر سے بیتاب ہوکر آئینہ نے اسکی تمثال کو کلیجہ سے لگا لینے کے لیے گل کی طرح آغوش کھول دیا ہے۔

۲ تیری تصویر ایسی شوخ کھنچی ہے کہ آئینہ نے بیتاب ہوکر آغوش کھول دیا ہے۔ چونکہ تصویر ہر وقت آئینہ ہی میں رہتی ہے۔ اس لیے اسکی شوخی بھی قائم رہتی ہے اور آئینہ بھی ہر وقت آغوش شوق کھولے رہتا ہے۔ آئینہ کے متعلق میرا شعر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے ؎

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

۳ تو اتنا چنچل ہے کہ آئینہ ادھر اٹھایا ادھر رکھ دیا۔ تیری شوخی سے بیتاب ہوکر آئینہ نے آغوش کھولا تھا اور پھر گل کی طرح کھولے ہی رہ گیا یعنی حیرت شوق آئینہ پر طاری ہوئی تو ہمیشہ کے لیے طاری ہوئی۔ جس طرح کلی کھل جانے کے بعد پھر کلی نہیں بن سکتی۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

جناب شوکت - قمری جل کر راکھ کی مٹھی بن گئی اور بلبل کا رنگ قفسی یعنی سیاہی مائل ہے - اے نالہ انکے جگر سوختہ کا بھی کوئی نشان ہے - قمری کا رنگ خاکستری اور بلبل کا سیاہ (رنگ آہنی پنجرے کے ہم شکل) ہوتا ہے - اور دونوں نالہ کرتی ہیں اور نالہ ہی سے انکو جلا دیا - تمام نسخوں میں قفس رنگ بالاضافت غلط طبع ہوا ہے (بلکہ "قفسی رنگ" ہے)

تنقید - اس حل میں اے نالہ انکے جگر سوختہ کا کوئی نشان بھی ہے عجیب فقرہ ہے - آتش کاوش ہوئی مگر بیت جیسی عقیم تھی ویسی ہی عقیم (بانجھ) رہی -

جناب حسرت - جگر سوختہ کا کوئی نشان سوائے نالہ کے باقی نہیں ہے - پہلا مصرع بطور تمہید کے لکھا ہے کہ جس طرح قمری عشق سرو میں ایک کف خاکستر اور بلبل عشق گل میں صرف رنگ ہی رنگ رہ جاتی ہے اسی طرح تمام سوختہ جگر کا کوئی نشان بجز نالہ کے باقی نہیں رہا ہے۔

تنقید - اگر جناب حسرت کا حل صحیح مانا جائے تو یہ مصیبت پیش آتی ہے کہ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اگر جگر سوختہ کا نشان سوائے نالہ کے کچھ باقی نہیں ہے اور تمامی کافی ہے تو یہ بات یعنی نالہ کشی تو بلبل و قمری میں بھی پائی جاتی ہے پھر مرزا صاحب نے شعر میں لفظ یعنی قمری کو کف خاکستر اور بلبل کو قفس رنگ کہا معنی و حسن شعر میں کیا اضافہ کیا ہے - اور جب اضافہ نہیں کرتا تو ع

این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

جناب طباطبائی - قمری میں بسبب نالہ کشی کے کچھ خاکستر جگر پائی جاتی ہے اور بلبل میں کچھ رنگ جگر کا ملتا ہے باقی جگر کا کچھ پتہ نہیں - مطلب یہ ہے کہ نالہ کشی ایسی چیز ہے کہ جگر کو جلا کر نابود کر دیتی ہے اور قفس میں سبد بھی ہے دونوں معنی یہاں مراد ہیں - قمری کو کف خاکستر تو ظاہری رنگ کے اعتبار سے کہتے ہیں لیکن زرد بلبل کو سبد رنگ کہنا نئی بات ہے مگر بے لطف ہے (۲) نالہ کو مخاطب بنانا بھی بے مزہ بات ہے اور جگر سے بظاہر بلبل و قمری کا جگر مراد ہے - احتمال یہ بھی ہے کہ اپنے جگر سوختہ کا نشان شاعر پوچھ رہا ہے - شعر میں جہاں دوسرے معنی کا احتمال پیدا ہوا وہ سست ہو گیا -

تنقید - مفہوم شعر کے متعلق میں طول کے خوف سے کچھ نہ لکھوں گا

(۱) بلبل کو قفس سے جنسی مناسبت ہے ظاہر ہے - پھر بلبل کو قفس رنگ کہنا یا قفسی رنگ کہنا بلبل کے معنی پر ایک لطیف و جدید لفظ کا اضافہ ہے جیسے لیلیٰ کو جان مجنوں [illegible]

اہل ذوق پر واجب ہے - یہ صحیح ہے کہ جس طرح سُرمئی اور اگرئی وغیرہ رنگوں کے نام ہیں اُس طرح قفسی کسی رنگ کا نام نہیں ہے گر رنگ سیاہ کی جگہ پر قفسی رنگ کہنا اور پھر بلبل کے متعلق ضرور داد کے قابل ہے - (۲) خبر نہیں نالہ کو مخاطب بنانا کیوں بے مزہ ہے اس لیے کہ غیر ذوی روح اشیا سے جانداروں کی طرح خطاب کرنا ایران و ہند کی شاعری میں عام ہے اور انگریزی میں بھی نایاب نہیں (۳) یہ ارشاد کہ شعر میں جہاں دوسرے معنی کا احتمال پیدا ہوا وہ سست ہو گیا یہ صحیح ہے مگر جب احتمال ہو نہ - جب تغیر لہجہ یا کسی اور صورت سے کئی مفہوم بے تکلف نکلیں تو داد کے قابل ہیں - خواہ وہ مطالب مصنف کے ذہن میں شعر کہتے وقت موجود ہوں یا نکات بعد الوقوع کے تحت میں آئیں اور یہ تو شاعری کا معجزہ ہے کہ شعر دو متضاد معنی رکھتا ہو اور دونوں اپنی جگہ پر لطیف و مضبوط ہوں۔ جس طرح تصویر کی آنکھ بنانے میں مصور کا کمال یہ ہے کہ ایسی آنکھ بنائے کہ انسان جس سمت سے تصویر پر نظر ڈالے یہی سمجھے کہ صاحب تصویر مجھی کو دیکھ رہا ہے (خاص کر توریہ کے محل پر تو ایسا کلام کمال زبان آوری کے لیے مایۂ ناز ہے) ملک المعانی حضرت خاقانی فرماتے ہیں

همسایه شنید نالهٔ ام گفت ‏ ‏ ‏ خاقانی را دگر شب آمد

اس کا حل یہ ہوگا:-

(۱) ہمسایہ نے میرا نالہ سنکر کہا، لو پھر رات ہوئی کمبخت نے کل کی رات نیند حرام کر دی تھی آج کی رات بھی آنکھوں میں کٹتی نظر آتی ہے -

(۲) ہمسایہ کا مقصود یہ ہے کہ خاقانی رات اس درد و کرب سے رو رہا تھا کہ رات کٹنے کی امید نہ تھی سبحان اللہ کہ اب تک زندہ ہے

(۳) ہمسایہ ہمدردانہ لہجہ میں کہتا ہے کہ خاقانی بیچارے کی رات بڑی مصیبت سے کٹتی ہے۔ لو پھر رات ہوئی اور اُس پر وہی شدائد گذرنے لگے - اے کیسی مصیبت کی زندگی ہے -

(۴) ہمسایہ بنظر استہزا کہتا ہے کہ لیجیے پھر رات ہوئی اور پھر وہی اُدھم مچنے لگا -

خدائے سخن میر

جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات ‏ ‏ ‏ کلی نے یہ سُنکر تبسم کیا

حل - کلی نے بتا دیا کہ گُل کا ثبات بقدر یک تبسم ہے -

(۲) کلی اس بات پر مسکرائی کہ میری بہار عمر کی بے ثباتی سے مجھے کس لطیف پیرایہ میں آگاہ کیا۔
(۳) کلی پوچھنے والے کی سادگی پر مسکرائی کہ میں تو ابھی کلی ہوں میں کیا جانوں کہ گل کا ثبات کتنا ہے یہ پوچھنا ہو تو گل سے پوچھے۔
(۴) یہ بھی مقصد ہے کہ حضور کے نصیحت فرمانے کی ضرورت نہیں میں خود اپنی بے ثباتی سے واقف ہوں۔
(۵) مسکرانے کی وجہ یہ تھی کہ چلے ہیں اس وقت یعنی آغاز بہار و شباب پر نصیحت کرنے جس وقت کوئی کسی کی نہیں سنتا۔
میں پھر اصل شعر لکھے دیتا ہوں :-

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ ۔۔۔ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

حل شعراز بیخود موہانی (۱) قمری اور بلبل دونوں نالہ کش ہیں۔ قمری سوز عشق سے جل کر کفِ خاکستر اور بلبل خاک سیاہ ہو گئی ہے۔ اور اس طرح دونوں اپنے سوز عشق کا مرقع بنی ہوئی ہیں ان کا دعویٰ عشق مسلّم ہے۔ اے نالہ میں اپنے سوز دل کے ثبوت میں دنیا کو کیا دکھاؤں۔ خالی نالہ دعویٰ بے دلیل ہے اور موجب رسوائی۔ کمال عشق یہ ہے کہ عاشق ہمہ تن سوز سراپا شعلہ بن کر رہ جائے۔ مقصد یہ ہے کہ میں شیدائیوں کی صف میں آتے ہوئے شرماتا ہوں اسلیے کہ میرا سوز سوز ناتمام ہے۔ مثال کے طور پر کچھ شعر لکھے جاتے ہیں۔ غالب

اُس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھا دے ۔۔۔ میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

سودا

سودا قمار عشق میں مجنوں سے کوہکن ۔۔۔ بازی اگر چہ لے نہ سکا جی تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپکو کہتا ہے عشقباز ۔۔۔ خانہ خراب تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

(۲) ایک اور مفہوم۔ مصرعۂ ثانی کو اگر لہجۂ تحقیر میں پڑھیں تو صاف نکلتا ہے : انسان اشرف المخلوقات ہے ظرف اُسے اپنی حیثیت کے موافق عطا ہوا ہے۔ اے نالہ تو قمری کو کف خاکستر اور بلبل کو خاک سیاہ دیکھ کر مجھ سے میرے جگر سوختہ کا نشان پوچھتا ہے میں تجھے کیا بتاؤں میرے جگر سوختہ کا نشان ہی کیا۔ میں بلبل و قمری کا سا اوچھا نہیں۔ مجھے جیسا سوز عطا ہوا ہے ویسا ہی ضبط بھی۔ دوہا

آہ کروں تو جگ جلے اور جنگل ہو جل جائے ۔۔۔ یہ پاپی جیرا نا جلے کہ جس میں آہ سمائے

شیخ ناسخ علیہ الرحمہ

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے ۔۔۔ جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا ۔۔۔ غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

کوئی اُستاد کہتا ہے

بلبل نیم کہ نعرہ زنم درد سر کنم قمری نیم کہ طوق بہ گردن در آورم
پروانہ نیستم کہ بہ یک دم عدم شوم شمعم کہ جاں گدازم و سر بر نیاورم

ترجمہ) قمری جس کا دل تھا وہ جل گئے راکھ کے رنگوں ہوگئی، بلبل سیاہ پڑ کر رہ گئی۔ مگر ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ سوز دل نے کلیجہ پھونک دیا اور دنیا نے نہ جانا کہ ہم پر کیا گزری۔ [illegible]

[illegible] ہو گیا بھی اور کوئی جل بھی خاک میں [illegible] ایسی جلی کوئی بھی [illegible]

۴ جب کوئی چیز جل جاتی ہے تو کوئلہ ہو جاتی ہے اور جب بالکل جل جاتی ہے تو راکھ ہو جاتی ہے۔ [illegible] کہ ایک کا رنگ خاکستری ہے دوسرے کا سیاہ۔ [illegible] ان دونوں [illegible] ترجیح نسکو ہے یعنی میرے نزدیک قمری کو بلبل پر ترجیح ہے۔

[illegible] افسردہ کیا وحشت دل کو معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

جناب شوکت۔ تیری خو میں اس قدر [illegible] کہ اس کے سامنے وحشت دل افسردہ ہے خوئے معشوق اور وحشت [illegible] دونوں [illegible]۔

تنقید۔ اگر مطلب یہی ہے تو اس میں خوبصورتی کا نام نہیں اسلئے کہ برہنہ لفظوں میں اسکے معنی یہ ہوئے کہ معشوق کی [illegible] عاشق کی [illegible] اور اُمنگوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ واقعہ بھی ہو تو کہنے کی بات نہیں جناب طباطبائی۔ معشوق ہو کر ایسا پھیکا پن، ایسی ٹھنڈی طبیعت نہ ناز و ادا کا حوصلہ، نہ چھیڑ کا مزہ۔ طرفہ بلا ہے۔ یعنی قابل نفرت ہے۔ خوے بیدماغی و بدمزاجی مراد ہے۔ لفظ وحشت اس شعر میں مصنف نے ذوق و شوق کی جگہ پر باندھا ہے اور اصل میں وحشت و نفرت کے معنی قریب ہیں وہ یہاں بنتے نہیں کیونکہ مطلب یہی ہے کہ تیری بدمزاجی سے دل کو وحشت ہوگئی نہ کہ وحشت دل افسردہ ہوگئی غرض یوں کہنا چاہیے تھا کہ افسردہ کیا خواہش دل کو یا حسرت دل کو جب لفظ مطابق معنی ہوتا۔

تنقید۔ (۱) طرفہ بلا ہے کے معنی "قابل نفرت ہے" تو نہیں بلکہ عجیب (انوکھی) بے جوڑ یا تماشے کی بات ہے اور بس۔

(۲) وحشت کے معنی یہاں ولولے اور اُمنگ کے ہیں جسے معشوق [illegible] زبان میں وحشت کہتے ہیں جب عاشق معشوق کو چھیڑتا ہے یا بیتابیاں کرنے لگتا ہے تو غمزہ [illegible] کی زبان سے ایسے الفاظ نکلوا دیا کرتا ہے جیسے یا وحشت یا ہیجو وحشت کی [illegible] حضرت داغ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

پوچھا مزاج اُس نے تو وحشت کی لے لی — آخر کو پردۂ دلِ دیوانہ کھل گیا

مرزا نے معشوق کا کہا ہوا صرف ایک لفظ یعنی "وحشت" دوہرا کر عاشق و معشوق کی خلوت عاشق کی چھیڑ چھاڑ اور معشوق کے جواب کی تصویر کھینچ دی جس کا لطف کچھ اہلِ ذوق ہی جانتے ہیں اپنی تنقید کی توثیق کے لیے مرزا ہی کا ایک مطلع اور جناب طباطبائی کی شرح نقل کیے دیتا ہوں۔ غالب

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

جناب طباطبائی اس شعر کا مطلب یہ تحریر فرماتے ہیں یعنی تو میرے اظہارِ عشق پر کہتا ہے کہ تو دیوانہ ہو گیا ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی (۳) تیری بدمزاجی سے دل کو وحشت و نفرت ہو گئی۔ یہاں یہ فقرہ بھی عاشق کی زبان سے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا خصوصاً اس صورت میں کہ الفاظِ مصنف کانوں پر ہاتھ دھر رہے ہیں۔ مراد قائل ادا کر رہی ہے طبع شاعر آمادۂ ہرب ہے۔ (۴) وحشت دل کو خواہش دل یا حسرتِ دل سے بدل تو دیں مگر مذاق سلیم کی پیشانی شکن آلود ہو جائے گی۔

حل۔ بیخود۔ تیری بے دماغی تیرے روکھے پھیکے پن نے دل کی امنگوں کو کم اور ولولوں کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ معشوق ہو کر چھیڑ چھاڑ سے ایسی نفرت۔ توبہ۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت — دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

بیخود۔ مجھے اس شعر کے مطلب میں کسی سے اختلاف نہیں ہے۔

حل۔ مرزا فرماتے ہیں کہ ہم حالت مجبوری میں محبت نباہ رہے ہیں۔ ہمارے پیمانِ وفا کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر کے تلے کسی کا ہاتھ دب گیا ہو اور نکالتے نہ بنے۔ اس میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ عہد کرتے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ گویا ہم سے اور معشوق سے پیمانِ وفا نہیں ہوا ہے بلکہ مجبوری سے۔ (یہاں مجبوری ذی روح تصور کی گئی ہے)

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ — تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

گذارش۔ اس شعر کے مطلب میں مجھے کسی سے اختلاف نہیں۔ ہاں اتنا عرض کر دینا ہے کہ شعر تو ادائے مطلب میں قاصر نہیں۔ خیر [illegible] جناب طباطبائی نے ادائے مطلب کا کیا معیار قرار دے رکھا ہے۔

حل۔ کسی مجروح [illegible] کی نظروں میں معشوق (یا کسی ظالم) کی تیغِ ستم کا انداز دیکھ کر اگلے شہیدوں کی تصویر پھر گئی ہے اور وہ کہتا ہے کہ تیری تلوار تلوار نہیں ایک آئینۂ تصویر نما ہے یعنی اس سے پتہ چلتا ہے کہ

اس تلوار کے گھاٹ اُترنے والوں پر کیا گذری ہوگی۔

اے پرتو خورشید جہانتاب ادھر بھی　　سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

پرتو خورشید۔ رحمت پروردگار۔ یا جناب رسالتمآبؐ۔ کرم و جلوۂ معشوق۔ مرشد۔

حل۔ اے تمام دنیا کے روشن کرنیوالے آفتاب کے نور ایک نظر کرم ادھر بھی۔ ہم پر سایہ کی طرح عجب وقت پڑا ہے۔ اس شعر میں بہت سے لطیف نکتے ہیں۔

(۱) دھوپ جب سایہ پر آجاتی ہے تو وہ بھی دھوپ ہوجاتا ہے۔ یعنی ہم کو اپنے رنگ میں رنگ دے۔

(۲) سایہ کی تشبیہ تعریف سے بے نیاز ہے۔ وہ یوں کہ سایہ کی مصیبت آفتاب کے سوا کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی یعنی ہمارے درد کا علاج سوا تیرے کسی کے بس کی بات نہیں۔

(۳) آفتاب کو سایہ کے چمکا دینے میں کوئی دقت ہوتی ہے نہ تکلیف یعنی تیرے ادنی سے اشارہ میں ہمارا کام بنجائے گا۔

(۴) عجب وقت پڑا ہے یعنی سخت سے سخت مصیبت ہے جسکے اظہار کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے نہ کوئی اُس مصیبت کا صحیح اندازہ کرسکتا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جناب شوکت کی شرح میں یہ شعر نہیں۔ جناب حسرت نے صرف نثر فرمادی ہے۔ جناب طباطبائی نے صرف داد دینے پر اکتفا فرمائی ہے (یعنی میر تقی کو بھی حسرت ہوگی کہ یہ مضمون مرزا نوشہ کے لیے بچ رہا) حالانکہ یہی شعر بیت الغزل (غزل کی جان) ہے

حل۔ کوئی گنہگار دنیا میں اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے وقت یا میدان حشر میں پرسش اعمال کے موقع پر کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار اگر میرے کیے ہوئے گناہوں کی سزا دیتا ہے تو جن گناہوں کی حسرت رہ گئی (یعنی جو گناہ قدرت نہ ہونے کے وجہ سے یا تیرے خوف کے سبب سے یا تیری خوشنودی کے خیال سے نہیں کیے پہلے اُسے نکال دے پھر جو تیرا جی چاہے سزا دے لے میں خوشی سے بھگت لوں گا۔

حاشیہ۔ اس شعر میں مرزا نے انسان کے ذوق گناہ کی انتہا دکھائی ہے۔

(۲) پروردگار اگر میرے کیے ہوئے گناہوں کی سزا دیتا ہے تو جن گناہوں کی حسرت رہ گئی اور ناکامیوں نے میرے دل پر جو قیامتیں توڑی ہیں تو اُن سے واقف ہے۔ جو گناہ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے میں

نہیں کیے اُس سے جو تکلیف میرے دل کو ہوئی ہے عجب نہیں جو وہی میرے گناہوں کا کفارہ ہوگئی ہو۔ اور جو گناہ تیرے خوف سے نہیں کیے اور جن لذتوں کو تیری خوشنودی کے لیے ترک کیا اُنکا اجر ملنا چاہیے۔ فیصلہ کرنے میں یہ تمام امور مدنظر ہیں عجب نہیں جو میں جزا کا مستحق ٹھیروں سزا کیسی۔

حاشیہ۔ مرزا نے بازپرس قیامت کے لیے قیامت کا جواب پیدا کیا ہے اور کس بلیغ انداز سے اپنا مطلب ادا کیا ہے۔

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب　　کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

حل۔ اے غالب اگر تجھے دنیا نے چھوڑ دیا تو ہراساں ہونے کی کون سی بات ہے۔ اگر کوئی تیرا شریکِ حال نہیں تو خدا تو موجود ہے۔ یہ شعر پڑھتے وقت ایک ایسے نا اُمید و مجبور و رو کردۂ دوستاں و مبتلاے آفات کی تصویر نظروں میں پھرنے لگتی ہے جسے اُمید کا فرشتہ تسکین دے رہا ہے۔

محمد احمد بیخود موہانی - ایم اے

اُردوے معلّٰی کانپور

مشفقی مولانا حسرت موہانی کا رسالہ اُردوے معلّٰی عرصہ سے بند تھا۔ تاآنکہ دہلی سے ایک صاحب نے اسی نام سے دوسرا رسالہ جاری کردیا۔ جو اب بھی نکل رہا ہے۔ سال رواں سے حسرت صاحب نے پھر اُردوے معلّٰی جاری کیا ہے اور جنوری و فروری دو ماہ کا مشترکہ پرچہ وصول ہوگیا ہے۔ علاوہ دیگر مضامین ادبی و سیاسی کے، چار چیزیں رسالہ میں ہرماہ شائع ہوں گی:۔

(۱)　ارباب سخن کے نام سے ایک تذکرہ حسرت صاحب نے لکھا ہے اُس میں سے کسی ایک معاصر شاعر کا حال

(۲)　سلسلۂ قادریۂ رزاقیہ میں سے کسی بزرگ کے حالات۔

(۳)　کتاب نکات سخن کے ۸ صفحے

(۴)　انتخاب دواوین اساتذہ

اس تازہ پرچہ میں شاہ حاتم کا جو دیوان ۲۵ صفحے پر ہے وہ ادنی درجہ کے بدیسی کاغذ پر ہے۔ حسرت صاحب کی کوشش اب دل آزاری کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ وطن دوستی کی بنا پر نہیں تو ادب نوازی ہی کے خیال سے اُنھیں کاغذ چھوڑنا چاہئے اُردوے معلّٰی کا سالانہ چندہ ؏ ٹھیرا ہے۔ درخواست خریداری "مولانا حسرت موہانی کانپور" کے پتہ پر بھیجنا چاہیئے۔

سیاسیات

از

محمد اجمل خاں صاحب بی اے (علیگ)

بہی خواہان اُردو با وجود عام کساد بازاری کے اپنے اپنے طور پر اس زبان کو علوم و فنون سے آراستہ کرنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ جس قدر قابل داد و ستایش ہیں ظاہر ہے۔ لیکن اس دورِ جدید میں علم السیاست پر کسی مستقل کتاب کا تصنیف یا تالیف نہ ہونا ضرور باعث تاسف تھا۔ مقام شکر ہے کہ محمد اجمل خاں صاحب کی سعی سے یہ کمی بھی ایک گونہ پوری ہوگئی۔ جہاں تک مجھے علم ہے اُردو میں یہ اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ اور اس اعتبار سے بفضل للمتقدم کی مستحق اور ہر طرح پر قدر افزائی کی سزاوار ہے۔ خدا اسے قبول عام عطا فرمائے اور اُردو خواں پبلک کو اس سے حسب خواہ نفع پہونچائے۔

صاحب کتاب نے اپنے کو مؤلف ظاہر کیا ہے اور یہ بھی تحریر فرمادیا ہے کہ اس کتاب کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ ہر ایک سیاسی موضوع پر مفصل بحث کرے، بلکہ اس کتاب میں جامعیت و اختصار کے ساتھ سلطنت کے نظریہ عمومی کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس باب میں گونہ کلام ہے کیونکہ اس کتاب میں مختلف نظریات اور اصولی و تاریخی بحثوں کو اس طرح جمع کردیا گیا ہے کہ ایک اُردو خواں شخص جس نے اس موضوع پر دوسری زبانوں کی کتابیں نہ دیکھی ہوں کسی صحیح اثر کو قبول نہ کرسکے گا۔ کتاب کے چند صفحات پڑھنے کے بعد مجھے یہ خیال گذرا کہ اس کا انداز بیان بلنچلی کی کتاب کے موافق رکھا گیا ہے جب میں نے دونوں کتابوں کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ صاحب کتاب نے بیشتر بلنچلی کا اتباع کیا ہے۔ اور درمیان درمیان میں (اور بالخصوص ابتدائی حصص میں) بعض دوسری کتابوں سے کچھ کچھ مطالب اضافہ فرمائے ہیں اور کہیں کہیں خود بھی حسب حاجت اسلامی و ہندوستانی نقطۂ خیال کو داخل کردیا ہے۔ لیکن اس ترتیب سے اس میں وہ خاص آسانی و سہولت باقی نہیں رکھی جو اُردو خواں پبلک کے لیے ضروری تھی۔ چونکہ اس کتاب میں بیشتر بلنچلی کی پیروی کی گئی ہے اس لیے اس نظر سے اس پر کچھ عرض کروں گا۔

بلنچلی (۱۸۰۸ - ۱۸۸۱ء) نے اپنی کتاب سنہ ۱۸۵۲ء میں ایک جلد میں شائع کی تھی۔ بعد کو اسے

بڑھا کر دو جلدیں کر دیں اور پھر ۱۸۹۵ء میں اس میں ایک اور جلد کا اضافہ کیا۔ انگریزی میں صرف جلد اول کا ترجمہ ہوا ہے۔ اور وہی ہم لوگوں کی دسترس کے اندر ہے۔ بقول مترجمین انگریزی بلنچلی نے یورپی سلطنتوں کے متعلق اس کام کی سعی کی ہے جس کی تکمیل ارسطو نے یونانی سلطنتوں کے متعلق کی تھی اور اس میں اُس نے معقول حد تک کامیابی حاصل کی ہے (ملخصاً) اس میں شک نہیں کہ اسوقت تک انگریزی میں جتنی کتابیں علم السیاست کے متعلق لکھی گئی ہیں ان سب میں باعتبار جامعیت بلنچلی کا پایہ بلند ہے لیکن نصف صدی میں علم السیاست نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ بلنچلی کی کتاب کو اب عام متداول کتابوں کے بجائے امہات الکتب میں شامل کرنا چاہیے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس میں مجھے صاحب تالیف سے اختلاف ہے کہ موصوف نے اس کتاب سے علم السیاست پر من حیث الوقت عبور حاصل کرنے کا جو مقصد پیش نظر رکھا ہے وہ کس قدر عسیر الحصول ہو جائے گا۔ مؤلف نے یہ سعی تو ضرور کی ہے کہ جا بجا اضافے کے حالات جدیدہ کو عنوانات قدیمہ کے تحت میں لا دیا ہے۔ مگر اس میں اس وجہ سے دقت پیش آگئی ہے کہ بلنچلی نے محض اصول سیاسیات پر بحث نہیں کی ہے بلکہ تاریخی حیثیت سے یورپی سلطنتوں کا تبصرہ بھی کیا ہے اور اپنی کتاب کو کثیر التعداد عنوانوں اور زیر عنوانوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر عنوان کے تحت میں نہایت اختصار کے ساتھ جامع الفاظ میں مطالب بیان کیے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا خلاصہ کرنا نہایت دشوار ہو گیا ہے۔ البتہ بعض مباحث ایسے ہیں جو ہندوستان کے لیے چنداں ضروری نہیں ہیں اور انھیں حذف کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کتاب دوم کے ابواب ۷ تا ۱۲۔ مگر ہمارے صاحب تالیف نے بیشتر خلاصہ کی سعی کرائی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر مباحث ناتمام سے رہ گئے ہیں اور اُن سے پوری تشفی نہیں حاصل ہوتی۔

صاحب تالیف نے بہت بڑی حد تک یہ سعی کی ہے کہ قدیم حالات کے ساتھ جدید حالات کو اور یورپی امور کے ساتھ ہندوستانی اور کہیں کہیں اسلامی امور کو بھی داخل کر دیا ہے۔ اور اس کوشش میں انھیں معقول و مفید کامیابی ہوئی ہے خصوصاً خلافت کی بحث اسلامی نقطۂ نظر سے قابل دید و داد ہے

باب الثالث کا مقالہ اول "سیاسی معلومات" کے نام سے موسوم ہے۔ مگر اس میں صرف پانچ الفاظ پر گفتگو کی گئی ہے: سلطنت یا دولت، حکومت، قانون، ملت و قوم، اور سوارا ج۔ اس میں زیادہ حصہ طریق وضع قوانین کی بحث میں صرف ہو گیا ہے۔ اور دوسرے الفاظ کے متعلق بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اصطلاح کے قائم ہونے کا نفع نہیں حاصل ہوتا بلکہ تشریحات کا فائدہ ہوتا ہے سوارا ج کے متعلق کوئی قطعی معنی نہیں قرار دیے گئے ہیں۔ اور کیونکر قرار دیتے جبکہ خود واضعان لفظ اب تک

اسکی تعریف سے قاصر ہیں۔

کتاب کو جس طرح پر تقسیم کیا گیا ہے اسکے متعلق بھی دو چار الفاظ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں
بلنچلی نے اپنے کتاب کو (Book) اور (Chapter) میں تقسیم کیا ہے۔ صاحب تالیف
نے اپنی کتاب کو "باب" اور "مقالہ" میں تقسیم کیا ہے لیکن اگر "مقالہ" کے تحت میں "باب" رکھتے تو
زیادہ موزوں ہوتا۔ کیونکہ عام رواج یہی ہے۔ اقلیدس کی تقسیم بھی یوں ہی ہے کہ انگریزی میں (Book)
اور اُردو میں "مقالہ" ہے۔ مقالہ، باب، فصل، جزو، یہ سب الفاظ ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی جگہ
رکھ دیا جائے تو کوئی لغوی اعتراض نہیں ہو سکتا مگر جب تک ضرورت شدید نہ ہو۔ رواج عام سے
اختلاف سہولت عام کے خلاف ہوتا ہے۔

آخر میں اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے یا یوں کہیے کہ انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ
دیا گیا ہے۔ اس میں یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوتی ہے کہ مولف نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔
یہ مرحلہ اس قدر دشوار گذار ہے کہ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس سے سابقہ پڑا ہو۔
مشکل در مشکل یہ ہے کہ بقول مولف سیاسیات و اخلاقیات کی اصطلاحیں بہ نسبت دیگر علوم کے زیادہ
مستعمل ہیں اس لیے ان میں لامحالہ ایسے الفاظ لانا پڑتے ہیں جو بامعنی ہوں اور صحیح مفہوم پر دلالت
کرتے ہوں، کیمیا وغیرہ کے مانند بےمعنی الفاظ سے کام نہیں چل سکتا۔ لیکن بعض ترجموں سے مجھے کسی قدر
اختلاف ہے مثلاً (Dominion) کا ترجمہ سیادت کیا گیا ہے حالانکہ (Sovereignty)
کا ترجمہ اگر سیادت کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔ اس آخرالذکر لفظ کا ترجمہ "استقلالیہ" کیا گیا ہے۔
مگر یہ غلطی مصری لٹریچر کی وجہ سے نادانستہ شائع ہو گئی ہے۔ استقلالیہ درحقیقت (Independence)
کے معنی میں ہے اور (Sovereignty) کا ترجمہ اہل مصر نے "سلطنت" کیا ہے (Law) کا
ترجمہ فرہنگ میں سنت، شریعت، شرع دیا گیا ہے مگر اصل کتاب میں قانون استعمال ہوا ہے۔
حاشا کہ اس سے یہ مقصود نہیں کہ مولف کی محنت قابل داد نہیں۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ ہمارے
پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ اصطلاحات قطعی قرار پا جائیں اور بلا استثنا وہی استعمال ہوں۔ اسی لیے
یہ خرابی پیدا ہوئی اور پیدا ہوتی رہیگی اور جب تک مستند کتابیں ہر فن پر موجود نہ ہو جائیں گی اور لکھنے
والے یا خود باہم کسی امر پر اتفاق نہ کرلیں گے اسوقت تک یہ دقت رفع نہ ہوگی۔

خلاصتہً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسوقت اُردو زبان کی ضرورت کے لحاظ سے مناسب یہ ہے
کہ یا تو حالات جدیدہ کے اعتبار سے مباحث قرار دیکر ان پر آزادانہ بحث کی جائے یا خاص خاص

کتابوں کا ترجمہ یا خلاصہ اس طرح پر کیا جائے کہ وہ ایک ہی کتاب کا ترجمہ یا خلاصہ ہو۔ مؤلف نے جو صورت مختلف کتابوں سے التقاط کی اختیار کی ہے وہ ابتدائی حالت میں غالباً سود مند نہ ہوگی جبتک کہ متعدد کتابیں اسی فن پر ایسی مہیا نہ ہو جائیں جن سے ہمارے علم پر کافی عبور حاصل ہو سکے۔

ہر حال صاحب تالیف کی محنت ہر طرح پر قابل داد و استحسان ہے۔ خدا اس کتاب کو قبولِ عام اور مؤلف کو آیندہ سلسلۂ تالیفات و تصنیفات کے جاری کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

تلمذ حسین

رباعیات

پیدا ہوئیں مستیاں مے حکمت سے
ظاہر ہوئے اسرارِ ازل فطرت سے
میخوار یہ کہہ اٹھے کہ خالق ہے کوئی
صانع کا پتہ چلا انھیں صنعت سے

اجسام کے پردہ میں ہے تنویرِ وجود
ہے حسنِ بشر پیکرِ تصویرِ وجود
خلقت میں نہاں ہیں ذات باری کے صفات
اشیا کی ماہیت ہے تفسیرِ وجود

ہے سرخیِ سے خودی کے افسانے میں
ساغر میں ہے جلوہ نور پیمانے میں
عالم ہو، خدا نہ ہو، یہ گفتار غلط
میخانہ ہو، ساقی نہ ہو میخانے میں

دل سوئے ریا ہوس عبادت میں رہے
حوروں سے ہو ربط ضبط جنت میں رہے
میخانہ میں رہے رنگ کا جمنا مشکل
ہاں شیخ فرشتوں کی جماعت میں رہے

کافور غم بے سروسامانی ہے
ترکوں میں کمال خالدِ ثانی ہے
ہیں لرزہ بر اندام عدو ہیبت سے
اس کے حملوں میں جوشِ ایمانی ہے

پھولوں کو شاق ہے جدائی میری
اک خواب و خیال ہے رہائی میری
دل تھام کے رہ جاتے ہیں مرغانِ چمن
یاد آتی ہے جب نغمہ سرائی میری

تاریکیِ قبر ہے کہ ہے دیدۂ کور
ہے گریۂ بیکسی نہ ہے یاس کا شور
یہ سلسلے فضائے شہر خموشاں میں کہاں
مانا - کچھ حسرتیں ہیں زندہ درگور

ہوں لاکھ خلافت کے اثر سے آزاد
مذہب ہو سیاست کے اثر سے آزاد
سب کچھ ہو زمانہ میں مگر "ہند نہ ہو
باروت کی طاقت کے اثر سے آزاد"

ہے شاہد و مے نہ شعر خوانی کے مزے
ہیں وصل کی راتیں نہ کہانی کے مزے
وہ فتنۂ اقربا وہ رسوائیِ عشق
پیری میں یاد ہیں جوانی کے مزے

تسکیں نہ ہو گریہ کا مزا لینے سے
ساحل نہ ملے کشتیِ غم کھینے سے
ہیں دشمنِ آبرو یہ کافر معشوق
مرنا بہتر ہے انکو دل دینے سے

تخئیل کا اور چھور کس نے دیکھا
ٹیگور کا اصل زور کس نے دیکھا
آزادیِ ہند کو نہ سمجھا مغرب
"ناچا جنگل میں مور کس نے دیکھا"

ہیں مستِ ازل فضا کو ہم ڈھونڈتے ہیں
کالی کالی گھٹا کو ہم ڈھونڈتے ہیں
ہیں طالب فلسفہ نہ منطق کی تلاش
کیفِ مے میں خدا کو ہم ڈھونڈتے ہیں

ہے غیرتِ مذہب نہ حمیت کا جوش
شمعِ اقبال ہو چکی ہے خاموش
شہرہ تھا کبھی دہر میں آزادی کا
اے اہلِ عرب آج ہو تم حلقہ بگوش

محمد حسین نازش بدایونی

اہلیا بائی اور ٹوکوجی ہولکر

احمد شاہ ابدالی پانی پت کے میدان سے فتحمندی کا سہرا باندھ کر لوٹ گیا اور ہندوستان کا ملک جسم بیجان کی طرح چھوڑ گیا۔ یہاں کے دونوں جنگجو فریق زخموں سے چور تھے اور فاتح و مفتوح قریب قریب یکساں طور پر خستہ حال تھے۔ شاہ عالم مفرور۔ غازی الدین خاں روپوش۔ نجیب الدولہ دہلی کا امیرالامرا اور شجاع الدولہ انگریزوں سے دوستی کے پینگ بڑھانے میں مصروف تھا تاکہ انکی مدد سے روہیلوں کو زیر اور نجیب الدولہ کے آبائی ملک پر قبضہ کرے۔ تمام شمالی ہندوستان میں لڑنے کی سکت کسی میں نہ باقی تھی۔ پنجاب میں سکھوں نے زور پکڑا اور پورب میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے امرائے دہلی کی باہمی مخالفت سے فائدہ اٹھایا۔ حیدرآباد کا صوبہ دار نظام دکن اپنی قلمرو میں وسعت دینے کے لیے مرہٹوں کے علاقہ پر حملہ آور ہوا لیکن فریقین میں طویل جنگ کی قوت باقی نہ تھی۔ دو ہی میدانوں میں فیصلہ ہو گیا اور باہم صلح کرکے اپنے اپنے گھر واپس گئے۔

باجی راؤ پیشوا پانی پت کی شکست سے چند ہی مہینے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا تھا اور اسکا لڑکا مادھو راؤ مسند نشیں تھا لیکن سلطنت کا انتظام اُسکے چچا رگھوناتھ راؤ کے سپرد تھا جو ہندوستان کی تاریخ میں "رگھوبا" کے نام سے مشہور ہے اور جسکی بدنصیبی نے یہ کہاوت بنادی تھی کہ "جو رگھوبا کا شریک ہوا مارا گیا یا ذلیل ہوا"۔

جنگ پانی پت سے چار برس بعد جب مرہٹوں کو دوبارہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ہمت ہوئی تو رگھوبا نے ہندوستان کا رخ کیا اور ملہار راؤ ہولکر بھی فوج لیکر اسکی مدد کو چلا لیکن چند ہی روز کے بعد یہ نامور سردار دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور رگھوبا کی مہم ناکام رہی۔

ملہار راؤ کے صرف ایک ہی بیٹا کنڈی راؤ تھا۔ جو جنگ پانی پت سے پہلے ہی ایک محاصرہ[1] میں قتل ہو چکا تھا۔ اس لڑکے کی شادی اہلیا بائی نام سندھیا خاندان کی ایک لائق لڑکی سے ہوئی تھی۔ اور اُس سے ایک بیٹا ملی راؤ موجود تھا۔

دادا کے مرنے کے بعد یہی ملی راؤ اندور کا راجہ ہوا۔ اور رگھوبا نے پیشوا کی طرف سے خلعت

---

[1] کنڈی راؤ کھیری کے محاصرہ میں مارا گیا تھا۔ یہ مقام ڈیگ اور بھرت پور کے درمیان واقع ہے۔

بھیجکر اُسکو ملہر راؤ کا جانشین تسلیم کر لیا۔ لیکن اُسکی صحت بہت خراب اور مزاج میں خفقانیت تھی حکومت پاتے ہی جنون کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اور چند ہی مہینوں میں مصیبت زدہ ماں اسکی بدعنوانیوں سے عاجز آ گئی۔ اہلیا بائی مذہب کی سخت پابند تھی اور برہمنوں کی خاص طور پر عزت کرتی تھی۔ لیکن راجہ کو اس فرقہ سے بغض تھا اور اُسکو برہمنوں کے ستانے میں لطف آتا تھا۔ برہمنوں کو جوڑے دان کرتا تو اُن میں بچھو رکھ دیتا تھا۔ اور روپیوں کی تھالی نذر کرتا تو زہریلے کیڑے اُس میں چھپا دیتا تھا۔ جب برہمنوں کو تکلیف پہونچتی تو وہ قہقہے لگاتا اور ماں روتی تھی!!

ایک بار راجہ کو شک ہوا کہ کوئی کاریگر محل کی ایک خادمہ سے تعلق رکھتا ہے تو بغیر کسی ثبوت کے اُس بیگناہ کو قتل کرا دیا۔ اور جب کچھ عرصہ کے بعد متواتر شہادتوں سے ثابت ہوا کہ کاریگر بیقصور تھا تو اس قدر پشیمانی ہوئی کہ حسرت و افسوس نے اُسکو پاگل بنا دیا۔ اور وہ سلطنت کے ناقابل ہو گیا۔ دکھیاری ماں دن رات اُسکے سرہانے بیٹھی آنسو بہایا کرتی تھی اور دوا دعا میں کوشش کرتی تھی۔ آخرکار نو مہینے برائے نام راج کرنے کے بعد فروری ۱۷۶۷ء میں ملی راؤ کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ملہر راؤ کا کوئی وارث باقی نہ رہا۔

اہلیا بائی کی ایک لڑکی بھی تھی۔ لیکن اُسکی شادی دوسرے خاندان میں ہوئی تھی اور وہ دھرم شاستر کے مطابق ریاست کی مستحق نہ تھی۔ دیوان نے مشورہ دیا کہ ہولکر کا ایک بعید رشتہ دار جو بہت کم عمر تھا گدی پر بٹھایا جائے تاکہ اس بہانہ سے انتظام حکومت دیوان کے ہاتھ رہے۔ مگر اُس نے غلطی کی کہ رگھوبا کو نذرانہ دینے کا وعدہ کر کے اپنا ہم رائے بنا لیا۔ اور اُسکی مدد کے بھروسہ پر اہلیا بائی کو اپنی تجویز سے اتفاق کرنے پر مجبور کیا۔

رگھوبا جس معاملہ میں شریک ہوتا اُس کا سرسبز ہونا غیر ممکن تھا۔ اہلیا بائی کو ہولکر کی ریاست میں پیشوا کا دخیل ہونا سخت ناگوار ہوا۔ اُس نے رگھوبا کو روپیہ دینے سے انکار کر کے دیوان کی شرمناک تجاویز کو نامنظور کر دیا۔ اور فوجی سرداروں سے مشورہ کر کے اعلان کیا کہ ملہر راؤ کا کوئی وارث سوائے اُسکی ذات خاص کے باقی نہیں ہے۔ اس لیے وہ خود حکومت کریگی اور فوج کی سپہ سالاری کے لیے کسی سردار کو انتخاب کریگی۔

رگھوبا نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے فوجی تیاریاں شروع کیں تو اہلیا بائی نے اُسکے پاس پیام بھیجا کہ "عورت پر چڑھائی کر کے دنیا میں بدنام نہ ہو۔ فتح سے عزت نہ بڑھے گی اور عورت سے شکست پانے کے بعد منہ دکھانا مشکل ہو جائے گا"

رگھوبا کو اگر سمجھ ہوتی تو وہ بدنصیبی میں کیوں مشہور ہوتا۔ اُس نے رانی کے عاجزانہ پیام کی کچھ پروا نہ کی اور ایک مظلوم بیوہ پر حملہ کے لیے فوج روانہ کی۔ اُس وقت مرہٹوں میں مادھوجی سندھیا حاکم اُجین اور جنوجی بھونسلا والی ناگپور بہت معزز و محترم تھے۔ ان دونوں نے عورت سے مقابلہ کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر فوج تو پیشوا کی خدمت میں حاضر کی لیکن لشکر کی سرداری سے انکار کر دیا۔ اور یہ عذر کیے کہ "عورت پر چڑھائی کرنا بہادری کے خلاف ہے" رگھوبا کو غیرت دلائی۔ نوعمر پیشوا مادھوراؤ نے بھی اہلیا بائی کی سفارش کی۔ اور سب طرف سے مجبور ہو کر رگھوبا اپنے ظالمانہ ارادوں سے دست بردار ہوا۔ اور جو لشکر اس رانی کے زیر کرنے کے لیے فراہم کیا تھا اُسکو نجیب الدولہ کے ستانے کے لیے ہندوستان کی طرف روانہ کر دیا۔ رگھوبا کی بدقسمتی سے اُسی وقت احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر دوبارہ حملہ کیا۔ اور یہ فوج بغیر کسی نمایاں کامیابی کے مالوہ واپس آئی۔

رگھوبا کے فتنہ سے نجات پا کر اہلیا بائی نے حکومت کا انتظام باطمینان اپنے ہاتھ میں لیا اور فوج کی سپہ سالاری پر ایک کارآزمودہ سردار ٹوکوجی نام جو پہلے "پگاہ" کی فوج میں افسر تھا مقرر کیا۔ یہ سردار ملہر راؤ کا رشتہ دار نہ تھا، مگر خاندان ہولکر سے تعلق رکھتا تھا۔ اور پانچ چھ پشتوں کے بعد اُسکا سلسلۂ نسب ملہر راؤ کے جد اعلیٰ ملہارجی سے ملتا تھا۔

اہلیا بائی نے ٹوکوجی کو رگھوبا کے ساتھ پونا روانہ کیا تا کہ پیشوا کے ہاتھ سے اُسکو خلعت پہنایا جائے۔ اور یہ اعلان کیا کہ دفتر و خزانہ کی نگرانی وہ خود کریگی اور فوج کا انتظام و اہتمام ٹوکوجی کے سپرد رہے گا۔

یہ سپہ سالار مالوہ میں بہت ہی کم رہا۔ اور دور دور دراز مقامات پر کبھی کبھی اُس نے اپنی ذمہ داری پر بھی کام کیا ہوگا۔ لیکن عام طور پر کل ضروری امور سلطنت اہلیا بائی کے اشارہ سے ہوتے تھے۔ جنگ و صلح کا فیصلہ اور ممالک غیر سے تعلقات بالکل رانی کے ہاتھ میں تھے۔ اُسکے وکیل پونا، حیدرآباد، سرنگاپٹم[1]، ناگپور، لکھنؤ، اور کلکتہ میں موجود رہتے تھے۔ مگر جب ٹوکوجی پونا میں ہوتا تھا تو وہی اہلیا بائی کی طرف سے پیشوا کے دربار میں وکیل سمجھا جاتا تھا۔ غرض راج کی سردار اہلیا بائی تھی۔ اور

---

[1] میسور میں حیدر علی نے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی تھی۔ اور سرنگاپٹم اُس کا دار السلطنت تھا حیدر علی کے جانشین ٹیپو سلطان کے عہد میں اس ریاست کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کا ملک انگریزوں، نظام، اور مرہٹوں کے تصرف میں آیا۔ موجودہ ریاست میسور اسی سلطنت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ ۱۲

اُسکی زندگی بھر ٹوکوجی نے اپنی عزت سپہ سالار سے زیادہ نہیں سمجھی۔

جب ٹوکوجی جنوب میں ہوتا تو ست پوڑا سے دکن کا علاقہ اُسکے زیر نگرانی رہتا اور شمال کی جائداد اہلیا بائی کے انتظام میں آتی۔ جب وہ شمال کی طرف جاتا تو ہندوستان، بندیلکھنڈ، اور راجپوتانہ کی جاگیر اُسکے سپرد رہتی اور دکن کا کاروبار اہلیا بائی دیکھتی۔ لیکن مالوہ اور نیماڑ کے اضلاع ہر صورت اہلیا بائی کے قبضہ میں رہتے تھے۔ اور ریاست کا خزانہ اُسکے تصرف میں تھا۔ جس کی ذاتی جاگیر کے علاوہ (جو چار لاکھ کے قریب تھی) بقیہ کل آمدنی ریاست کے بہی کھاتہ میں جمع ہوتی تھی۔ اور ایک ایک پائی کا حساب مرتب رکھا جاتا تھا۔

تقریباً تیس سال تک ٹوکوجی اور اہلیا بائی کی متحدہ حکومت قائم رہی۔ لیکن ان دونوں ذی اختیار حاکموں کے درمیان جھگڑے کا تو کیا ذکر ہے، کبھی چشمک کی بھی نوبت نہیں آئی۔ اور انھوں نے اپنے باہمی اتفاق سے "دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند" کی قدیم کہاوت میں ایک استثنا پیدا کردیا!!

ٹوکوجی ریاست کی فوج لیے ہوے دور دور لڑتا رہا۔ لیکن اس عقلمند رانی نے محض اپنے انصاف اور رحم کی طاقت سے ریاست کے حدود میں امن قائم رکھا۔ وہ روزانہ دربار عام میں بے پردہ جلوس کرتی۔ سرکاری کاغذات پر خود دستخط بناتی۔ اور بذات خاص استغاثے سنتی تھی۔ وہ طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے بیدار ہوکر پوجا پاٹ سے فراغت کے بعد کچھ دیر تک مذہبی کتابیں سنتی، برہمنوں کو خیرات و خوراک تقسیم کرتی، اور ناشتہ کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرکے دربار میں آتی تھی۔ جہاں عموماً دو بجے سے چھ بجے شام تک موجود رہتی تھی۔ اُسکے بعد دو تین گھنٹے مذہبی عبادت میں صرف کرکے ۹ بجے شب سے پھر کار منصبی شروع کرتی اور گیارہ بجے رات سے پہلے بستر پر نہ جاتی تھی۔ تیس برس تک مسلسل یہی دستور العمل قائم رہا۔ البتہ تیوہاروں کے موقع پر اس میں کچھ تغیر ہو جاتا تھا۔ باوجود سخت دماغی محنت کے وہ سوائے اناج اور ترکاریوں کے کچھ نہ کھاتی تھی۔ اور گوشت سے پرہیز کرتی تھی، اگرچہ اُسکی قوم میں اسکا استعمال ممنوع نہ تھا۔

اسکی انتظامی قابلیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اُسکے عہد میں بجز ایک ناکام حملہ کے جو اودے پور کے رانا نے کیا تھا کسی بیرونی دشمن کو اُسکے ملک پر چڑھائی کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اُسکے طویل دور حکومت میں ایک ہی برہمن وزارت کے عہدہ پر قائم رہا۔ اور اُسکے عمال بھی بہت کم تبدیل کیے جاتے تھے۔ مالگزاری کی وصولی کے لیے اُس نے زمینداروں سے بندوبست

کیا اور اندور کو جو اُسکے وقت سے پہلے ایک مختصر گاؤں تھا ترقی دے کر ہندوستان کے دولتمند شہروں میں شمار کیے جانے کے قابل بنا دیا۔

ایک انگریز آفسر[1] نے جو اہلیا بائی کی وفات سے تھوڑی ہی مدت کے بعد اندور میں وارد ہوا تھا، اس رانی کے رحم و انصاف کے چند قصے لکھے ہیں، جن کا درج کرنا اس مضمون کی دلچسپی میں اضافہ کر سکتا ہے:-

(۱) ایک بار ٹوکوجی ہولکر اپنی فوج لیے ہوئے اندور کے پاس خیمہ زن تھا۔ وہاں کا ایک ساہوکار دیوی چند فوت ہوا اور اُسکے کوئی اولاد نہ تھی۔ ٹوکوجی نے ساہوکار کی جایداد سے ریاست کا حق وصول کرنا چاہا تو ساہوکار کی بیوہ اہلیا بائی کے پاس شکایت لیکر مہیسہ پہونچی۔ رانی نے بیوہ کو خلعت سے سرفراز فرمایا اور اوسکے خاوند کی جایداد کا مالک تسلیم کر لیا۔ ٹوکوجی کو حکم دیا کہ وہ اندور سے فاصلہ پر قیام کرے اور اس شہر کی رعایا کو نہ ستائے۔

(۲) سرونج کا ایک مہاجن سبجھ کھیم داس مر گیا۔ ریاست کے عامل نے اُسکی بیوہ سے تین لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا اور جائداد ضبط کرنے کی دھمکی دی۔ متوفی کے رشتہ داروں نے بیوہ کو ایک لڑکا گود لینے کی صلاح دی لیکن عامل اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ بیوہ اہلیا بائی کے پاس پہونچی تو رانی نے اُسکو ایک دن بھی لیت و لعل میں نہ رکھا۔ بیوہ کو گود لینے کی اجازت دی اُس کے متبنے لڑکے کو اپنے زانو پر بٹھا کر خلعت، جواہر اور پالکی سے سرفراز فرمایا۔ اور سرونج[2] کے عامل کو تبدیل کر دیا۔

(۳) اہلیا بائی نے تلسی کی پتی ہاتھ میں لیکر ہولکر کا کل خزانہ نیک کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اُس نے تمام علاقہ میں دھرم سالے اور کنوئیں تعمیر کرائے۔ جگناتھ، دوارکا، کیدارناتھ اور رامیشورم تک جاتریوں کے آرام کے لیے اُس نے عمارتیں بنوائیں۔ اور ہر سال خیرات کے لیے تمام مقدس مقامات پر کثیر رقمیں بھیجا کرتی تھیں۔

(۴) گرمیوں کے موسم میں اہلیا بائی کے ملازم سڑکوں پر مسافروں کو پانی پلانے کے لیے تعینات رہتے تھے اور جاڑوں میں اُسکی سرکار سے محتاجوں کو لباس تقسیم ہوتا تھا جنگلی جانوروں

---

[1] میجر جنرل سر جان ملکم۔ ملاحظہ ہو انکی یادداشت بابت مالوہ۔ مطبوعہ ۱۸۲۳ء جلد اول

[2] اُس زمانہ میں حکام کی عزت برقرار رکھنے کا شاید خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ اور رعایا کی دلجوئی سرکاری ملازموں کا دبدبہ قائم رکھنے سے ضروری سمجھی جاتی تھی !!!

چڑیوں، اور مچھلیوں کی خوراک بھی اُسکے خزانہ سے مقرر تھی۔ مہیسر کے قریب کاشتکاروں کے بیل دوپہر کے وقت تھوڑی دیر کے لیے ہل چلانے سے روک دیے جاتے تھے اور رانی کی طرف سے ان جفاکش جانوروں کو پانی پلایا جاتا تھا۔ اُس نے بہت سے کھیت خرید کرکے چڑیوں کی خوراک کے لیے وقف کردیے تھے۔ اور کہا کرتی تھی کہ کسان پرندوں کو اپنے کھیت سے بھگاتے ہیں اُن کا پیٹ بھرنے کے لیے ان کھیتوں کی پیداوار نذر کی جاتی ہے۔

اہلیا بائی کا قد میانہ اور جسم اکہرا تھا۔ وہ خوبصورت تو نہ تھی لیکن چہرہ پر عبادت وریاضت کا نور برستا تھا۔ وہ بہت خوش مزاج تھی اور اُسکو غصہ بڑی مشکل سے آتا تھا۔ ضرورت کے موافق لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ لیکن اُس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ باوجودیکہ بیس سال کی عمر میں بیوہ ہوجانے کے اُس کی عصمت پر کبھی کسی قسم کا شبہ نہیں کیا گیا۔ شوہر کے مرنے کے بعد اُس نے رنگین لباس چھوڑ دیا تھا اور ایک ہلکی ہنسلی کے سوا کوئی زیور اُسکے بدن پر نظر نہ آتا تھا۔ اُسکو خوشامد بہت ناپسند تھی۔ ایک برہمن نے اُس کی تعریف میں ایک کتاب لکھ کر سنائی تو اُس نے کہا کہ وہ بہت کمزور اور گنہگار عورت ہے اور ان تعریفوں کی مستحق نہیں۔ مصنف کو کچھ انعام نہیں دیا اور اُسکی کتاب محل کے جھروکہ سے نربدا میں پھینکدی!!

زندگی کے آخری حصہ میں اس شریف رانی کو ایک سخت صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اُسکا لڑکا ملی راؤ تو پہلے ہی مجنون ہوکر مرچکا تھا اب اُسکی لڑکی مکتا بائی بھی بیوہ ہوگئی۔ اس لڑکی کی شادی جسونت راؤ پھونسیا سے ہوئی تھی۔ اور ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا جو جوان ہوکر مرگیا بیٹے سے سال بھر بعد شوہر بھی رخصت ہوا تو مکتا بائی نے اپنے خاوند کے ساتھ ستی ہونے کا ارادہ کیا۔ اہلیا بائی مزاحم ہوئی اور بہت دردسے سمجھایا کہ بوڑھی ماں کو دنیا میں بے یار و مددگار نہ چھوڑے مگر مکتا بائی نے جواب دیا کہ "ماں! تم بوڑھی ہوگئی ہو اور تمھاری عبادت کی زندگی چند سال میں ختم ہو جائے گی۔ میرا لڑکا اور خاوند دونوں گزرگئے۔ جب تم بھی چلی جاؤگی تو میں دنیا میں کس کے سہارے پر جیونگی؟ اور اُسوقت ایسی عزت کی موت نصیب نہ ہوسکے گی جیسی کہ آج ممکن ہے" اہلیا بائی لاجواب ہوئی اور اُس نے قصد کیا کہ بیٹی کی چتا اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ وہ جلوس کے ساتھ مرگھٹ تک گئی اور چتا سے کسی قدر فاصلہ پر خاموش کھڑی رہی لیکن احتیاطاً دو برہمن اُسکے ہاتھوں کو تھامے تھے تاکہ وہ خودکشی نہ کرسکے۔

جب آگ کا پہلا شعلہ بلند ہوا اور جان سے زیادہ عزیز بیٹی کا جسم جسکو اپنی گود میں پال کر جوان

کیا تھا جھلسنا شروع ہوا تو مصیبت زدہ ماں بے قابو ہوگئی اور چیخیں مارنے لگی - اُسکے دونوں ہاتھ برہمنوں کے قابو میں تھے ورنہ چتا میں کود پڑتی !! اپنے ہاتھوں کو چھڑا نہ سکتی تھی لیکن غصہ اور رنج سے کئی بار کاٹ کھایا !! جب چتا سرد ہوگئی تو رانی نے ندی میں غسل کیا اور محل کو واپس گئی - مگر یہ غم اُسکو کبھی فراموش نہ ہوسکا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دنیا سے رخصت ہوگئی - اُس کی زندگی ہندوستان کی تاریخ میں عورتوں کی انتظامی قابلیت کی ایک عجیب و غریب تصویر ہے - وہ خودپسندی اور غرور سے بیگانہ تھی - مذہب کی پابند تھی مگر تعصب نہ رکھتی تھی - خودمختار حاکم تھی لیکن عاجزی اور فروتنی اُس کا معمول تھا - تمام بداعمالیوں سے پاک تھی لیکن دوسروں کی لغزشیں معاف کرنے کو ہر وقت تیار رہتی تھی - اور تمام ہندوستان میں اُس وقت کوئی فرمانروا اُس سے بہتر موجود نہ تھا - ملک کے اندرونی انتظامات اور رانی کے ذاتی خصائل تو بیان ہوچکے اب اُسکے بیرونی تعلقات کی داستان سننا چاہیے - اُسکے عہد میں ہلکر کی فوج نے جو ناموری حاصل کی وہ جس طرح ٹکوجی کی شجاعت کا ثمرہ تھی اُسی طرح اہلیا بائی کی تدبیر و جفاکشی کا نتیجہ تھی - لشکر کا مہیا کرنا اور اسکو بہترین آلات جنگ سے مسلح بنانا اہلیا بائی کا کام تھا[1] - میدان میں مصلحت و دانشمندی سے اُنکو لڑانا

[1] ریاست اندور کے پرانے کاغذوں میں ایک اقرارنامہ دستیاب ہوا ہے جو اہلیا بائی نے ایک امریکن مسٹر بوائڈ سے کیا تھا اور جسکی رو سے جدید طرز کی قواعدداں فوج مرتب کی تھی - یہ اقرارنامہ ۱۷۹۳ء میں ہوا تھا - اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ایک ہزار سپاہیوں پر کس قدر خرچ پڑتا تھا -

تعداد	عہدہ	تنخواہ		
۱	خاص سردار	۲۰۰۰	ماہوار	
۱	کپتان	۳۰۰	"	
۵	لفٹنٹ	۱۵۰	"	فی کس
۹	سرجنٹ میجر	۶۵	"	
۹	سرجنٹ	۶۵	"	فی کس
۱	کامدان (دیسی)	۶۰	"	
۱۰	صوبہ دار	۴۰	"	فی کس
۱۰	جمعدار	۲۰	"	
۴۰	حولدار	۱۲	ماہوار	فی کس
۴۰	نائک	۸	"	"
۱۰	تنبورچی	۸	"	"
۱۰	بانسری والے	۸	"	"
۸۴۱	سپاہی	۶	"	"
۲	کارکن	۳۰	"	"
۵	ہرکارے	۵	"	"
۱۰	بہشتی	۴	"	"
۵	مشعلچی	۵	"	"

کل میزان ۱۰۰۱ ملازم اور ماہواری خرچ ۰۲۳۶

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

ٹوکوجی کی خدمت تھی۔

پہلے بیان ہوچکا ہے کہ اہلیا بائی نے اپنے انتخاب کیے ہوئے سپہ سالار کو پیشوا سے خلعت حاصل کرنے کے لیے پونا بھیجا تھا۔ مگر وہاں مراحم خسروانہ سے سرفراز ہونے کے بعد قیام کی کچھ ہی دن نوبت آئی تھی کہ اُسکو ہندوستان جانا پڑا۔ مرہٹوں کی فوجی قوت اب کسی قدر سنبھل گئی تھی اور شمال کے مسلمانوں سے جنگ پانی پت کا عوض لینے کی آگ اُنکے سینوں میں بھڑک رہی تھی۔ بیس ہزار سواروں کی ایک منتخب فوج بخشی رامچندر کی ماتحتی میں ۱۷۶۹ء کے دسہرہ کے بعد پونا سے روانہ ہوئی۔ مہادا جی سندھیا (جسکو پانی پت کی شکست نے لنگڑا کردیا تھا) اور ٹوکوجی ہولکر پندرہ پندرہ ہزار سوار ساتھ لیکر ہمرکاب ہوے۔ اسکے علاوہ لٹیروں کی ایک جماعت ہمراہ تھی۔ جس میں عرب۔ حبشی۔ اور دوآبہ کے پٹھان اور بعض ہندو بھی شامل تھے۔

یہ عظیم الشان لشکر پہلے راجپوتانہ میں داخل ہوا اور وہاں سے دس لاکھ روپیہ "نقا یا خراج" کے نام سے وصول کیا۔ اور پھر بھرت پور کے علاقہ میں پہونچے اور وہاں سورج مل جاٹ کے لڑکے کو شکست دے کر ۶۵ لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ کے وصول کیا۔ یہاں سے نجیب آباد پر دھاوا

(بقیہ حاشیہ صفحہ) علاوہ اس ماہواری خرچ کے ریاست کو اس پلٹن کے لیے حسب ذیل سامان مہیا کرنا لازم تھا:

تعداد	سامان	قیمت	فی	تعداد	سامان	قیمت	فی
۱۴۱۹	بندوقیں مع سنگین بحباب	۱۲ روپیہ	فی عدد	۱۴۱۹	کمربند بحباب	۸؍	فی عدد
۱۴۱۹	کرتے	۴	،،	،،	توڑے	عہ؍	،،
۱۴۱۹	پگڑی	۱؍	،،	،،	پاجامے	؍	،،

اس خرچ کی میزان ۴-۱۸۱۱۴ ہوتی ہے۔ یعنی ۱۰۰۰ سپاہی کی پلٹن پر تقریبًا ۱۸۰۰۰ یکمشت اور ۱۱۳۴۶ ماہوار خرچ ہوتا تھا۔ اہلیا بائی نے اس طرح کی چھ پلٹنیں بنائی تھیں اور ان کے سردار یورپ کے قواعد داں ملازم رکھے تھے۔

لے مرہٹے سورج مل کے بہت ممنون تھے۔ کیونکہ پانی پت کی شکست کے بعد اُس نے بھاگے ہوے دکھنیوں کو کپڑے اور خوراک سے مدد کی تھی۔ جب دہلی کے وزیر نے جاٹوں کو زیر کرنے کے لیے ۱۷۶۳ء میں سورج مل کو شکست دیکر قتل کردیا تو ملہار راؤ ہولکر سورج مل کے لڑکے کی مدد کے لیے ۱۷۶۵ء میں ہندوستان آیا تھا اور دہلی کے محاصرہ میں شریک تھا مگر بعد کو نجیب الدولہ کی خاطر سے اُس نے جاٹوں کی اعانت چھوڑ دی اور دکن واپس گیا۔ اُسکی واپسی کے بعد سورج مل کے لڑکوں میں باہم جھگڑا ہوا اور ۱۷۷۰ء میں مرہٹے اُس جھگڑے کے تصفیہ کے لیے بھرت پور آئے تھے ورنہ جاٹوں سے کوئی مخالفت نہ تھی۔ یہاں اتفاق سے جنگ ہوگئی، اور اسکے تاوان میں ۶۵ لاکھ روپیہ لینا پڑا۔ لیکن اس میں سے صرف ۱۰ لاکھ نقد دیا گیا، اور بقیہ کی قسطیں مقرر کردی گئیں!!!

کرنے کی نیت تھی مگر برسات شروع ہوگئی اور موسم بارش ختم ہونے کے انتظار میں بمقام ٹوگیہ خیمہ زن ہونا پڑا

ٹوکوجی کو ملہر راؤ اور نجیب الدولہ کے قدیم دوستانہ تعلقات معلوم تھے اور وہ اپنے آقا کے دوست کو بربادی سے بچانا چاہتا تھا۔ اُس نے نجیب الدولہ سے خط کتابت شروع کی تاکہ پٹھانوں کا حق دوستی ادا ہو اور پیشوا کی حکومت کو یہ نفع پہونچے کہ نجیب الدولہ کی معرفت ہندوستان کا جائز بادشاہ شاہ عالم جو اُس وقت الہ آباد کے قلعہ میں شجاع الدولہ اور انگریزوں کی پناہ میں ہے اپنے دارالسلطنت کو واپس بلا یا جائے اور وہ پیشوا کو ہندوستان میں وسیع اختیارات عطا کرے۔

رامچندر گنیش اور مہاد اجی سندھیا نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ سندھیا نے کہا کہ "میں پیشوا کے لیے روہیلکھنڈ اور افغانوں کا ملک بزورِ شمشیر حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ کو اپنے بھائی بھتیجوں کے خون کا عوض لینا ہے جو پانی پت میں مارے گئے اور اپنی ٹانگ کا بھی بدلہ نکالنا ہے جو ہمیشہ کے لیے بیکار ہوگئی۔ ٹوکوجی ان امرائے بھائی بندی کریں لیکن میں انتقام کا خیال دل سے نہیں نکال سکتا۔ بہتر ہے کہ اس معاملہ کی اطلاع پیشوا کو کی جائے اور اگر وہ ٹوکوجی کی رائے سے اتفاق کرے تب میں بھی منظور کر لوں گا۔"

پیشوا کے پاس قاصد بھیجے گئے اور وہاں سے جواب آیا کہ نجیب الدولہ مرہٹوں کا دوست کسی طرح نہیں ہو سکتا ہے مگر شاہ عالم کا الہ آباد سے واپس بلانا ضروری ہے اور اس کوشش میں نجیب الدولہ کی مدد سے آسانی ہوگی لہٰذا روہیلوں سے صلح کر لی جائے۔

درحقیقت ادھوجی کی رائے غلط تھی۔ اس وقت نجیب الدولہ پر سختی کی جاتی تو نجیب آباد بھی پانی پت کی طرح مشہور ہو جاتا۔ بہرحال پیشوا کے تصفیہ پر عمل کیا گیا اور روہیلوں کا پیام صلح منظور رہوا۔

نجیب الدولہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اُسکو زندگی کی کم اُمید باقی تھی۔ صلح کے بعد وہ خود مرہٹوں کے لشکر میں آیا۔ سندھیا سے بھی صفائی کی کوشش کی۔ اور اپنے لڑکے ضابطہ خاں کا ہاتھ ٹوکوجی کے ہاتھ میں دیکر دونوں خاندانوں کے موروثی تعلقات آیندہ نسل میں قائم رکھنے کی کوشش کی۔ بوڑھا باپ جانتا تھا کہ لڑکے میں حکومت سنبھالنے کی لیاقت نہیں ہے۔ اسکی آنکھیں بند ہونے کے بعد روہیلوں پر مصیبتوں کا ہجوم ہوگا اور اُس نازک وقت کے لیے ٹوکوجی سے بہتر کوئی رفیق نہیں ہو۔ مرہٹہ سردار نے نہایت خندہ پیشانی سے ضابطہ خاں کی امداد کا وعدہ کیا اور اپنے امکان بھر تمام عمر اس قول پر قائم رہا۔

نجیب الدولہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مر گیا[1] اور ضابطہ خاں نے دوآبہ اور روہیلکھنڈ کے آبائی اضلاع پر قبضہ کر لیا۔ وہ باپ کی جگہ دہلی پر بھی متصرف ہوا۔ اور کہا جاتا ہے کہ قلعہ شاہی کی بعض بیگمات سے شرمناک تعلقات پیدا کیے۔ ٹوکوجی نے اپنے قدیم منصوبوں پر عمل شروع کیا اور شاہ عالم سے دہلی واپس آنے کے لیے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہوا۔

یہ ایک دردناک داستان ہے کہ اکبر و جہانگیر کا وارث شاہ عالم جو شجاع الدولہ کی پناہ اور انگریزی فوج کی حفاظت میں الہ آباد و کوڑہ پر برائے نام حاکم تھا اپنے دوستوں اور ہوا خواہوں کی نازک مزاجی سے ایسا عاجز آگیا تھا کہ اُس کو شاہی نوبت خانہ اس قصور پر بند کرنا پڑا کہ انگریزی کمانڈر کے خواب[2] استراحت میں شہنائی کی آواز سے خلل پڑتا تھا!!

اللہ جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت!! یہ وہی شہنائی تھی جس کی بابت دو سو برس پہلے برنیر نے لکھا تھا کہ "یہ موثر موسیقی دل و دماغ پر ہیبت طاری کرتی ہے" جب اکبر و جہانگیر کے بے اختیار شہنشاہ نہ رہے تو شہنائی ایسی ذلیل ہوئی کہ سوداگروں کے فوجی افسر کو اُس کی آواز ناگوار معلوم ہونے لگی!!!

بعض مورخ شاہ عالم پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ شجاع الدولہ کی پناہ چھوڑ کر الہ آباد سے کیوں چلا گیا؟ مگر اس وقت اُن کو فراموش ہو جاتا ہے کہ الہ آباد میں اُسکو کیا چین نصیب تھا جسکے چھوڑنے کا وہ قلق کرتا اور ٹوکوجی کے نامہ و پیام کو خداوندی مدد تصور نہ کرتا!!

بہرحال شاہ عالم نے مرہٹوں کی حمایت کو اپنے قدیم ہوا خواہوں کی محبت پر ترجیح دی اور مرہٹوں کو بطور معاوضۂ خدمت دس لاکھ روپیہ دینے کا اقرار کرکے الہ آباد سے دوآبہ کی طرف راہی ہوا۔ ۱۷۷۱ء کے موسم بارش میں وہ فرخ آباد کے قریب پہنچ چکا تھا کہ سندھیا اپنے منتخب سواروں کے ساتھ اُسکے استقبال کو گیا۔ اور ۲۵ - دسمبر کو شاہ عالم دوبارہ دہلی میں داخل ہوا۔ ضابطہ خاں پہلے ہی یہاں سے فرار ہو گیا تھا اور دہلی میں مرہٹوں کی فوج امن قائم رکھنے کے لیے مقیم تھی۔

ٹوکوجی نے ضابطہ خاں کو دہلی بلا کر عفوِ تقصیر کے لیے بادشاہ کے سامنے پیش کرنا چاہا مگر وہ بدنصیب محلاتِ شاہی میں (گمان کیا جاتا ہے کہ) ایسی بدعنوانیاں کر چکا تھا کہ اُس کو منہ دکھانے کی

[1] نجیب الدولہ اکتوبر ۱۷۷۰ء میں مرا۔

[2] یہ واقعہ متعدد تاریخوں میں درج ہے مگر اس مقام پر ایک انگریزی کتاب کی سند لکھنا مناسب ہے۔ ملاحظہ ہو ایچ جی کینز) سی آئی ای کی" مادھو راؤ سندھیا" مطبوعہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۵۷۔

ہمت نہ ہوئی اور نجیب آباد کے پاس اپنے قلعہ پتھر گڈھ میں بیٹھا رہا۔ جب ٹوکوجی کے بلانے سے بھی ضابطہ خاں دہلی نہ آیا تو سندھیا کو روہیلوں سے اپنا عوض لینے کا موقع ملا اُس نے وقت مناسب سمجھ کر شاہ عالم کو ساتھ لیا اور روہیلوں پر چڑھائی کر دی۔ شجاع الدولہ مدت سے روہیلوں کے تباہ کرنے کی فکر میں تھا۔ اُس نے ضابطہ خاں کو مدد نہ پہونچنے دی۔ اور بہادر نجیب الدولہ کا بدقسمت لڑکا ایسا بدحواس و سراسیمہ ہو کر بھاگا کہ اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ نہ لے جا سکا۔ مرہٹوں نے پتھر گڈھ پر (جسکے کھنڈر آج تک سیاحوں کو رُلاتے ہیں) قبضہ کر لیا اور بے شمار دولت اُن کے ہاتھ آئی۔

سندھیا نے اپنی ٹانگ کے معاوضہ میں ضابطہ خاں کے لڑکے غلام قادر کو زنانہ بنوایا اور مشہور یہ کیا کہ باپ نے محلات شاہی میں جو گستاخیاں کی تھیں انکی سزا میں بیٹے کو یہ ڈنڈ دیا جاتا ہے!!
المختصر سندھیا اپنا جوش غضب ٹھنڈا کرکے راجپوتانہ کی طرف چلا گیا اور ہولکر کو پھر ضابطہ خاں کی طرفداری کا موقع ملا۔ اُس نے شاہ عالم کے وزیر مرزا نجف خاں کو زک دیکر ضابطہ خاں کو پھر امیر الامرا بنایا۔ پیشوا کو سلطنت دہلی کی سپہ سالاری کا اعزازی عہدہ اور دوآبہ کا جنوبی علاقہ دسمبر ۱۷۷۲ء میں دیا گیا۔ لیکن یہ معاملات ابھی طے نہ ہو پائے تھے کہ پونا سے پیشوا مادھو راؤ[1] کے موت کی خبر آئی اور چند ہی مہینے کے بعد اُس کا نابالغ بھائی نرائن راؤ بھی قتل کر دیا گیا۔ پونا میں خانہ جنگی کا اندیشہ تھا اس لیے سب مرہٹہ سردار دہلی کو اُس کے حال پر چھوڑ کر گھر کی خبر لینے چلے۔

نرائن راؤ کو[2] قتل کرکے رگھوبا خود منصب پیشوائی پر قابض ہونا چاہتا تھا لیکن اُس کی بدنصیبی ساتھ تھی۔ مادھو راؤ کی حاملہ بیوی ایک پہاڑی قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئی تھی۔ وہاں اُسکے ایک بچہ پیدا ہوا جسکو پونا کے ارکین دربار نے پیشوا بنانا چاہا۔ رگھوبا وزیروں کی اس دلیری سے بہت ناخوش ہوا اور اُنکو سزا دینے کی نیت کی۔ لیکن فوج کے بیشتر حصہ نے رگھوبا سے مخالفت کی اور پونا کے قریب شکست پاکر وہ شمال کی طرف بھاگا۔ اور اُس وقت اندور پہونچا جبکہ سندھیا اور ہولکر نے ہندوستان سے واپس آکر وہاں اپنے خیمے گاڑ دیے تھے۔

دونوں معزز سرداروں نے رگھوبا کی داستان غم سُن کر اُس کی مدد کا وعدہ کیا اور گجرات کی طرف بڑھے تاکہ وہاں کے راجہ گیکوار کو بھی سازش میں شریک کریں۔ بمبئی میں انگریزوں کی ایک

---

[1] مادھو راؤ ۱۸ نومبر ۱۷۷۲ء کو ۲۸ سال کی عمر میں بعارضۂ دق فوت ہوا۔

[2] نرائن راؤ ۳۰۔ اگست ۱۷۷۳ء کو قتل کیا گیا۔

تجارتی کمپنی تھی جو تاؤنا بنگال کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی تابع تھی لیکن وہ اپنی حفاظت کیلئے کچھ قواعد داں فوج مہیا رکھتی تھی اور پرتگیز کے مقبوضات کو جو اسکے ارد گرد واقع تھے رشک و حسد سے دیکھا کرتی تھی۔ کلکتہ کی کمپنی کی طرح اسکو بھی اپنا قبضہ حکومت بڑھانے کی ہوس تھی مگر مرہٹوں کی دھاک نے ابھی تک اسکو پاؤں پھیلانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ پونا کے ارکین حکومت میں بگاڑ ہوا تو اس کمپنی کی بھی تقدیر جاگی۔ رگھوبا پرتگیز کے مقبوضات سالسٹ وبسین اس جماعت کو دلانے کا وعدہ کرکے پندرہ سو سپاہیوں کی مدد اُن سے بھی حاصل کرلی۔ لیکن قبل اسکے کہ یہ اتحادی کوئی نمایاں خدمت کر سکیں اہلیا بائی نے مداخلت کی اور مادھوراؤ کی بیوہ اور یتیم بچہ پر ترس کہا کر اپنے سپہ سالار تُکوجی کو رگھوبا کا ساتھ دینے سے منع کر دیا۔ سندھیا نے بھی تقلید کی۔ اور یہ دونوں سردار رگھوبا کی اعانت سے کنارہ کش ہو گئے۔

انگریزی امداد کے بھروسہ پر رگھوبا پونا کے وزیروں سے ٹکر لڑا اور سخت نقصان اُٹھا کر دسمبر ۱۷۷۴ء میں "سورت" پہونچا۔ دوستوں نے اسکو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سالسٹ وبسین کے علاوہ ایک اور زرخیز علاقہ کا وعدہ لے کر تین ہزار سپاہیوں سے مدد کی اور رگھوبا کو بزورِ شمشیر پیشوا بنانے کے لیے پونا پر چڑھائی کر دی۔

وزیروں نے اس نئے لشکر سے بھی مقابلہ کیا۔ اور اس "کے مقام پر سخت لڑائی ہوئی جس میں انگریز مورخ نمایاں شکست کے بعد اپنی فتح بتاتے ہیں۔ ۲۲ دن کے بعد بہاؤ بیر" کے مقام پر پھر سامنا ہوا مگر مرہٹے اپنی توپیں دریا میں پھینک کر پسپا ہو گئے اور رگھوبا کو مال غنیمت میں ایک ہاتھی اور چند اونٹ ملے!!

اس عرصہ میں کلکتہ کی صدر کمپنی کی طرف سے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے اپنا سفیر پونا بھیجا اور وزیروں سے صلح کرنا چاہی۔ اراکین دربار نے شرط لگائی کہ رگھوبا اُنکے حوالہ کر دیا جائے اور جو علاقہ انگریزوں کو اُس نے دیا ہے واپس کیا جائے۔ ان شرائط کا ایک حصہ منظور ہوا۔ اور رگھوبا کی اعانت ترک کرنے کا اقرار کیا گیا۔ صلحنامہ پر دستخط ہو گئے جو "عہدنامہ پورن دھر" کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن رگھوبا اس معاملہ میں کوئی فریق نہ تھا۔ اُس نے صلح قبول نہ کی اور اپنے دوستوں کے پاس بمبئی پہونچا جہاں اُس کی آؤ بھگت کی گئی۔ اور نومبر ۱۷۷۶ء میں دس ہزار

نہ ملاحظہ ہو گرانٹ ڈف کی تاریخ مرہٹہ جلد دوم صفحہ ۲۹۹ و ۳۰۰۔ یہ تسلیم ہے کہ انگریزی سپاہی بہت بےقاعدہ بھاگے کرنل کی اجازت کے بغیر فوج نے واپسی شروع کر دی اور جھاڑیوں میں جا کر چھپی۔ جہاں دشمن نے موقع پاکر خوب قتل کیا۔ یہ بھی اقرار ہے کہ ۲۲۲ سپاہی قتل ہوئے جن میں ۸۶ یورپین اور ۱۱ آفسر تھے لیکن فتح انگریزوں ہی کو نصیب ہوئی کیونکہ مرہٹے اتنے آدمی مار کر واپس ہٹ گئے!!! نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے ؏ پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے!!!

اس کی پنشن مقرر ہوئی۔

اُدھر پونا کے ارا کین میں باہم پھوٹ پڑی۔ پہلے تو پنڈت سکھرام باپو اور بالاجی جنار دین (جو انگریزی تاریخوں میں نانا فرنویس کے نام سے مشہور رہے) متفق تھے مگر اب اُن میں بگاڑ ہو گیا۔ پونا کے حلقۂ وزرا میں یہی دونوں سردار سب سے زیادہ قابل تھے اور انکی باہمی تکرار ریاست کی تباہی کا سبب ہوئی۔

کہتے ہیں کہ پیشوا کی ماں گنگا بائی نانا فرنویس سے نسبت رکھتی تھی اس لیے نانا کا پایہ زبردست سمجھ کر سندھیا نے اُس کا ساتھ دیا اور ٹوکوجی نے سکھرام کی مدد کی۔ بمبئی نے ان سرداروں کی مخالفت میں اپنا نفع دیکھ کر پھر رگھوبا کو پیشوا بنانے کی کوشش شروع کی۔ چار ہزار انگریزی فوج کی مدد سے رگھوبا پونا کی طرف چلا۔ ٹوکوجی نے اس نازک وقت پر نانا کا ساتھ دیا اور ۹۔ جنوری ۱۷۷۹ء کو طالع گانوں کے مقام پر رگھوبا کو ایسی زک پہونچی کہ وہ پھر کبھی سر نہ اُٹھا سکا۔ انگریزی فوج کا سردار بیمار پڑا۔ سپاہی بد دل ہوے۔ سامان رسد جلا دیا گیا۔ توپیں تالابوں میں پھینک دی گئیں۔ اور پونا سے ایک جدید صلحنامہ ہوا جسکے شرائط یہ تھے کہ رگھوبا انگریزوں کی حمایت سے الگ کر دیا جائے، جو علاقہ انگریزوں نے حاصل کر لیا ہے واپس کیا جائے اور "بروچ" کا پرگنہ سندھیا کو دیا جائے۔

بمبئی کی شکست خوردہ فوج نے یہ عہد و پیمان کیے۔ پونا کا دربار مطمئن ہو گیا۔ لیکن کلکتہ کی انگریزی فوج نے وسط ہند پر حملہ کر دیا اور بندیلکھنڈ کے سرداروں کو شکست دیکر سورت تک پہونچ گئی۔ پونا کے ارا کین سے ایک جدید صلحنامہ کے لیے سلسلہ جنبانی کی۔ سندھیا نے دربار پونا پر اپنا قابو رکھنے کے لیے قوم کا ساتھ چھوڑ دیا اور انگریزوں سے جداگانہ صلح کرنا چاہی اُسکی کم ہمتی سے دوسروں نے فائدہ اُٹھایا۔ انگریزی فوج نے دارالسلطنت احمدآباد پر قبضہ کر لیا اور گوالیار کا قلعہ جو ناقابل فتح خیال کیا جاتا تھا مسخر کر لیا۔

اب سندھیا کو ہوش آیا کہ اُدھر تو ہندوستان کا راستہ بند ہوا جاتا ہے اور ادھر پیشوا کی حکومت تباہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی فوج لیکر انگریزوں سے مقابلہ کو بڑھا۔ مگر اُسکا خیمہ و خرگاہ لٹ گیا۔ ہاتھی گھوڑے چھن گئے اور مجبور ہو کر اُسنے انگریزوں سے صلح کی جسکی ایک شرط یہ تھی کہ وہ دربار پونا سے بھی لڑائی بند کرا دے گا۔ آخرکار سندھیا کے اثر سے ۱۷۔ مارچ ۱۷۸۲ء کو سلبائی کے صلحنامہ پر فریقین کے دستخط ہوے۔ طالع گانوں کا صلحنامہ منسوخ اور پورندھر کا عہدنامہ بحال

کیا گیا۔ سالسٹ وغیرہ جزائر ہمیشہ کے لیے بمبئی کی کمپنی کو مل گئے۔ اور مرہٹوں کی سلطنت میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" کو مداخلت کا حق حاصل ہوگیا۔

اب مادھوراؤ کا نابالغ لڑکا پیشوا تسلیم کر لیا گیا۔ انتظام حکومت نانا فرنویس کے سپرد ہوا۔ اور رگھوبا کی پنشن[1] مقرر کر دی گئی۔ سندھیا ہندوستان واپس گیا لیکن ہولکر کو پونا کے دربار نے دکن کی خدمات کے لیے روک لیا۔

مرہٹوں نے میسور کے حاکم ٹیپو سلطان سے لڑائی شروع کی اور اس جنگ میں ٹوکوجی نے بہت شجاعت و جوانمردی دکھائی۔ اس مظلوم ریاست کی دردناک داستان بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں البتہ ٹوکوجی کی انتہائی قابلیت کے لیے اس قدر اشارہ کافی ہے کہ "کٹوڑ" کے ضلع سے ٹیپو کو خارج کرنا "ساوانور" کے محفوظ قلعہ پر تصرف کرنا اور ۱۷۸۶ء میں ۴۵ لاکھ روپیہ اور کچھ علاقہ لیکر مرہٹوں کی عظمت ٹیپو کے دل میں نقش کرنا ہولکر ہی کا کام تھا۔

غرض بارہ برس دکن میں مصروف رہنے کے بعد میسور کی لڑائی کا خاتمہ کرکے ٹوکوجی اہلیا بائی کی خدمت میں واپس گیا مگر مہیسر میں چند ہی روز قیام کی نوبت آئی تھی کہ اسکو باجی راؤ پیشوا کے لڑکے علی بہادر کی مدد کے لیے بندیلکھنڈ جانا پڑا۔ یہ لڑکا ایک مسلمان عورت سے پیدا ہوا تھا اور ماں کے مذہب پر تھا لیکن پونا کے اراکین حکومت کو اسکی خاطر عزیز تھی۔ ٹوکوجی کو اسکی امداد و اعانت کا حکم دیا گیا اور وفادار سپہ سالار نے اپنی ہمت و بہادری سے اس لڑکے کو "باندہ کا نواب" بنا دیا۔ جہاں اسکی اولاد غدر ۱۸۵۷ء تک مسند نشین اور حاکم بااختیار رہی۔

اس مہم سے فراغت نہ ہوئی تھی کہ ٹوکوجی کو سندھیا کی مدد کیلئے ہندوستان جانے کا حکم دیا گیا۔ وہاں اس عرصہ میں ضابطہ خاں کا ناقابل لڑکا غلام قادر نہایت ظلم و ستم برپا کر چکا تھا۔ شاہ عالم کو نابینا بنا کر اور اپنے ساتھ کل روہیلوں کی تباہی کرا کے ہندوستان کے سیاہ و سفید کا اختیار مادھوجی سندھیا کے ہاتھ میں پہونچا چکا تھا۔ یہ حسرت خیز کہانی ہندوستان کی تاریخ میں خون کے حرفوں سے لکھی ہوئی ہے اور اس مختصر مضمون میں اسکے دوہرانے کی قلم کو ہمت نہیں!!

اس تباہی کے زمانہ میں ہولکر کے خاندان نے ہندوستان سے بے تعلقی اختیار کر رکھی تھی۔ اور غلام قادر کے مظالم کے وقت ٹوکوجی دکن کی مہمات میں مصروف تھا جب سندھیا کے اصرار سے

---

[1] اس صلح نامہ کے بعد رگھوبا نے دریائے گوداوری کے کنارے کوپرگانوں کے مقام پر سکونت اختیار کی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فوت ہوگیا اور اس کی بدنصیبیوں کا سایہ اسکے لڑکے باجی راؤ پر آگیا۔

پیشوا نے ٹوکوجی کو دوبارہ ہندوستان جانے پر مجبور کیا تو مادھوجی کی طاقت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ہولکر اُس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا ورنہ اُس کا زور توڑ سکتا تھا۔ وہ پیشوا کے حکم سے ہندوستان گیا اور شروع شروع میں سندھیا کی اعانت بھی کی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ دہلی کے معاملات میں دست اندازی سے مرہٹوں کا قومی فائدہ نہیں ہو سکتا ہے تو اُس نے وریدہ سندھیا کی مخالفت شروع کی اور اپنی حکمت عملی سے مادھاجی کو (جسکی تعریف میں بعض انگریز مورخ بہت رطب اللسان ہیں) ایسا عاجز کیا کہ اُس نے خود درخواست کی کہ ہولکر واپس بُلا لیا جائے!! پیشوا بھی سندھیا کو ہندوستان میں آزاد رکھنا نہیں چاہتا تھا اسلیے ٹوکوجی کی واپسی کا حکم صادر ہوا اور مجبوراً سندھیا خود پونا کا عازم ہوا۔ وہ درحقیقت دہلی کا بادشاہ تھا۔ اُس نے شاہ عالم کی طرف سے پیشوا کو سلطنت کا وکیل مطلق مقرر کیا اور خلعت وکالت نذر کرنے کے بہانہ سے دکن گیا۔

مادھوجی کے ہٹنے کے بعد اُسکے سرداروں سے ہولکر کھلم کھلا لڑ پڑا۔ اور لکھیری کے درہ پر سندھیا کے فرانسیسی افسروں کے دانت کھٹے کردیے۔ اُسکی فوج کا سپہ سالار "ڈی بوائن" اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں تحریر کرتا ہے کہ "لکھیری سے زیادہ جی توڑ لڑائی اُس نے کبھی نہیں دیکھی۔ ہولکر کے توپخانہ نے ایسی آگ برسائی کہ اُسکا جواب دینا ناممکن تھا اور اُسکے سواروں نے اس زور سے دھاوا کیا کہ سندھیا کی فوج کو جنگل میں پناہ لینا پڑی" مثل مشہور ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ کاشی راؤ اور باپوجی جن میں سے ایک ہولکر کا بیٹا تھا اور دوسرا بھتیجا تھا دشمنوں سے مل گئے اور انجام کار ٹوکوجی کے لشکر کو شکست ہوئی۔ وہ اپنی باقیماندہ فوج لیکر مالوہ کی طرف واپس ہوا اور بدنامی کا داغ مٹانے کے لیے سندھیا کے دارالسلطنت اوجین کو لوٹ لیا۔ کسی کو اُسکی بہادر فوج سے بدلہ لینے کی ہمت نہ پڑی اور وہ باطمینان مالوہ میں مقیم رہا۔ یہاں تک کہ چند مہینوں کے بعد پیشوا نے اُسکو نظام دکن سے لڑنے کے لیے بُلایا۔ ۱۷۹۵ء میں مرہٹوں کے صوبہ دار دکن سے لڑائی آخری موقع تھا کہ پیشوا کے فرمان پر کُل مرہٹے سردار جمع ہوں اور ایک جھنڈے کے نیچے اکٹھا ہو کر ناموری حاصل کریں۔ لہذا اس جنگ کا کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا مناسب ہے۔

میسور کی ریاست تباہ کرنے اور سلطان ٹیپو کو زیر کرنے کے لیے انگریزوں کی کمپنی نے پیشوا اور نظام دکن سے اتحاد کیا تھا اور میسور کے خلاف پچھلی لڑائی میں مرہٹوں اور مغلوں کے سپاہی دوش بدوش لڑتے تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے لیے مرہٹوں کے حقوق "چوتھ" اور "سردیش مکھی" جو آصف جاہ کے وقت سے حیدرآباد میں معین تھی معرض التوا میں پڑ گئے تھے۔ مگر جب ٹیپو سے صلح ہوئی تو مرہٹو

نے اپنے موروثی حقوق کا مطالبہ شروع کیا۔ اور کئی کرور روپیہ کا نظام سے مطالبہ کیا۔ کچھ عرصہ تک نامۂ و پیام جاری رہے لیکن آخر کار نانا فرنویس کے پُر زور مراسلات سے عاجز آکر نظام کے وزیر مشیر الملک نے مرہٹوں کے وکیل کو جواب دیا کہ "حساب بہت پیچیدہ ہے اسکے سمجھانے کے لیے نانا فرنویس کو خود یہاں آنا چاہیے۔" وکیل نے عذر کیا کہ "نانا صاحب کے پاس کام کا بہت ہجوم ہے وہ یہاں کیسے آسکتے ہیں۔" مشیر الملک نے غصہ میں کہدیا کہ "میں تم کو دکھادوں گا کہ وہ یہاں کیونکر لائے جاسکتے ہیں۔" یہی دھمکی اعلان جنگ سمجھی گئی۔ اور اگرچہ خط کتابت اسکے بعد بھی جاری رہی مگر فریقین نے جنگی تیاریاں شروع کردیں!

اب مادھوجی سندھیا[1] کا انتقال ہوچکا تھا اور اُسکے بھائی کا پوتا دولت راؤ سندھیا کی ریاست کا وارث ہوا نانا کی مٹھی میں تھا۔ تُوکوجی ہمیشہ سے تابع فرمان تھا اور یہ دونوں سردار فوراً پونا پہونچ گئے۔ برار کا راجہ اپنی فوج لیکر پیشوائی اعانت کو آیا۔ بڑودہ کے گیکوار نے اپنی فوج خدمت کے لیے روانہ کی۔ ناگپور کا بھونسلا پندرہ ہزار سوار اور پیدل لایا۔ جنوب کے برہمن جاگیردار اور مانکری وغیرہ اپنی اپنی فوجیں لیکر جھنڈے کے نیچے جمع ہوے اور یکم جنوری ۱۷۹۵ء کو نوعمر پیشوا نانا فرنویس کی سرپرستی میں ایک لاکھ ۳۴ ہزار سے زیادہ سوار اور پیدل لیکر پونا سے راہی ہوا۔ تُوکوجی کے مشورہ کے مطابق پرسرام بھاؤ کُل فوج کا سپہ سالار بنایا گیا اور پانی پت کی شکست سے سبق لیکر بھاری اسباب ہر کوچ پر ایک منزل پیچھے چھوڑتے ہوے آگے بڑھے۔ بہترین سواروں کا ایک دستہ باقاعدہ پیدل اور ڈیڑھ سو توپوں کے ساتھ آگے روانہ کیا گیا اور دس ہزار پنڈاری لوٹ مار کے لیے ساتھ رکھے گئے۔ اُدھر سے نظام بھی ایک لاکھ دس ہزار جرار لیے ہوے مرہٹوں کی سرحد کی طرف آرہا تھا۔ پہری گھاٹ کے قریب پیشوائی ایک دستۂ فوج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اور یہ رسالہ مغلوں کے حملہ کی تاب نہ لاکر منتشر ہوگیا۔ دوسرے ہی روز صبح کو مرہٹوں کی پوری فوج داہنی طرف سے نمودار ہوئی۔ نظام نے اپنا ہاتھی روکا۔ خیمہ دخرگاہ بائیں طرف ہٹایا اور اپنے ایک سردار کو مرہٹوں کے مقابل کیا۔

پرسرام بھاؤ نے قلب لشکر میں اپنا مقام کیا اور پیشوا و ہولکر کی فوجیں اپنے ساتھ رکھیں۔ رگھوجی بھونسلا کو داہنے بازو پر اور دولت راؤ سندھیا کو بائیں طرف متعین کیا۔ مغلوں کے بلوچی رسالہ نے لڑائی شروع کی اور پرسرام کو گھوڑے سے گرادیا۔ سپہ سالار کی بمشکل جان بچی اور مرہٹوں کا

---

[1] مادھوجی سندھیا پونا کے قریب ۱۲ فروری ۱۷۹۴ء کو فوت ہوا۔

ہراول لشکر سراسیمہ ہو کر بھاگا - مگر اس عرصہ میں مرہٹوں کے دونوں بازو قریب آ گئے تھے - بھونسلا نے "بان" چلانا شروع کیے جو مرہٹوں کا آبائی آلۂ جنگ تھا اور جس میں بھونسلا کو خاص مہارت تھی توپوں نے بھی آگ برسائی اور چند منٹ میں لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا!! سوار بھاگے - اور پیادوں کو بھی خوفزدہ ہو کر جگہ چھوڑنا پڑی - نظام نے اپنے لشکر کو پیچھے کی طرف ہٹایا تاکہ "کردلا" کے محفوظ مقام پر پہونچ جائے مگر آفتاب غروب ہو گیا تھا اور ہر طرف تاریکی چھا رہی تھی - دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں - یہاں تک کہ اندھیرا ایسا سخت ہوا کہ کسی کو کچھ نہ سوجھتا تھا - دن بھر کی تھکی ماندی فوج لڑائی کو غیر ختم چھوڑ کر میدان میں کمریں کھول کر لیٹ گئی اور تجویز کیا کہ آفتاب طلوع ہونے کے بعد پھر لڑائی ہوگی -

خدا کی شان! مرہٹوں کا ایک دستہ پانی کی تلاش میں ایک چشمہ کے پاس گیا جہاں مغلوں کی کچھ فوج پڑی ہوئی تھی - مرہٹوں نے انکو دیکھ کر فیر کیے مغلوں نے جواب دیا - بندوقوں کی آواز سے سارے لشکر میں کھلبلی مچ گئی اور شبخون کے اندیشہ سے نظام کے قواعد داں سپاہی ادھر اُدھر بھاگنے لگے - جب چاند نکلا اور کسی قدر اُجالا ہوا تو نظام نے "کردلا" کے قلعہ میں پناہ لی لیکن اُس کی فوج کا بیشتر حصہ فرار ہو چکا تھا اور اپنے ہی خیمہ و خرگاہ لوٹ رہا تھا!!

جب صبح ہوئی اور مرہٹے دشمن سے مقابلہ کو آگے بڑھے تو میدان جنگ بندوقوں اور ذخائر جنگ سے پٹا ہوا تھا لیکن دشمن کا نشان نہ تھا - یہ خبر فوراً مشہور ہو گئی اور ہر طرف سے رہٹے مغلوں کا سامان لوٹنے کے لیے آموجود ہوے - مال غنیمت کا انبار جمع کیا اور کردلا کی پہاڑی کے سامنے جہاں نظام محصور تھا قلعہ شکن توپیں لگا دیں -

نظام نے دو دن تک نہایت بہادری اور استقلال سے توپوں کی آگ برداشت کی لیکن جب وہ جگہ ناقابل قیام ہو گئی تو صلح کا پیام بھیجا - مرہٹوں نے پہلی شرط پیش کی کہ مشیر الملک جس نے نا فرنویس کی توہین کی ہے اُنکے حوالہ کر دیا جائے - اور کچھ علاقہ مع تین کرور زر نقد کے بطور تاوان دیا جائے - نظام اُس وقت بے بس اور سب شرطیں قبول کرنے کو تیار تھا لیکن اپنے وزیر کو دشمنوں کے سپرد کرنا نہیں چاہتا تھا - وفادار وزیر اپنے آقا کی مصیبت دُور کرنے کے لیے جان نذر کرنے کو آمادہ ہو گیا اور اپنی خوشی سے مرہٹوں کی قید میں جانا منظور کیا - ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!!!

کہتے ہیں کہ جب مشیر الملک دو سو مرہٹوں کی حراست میں پیشوا کے کیمپ کی طرف جا رہا تھا تو

نوجوان پیشوا راستہ ہی میں ملا۔ مشیر الملک کو گرفتار دیکھ کر نہایت متاسف ہوا اور اس نمک حلال وزیر کو عزت سے اپنے ساتھ لیگیا۔ مرہٹہ اس غیر متوقع فتح پر بہت ہی خوش تھے مگر بلند ہمت پیشوا اداس تھا اور مشیر الملک کو دیکھکر اُسکے چہرہ پر اس قدر سخت حسرت کے آثار طاری ہوگئے تھے کہ نانا فرنویس کو اُسکے قلق کی وجہ دریافت کرنا پڑی۔

اولو العزم پیشوا کا جواب سرخی سے لکھنے کے قابل ہے۔ اُس نے کہا کہ "ہندوستانی حکومتوں کی عظمت و شوکت کا خاتمہ ہوگیا اور ان کے دن پورے ہوچکے مغلوں نے ایسی شرمناک صلح کی کہ اپنے وزیر کو بھی ہمارے حوالہ کردیا اور میرے ہم قوم اُس فتح پر خوشی منا رہے ہیں جس کے لیے اُنکو کوئی کوشش نہیں کرنا پڑی" !!

واقعی اس لڑائی میں فریقین کے دو سو آدمی بھی بمشکل قتل ہوے تھے اگرچہ بعد کو رات کی تاریکی اور کردلا کے محاصرہ نے نظام کو بہت نقصان پہونچایا تھا۔ ہر حال اس فتح نے پانی پت کا غم غلط کردیا اور دکن کے علاقہ میں ایکبار پھر مرہٹوں کی عزت قائم کردی۔

جنگ سے فراغت کے بعد پیشوا، نانا فرنویس اور سندھیا و ہولکر وغیرہ پونا کو واپس ہوے لیکن پیشوا نانا فرنویس کی سختیوں سے تنگ آگیا تھا وہ ۲۵ - اکتوبر سنہ ۱۷۹۵ء کی صبح کو خود کشی کی نیت سے محل کے جھروکہ سے کود پڑا اور دو دن کے بعد دنیا سے رخصت ہوگیا۔

مرنے سے قبل اُس نے وصیت کی تھی کہ اسکی جگہ رگھوبا کا لڑکا باجی راؤ مسند پر بٹھایا جائے لیکن نانا کو خوف ہوا کہ باجی راؤ حکومت پاکر اپنے باپ کا بدلہ لیگا۔ لہذا وصیت کا لحاظ نکرکے ٹکوجی وغیرہ سرداروں سے مشورہ کیا گیا اور یہ رائے قرار پائی کہ سابق پیشوا کی بیوہ جسو دھا بائی کسی لڑکے کو گود لے اور اُس بچہ کی طرف سے نانا حکومت کا منتظم رہے۔ یہ معاملہ دیکھ ٹکوجی جنوری سنہ ۱۷۹۶ء میں پونا سے رخصت ہوا۔ کیونکہ مہیسر میں اہلیا بائی کا انتقال ہوچکا تھا اور ہولکر کا فوراً مالوہ واپس آنا لازمی تھا۔

ہولکر کی واپسی کے بعد باجی راؤ نے دولت راؤ سندھیا کو چار لاکھ کی جاگیر دینے کا وعدہ کرکے اپنا ہمخیال بنالیا۔ اور نانا فرنویس کو بھی باجی راؤ سے اپنے عفو تقصیرات کا پروانہ لکھوا کر اُسی کو پیشوا تسلیم کرنا پڑا۔

ٹکوجی کی عمر ۷۰ برس کے قریب ہوچکی تھی اور ضعیفی نے اُسکو مزید محنت کے ناقابل بنا دیا تھا۔ اُس نے مالوہ پہونچکر کل انتظام ریاست اپنے ہاتھ میں لیا۔ لیکن جو قواعد و قوانین اہلیا بائی

نے جاری کیے تھے اُن میں دست اندازی نہیں کی۔ اُسکو خبریں پہونچتی رہیں کہ پونا میں اُسکے بعد بہت انقلابات ہوے۔ سندھیا نے باجی راو کی طرفداری کی۔ مشیر الملک نے مرہٹوں کی قید سے عزت و آبرو کے ساتھ رہائی پائی۔ نظام سے جدید عہدنامہ ہوا۔ اور وہ کل علاقہ جو کرولا کی لڑائی کے بعد حاصل ہوا تھا واپس کیا گیا۔ اور نانا فرنویس نے باجی راؤ کو پیشوا بنا دیا لیکن ہولکر نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ پیشوا کی گدی کا فرماں بردار رہا اور کسی معاملہ میں دخل نہیں دیا۔ یہاں تک کہ ۱۵۔ اگست ۱۷۹۷ء کو دنیا سے رخصت ہوگیا۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

"خافی خاں"

"ہند عہد اورنگ زیب میں"

(از مرزا یار جنگ مولوی مرزا سمیع اللہ بیگ میر مجلس عدالت العالیہ حیدرآباد دکن)

جناب مرزا صاحب نے "ہند عہد اورنگ زیب میں" بحیثیت مجموعی ایک قابل قدر کتاب لکھی ہے شروع کے ابواب میں انگریز سیاح کے سفرنامہ کے اقتباسات جو مع اپنے اضافہ و تشریح کے دیے ہیں، وہ ہر اعتبار سے مفید و دلچسپ، اور معلومات افزا ہیں۔ اور انکی یہ کوشش صد درجہ قابل داد و ستایش ہے۔ اردو میں اس سیاح کے یہ بیش قیمت معلومات بالکل پہلی بار آئے ہیں، جن سے بدنام اورنگ زیب کے بہت سے روشن پہلو پیش نظر ہو جاتے ہیں، اور اسلامی عہد حکومت کے بہت سے دھبے دُہل جاتے ہیں۔ آخری باب جسے مرزا صاحب نے سب سے زیادہ اہم قرار دیا ہے، وہ بھی بحیثیت مجموعی قابل داد ہے، اس میں سنجیدگی کے ساتھ ہند و مسلم اتحاد کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ ان میں سے کوئی تدبیر غلط یا غیر ضروری نہیں۔ سب مناسب و ضروری ہیں، البتہ شاید بہت دور رس نہ ہوں۔ حقیقی و پائدار اتحاد کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے، وہ یہ کہ دونوں قومیں اپنے اپنے مذہب سے صحیح طور پر واقف اور انکی ہدایات پر عامل ہوں۔ صحیح مذہبیت کسی قسم کے دنیوی جھگڑے باقی ہی نہ رہنے دیگی، اور اُسوقت ان مناقشات کی بے حقیقتی اور بے وقعتی ہندو مسلمان دونوں پر از خود منکشف ہو جائیگی۔ کتاب میں کمی صرف یہی کی ہے، کہ اس پہلو پر مرزا صاحب نے زور نہیں دیا ہے، بلکہ مسئلہ خلافت وغیرہ کے سلسلہ میں بعض الفاظ ایسے بھی انکے قلم سے نکل گئے ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ مسلمانوں کی مذہبیت کو پسند نہیں فرماتے۔ یہ محض نفس پرستی ہے جسے مذہب کا نام دیکر لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں، ورنہ حقیقی مذہب (خصوصاً ہمارا اسلام) تو ایک مستقل دعوت امن و پیام صلح کا نام ہے۔ کاش لوگ زیادہ تعداد میں مرزا صاحب کی کتاب کو پڑھیں، اور انکی سنجیدہ تجاویز اصلاح پر غور و عمل کریں۔

عبد الماجد - دریا باد - بارہ بنکی

دوا فروش کی بیوی

(از روسی افسانہ نگار چیکوف)

آن تان چیکوف ملک روس کا سب سے بڑا افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے' ایک صاحب نظر اہل الرائے کے الفاظ میں اُس کے آرٹ کی سب سے بڑی خصوصیت "یاسیت کا رنگ لیے ہوئے واقعیت نگاری ہے جو اُسکے قلم کے ہر نقش میں دھندلکے کی ہلکی ہلکی تاریکی پیدا کر دیتی ہے" ذیل میں ہم اُسکی ایک نہایت مختصر کہانی پیش کرتے ہیں جو اُسکے کمال کا بہترین نمونہ ہے، اُمید ہے کہ ہمارے ناظرین اس سے صحیح طور پر لطف اُٹھائیں گے۔ (ج۔ا۔ق)

قصبۂ 'ب' جس میں صرف دو تین ٹیڑھی اور ناہموار سڑکیں تھیں، محوِ خواب تھا، فضا پر کامل خاموشی مسلط تھی، ہوا بند تھی، بستی کے باہر بہت دُور ایک کُتا اپنی مہین مگر بھیانک آواز میں شور مچا رہا تھا، آسمان پر ہلکی ہلکی روشنی تھی، صبح ہونے والی تھی۔

ہر چیز پر نیند کا غلبہ تھا، کائنات اپنی مسلسل گردش سے گویا تھک کر سوگئی تھی، اگر کوئی ہستی اب تک نہ سویا تھا تو وہ ایک دوا فروش چرنومارڈک کی نوجوان بیوی تھی، وہ تین مرتبہ بستر پر لیٹی اور ہر مرتبہ اُٹھ بیٹھی، اُسے مطلق نیند نہ آئی وہ گھبرا رہی تھی، نہ معلوم کیوں؟ ..... آخرکار وہ اپنے رات کے لباس میں کمرہ کی کھڑکی سے لگ کر گلی میں تکنے لگی مگر پھر بھی اُس کی پریشانی کا وہی عالم تھا۔ اس وقت وہ بیحد مغموم اور نڈھال تھی، اتنی بد حواس کہ بے اختیار رونے کو جی چاہ رہا تھا، خدا معلوم کیا بات تھی؟ .....

اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسکے سینہ پر کوئی بوجھ، کوئی وزنی پتھر ہے جو برابر گلے تک آآ کر اُسے زار زار رونے سے روک لیتا ہے چند قدم کے فاصلہ پر دیوار سے لگا ہوا اُس کا شوہر چرنومارڈک، خراٹے لے رہا تھا۔ ناک پر ایک مچھر بیٹھا ڈنک مار رہا تھا مگر اُسے سونے میں کچھ خبر نہ تھی۔
اُس کا چہرہ بشاش معلوم ہوتا تھا، شاید وہ خواب میں دیکھ رہا تھا کہ بستی کے تمام لوگ کھانسی میں مبتلا ہیں، اور اُس کی دوکان سے دوا خریدنے آئے ہیں۔ اب اُسے کوئی چیز، کوئی آواز بیدار

نہ کر سکتی تھی۔

دوکان بستی سے بالکل باہر تھی، اس لیے دوا فروش کی بیوی کھڑکی سے دُور تک کے مناظر، سبزہ، کھیت، تالاب بہ آسانی دیکھ سکتی تھی۔ مشرق کی طرف افق روشن ہوتا جاتا تھا، اتنے میں گویا آگ کی روشنی کی طرح پیدا ہوگیا اور بالکل غیر متوقع طور پر ایک گول سرخ رنگ کا پیارا پیارا چاند جھاڑیوں کی آڑ کڑے جھانکنے لگا، رفتہ رفتہ بلند ہوتا گیا اور ذرا سی دیر میں اُسکے چہرہ پر، کمرہ میں، سڑکوں پر چاندنی ہی چاندنی تھی۔

رات کی مہیب خاموشی میں یکا یک کہیں قریب ہی ایک آہٹ سنائی دی جو رفتہ رفتہ قدموں کی چاپ میں بدل گئی۔ اُسے تھوڑی دُور پر دو آدمی ہاتھ ہلاتے ہوئے، زور زور باتیں کرتے اور اپنی چال سے سڑک پر شور مچاتے ہوئے نظر آئے۔

"شاید یہ سپاہی ہیں جو کپتان پولیس کے بنگلہ سے اپنے گھر واپس جا رہے ہیں" دوا فروش کی بیوی نے خیال کیا۔

تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کچھ اور قریب آگئے، اب وہ اُنھیں بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ ایک تو خوب موٹا تازہ قد آور آدمی تھا دوسرا ذرا دُبلا پتلا اور پستہ قد۔ دونوں قدم بہ قدم جھپٹتے ہوئے چلے آرہے تھے، اُس کی دیوار کے نیچے پہونچکر اُن کے قدم سست پڑنے لگے اور آواز بھی دھیمی ہوگئی دونوں نے اوپر کی طرف نگاہ کی اور آپس میں یوں باتیں کرنے لگے:

"یہی دوا فروش کی دکان معلوم ہوتی ہے" ایک نے کہا

"دوا فروش کی تو ہے ہی، آہ.... مجھے یاد ہے گذشتہ سنیچر کو میں یہاں ریڈی کا تیل خریدنے آیا تھا، بہت بدقطع اور عجیب شکل و ہیئت کا آدمی ہے مگر..." دوسرے نے جواب دیا۔

"اس وقت سو رہا ہوگا اُس کی بیوی بھی سوتی ہوگی آبٹوسو! کیا کہوں کیسی حسین عورت ہے!"

"آہ، میں دیکھ چکا ہوں، یہی تو میں بھی کہنے کو تھا، ڈاکٹر! بتاؤ تو وہ اپنے بدصورت شوہر کو پسند بھی کرتی ہوگی، کیا وہ اُس سے کبھی محبت کر بھی سکتی ہے؟"

"نہیں، غالباً وہ ہرگز اُس سے محبت نہ کرتی ہوگی" ڈاکٹر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"وہ اس وقت کھڑکی سے لگی سوتی ہوگی کیوں آبٹوسو! گرمی کے مارے ہلکان ہوئی جاتی ہوگی اُس کے لب نصف کھلے ہوں گے اور ایک پاؤں چادر سے باہر نکلا ہوا پٹی پر لٹک رہا ہوگا.... بیوقوف دوا فروش کو اپنی خوش قسمتی کی ذرا بھی خبر نہیں" اُس نے ہنستے ہوئے کہا

عورت اور بوتل کے درمیان کیا فرق نظر آتا ہوگا!"

"میں کہتا ہوں ڈاکٹر" افسر نے رُک کر کہا "اگر اس وقت چل کر اس دوکان سے کوئی دوا خریدیں تو کیسا ہے؟ اس بہانہ سے شاید ہم پھر اسکو دیکھ سکیں"

"خوب سوچا! ..... مگر بھلا رات میں"

"اُنھ" افسر نے منہ اُٹھا کر کہا "اس سے کیا ہوتا ہے، بلکہ یہ لوگ تو رات میں خدمت کرنے سے اور بھی خوش ہوتے ہیں"

"تم کہتے ہو تو بھائی ....."

دوا فروش کی بیوی تمام باتیں پردہ کی آڑ سے سنا کی، اتنے میں اُس نے گھنٹی کی آواز سنی، نہایت اطمینان سے اُس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوے جو میٹھی نیند اُڑا رہا تھا اپنی پوشاک بدلی، پیروں میں سلیپر پہنی اور دوکان کے دروازہ کی طرف چلی۔

شیشوں کے دوسری جانب اُسے صرف دو پرچھائیاں نظر آئیں، روشنی تیز کرکے فوراً اُس نے دروازے کھول دیے۔ اب نہ وہ مغموم تھی اور نہ نڈھال، نہ اُس کا جی رونے کو چاہ رہا تھا، مگر اُس کا دل نہ معلوم کیوں اب بھی دھڑک رہا تھا، موٹا تازہ ڈاکٹر اور دُبلا پتلا آفیسر اندر داخل ہوے دوا فروش کی بیوی نے اب اُن کی صورتیں دیکھیں، ایک موٹا تازہ سیاہ فام تھا، چھوٹی داڑھی، بہت سست، ہلکی سی جنبش سے اُس کی پیشانی پسینہ سے تر ہو جاتی، شاید اُسے اپنے موٹاپے سے تکلیف پہونچتی تھی، دوسرا دُبلا پتلا خوش رُو اور نازک اندام تھا، مُنڈی ہوئی ڈاڑھی، زنانہ چہرہ، بڑا تیز اور نرم،

"فرمائیے، کیا حاضر کروں؟" دوا فروش کی بیوی نے لباس کو ایک ہاتھ سے اپنے سینہ پر پکڑے ہوے سوال کیا،

"چار آنے کی وہ ..... دیکھیے اُسے کیا کہتے ہیں وہ ..... ہاں پپرمنٹ کی ٹکیاں عنایت کیجیے"۔ لکنت کرتے ہوے ایک گھبرائے ہوے لہجہ میں ڈاکٹر نے ادا کیا۔

آہستہ آہستہ دوا فروش کی بیوی نے الماری کی طرف ہاتھ بڑھایا، بوتل نکالی اور ٹکیاں تولنے لگی۔ اُس کے خریدار دیر تک اُس کی پشت پر نظر جمائے رہے، ڈاکٹر تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا اور افسر نہایت سنجیدگی سے،

"یہ پہلا اتفاق ہے کہ میں نے کسی دواخانہ میں عورت کو کام کرتے دیکھا" ڈاکٹر نے ہمت کرکے

خاموشی کو توڑا۔

"اس میں ہرج ہی کون سا ہے" دوا فروش کی بیوی نے بغیر اپنی نظر اُٹھائے جواب دیا "میرے شوہر کا کوئی مددگار نہیں، اور میں ہمیشہ اُس کا ہاتھ بٹاتی ہوں"

"آپ کی دوکان کیسی مختصر اور سجی ہوئی ہے! مختلف رنگ کی بوتلیں .... ڈبے، فرنیچر .... اور ہاں، کیوں آپ کو اِن زہریلی چیزوں کے درمیان نقل و حرکت کرنے سے خوف نہیں لگتا؟"

دوا فروش کی بیوی نے کوئی جواب نہ دیا اور با اطمینان دوا کے پیکیٹ کو بند کیا، مُہر لگائی، اور ڈاکٹر کے حوالہ کیا، آبٹیوسو نے قیمت ادا کی۔

آدھ منٹ خاموشی رہی ...... دونوں ایک دوسرے کو دیکھا کیے، دروازہ کی طرف بڑھے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے،

"اچھا! دو آنہ کا سوڈا بھی دیدیجیے" ڈاکٹر نے بالآخر کہا۔

اور پھر دوا فروش کی بیوی کے ہاتھ الماری کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے، بوتل اُٹھا کر اُس نے دوا تولنا شروع کی۔

"کیوں صاحب، آپ کی دوکان میں کوئی ..... ایسی دوا ....." آبٹیوسو نے اپنی انگلیاں پھیلا کر رُکتے ہوئے کہا "کوئی .... ایسی چیز .... یعنی .... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی .... مقوی .... ؟"

"ہے، کیوں نہیں" دوا فروش کی بیوی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"خوب! آپ عورت نہیں فرشتہ ہیں، چار آنے کی کوئی مقوی دوا دیدیجیے"

دوا فروش کی بیوی نے خاموشی کے ساتھ سوڈے کا پیکیٹ بنایا، مُہر لگائی اور ڈاکٹر کو بیچ دیا، پھر وہ دروازہ سے نکل کر گھر کے اندر چلی گئی۔

"فرشتہ! ..... دیوی نہیں کہتے خوب خوب، ..... اوہ کیا" ایکبار پیچھے سے کوئی سنو، سنو، یہ خراٹے، اُس کا شوہر بالکل غافل ہے، میٹھی نیند سو رہا ہے"

ایک منٹ کے بعد دوا فروش کی بیوی واپس آئی اور ایک شیشی لا کر میز پر رکھدی، وہ ابھی ابھی دوا کی کوٹھری سے نکلی تھی اس لیے ہانپ رہی تھی کسی قدر لمبا سا اور میں اسے پڑھنا " اور رنج۔

"آہستہ آہستہ" آبٹیوسو بولا "اتنے زور سے بات مت کیجیے آپ کے شوہر کی آنکھ کھل جائے"

"اس میں ہرج ہی کون سا ہے" دوا فروش کی بیوی نے پھر اپنے طمانیت خیز لہجہ میں کہا۔

دوائیں خرید کر دونوں خریدار اُس سے رخصت ہونے لگے' دوا فروش کی بیوی نے اُن سے ہاتھ ملا کر ایک بھولے انداز میں کہا۔

"آپ لوگ کبھی کبھی اس طرف آنکلا کیجیے' میں تنہائی میں کسی قدر پریشان ہوتی ہوں.... ہماری دوکان بھی تو بستی سے باہر واقع ہوئی ہے" اُس کا دل اب پھر اُسی خوفناک رفتار کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ کیوں؟ یہ اُسے بھی نہ معلوم تھا۔

"ضرور آئیں گے' ضرور آتے رہیں گے" ڈاکٹر نے اپنے ساتھی کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا

"شکریہ" دوا فروش کی بیوی بولی۔

"آپ کا شوہر خواب میں آپ کو دیکھ رہا ہوگا ...." آبیٹوسو نے چلتے چلتے ادا کیا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں!" دوا فروش کی بیوی نے کہا

"کیسی باتیں!" آبیٹوسو نے دوہرایا "خوب! شکسپیر تک نے لکھا ہے' وہ خوش نصیب ہے جو اپنی جوانی میں جوان رہے' اب کہیے"

"میرا ہاتھ چھوڑ دیجیے" دوا فروش کی بیوی نے ہٹ کر کہا۔

آخر دونوں رخصت ہوئے مگر مُڑ مُڑ کر دیکھتے جاتے تھے' جیسے وہ کوئی چیز بھول گئے ہوں۔ دوا فروش کی بیوی فوراً اپنے کمرہ میں آئی' اور پھر کھڑکی سے لگ کر اُسی پریشانی' اُسی نامعلوم گھبراہٹ کا شکار بن گئی۔ اُس نے دونوں خریداروں کو دوکان سے نکل کر کوئی بیس قدم جاتے ہوئے دیکھا' چلتے چلتے وہ رُک گئے اور آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے ..... وہ کیا باتیں کر رہے تھے؟ اُس کا جی بیٹھا جاتا تھا' سر میں درد ہو رہا تھا .... آخر وہ کیا باتیں کر رہے تھے؟ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا' .... آخر وہ کیا باتیں کر رہے تھے؟ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دونوں اُس کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں'!

پانچ منٹ بعد ڈاکٹر آبیٹوسو سے علیٰحدہ ہو گیا اور ایک گلی میں چلا گیا' آبیٹوسو دوکان کی طرف پھر بڑھا .... اب وہ اُس کی دیوار کے نیچے تھا' دو قدم بڑھا' پھر پیچھے ہٹ گیا' آخرکار گھنٹی بجی۔

"کون ہے؟ .... کیا ہے؟" یکایک دوا فروش کے کرخت اور غیر دلچسپ لہجہ کی آواز دوا فروش کی بیوی کے کانوں میں گونجی "گھنٹی بج رہی ہے' کوئی خریدار آیا ہے اور تم یوں ہی بیٹھی ہو؟ کیوں؟ اسی طرح کام چلے گا؟" دوا فروش کا غصہ ہر جملہ کے ساتھ بڑھتا جاتا تھا۔

"کون ہے؟ .... کیا ہے؟" دوا فروش نے دوکان کا دروازہ کھول کر پوچھا۔
"مجھے .... مجھے ...." آبیٹو سو گھبرا گیا "وہ .... چار آنہ کی وہ .... پپرمنٹ کی ٹکیاں عنایت کیجیے"۔
نیم خوابی کے عالم میں آنکھیں ملتے ہوئے، جمائی لیکر دوا فروش نے الماری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
دو منٹ بعد دوا فروش کی بیوی نے آبیٹوسو کو دوکان سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ کچھ قدم چل کر اُس نے پپرمنٹ کے پیکٹ کو زمین پر پھینک دیا۔ گلی سے اُس کا ساتھی آکر اُس سے مل گیا، اور ایک دوسرے سے نگاہوں میں باتیں کرتے ہوئے کہرے کے ہلکے غبار میں دونوں غائب ہو گئے۔
"میری طبیعت بہت اُلجھ رہی ہے!" دوا فروش کی بیوی نے اپنے شوہر کو خفگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "ارے میری طبیعت بہت اُلجھ رہی ہے!"　　اُس نے دوہرایا اور اُسکی آنکھیں نم آلود ہو گئیں "کیا کسی کو میری حالت .... کیا کوئی مجھ پر رحم .... ؟"
"میز پر چار آنے پیسے بھول آیا ہوں، اُٹھا لینا" کپڑے بدلتے ہوئے دوا فروش نے اپنی بیوی سے کہا،

یہ کہا اور بستر پر دراز ہو کر پھر سو گیا،

جلیل احمد قدوائی (علیگ)

حواس اُڑتے ہیں ایک اک سانس میں وہ ساز و ساماں ہے　　کہ دلجمعی ہمارے واسطے خواب پریشاں ہے
کسی آفت کا ڈر کیا زندگی سے جبکہ منہ موڑا　　محبت کی ہو مشکل جو کوئی وہ مجکو آساں ہے
یہ انا لن ترانی کہ کے سب کچھ کہہ گیا کوئی　　ابھی تک جو کہ اصل مدعا ہے وہ تو پنہاں ہے
خوشا قسمت اجل کا لطف اُٹھایا جیتے جی میں نے　　فراقِ دوست میں جو سانس ہو وہ آفتِ جاں ہے
نظر کی حسن کے ہنگاموں پر جب دل لپکا، اُٹھا　　قیامت جسکو کہتے ہیں ترا کارِ نمایاں ہے
اُٹھا لوں لذتِ آفاتِ الفت اے اجل تھم جا　　بہت خوش ہوں کہ پیسے گھر میں مہماں شام ہجراں ہے
ملالِ عشق میں ٹپکے جو آنسو بن گئے تارے　　نظر پڑتی ہے دنیا کی مراد اماں وہ داماں ہے
حقیقت خلفشِ دل کی کہوں کیا ہمنفس تجھ سے　　لہو کے ایک اک قطرہ میں ایک اک درد پنہاں ہے

تعلق نجد کو وحشتِ فنا سے کچھ نہیں مخشر
وہ مجنوں کا بیاباں اور یہ میرا بیاباں ہے۔

مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی

ختنہ تاریخ کی گریزاں روشنی میں

تاریخ کی نظر جہاں تک کام کرتی ہے، اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ختنہ کا آغاز کب سے ہوا، اور کس ملک نے سب سے پہلے اس کی ابتدا کی۔ لیکن تاریخی عہد جب سے شروع ہوتا ہے اُس وقت سے ہر زمانہ میں اور ایک دوسری سے بیخبر ہر قوم میں اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ کہیں فاتح مفتوح کے ختنے کرتا ہے، کہیں بے شمار ختنوں کا ہار بہادری کا تمغہ سمجھا جاتا ہے، اور کہیں مختونیت کو خدائی حکم تصور کیا جاتا ہے۔

توراۃ کا بیان ہے کہ اس کا آغاز سب سے پہلے حضرت ابراہیم نے کیا۔ چنانچہ ایک یوروپین مورخ ہارڈیک اسی بنا پر یہودیوں کے ذریعہ مصر میں اس کا رواج کرتا ہے۔ لیکن تاریخ اُسکے اس بیان کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ وہ کہتی ہے کہ مصر میں اس کا رواج بہت قدیم زمانہ سے تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں کھڈنگ کے ایک مجسمہ کے حالات لکھے ہیں، جس میں ایک لڑکے کے ختنوں کا منظر دکھایا گیا ہے۔ یہ مجسمہ بادشاہ یرامی سس کے بیٹے کا ہے۔ خود توراۃ کے الفاظ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ختنہ کا اُس زمانہ میں عام رواج تھا۔ کیونکہ اس میں صرف یہ حکم دیا گیا ہے' یہ نہیں بتایا گیا کہ ختنہ کیا چیز ہے اور کس طرح کیا جائے۔ اس سے صاف طور پر یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم پہلے سے جانتے تھے کہ ختنہ کسے کہتے ہیں۔ مصر قدیم کی رسوم کا مصنف کن سن لکھتا ہے کہ مصر میں ختنہ کا رواج ۱۸۹۶ قبل مسیح سے بھی پہلے عام ہو چکا تھا" اور مصری کتبات بھی اسکی شہادت دیتے ہیں۔ اسکے قریب قریب ہیروڈوٹس کے شارح رائی سن اور ایک ماہر اثریات سربان کی تحقیقات ہیں۔

بعض مورخ اس زمانہ کی معلوم دنیا کی اور قوموں میں بھی اس کا رواج پاتے ہیں۔ چین میں بھی قدیم الایام سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ فینقیہ والے بھی اسکے عادی نظر آتے ہیں، اور جب کلمبس امریکہ جاتا ہے تو میکسیکو وغیرہ میں عام طور پر لوگوں کو مختون دیکھتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ہمارے ہاں یہ رسم بہت قدیم سے جاری ہے۔ ہندوستان میں بھی ایک خاص گروہ میں ختنہ کا رواج تھا۔ بحر جنوبی کے بعض جزائر میں پوری پوری بستیاں مختون ہوتی تھیں۔ اور اگرچہ اُس زمانہ میں ایسی آسانیاں نہ تھیں جیسی اب پیدا ہو گئی ہیں، یعنی اُس زمانہ میں پتھر کے چاقو اور لوہے کے ٹکڑوں سے ختنہ کیا جاتا تھا، تاہم وہ لوگ خوشی خوشی بچپن یا جوانی میں اس فرض سے سبکدوش ہوتا

ضروری سمجھتے تھے۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رسم سادتھ سی کے جزیروں، جنوبی امریکہ کی بعض قوموں، وسط امریکہ کی اقوام، ساحل ایمزان کی بستیوں، اسٹریلین قبائل، کیلی ڈونیا، میلن رہشیا، پاہن رہشیا، ہوزس، ہوبرٹی ڈس، اور ہائن کاٹ وغیرہ میں نہایت قدیم زمانے سے اب تک پائی جاتی ہے۔
بعض جگہ یہ رسم صرف سرداروں اور معززوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ چنانچہ مون ہاٹ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ پاہن رہشیا میں صرف سردار ختنے کراتے تھے۔

بعض مورخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس رسم کے ادا کرنے پر بڑے جشن منائے جاتے تھے۔ کےلیس کا بیان ہے کہ بسوٹو کی قوم میں ختنہ نہایت عجیب و غریب طریقہ پر کیے جاتے تھے۔ ہر سال چند مقررہ تاریخوں پر ساری قوم کے نوجوان جمع کیے جاتے تھے، اور آبادی سے دور ایک مقام پر جہاں ان کے رہنے سہنے کا انتظام کیا جاتا تھا، یہ رسم ادا کی جاتی۔ ختنہ کے بعد یہ لوگ سات سات آٹھ آٹھ مہینے تک یہیں رہتے تھے۔ اس عرصہ میں ان کو فنون جنگ کی تعلیم دی جاتی تھی، اور بچپن کا نام تبدیل کر کے ایک دوسرا نام رکھا جاتا تھا۔ یہ نام پاکی اور بہادری کا خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے تھے۔ اسٹریلیا میں بھی اس رسم کو بہت معزز سمجھا جاتا تھا۔ ختنہ کے زمانہ میں جنگ وجدل بند کردی جاتی، اور بڑے اہتمام سے اس کام کو انجام دیا جاتا تھا۔ ملایا اور بورنیو میں بھی یہ رسم بہت دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ جنوبی افریقہ کی ایک قوم کوانا اور مڈگاسکر کی ایک قوم ہواس بھی اس رسم کو تیوہار کی طرح سمجھتی، اور رقص وسرود کے جلسوں کے ساتھ ادا کرتی ہے۔
ان واقعات کے ہوتے کوئی وجہ نہیں کہ توراۃ کے ایک مشتبہ بیان پر حضرت ابراہیم کو اس ارتقائی فعل کا موجد تسلیم کیا جائے۔ البتہ انھیں یہ فضیلت ضرور دی جاسکتی ہے کہ وہ سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے اس کو مذہبی حیثیت سے اختیار کرکے رواج دیا اور شریعت کے رنگ میں فرضیت مرتسم کر دی۔ اسی غرض سے خود انھوں نے ۹۹ برس کی عمر میں ختنے کیے، اور اپنے خاندان کے ایک متنفس کو بھی غیر مختون نہ چھوڑا۔

یہودی کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف بنی اسرائیل کے لیے تھا، تاکہ ان میں اور دوسری قوموں میں امتیاز رہے، لیکن نہ تو تاریخ اس کی تائید کرتی ہے اور نہ خود اُن کا عمل اس کا مؤید ہے۔ جو لوگ یہودی مذہب اختیار کرتے تھے اُن کے ختنے تو شرعاً کیے ہی جاتے تھے، لیکن اس سے نہ غلام بچتے تھے نہ قیدی، بلکہ وہ لوگ بھی جو یہودی رعایا بنتے مختون کر دیے جاتے تھے۔ اور یہ کام بڑی دھوم دھام سے انجام

دیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر شخص ختنے کرنا سکیتا تھا، تاکہ وقت بے وقت خود یہ کام کرسکے۔ ان میں یہ مذہبی روایت چلی آتی تھی کہ ختنے کرنے والے کو کیڑے نہیں کھائیں گے۔

عیسائیوں میں اگرچہ اس کے متعلق کوئی خاص حکم نہیں ہے، لیکن پال نے صرف یہودیوں سے عداوت میں اس کی ممانعت کردی، اور گلیشت والوں کو لکھا کہ اگر انھوں نے ختنے کرائے تو انھیں مسیحؑ سے کسی شفاعت کی امید نہیں رکھنا چاہیے۔ حالانکہ پطرس اور جمیس کے سامنے پال کو علانیہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا، اور اُس نے اپنے ہاتھ سے اپنے ایک پیرو کا ختنہ کیا۔ تاہم اسکے بعد بھی وہ عملاً مخالفت ہی کی تعلیم دیتا رہا۔ لیکن جن ملکوں میں پال کی تعلیمات کا اثر نہیں پھیلا ہے، وہاں عیسائی بھی ایک مدت دراز سے ختنے کراتے ہیں، خصوصاً حبش کے عیسائیوں میں اس کا بہت رواج رہا ہے۔

اسلام جو اپنی اصولی تعلیمات میں اپنے اولین موسس — حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کا داعی ہے، ابتدا سے اس کو فریضۂ مذہبی سمجھتا ہے، رسول اللہؐ نے اس کو اسلام کی فطرت فرمایا ہے، اور مسلمان ہونے کے ساتھ مختون ہونا بھی ضروری قرار دیا ہے۔ گو مسلمانوں میں بعض ایسے فرقے بھی ہیں جو ختنہ نہیں کراتے، لیکن وہ اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے کسی شمار میں نہیں ہیں، اس لیے اسلام کے لیے اس کا وجود و عدم یکساں ہے۔

"ناظر"

نہ کیونکر تیری پیدائش سے ہوں خوبرو پیدا
وہی پیدا ہے تجھ سے۔ اے صنم جس سے ہے تو پیدا

نہیں ملتا ہے وہ دیر و حرم میں سر جھکانے سے
وہی پاتا ہے جو کرتا ہے دل میں جستجو پیدا

پتا دلبر کا میرے۔ اس زمانے میں نہ کچھ پوچھو
وہی ہے۔ قبلۂ عالم! ہوا جو قبلہ رُو پیدا

پڑا سایہ نہیں اُس پر اگر اُس لعبت خنداں کا
ہوئی۔ اے بلبلو! گل میں کہاں سے رنگ و بو پیدا

طلسم قدرتِ خالق کا عالم اک تماشا ہے
کہ مُشتِ خاک سے ہوتے ہیں کیا کیا ماہرو پیدا

کیا ہے قتل ظالم نے۔ مگر دستِ حنائی سے
کہ خونِ شوق میں ہے۔ سونگھو مہندی کی بو پیدا

سبین الظفر شوق (وکیل)

جناب عزیز کی ایک غزل

یہ میری اہم ترین جسارت ہوگی اگر میں لسان الہند جناب عزیز صاحب کے کلام پر قلم اُٹھانے کی جرأت کروں لیکن شاید میری معذرت بارگاہ مقبولیت میں باریاب ہو جائے اگر میں اس قدر عرض کردوں کہ میں نے ان چند سطور میں محض حق جوئی اور حق نمائی سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ عزیز صاحب کا پایہ اس سے کہیں بلند ہے کہ مجھ ایسے احقر الرائے کے الفاظ اُنکی پا بوسی کر سکیں یا ذرا سا بھی نقصان پہونچا سکیں اور نہ میرا یہ مقصد ہو سکتا ہے۔ میں محض اس قدر چاہتا ہوں کہ اشعار پر ایسی نظر ڈالوں کہ کچھ مجھے حاصل ہو جائے اور میں دیکھ لوں کہ آیا میرے خیالات درست ہیں۔ اس غرض کے لیے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انکے تازہ ترین دماغی مظاہرہ پر اجمالی نگاہ دوڑائی جائے۔ اس لیے کہ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسی غزل انکے کمال مشق کی دستار زیب فرق کیے ہوگی۔ ہمیں اس سے قطعی بحث نہیں کہ اُن کا مذاق شاعری کیا اور کیسا ہے۔ ہم صرف اپنے خیالات کو بندش، تراکیب، اور صرفِ محاورہ کے دائرہ ہی میں محدود رکھیں گے۔

لکھنؤ کے ایک حال کے مشاعرہ کی غزل جس کا تعلق انجمن معین الادب سے تھا ہمدم میں شایع ہوئی ہے مطلع ہدیۂ ناظرین ہے:

شب آخر ہم بھی آخر دیکھیے کبتک وہ آتے ہیں — بصارت گھٹتی جاتی ہے چراغ اب بجھتے جاتے ہیں

نزاکت غزل کو خیال میں رکھتے ہوئے مطلع کا پہلا ٹکڑا "شب آخر ہم بھی آخر" کس قدر گرانبار ہے۔ عزیز صاحب کی غایت تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ شب آخر ہے اور ہم بھی آخر ہیں یعنی قریب ختم ہیں اب نہ معلوم وہ کب آئیں گے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ آیا وہ غایت پوری بھی ہوتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ "شب آخر ہم بھی آخر" کا ٹکڑا نامکمل ہے اور مصرعہ کی کوتاہیٔ قسمت کی وجہ سے اس طرح قطع کر دیا گیا ہے کہ ثقیل اور مکروہ ہو گیا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "ہے" اور "ہیں" کی لفظیں شامل کر دی جائیں۔ ورنہ "آخر" اس طرح "دیکھیے" کی دُم میں لگا ہوا ہے کہ پڑھنے والا معًا "آخر دیکھیے" پڑھے گا اور گمراہ ہو جائے گا۔ جس کی اُمید ایک ہادیٔ زبان سے نہیں کی جا سکتی۔

اس مطلع کے دوسرے مصرعہ میں لف ونشر غیر مرتب سے کام لیا گیا ہے۔ اور پہلے مصرعہ کے پہلے جزو کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ اپنے ختم ہونے کا ثبوت یہ بتایا گیا ہے کہ "بصارت گھٹتی جاتی ہے" جو بالکل خلاف واقعہ ہے۔ بصارت کا گھٹنا ہرگز اسکی دلیل نہیں کہ موت کے دن نزدیک ہیں، یا آخر وقت قریب ہے۔ بصارت موت سے پچاس سال پہلے بھی "گھٹتی جاتی" نہیں بلکہ ختم ہوسکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ موت کا ہاتھ اس نابینا تک زوالِ بصارت کے بعد ہی پہونچ جائے۔ زوال بصارت موت کا نتیجہ ہے لیکن نہ تو موت زوال بصارت کا نتیجہ ہے اور نہ ضعف بینائی موت کی علامت۔ عزیز صاحب کے کلیہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس شخص کی بصارت گھٹ جائے یا گھٹنے لگے وہ موصوف کے خیال کے مطابق قریب المرگ ہے۔ اس نظریہ کے مطابق لاکھوں فی الواقعی زندہ حضرات مردہ ہوگئے اور کروڑوں لبِ گور۔ حالانکہ قوائے ظاہری یہ بتا رہے ہیں کہ وہ ابھی برسوں جئیں گے۔ اور نہ یہی کسی طرح ثابت ہے کہ جب آدمی مرنے لگتا ہے تو اسکی بصارت کم ہوجاتی ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ آنکھوں میں اندھیرا ضرور چھا جاتا ہے، لیکن بصارت کا کم ہونا اور آنکھوں پر تاریکی کا چھا جانا دو مختلف باتیں ہیں اور پہلے فقرہ کو موت کی علامات سے کوئی تعلق نہیں۔ برخلاف اسکے پتلیوں کا پھر جانا یا الٹ جانا، تشنج، نبضوں کا ڈوبنا وغیرہ وغیرہ موت کے لیے ضروری ہیں۔

عزیز صاحب کے ثبوت کے دوسرے ٹکڑے میں بھی ایک حد تک یہی عیب موجود ہے لیکن اسقدر نمایاں طور سے نہیں۔ اس لیے کہ چراغ کا تیل عموماً قریبِ صبح ختم ہوجاتا ہے اور چراغ بجھنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ جب ہی ہوا چلے تب ہی چراغ بجھ سکتے ہیں۔ یعنی صبح کی علامتوں میں سے چراغ کا بجھنا کوئی یقینی علامت نہیں۔ قطع نظر اسکے ایک بات اور نمایاں طور سے ظاہر ہے وہ یہ کہ مصرعہ کی ترکیب اس امر کی مقتضی ہے کہ جملہ یوں ہو "بصارت گھٹتی جاتی ہے اور چراغ بجھتے جاتے ہیں"۔ اس حساب سے "اب" کی لفظ بیکار رہے اور ممکن ہے غلط اور لغو بھی ہو۔

اس غزل کا دوسرا شعر وہ معرکۃ الآرا شعر ہے جسے حضرات لکھنؤ نے مشاعرہ میں بہت پسند کیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے

اٹھیں گی وہ حیا پرور نگاہیں کیا مری جانب ۔ مقابل ہے ابھی آئینہ اور شرماے جاتے ہیں

ہم بھی عزیز صاحب کے اس شعر کی مخلصانہ داد دیتے ہیں۔ عوام الناس میں مقبول ہوجانے

کے بعد ہمارا قلم کچھ لکھتے ہوئے کانپتا ہے لیکن ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ لفظ "کیا" "اٹھیں گی"
سے اس قدر دور ہو گیا ہے کہ جملہ کو استفہامیہ بنائے دیتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "وہ" یا کسی ایسی ہی
لفظ کا استعمال ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے عوام میں رائج ہو لیکن اساتذہ کے یہاں مقبول ہونا
باعث حیرت ہے۔ اس لیے کہ پہلے مصرعہ کا فاعل "نگاہیں" ہے اور دوسرے مصرعہ میں "وہ" فاعل
ہے۔ اسی لیے اسکے اظہار کی قطعی ضرورت ہے۔ تاہم اس طرح کے تمام اعتراضات شعر کی خوبیوں کو
جائز مقبولیت سے نہیں روک سکتے۔

تیسرے شعر کے متعلق ہم کسی طرح یقین نہیں کر سکتے کہ لسان الہند کے قلم معجز رقم کی گلکاری ہے
غالباً کاتب کی اصلاح ہوگی۔ فرماتے ہیں

شب غم منحصر گریہ پہ ہے اختر شماری بھی   جب آنسو ضبط کرتا ہوں ستارے ڈوب جاتے ہیں

دوسرا مصرعہ صریحاً غلط ہے۔ زبان اردو تو یوں بولے گی کہ "جب میں آنسو ضبط کرتا ہوں
ستارے ڈوب جاتے ہیں"۔ بہرتقدیر خواہ عزیز صاحب نے یوں ہی نظم کیا ہو یا یہ اصلاح کاتب
کی جدت طبع کا نتیجہ ہو شعر کا مطلب سمجھنے میں ہمیں اہم ترین دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ شعر
میں سوائے ظاہری اوصاف شاعری کی نمایش مثلاً بندش، روایت و شوکت الفاظ وغیرہ کے
بالکل صفر ہے۔ موجودہ خوبیاں بھی اس وجہ سے کالعدم ہیں کہ شعر کا مطلب ہی غائب ہے۔ شعر محض
الفاظ کی اینٹوں اور تنظیم کے گارے کی یکجائی کا نام نہیں، بلکہ شعر وہ عمارت ہے جو اس مجمع مصالحہ
کا ایک حسین ترین نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ عزیز صاحب کا یہ شعر عمارت کے درجہ تک
نہیں پہونچتا۔ کم از کم ہماری سمجھ اس شعر کا مطلب سمجھنے سے بالکل قاصر ہے۔ ممکن کیا بلکہ یقیناً یہ ہماری
سمجھ کا قصور ہے۔ ہم ہیزم کوشش صرف کر کے یہ ضرور مطلب نکال سکتے ہیں کہ آپ اختر شماری سے
قطرہ ہائے اشک کا گننا مراد لیتے ہیں لیکن اگر یہی مطلب ہے تو شعر کا لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ ظاہر
ہے کہ جب گریہ کریں گے تب ہی آنسو نکلیں گے ورنہ پھر پیاز اور چاقو لے کر بیٹھا جائے اور اس طرح
آنسو نکالے جائیں۔ مگر غالباً عزیز صاحب کا یہ مطلب نہیں۔ انھوں نے فی الواقعی اختر بمعنی کوکب
نظم کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو شعر خلاف واقعہ ہے۔ کسی کے آنسوؤں کے ضبط کرنے سے ستارے نہیں
ڈوب سکتے۔ چاہے کوئی شخص گھنٹوں آنکھیں بند کیے اور دل مسوسے بیٹھا رہے۔ آسمان کے چپکتے

والے اسی طرح جگمگایا کریں گے۔ اسکے لکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ شعر خلاف واقعہ نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عزیز صاحب لفظی مناسبت کی زنجیر میں پھنس کر ایسے پابند ہو گئے کہ معنویت کو کھو بیٹھے۔ کیا اسکے علاوہ کوئی اور بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ صرف ستاروں اور اشک کے قطروں کی مشابہت نے شعر کو مہمل کر دیا ہے۔

غبار اُٹھتا ہے بھر دیتے جوش بندگی اتنا   زمیں گردوں کو ٹھکراتی ہے جب ہم سر جھکاتے ہیں

ہم عزیز صاحب کے طرز عبودیت اور شان بندگی کے معترف ہیں لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ شعر کس طرح نظم کیا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ کے ثبوت میں پہلا مصرعہ یوں ہے کہ "ہم جوش بندگی اتنا بھر دیتے ہیں کہ غبار اُٹھتا ہے" قلم بجائے "غبار اُٹھتا ہے" کے "غبار اُٹھنے لگتا ہے" لکھنے جا رہا تھا لیکن ہمیں محض مصرعہ کی نثر کرنی منظور تھی اس لیے قلم کو روک لیا (کیا میرا قلم غلط لکھنے جا رہا تھا؟) ہم اس موقع سے نہایت ادب کے ساتھ گریز کریں گے اور اپنی کم مائگی کا اعتراف کر جائیں گے لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا "جوش بندگی" عزیز صاحب کس برتن یا کس شے میں بھر دیتے ہیں۔ کیا کسی ایسی چیز کا حوالہ عزیز صاحب نے دیا ہے؟ اور کیا بغیر ایسے حوالہ کے شعر نامکمل نہیں؟ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ آپ کس چیز میں جوش بندگی بھر دیتے ہیں تو ہم آگے چل کر پتہ لگاتے کہ آیا اس عمل سے غبار اُٹھ سکتا ہے یا نہیں۔ اور پھر اتنا غبار کہ آسمان کو ٹھکرا دے۔ گو ہم کم بضاعتی کی وجہ سے جواہرات عزیز پر لکھنے سے قاصر ہیں تاہم ہمیں کوشش بلیغ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ زمین میں جوش بندگی بھر دیتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ یا کوئی ایسا کر بھی سکتا ہے کہ زمین ایسی ایک چیز میں جوش بھر دے۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ مجازاً ایسا لکھا گیا ہے تو پھر یہ ثابت کرنا محال ہے کہ کسی کے سر جھکانے سے (جو عزیز صاحب کے خیال کے مطابق جوش بندگی بھرنے کا ذریعہ ہے) اس قدر غبار کبھی اُٹھا بھی ہے یا اُٹھ بھی سکتا ہے؟ اس قدر کیا معنی کسی قدر بھی اُٹھ سکتا ہے؟ آپ کا سجدہ نہ ہوا ٹھوکر ہو گئی۔ اور پھر سجدہ کہاں محض سر کو جھکاتے ہی تو ہیں۔ عزیز صاحب کا یہ بھی خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح غبار کا ایک ستون جو زمین سے آسمان تک اُٹھا ہوا ہو گا وہی زمین کا پاؤں ہو گا۔ کیا ان تمام باتوں کا خیال شعر کو مضحکہ آمیز نہیں بنا دیتا اور کیا یہ شعر مہمل (؟) اور خلاف شان لسان الہند نہیں تاہم ہم اس سے منکر نہیں ہو سکتے کہ عزیز صاحب نے اس شعر میں جوش کا دریا بہانے کی بے انتہا کوشش کی ہے۔

بتا گورِ غریباں تجھ پہ کس نے قدم رکھا نشاں تربت کے سطح خاک سے کیوں اُبھر آتے ہیں

عزیز صاحب کے طرز شاعری کا ایک نہایت مکمل نمونہ ہے - ہم اسکی داد دینے سے قاصر ہیں
عزیز صاحب نے اسی مضمون کو کئی جگہ پر نظم کیا ہے اور ہر جگہ اسی قدر کامیابی ہے جس قدر موصوف سے امید کی جا سکتی ہے

مری ہستی ذرا دکھلا اُنھیں آئین خودداری مجھے بھی دیکھنا ہے تجھکو وہ کیونکر مٹاتے ہیں

عزیز صاحب نے یہ شعر بہت ہی جھنجلا کے کہا ہے - ہمیں اُنکے عارضی خیال پر اعتراض کی ضرورت نہیں لیکن ایک معشوق کی ہمہ گیر شاہنشاہی کی خدمت میں ایسے خیالات گستاخانہ اور باغیانہ ہیں. خودداری کا صرف نہایت موزوں ہے -

سمجھتا ہے دلِ بیتاب یہ بجلی چمکتی ہے وہ رہ رہ کر حریم ناز کا پردہ اُٹھاتے ہیں

(قربان اس نادانی کے) درست ہے کہ معشوق کی شوخیوں سے یہ بالکل بعید نہیں کہ وہ رہ رہ کر حریم ناز کا پردہ اُٹھائے اور نہ دل عاشق سے یہ بعید ہے کہ وہ بجلی چمکتی ہوئی دیکھے. مگر دل کے ساتھ بیتاب کی لفظ بیکار استعمال کی گئی ہے - یہ بیتابی کی وجہ سے نہیں ہے کہ دل بجلی کی چمک دیکھتا ہے یہ خود کرشمۂ برق حسن ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی دل سمجھنے میں دھوکا کھا سکتا ہے لیکن بیتابی کو اس سے کوئی تعلق نہیں - یہ لفظ غالباً محض بجلی کی مناسبت کی وجہ سے ٹھونس دی گئی ہے - یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ "یہ" کی لفظ کس قدر بُری جگہ پر رکھی گئی ہے اسے "سمجھتا ہے" کے ساتھ ہونا چاہیے یعنی" دل بیتاب یہ سمجھتا ہے" یہ ضرور ہے کہ اس قدر شاعری میں جائز ہے مگر یہاں خاص موقع ہے "یہ" کے بعد ہی "بجلی" کی لفظ موجود ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اشارہ بجلی کی طرف ہے - اور اگر "یہ" "بجلی" ہی کے پیشتر ہونا چاہیے اور یوں ہی عمداً نظم کیا گیا ہے تو عزیز صاحب کے سے بلندپایہ اور مسلم الثبوت اُستاد کی شان سے کس قدر گرا ہوا ہے. کوئی نومشق لکھتا تو دوسری بات تھی.

پریشاں دل کے ذرّے ہیں ذرا انکو بہم کر لیں دیارِ عشق تجھ میں ہم بھی اک کعبہ بناتے ہیں

خوب شعر ہے - مگر دوسرے مصرعہ میں "تو" یا "تو پھر" یا کسی ایسی ہی یا بہتر لفظ کی نہایت ضرورت ہے شعر کے حسن میں داغ لگ رہا ہے.

دلِ ویراں کو دیکھو آسمانِ حسن کے تارو — بتاؤ کس طرح اُجڑی ہوئی بستی بساتے ہیں

خوب نظم کیا ہے مگر معشوق سے تخاطب کے لیے جو الفاظ چُنے گئے ہیں وہ کچھ ناموزوں سے ہیں اس طرزِ تخاطب کی اور تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی بجز اسکے کہ تارے آسمان پر ایک بستی بسائے ہوئے ہیں اور ایک خانماں برباد آبادیستی کو دیکھ کر اُسی سے طریقۂ آبادی دریافت کر رہا ہے۔ اب رہا یہ کہ "آسمانِ حسن کے تارو" جسکے معنی سوائے "حسینوں" کے اور کچھ نہیں ہو سکتے ذرا نازک سا ہے اور قبولیت قدرے مشکل امر ہے۔ حسینوں کے پکارنے میں جو علت مخفی ہو سکتی ہے وہ محض یہ کہ انھیں کی برباد کی ہوئی بستی اُنھیں کے آباد کرنے سے بس سکتی ہے۔ اگر اسی لیے حسینوں کو پکارا جا رہا ہے تو وہ الفاظ بیکار رہیں۔ غالباً عزیز صاحب نے ادھر عجلت میں خیال نہیں فرمایا ورنہ قلم کی معمولی رفتار میں قبولیت کی راہ کا یہ روڑا دور ہو جاتا۔

تمھاری حسرتِ تعمیر پر اے خاک کے پتلو — شکستہ مرقد اب تک مقبروں میں مسکراتے ہیں

نہایت ہی عمدہ اور لاجواب شعر ہے اور واقعی تعریف سے مستغنی ہے۔ ہمیں اسی آئینہ کی جھلک ایک مرتبہ اور عزیز صاحب کے قابل ناز اُستاد یعنی مولانا صفی کے ایک شعر میں مل چکی ہے جسے ہم انصاف کے خون میں ہاتھ بھرنے سے احتراز کرتے ہوئے آپ کے تفنن طبع کے لیے ضرور لکھیں گے

صفی ٹوٹی ہوئی ہر قبر یہ ہنس ہنس کے کہتی ہے — کہ رہنا ہے قیامت تک اسی اُجڑے ہوئے گھر میں

عزیز صاحب نے مقطع خوب ارشاد فرمایا ہے اور عزیز محترم اور پھر مابعد واقعات کے تذکرہ میں جو پہلو مدنظر رکھا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ملاحظہ ہو:

عزیز محترم کو انکی محفل خوب راس آئی — نکالے جاتے ہیں روز اور وہیں پھر پائے جاتے ہیں

انرهر۔ از لکھنؤ

(بقیہ صفحہ ۶۸)

دیوان غالب کی شرح پر جو مضمون مکرمی مولوی محمد احمد بیخود موہانی بی اے کا اس دفعہ شایع کیا جا رہا ہے کئی سال ہوئے کسی اخبار میں چھپ چکا ہے اور اب بعض ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ الناظر میں شایع کرنے کی غایت یہ ہے کہ اسکے بعد بیخود صاحب کی بسیط شرح کے بعض اجزا نذر ناظرین کیے جائینگے۔ جو اس تمہید کے مطالعہ کے بعد امید ہے کہ زیادہ دلچسپی کا موجب ہوں گے

۴۔ اپریل ۱۹۲۵ء

نظرے خوش گذرے

یہ پرچہ قدرے تاخیر سے شایع کیا جا رہا ہے۔ سبب یہ ہوا کہ انعامی مضامین کا پلندہ بدایوں میں کئی ہفتے رکا رہا۔ اور ۳۱۔ مارچ کو کل ارکان مجلس انتخاب کی رائیں وصول ہونے کے بعد آخری فیصلہ ہو سکا۔

انعام کے مستحق مولوی سعید انصاری قرار پائے ہیں۔ اسی نام کے ایک سابق رفیق دار المصنفین چونکہ شہرت پا چکے ہیں اسلیے مغالطہ سے بچانے کے لیے یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان ادیب جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ کے طالب علم ہیں۔ عزیز موصوف اس کامیابی پر دلی مبارکباد قبول کریں

یہ مضمون کافی طولانی ہے اور ایک ہی دفعہ میں شایع کرنے کے خیال سے طے کرنا پڑا کہ اپریل اور مئی کا مشترکہ پرچہ نکالا جائے۔ لہذا ناظرین کرام اپریل کے پرچہ کا انتظار نہ فرمائیں۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد مولوی سید نجیب اشرف ندوی اور مولوی محمد یحیی تنہا (غازی آباد) کے مضامین بھی الناظر میں درج کیے جائیں گے کہ بعض ارکان مجلس کی رائے میں یہ بھی لائق انعام تھے۔ بقیہ مضامین صرف مجموعہ کے ساتھ شایع ہو سکیں گے۔ مضامین کے متعلق رایوں کا خلاصہ بھی آیندہ درج کیا جائیگا۔

مولوی سعید انصاری کا مضمون کتابی صورت میں چھاپا جائے گا۔ اور تیار ہونے کے بعد رقم انعام کے ساتھ اسکے پچاس نسخے پرنسپل صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی معرفت انکی خدمت میں پہونچینگے۔

حیدر آباد سے ایک صاحب نے جناب جوش ملیح آبادی کی تائید میں ایک تحریر بھیجی تھی۔ ندوۃ العلما کے سالانہ اجلاس اور انجمن اردو کے ادبی جلسہ و نمایش کی مصروفیتوں میں یہ تحریر کہیں نظر سے پوشیدہ ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ آیندہ نمبر میں تلاش کرکے شایع کی جائے گی۔

مسلسل مصروفیتوں ہی کی بنا پر باوجود قصد مصمم کے اس دفعہ بھی روداد سفر نہ مرتب ہو سکی۔ خدا کرے آیندہ اسکی بھی تلافی ہو جائے۔

انجمن اردو کا سالانہ جلسہ یکم مارچ کو ہوا۔ دستور العمل میں ضروری ترمیم کے بعد حسب ذیل انتخابات عمل میں آئے:

صدر - مولوی عبدالماجد بی اے مصنف فلسفۂ جذبات

نائبان صدر - شمس العلما مولوی کمال الدین احمد ایم اے پرنسپل جوبلی کالج - سید جالب دہلوی اڈیٹر ہمدم و نواب سید ذکی علی خاں ہاتف لکھنوی

معتمد - مرزا محمد عسکری بی اے پنشنر مترجم حکومت ہند

شرکا معتمد - سید مسعود الحسن رضوی ایم اے ایل ٹی لکچرر اردو لکھنؤ یونیورسٹی - منشی احترام علی رئیس کاکوری

ارکان مجلس انتظامی - ڈاکٹر بذل الرحمن ایم اے پروفیسر عربی و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی - مولوی عبدالقوی فانی ایم اے لکچرر فارسی لکھنؤ یونیورسٹی - مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی - منشی وشنپت رائے المعروف بہ پریم چند - سید مقبول حسین ظریف لکھنوی - خان بہادر میر سید حسین پنشنر ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ - حکیم عبدالحمید سکرٹری تکمیل الطب کالج لکھنؤ - مسٹر معین الدین بی اے بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ - ابوالکمال اُمید امیٹھوی اڈیٹر ڈسٹرکٹ گزٹ گونڈہ - شیخ ممتاز حسین جونپوری منصرم عدالت ججی لکھنؤ - ظفر الملک　　انتخابات کے بعد بعض تجاویز پیش ہو کر منظور ہوئیں جنمیں سے سب سے اہم یہ ہے کہ سال رواں میں انجمن اُردو کے لیے پانچ ہزار روپیہ فراہم کیا جائے۔

۲۱ - مارچ کو عبدالماجد صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد جناب نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی رئیس علیگڈھ نے ادبی جلسہ کا افتتاح ایک نہایت ہی دلنشیں اور پرمغز تقریر سے کیا جسکے آخر میں کارکنان انجمن کو بعض مفید مشورے دیے۔ شروانی صاحب کے بعد حضرت عزیز لکھنوی نے چند اشعار جو اسی موقع کے لیے لکھے تھے پڑھے۔ مولوی نور الحسن نیر مصنف نور اللغات نے اس بحث پر کہ "اُردو نے دوسری زبانوں میں کیا تصرفات کیے" ایک بسیط مضمون کے کچھ اجزا سنائے اور اڈیٹر الناظر نے مختصراً انجمن اُردو کے مقاصد بیان کیے۔

۲۲ - مارچ کو معتمد انجمن نے ایک تقریر کے دوران میں رائے جیشور بلی بی اے تعلقدار دریاباد و وزیر تعلیم صوبہ متحدہ سے افتتاح نمائش کی درخواست کی۔ رائے صاحب نے ایک مختصر تقریر کے بعد جملہ معزز حاضرین کے ساتھ امیر الدولہ لائبریری کی سب سے اوپر والی منزل پر جاکر نمائش کا افتتاح فرمایا۔ تھوڑی دیر سیر کے بعد رائے صاحب تشریف لیگئے اور ہال میں جناب مولانا محمد عبدالحلیم شرر اڈیٹر دلگداز کی صدارت میں ادبی جلسہ پھر منعقد ہوا۔ شرر صاحب کے خطبہ صدارت کے بعد جناب عنفی لکھنوی نے ایک نظم پڑھی جسمیں اُردو زبان کی تاریخ بیان کیگئی اور قدیم اردو شاعروں کا کلام نمونۃً شامل کرلیا گیا تھا۔ پھر سید مسعود الحسن رضوی نے اپنے طولانی مضمون کے کچھ اجزا پڑھکر سنائے جسمیں اُن اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا جو اُردو شاعری پر انگریزی تعلیمیافتہ اصحاب عام طور پر کرتے ہیں۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ اسکے بعد چند تجاویز پیش ہو کر منظور ہوئیں جنمیں لکھنؤ یونیورسٹی اور صوبجات متحدہ کی ٹکسٹ بک کمیٹی کو اُردو کی ترقی میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی۔

نمائش ۲۲ سے ۲۴ مارچ تک ۱۰ بجے صبح سے ۶ بجے شام تک کھلی رہی تاکہ شائقین کو باطمینان دیکھنے کا موقع رہے آخری دن شام کا وقت خواتین کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا۔

(بقیہ بر صفحہ ۹۶)

کھانے سے فراغت کے بعد تیسرے پہر کو مہاتما پاوا سے روانہ ہوئے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ پیچش کی تکلیف شروع ہوئی۔ انندا سے پانی مانگا اور کورکتسا ندی میں آخری غسل کیا۔ جب مرض کو طول ہوا اور تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی تو آپ نے چند ٹھٹھیرے کا شکریہ ادا کیا اور مریدوں سے ارشاد کیا کہ ایک سجاتا کی ضیافت قبول ہوئی تھی جس کی برکت سے مجھکو نور عرفان نصیب ہوا۔ اب چند کی دعوت پسند آئی جو دنیا سے نجات دلا دیگی!!

اگر یہ صحیح ہے کہ "پاوا" زمانۂ حال کا "پاواپوری" تھا تو کم سے کم دس روز میں یہ جماعت کسیا پہونچی ہوگی۔ کیونکہ پیچش کی تکلیف میں دس بارہ میل بھی روزانہ چلنا مشکل تھا۔ گمان ہوتا ہے کہ یہ پاوا کوئی دوسری بستی تھی جو کسیا سے تھوڑی ہی دور واقع تھی ورنہ جاں نثار مرید اپنے مریض استاد کو اس قدر طویل سفر جاری رکھنے نہ دیتے اور راستہ ہی میں کسی جگہ طبیعت کی یکسوئی تک قیام کرتے۔

بہرصورت جب مہاتما کوسی نگلا کے قریب پہونچے تو ضعف کی شدت سے قدم اُٹھانا محال ہوگیا تھا۔ ہرن وتی ندی کے کنارے ایک درخت کے کنارے ایک سال کے درخت کے نیچے دکھن کی طرف منہ کرکے لیٹے دیر تک انندا سے باتیں کرتے اور "سنگھ" کے برقرار رکھنے کے لیے ہدایتیں فرماتے رہے۔ کوسی نگلے کے رئیس مہاتما کی آمد سنکر سال کے باغ میں آئے اور اپنے بیوی بچوں کو عیادت اور تیمارداری کے لیے ساتھ لائے۔ انندا نے ہر ایک ٹولی الگ الگ کردی اور مہاتما سے سب کا تعارف کرایا۔ مہاتما نے اُنکو نصیحتیں کیں اور خاموش ہوگئے۔

شام ہوئی تو انندا رونے لگا۔ مہاتما نے آنکھ کھول دی۔ عزیز چیلے کو تسلی دی اور اُسکو بھی جلد "نروان" حاصل ہونے کا مژدہ سنایا۔ سب مریدوں کو انندا کی خاطرداری کی ہدایت کی۔ اسکے بعد ہلکی غشی پیدا ہوگئی۔

آدھی رات کو سوبھدرا نام ایک برہمن کوسی نگلا کا رہنے والا مہاتما کی خدمت میں چند دشوار مسائل حل کرنے کو آیا۔ تیماردار حاضری میں مزاحم ہوئے مگر مہاتما نے اُسکو اصرار سے اپنے پاس بلوایا اور اُسکی تشفی کردی۔ سوبھدرا ایمان لایا اور "سنگھ" میں داخلہ کی اجازت چاہی۔ عام طور پر بغیر چار مہینے کے امتحان ریاضت کے کوئی مرید "سنگھ" میں شامل نہیں کیا جاتا تھا مگر مہاتما کے

علم سے سو بعد از ا فوراً "سنگ" کا ممبر بنایا گیا۔

اسکے بعد مہاتما نے سب مریدوں کو وصیت کی کہ "میرا انتقال ہو جائے اور میں تمھاری نظر کے سامنے نہ رہوں تو یہ نہ سمجھنا کہ بودھ تمھارے ساتھ نہیں ہے۔ تمھاری ہدایت کے لیے میرا قانون موجود ہے اور اُس سے ہر مشکل حل ہو سکتی ہے۔" پھر انندا کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ "جو زندگی بخشتا ہے وہی بیماری اور موت کا بھی باعث ہے۔ اس تعلیم کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ اپنے دل کو حق سے بھرو اور جو تم کو بتایا گیا ہے دوسروں کو سکھاؤ۔"

یہی آخری الفاظ تھے جو زبانِ مبارک پر جاری ہوئے۔ اسکے بعد گہری بیہوشی طاری ہوئی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

اب مریدین کی جماعت میں بحث شروع ہوئی کہ مہاتما کی تجہیز و تکفین کس طرح کی جائے۔ آخرکار نعش کو نقارے بجاتے ہوئے کسیا کے پورب طرف مکٹا بندھن کے مندر میں لیگئے اور چکرورتی راجاؤں کی لاش جس ساز و سامان سے پھونکی جاتی ہے اُسی طرح ملا قوم کے رئیسوں نے گوتم کی کریا کی۔ چتا کی آگ کیوڑے اور گلاب سے بجھائی گئی اور ہڈیاں جمع کرکے کسیا کے ٹاؤن ہال تک پہونچائی گئیں جہاں برچھیوں کی جالی اور کمانوں کے حصار سے انکو محفوظ کیا گیا۔ بہت سے چھتری راجاؤں نے اس مقدس یادگار میں حصہ مانگا لیکن وہ متبرک ہڈیاں صرف راجگانِ پاوا اور کوسی نگلا کو تقسیم کی گئیں جنھوں نے عالیشان گنبد اپنے اپنے حصہ رسدی پر تعمیر کیے۔ انھیں میں کا ایک گنبد حال میں کسیا کے قریب پایا گیا اور سنگین کتبہ بھی دستیاب ہوا جس نے ثابت کر دیا کہ کسیا ہی زمانہ قدیم کا کوسی نگلا ہے۔ مگر پاوا کے متعلق ہنوز تحقیقات غیر مکمل ہے۔

برسات کا موسم آیا تو حسب دستور سابق گوتم کے سب چیلے راجگڈھ میں جمع ہوے اور راجہ مگدھ (اجاٹا سترو) کی سرپرستی میں بودھ مذہب کی پہلی کاونسل منعقد ہوئی اور کشپ اُس کا صدر انجمن ہوا۔ اُسوقت تک کوئی بدعت شروع نہ ہوئی تھی۔ لہذا کاونسل میں کوئی جدید مسائل طے نہیں ہوے۔ قانون شریعت پڑھا گیا اور حاضرین مجلس نے اُس پر عمل کرنے کا عہد کیا۔

سو برس کے بعد ویشالی کے راجہ دھرم اشوک نے دوسری کونسل طلب کی اور فرعی مسائل میں جو اختلافات پیدا ہوگئے تھے انکو کثرت رائے سے طے کرایا۔

تیسری کاونسل گوتم سے ڈھائی سو برس بعد مہاراجہ اشوک نے بمقام پٹنہ منعقد کی اور اسی مجلس نے "ترپی پاٹکا" مرتب کی جس میں گوتم بودھ کی سوانحعمری اور اُنکے اقوال و اعمال اور احکام درج تھے یہ کتابیں تھوڑے ہی عرصہ کے بعد راجہ اشوک کے لڑکے یا بھائی مہندر نے جنوبی ممالک میں پہونچائیں جہاں انکی بیحد تعظیم و تکریم کی گئی اور آج تک لنکا، سیام، اور برما وغیرہ میں یہی مجموعۂ احکام مستند مانا جاتا ہے۔

"ترپی پاٹکا" کے مطابق مہاتما کا سنہ وفات ۲۱۸ برس قبل تخت نشینی اشوک کے تھا یعنے ۴۸۲ سنہ قبل مسیح۔ اور یہی صحیح ہے۔

چوتھی کاونسل پہلی صدی عیسوی میں راجہ کنشک نے جلھندر کے مقام پر منعقد کی اور وہاں جو اصول مذہب قرار پائے وہ کشمیر، تبت اور چین پہونچے لیکن یہ احکام اور قوانین تیسری کاونسل کے نتایج سے اس قدر مختلف تھے کہ جنوبی ممالک کا قانون بنایا تا یا "چھوٹی گاڑی" مشہور ہوا اور شمالی ممالک کا مجموعہ مہایانا یا "بڑی گاڑی" کے خطاب سے سرافراز ہوا۔ "چھوٹی گاڑی" صرف اُن نفوس کو نجات کی منزل تک پہونچا سکتی تھی جو نیک اعمال کریں اور شریعت کے مطابق خواہش نفسانی پر فتح حاصل کریں لیکن "بڑی گاڑی" ہر ایک شخص کو جو بودھ مذہب میں داخل ہو منزلِ مقصود تک پہونچانے کی ذمہ دار تھی!!

آج یورپ کا آفتاب اقبال نقطۂ نصف النہار پر ہے۔ تمام دنیا کو شائستگی و تہذیب کا سبق پڑھانے کا اُس نے بیڑا اُٹھایا ہے اور ربع مسکوں کے رسوم و اخلاق میں اصلاح کرنے کا بارگراں سفید آدمی کی نازک پشت پر تبایا جاتا ہے۔ وہ صرف علم و دولت ہی میں تمام عالم سے افضل نہیں ہے بلکہ فتحمندی کے نشہ میں اپنی معاشرت اور اپنے مذہب کو بھی ساری متمدن دُنیا کے لیے سزاوار تقلید اور قابل تسلیم ظاہر کرتا ہے۔ ۴۵ کروڑ بندگان خدا مذہب بودھ کے چشمۂ فیض سے تسلی پاتے ہیں لیکن یورپ کو اس اظہار خیال میں کچھ تامل نہیں کہ گوتم کا اول تو وجود ہی مشتبہ ہے اور اگر اس نام کا کوئی انسان دنیا میں تھا بھی تو وہ مفتری اور کذاب ہوگا۔ جھوٹا آدمی ایک دیوار بھی سیدھی نہیں بنا سکتا۔ بودھ مذہب کا قلعہ ڈھائی ہزار برس تک کیونکر قائم رہتا اگر اس کا

معاوضہ حق محنت نہ ہوتا اور اسکی تعمیر میں روستقبازی کا مسالہ نہ صرف کیا جاتا۔

گوتم بودھ نے جو تعلیم اپنی قوم کو دی اُسکے دو حصے ہیں اور تمام شائستہ مذاہب کی بنیاد انھیں دونوں پر ہوتی ہے یعنی اصلاح اخلاق اور علم الٰہیات یا بالفاظ دیگر اعمال اور عقائد۔ مابہ الامتیاز یہ ہے کہ کوئی شریعت عقائد کو مقدم کرتی ہے اور کوئی اعمال کو۔ بعض ملتیں عقیدہ تنہا کو نجات کے لیے کافی سمجھتی ہیں اور بیشتر مذاہب عمل صالح کے بغیر نجات ابدی محال تصور فرماتے ہیں لیکن گوتم نے اصلاح اخلاق کو اس قدر ضروری سمجھا کہ عقائد کو پس پشت ڈال دیا اور ہر طالب نجات کے لیے پہلی شرط یہ قرار دی کہ دنیا اُسکے ہاتھ اور زبان سے بے خوف رہے۔ اُسکی تعلیم کا بیشتر حصہ فلسفۂ اخلاق کی تشریح ہے اور ڈھائی ہزار برس پہلے جو قانون اُس نے مرتب کیا تھا ترقی یافتہ دُنیا اسوقت تک اُس میں کوئی قیمتی اضافہ نہ کر سکی۔

شریعت گوتم کے "دس احکام" یہ ہیں:- (۱) کسی ذی روح کی جان نہ لو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا نہ کرو (۴) جھوٹ نہ بولو (۵) کسی کو بُرا نہ کہو (۶) قسم نہ کھاؤ (۷) فضول گفتگو نہ کرو۔ (۸) کسی پر غصہ نہ کرو (۹) کوئی نشہ کی چیز استعمال نہ کرو۔ (۱۰) غلط عقائد کے پاس نہ جاؤ یعنے بھوت پریت، دیوی دیوتا کو نہ مانو۔

وہ پانچ پیشوں کو منع کرتا ہے:- (۱) ہتھیار بیچنا (۲) لونڈی غلام بیچنا (۳) گوشت بیچنا۔ (۴) شراب بنانا یا بیچنا (۵) زہر بیچنا۔

گوتم کی اخلاقی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے:- (۱) دانشمندوں کی خدمت کرو اور نادانوں کی صحبت سے بچو۔ اُسکی عزت کرو جو عزت کا مستحق ہو۔ (۲) علم حاصل کرو اور عقل کی روشنی بڑھاؤ (۳) والدین کی اطاعت کرو۔ اہل و عیال کی خبرگیری کرو اور ایسا پیشہ اختیار کرو جس سے کسی کو دُکھ نہ ہو۔ (۴) خیرات کرو۔ ایمانداری سے رہو اور عزیزوں رشتہ داروں کی مدد کرو۔ (۵) گناہ سے بچو۔ شراب کے پاس نہ جاؤ۔ اور نیک کاموں سے کبھی نہ تھکو۔ (۶) عاجزی اور فروتنی اختیار کرو۔ قناعت اور شکرگزاری اپنا شیوہ بناؤ۔ (۷) مصیبت برداشت کرنے کی عادت ڈالو (۸) اپنی عصمت کی حفاظت جان سے زیادہ کرو (۹) دل پر اتنا قابو حاصل کرو کہ کسی غم و غصہ کا اُس پر اثر نہ ہو (۱۰) "نروان" حاصل ہونے سے نااُمید نہ ہو اور یقین رکھو کہ

اصلاح اخلاق سے یہ مرتبہ خود بخود مل جائے گا (۱۱) نفس کو زیر کرو اور تمام عالم سے محبت رکھو

آج مسیحی دُنیا حیرت کرتی ہے کہ فلسفۂ اخلاق کے یہ زریں اصول جو اُسکے خیال کے مطابق پہلی بار کوہ سینا پر بیان کیے گئے تھے اور جن پر عہدنامۂ عتیق کو ناز ہے یا جو اول مرتبہ یروشلم کے ایک ٹیلہ پر ظاہر کیے گئے تھے اور جو عہدنامۂ جدید کا طرۂ امتیاز ہیں۔ تاریکی اور جہالت کے عہد میں ہندوستان کا ایک جوگی کیونکر دریافت کرسکا؟ مگر وہ بھولتی ہے کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا خداوند رب العالمین تھا اُس نے مصروشام کو اپنے مقرب بندوں کے قدوم سے سرفراز کیا تو کیا اہل ہند سے اُسکو تعلق نہ تھا اور اُنکی رہنمائی کے لیے کسی رسول کی ضرورت نہ تھی؟ جس دانشمند ازل نے پانچ سو برس کے بعد حضرت عیسیٰ کی زبانِ مبارک سے بیت المقدس میں رحم اور محبت کا وعظ کہلایا وہ ہندوستان کے گوتم کو بھی اپنا مقرب بنا سکتا تھا اور اُسکی زبان سے بھی کلمۃ الحق کا اظہار ہو سکتا تھا!! اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انبیائے بنی اسرائیل کی طرح راجہ رامچندر، سری کرشن، مہاویر اور گوتم وغیرہم بھی مرسل تھے تو یہ معمّا فوراً حل ہو جاتا ہے۔

گوتم خود کہتا ہے کہ یہ اصول اُسکے ایجاد کیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ "دنیا میں تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد راہ حق کی ہدایت کے لیے "بودھ" پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور سب یکساں تعلیم دیتے ہیں لیکن دنیا کچھ عرصہ کے بعد اُنکی نصیحتوں کو بھول جاتی ہے اور اُسوقت ایک نیا "بودھ" وجود میں آتا ہے جو دھرم کو ازسرنو زندہ کرتا ہے۔ مجھ سے پہلے ۲۴ بودھ دنیا میں رہنمائی کے لیے تشریف لا چکے ہیں اور میرا نمبر پچیسواں ہے۔ میرے بعد ایک بودھ آئے گا جس کا نام میتریا بودھ یا رحم کا پیغمبر ہوگا!" گوتم کے معتقد یقین رکھتے ہیں کہ وہ رحم کا پیامبر رسان ابھی تک ظاہر نہیں ہوا عیسائی کہہ سکتے ہیں کہ گوتم نے حضرت مسیح کی آمد کی خبر سُنائی تھی اور مسلمان دعویٰ کرسکتے ہیں کہ "بودھ" سے مراد وہ نبی ہے جسکی شریعت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہ ہو اور "میتریا بودھ" سے اشارہ اُس برگزیدہ ذات کی طرف ہے جسکو ارحم الراحمین کی سرکار سے "رحمۃ للعالمین" کا لقب ملا۔ والغیب عند اللہ!!

علم الٰہیات پر گوتم نے زیادہ توجہ مبذول نہیں کی۔ وہ خلقت عالم و آدم کے اسباب پر گفتگو نہیں کرتا۔ اُسکی تعلیم مادی دنیا کو موجود اور بنی آدم کو زندہ و قائم دیکھ کر شروع ہوتی ہے۔ چوبیس کروڑ دیوتا ہندوستان میں خدائی کے دعوے دار بتائے جاتے ہیں اور وہ اُن سب کی عظمت

سے یکقلم انکار کرتا ہے۔ مسئلہ تناسخ کو اپنے اصول ذہن نشیں کرانے کے لیے دلائل کی پہلی سیڑھی بناتا ہے لیکن آگے چل کر روح کی فنا اور بقا میں شک ظاہر کرتا ہے اور جب روح فنا ہوگئی تو تناسخ کہاں رہا؟

وہ جزا و سزا کا قائل ہے اس لیے تطبیق کرتا ہے کہ روح کے فنا ہونے کے بعد اعمال باقی رہتے ہیں اور وہی اعمال نیک یا بدصورت اختیار کرکے دنیا میں واپس آتے ہیں۔ وہ بہشت اور دوزخ کو مانتا ہے لیکن جہنم کے خوف سے اعمال بد کو ترک کرنے اور فردوس کی طمع میں نیک افعال کرنے کی رغبت نہیں دلاتا۔ اسکی تعلیم میں ابدی عذاب کسی انسان کے لیے نہیں ہے۔ بدترین مخلوق کے لیے بھی سزا کی ایک حد ہے۔ اور جب اسکے گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا تو اسکو بھی نجات حاصل ہوگی۔ کیونکہ خالق کی محبت و شفقت ہرگز گوارا نہیں کرسکتی کہ اسکی مخلوق دائمی مصیبت میں رہے۔ دیودت گوتم کے وقت میں ایک مدعی حکمت و ریاست تھا۔ اُس نے گوتم کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسکی بابت بھی ارشاد ہے کہ دیودت بہت بُرا ہے۔ مگر ایک ساعت رحم کی آئیگی اور اُسوقت اسکو بھی نجات مل جائیگی۔"

گوتم کہتا ہے کہ دنیا یہی ایک نہیں ہے جس میں ہم بستے ہیں بلکہ اسی صورت کے بہت سے عالم ہیں جنکی ہمکو خبر نہیں۔ ہر ایک دنیا ایک مقررہ مدت کے بعد آگ پانی یا ہوا سے تباہ ہو جاتی ہے مگر گناہ پھر نئی دنیا بسا دیتا ہے جسکی آبادی پہلی دنیا کے برابر ہوتی ہے صرف وہ روحیں کم ہوجاتی ہیں جو "نروان" حاصل کرچکی ہوں۔

وہ تلقین کرتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز دائمی نہیں ہے اور نہ کوئی شے اپنی قوت یا خاصیت سے وجود میں آتی ہے بلکہ موجود کی جاتی ہے۔ دوسری منزل میں وہ دنیا کا وجود ہی مشتبہ بتاتا ہے:۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کا وجود ہے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس کا وجود نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے لیکن اسکے خلاف بھی نہیں ہے۔ اس وجود نہیں ہے اور اس کا عدم وجود بھی نہیں ہے۔ یہ غلط نہیں ہے لیکن صحیح نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ایسا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ لہذا نہ ہے نہ نہیں ہے!!!

آخری منزل فلسفہ کی یہ ہو جاتی ہے کہ نہ انسان ہے نہ جانور نہ زندگی نہ موت نہ روح نہ جسم نہ زماں نہ مکاں۔ نہ خلا نہ آبادی۔ نہ عقل نہ خیال بلکہ ان کا عدم ہی نہیں ہے اور عدمِ عدم کا عدم بھی نہیں ہے!! یہ فنا مطلق تھی جو گوتم تعلیم کرتا ہے اور حاصل اس فنا سے "نروان" ہے جو "فنا" کی بھی فنا ہے!!!

گوتم یہ نہیں بتاتا کہ "فنا" کے بعد ذاتِ باری کے ساتھ "بقا" ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ویدانت اور

ماخوذ از اسباق تاریخ مذاہب مولفہ ارنسٹ ارنیاں مطبوعہ لندن ۱۸۸۶ء صفحہ ۷۷ و ۸۰ و ۸۳ و ۹۳۔

تصوف اُسکے ارشاد کو سر آنکھوں پہ جگہ دیتے بلکہ اسکے فلسفہ میں اس سوال کا کچھ جواب ہی نہیں کہ "نروان" کے بعد روح اگر فنا نہ ہوئی تو کہاں رہتی ہے اور کیا ہو جاتی ہے؟ تصوف اور ویدانت کی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ "تو وہ ہے"۔ "تو" کی ضمیر انسان کی طرف اور "وہ" کی خالق کی طرف راجع ہے اور "ہے" ان دونوں کے ملانے کی وہ زنجیر ہے جسکی طرف ایک عارف نے اشارہ کیا ہے "گر حفظ مراتب نکنی زندیقی"۔

گوتم نے اپنی منطق سے "تو" کو فنا کر دیا ہے "کا وجود مشتبہ بتایا اور "وہ" کی بابت اُسکی تعلیم حسبِ دستور کہ اب تک سمجھی جا سکی ساکت ہے۔ یہ تو یقین نہیں آتا کہ گوتم کا سا دانشمند واجب الوجود سے منکر ہو گا لیکن اُسکے قانون میں کسی جگہ خدا کا نام جپنے کی ہدایت نہیں ہے۔ وہ اصلاح اخلاق کے لیے مراقبے تعلیم کرتا ہے جن میں سے پہلا مراقبہ قطع تعلقات کا، دوسرا طہارت کا، تیسرا مسرت کا، چوتھا رحم کا اور پانچواں محبت کا ہے۔ طالبوں کے اطمینان قلب کے لیے خانقاہیں قائم کرتا ہے اور اُسکے قواعد مقرر کرتا ہے لیکن خدا کو یاد کرنے کا اُسکے ٹائم ٹیبل میں کوئی وقت نہیں ہے۔

روسا اور دولتمند گوتم اور اُسکے ابتدائی چیلوں کی راستبازی، نکوکاری دیکھکر بڑی بڑی جائدادیں خانقاہوں کے لیے وقف کرتے ہیں اور بے فکری کی طمع میں بہت سے بد وضع لوگ بھی سنگ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ذات کی قید اُٹھ جانے سے شودر اور چنڈال بھی جماعت خانوں میں آتے ہیں اور اپنی موروثی بُرائیاں ساتھ لاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ خانقاہیں اُن تمام ناپاک حرکات کا سرچشمہ بنجاتی ہیں جنکے دور کرنے کے لیے گوتم نے یہ سلسلہ قائم کیا تھا اور وہ تمام بدافعالیاں ان جماعت خانوں میں سرزد ہوتی ہیں جنھوں نے رومن کیتھولک فرقہ کے رہبانیت خانوں کو یورپ کے ازمنۂ متوسطہ میں بدنام کیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ تاریخ تکرار کرتی ہے اور ہزار برس کے بعد یورپ میں پھر وہی تماشا ہوتا ہے جو سرزمین ہند پر پہلے کھیلا جا چکا تھا۔!!

جب کوئی معبود نہ تھا تو سفارش کے لیے کسی درمیانی فرقہ کی کیا احتیاج تھی؟ گر چند روز کے بعد تبت اور چین میں باقاعدہ پادریوں کی جماعت تیار ہو جاتی ہے۔ گوتم کی مورت سے توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے "بودھ" کو خدا بنا دیا جاتا ہے۔ خیرات، عصمت، نیکی اور عقل وغیرہ کے بُت بنائے جاتے ہیں اور اُنکے سامنے عقیدت مندوں کا سر نیاز خم ہوتا ہے۔ جنوب میں لنکا اور سیام وغیرہ کی حالت کسی قدر بہتر رہتی ہے گر وہاں بھی پیپل کے درخت پر ہار پھول چڑھائے جاتے ہیں اور گوتم کو

کُل اختیارات خداوندی سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ غرض وہ تمام عیوب باستثناءِ قربانی کے جنکی اصلاح کا گوتم نے بیڑا اُٹھایا تھا اُسی کے مذہب کا جزو بنجاتے ہیں اور اب برہمنوں کو گوتم اور اُسکے معتقدوں سے ذات کی قید توڑنے اور پنڈتوں کو مالی نقصان پہونچانے کا عوض لینے کا موقع ملتا ہے۔ انجام یہ کہ ۴۰۰ئ میں جب چینی سیاح فاہیان ہندوستان میں وارد ہوتا ہے تو یہاں اپنے مذہب کی ترقی ختم پاتا ہے اور دو سو برس کے بعد ہیان سیانگ زیارت کی نیت سے آتا ہے تو مذہب بودھ کو نہایت شکستہ حالت میں دیکھتا ہے۔ آٹھویں یا نویں صدی عیسوی میں برہمنوں کو اس مذہب پر پوری فتح حاصل ہو جاتی ہے اور جب مسلمانوں کے قدم یہاں جمتے ہیں تو اس ملت کا نام و نشان بھی اُسکے وطن میں باقی نہیں رہتا اگرچہ دور دراز ممالک میں وہ ہنوز پھولتا پھلتا ہے۔

کہہ سکتے ہیں کہ یہ نتیجہ تھا اُس سخت خامی کا جو شریعتِ گوتم میں تھی یعنی "خدا کی امداد کے بغیر محض اپنے قوت بازو سے نجات سرمدی حاصل کرنے کی کوشش"! اہلِ معرفت کہتے ہیں کہ خدا کا نام رٹو اور مالک سے لَو لگاؤ تا کہ "وہ" اپنی محبت کی آگ سے خواہشوں کو جلا دے ورنہ نفس کو زیر کر کے ریاضت کے راستہ سے خدا تک پہونچنا بہت دشوار بلکہ قریب قریب غیر ممکن سے ہے۔

گوتم کی تعلیم اس اصول کے بالکل خلاف تھی۔ وہ اپنے مریدوں کو یا تو خدا کا نام لینے کی ہدایت نہ کرتا تھا یا اُسکے ابتدائی چیلوں نے یہ ضروری حصہ اُسکی شریعت سے حذف کر دیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں یہ اخلاقی مذہب منکرینِ خدا کی ملت خیال کیا گیا اور "خالق" مہیا کرنے کے لیے مخلوق "بودھ" کو خدا بنانے پر مجبور ہوئی۔

اس فلسفیانہ مذہب کا اپنے خدا پرست اور فدائے روحانیت وطن سے بے نشان ہو جانا بھی اُسکے دامنِ کمال پر ایک بدنما داغ ہے۔ چین و برہما کے عقیدت مندوں نے "انکارِ وجود" کو دل میں جگہ دی تو وہاں نہ کوئی شایستہ مذہب پہلے سے موجود تھا، نہ بھگوت گیتا کی بانسری وہاں بجی تھی۔ سری کرشن اور رہیلا دکے دیس میں یہ شریعت زندہ رہتی تو البتہ جامع کمالات اور ناسخ ادیان و ملل کا خطاب پانے کی مستحق ہوتی۔

میتریا بودھ! آپ اس شریعت کی تکمیل فرمائیں!!

امیر احمد علوی

کلام حالی

مولانا حالی کی متفرق نظمیں جو بیحد مقبول ہیں
شکوۂ ہند۔ بیوہ کی مناجات۔ عرض حال ۲ر
مسدس۔ نشاط۔ خدمت۔ مناظرہ رحم و انصاف ۱ر
حب وطن۔ چھوٹو اور لیلے کا مناظرہ ۱ر
(خریداران الناظر کے لیے تین چوتھائی قیمت)

مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر و انشاپرداز و فلسفی
مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم
جسے اُردو میں اعلیٰ درجے کے فلسفیانہ خیالات
کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا۔ قیمت ۴ر
(خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

کلام اقبال

ڈاکٹر اقبال کی مقبول عام نظمیں:-
شکوہ ۔ جواب شکوہ ۔ شمع و شاعر ۲ر
بلال ۔ فریاد اُمت ۔ تصویر درد ۲ر
۱ر
(خریداران رسالہ کو تین چوتھائی قیمت پر)

مسلمانان اندلس

نامور مورخ اسٹینلی لین پول کی کتاب
مورس ان اسپین کا اُردو ترجمہ از مولوی
سید عبدالغنی وارثی قیمت عہ
(خریداران رسالہ سے عہ)

خوان دعوت

لڑکیوں کو کھانا پکانا سکھانے کیلیے
م۔ب صاحب لکھنوی نے افسانہ کے دلکش
پیرایہ میں یہ کتاب مرتب کی ہے جسمیں
باورچی خانہ کے ضروری انتظامات
اور عمدہ و لذیذ کھانوں کی مجرب
ترکیبیں ذاتی تجربہ کی بنا پر تحریر
کی ہیں۔
قیمت عمر
(خریداران رسالہ کے لیے ۱۲ر)

تذکرۂ حزیں

مشہور شاعر شیخ علی حزیں۔ جو ایران
سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے
ذاتی دلچسپ سوانحعمری قیمت ۴ر
(خریداران رسالہ سے ۳ر)

دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خدا پرست اور دنیا دار کی
کہانی ۱ر۔ مساوات۔ از مسٹر سلطان
حیدر جوش ۱ر اتفاقات زمانہ ۱ر
(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

حیات نظامی

مشہور شاعر حضرت نظامی گنجوی
کی سوانحعمری۔
قیمت ۴ر
(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

جمیل و بثینہ

عرب کے حسن و عشق کا
دلچسپ افسانہ
قیمت ۳ر
(خریداران الناظر کے لیے ۲ر)

عورتوں کی اِنشا

خواتین اور کمسن صاحبزادیوں کو خطوط
نویسی سکھلانے والی کتاب مصنفہ بیگم
صفدر علی صاحبہ۔ قیمت عہ
(خریداران رسالہ کے لیے ۴ر)

مصنوعی شوہر

انقلاب ایران کی ایک ظریفانہ داستان
ہنستے ہنستے لوٹ جائیے گا۔
قیمت ۱ر
(خریداران الناظر کے لیے ۱۰)

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مسلمانوں کی تہذیب

یعنی مسلمانوں کی تمدنی ترقی کے متعلق نواب محسن الملک مرحوم کا ایک فاضلانہ لکچر۔ ۴ر

قیمت ۶ر

(خریداران الناظر سے ۵ر)

میلاد النبی

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے اصل عربی متن کے مقابل اس کا نہایت فصیح اُردو ترجمہ۔

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم جس میں لفظ صوفی کی تحقیق، تصوف کی ابتدا اور اسکی درجہ بدرجہ ترقیاں کا ذکر ہے اور آخر میں تصوف کے تمام شعبوں کو اسلام سے تطبیق دیگئی ہے

قیمت ۸ر (خریداران رسالہ کے لیے ۵ر)

مقدمہ شعر و شاعری

مولانا حالی نے اپنے دیوان کے شروع میں جو لاجواب مقدمہ لکھا تھا وہ دوسرے ایڈیشن کے وقت ایڈیٹر الناظر نے دیوان سے علیحدہ کرکے چھاپا۔ اسمیں شعر کی حقیقت، ماہیت اور شاعری کے اصول و اساس پر بحث کرکے اُردو شاعری پر ایک بسیط تبصرہ لکھا گیا ہے۔ قیمت عہ (خریداران رسالہ سے عہ)

خطاب

(از ملا جی)

سرکاری خطابات کے آرزومند کوشش کرنے سے پہلے اسکو ملاحظہ فرمالیں ۴ر

(خریداران الناظر کیلئے ۳ر)

ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار تاریخ مولفہ مسٹر عنایت اللہ بی اے رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۴ر

(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

وکرم اروسی

مترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم۔ یہ کالی داس کے مشہور و معروف ڈرامے کا اُردو ترجمہ ہے جس میں لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ اضافہ کیا ہے اور ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر بحث کی ہے اور کالی داس کا موازنہ شیکسپیر اور سیر اسکیلس وغیرہ سے کیا ہے۔ قیمت عہ خریداران الناظر سے عہ

تسخیر فرانس

شکسپیر کے لاجواب ڈرامہ ہنری دی ففتھ کا اُردو ترجمہ۔ از منشی تفضل حسین صاحب ناظر۔ قیمت ۸ر

(خریداران الناظر کے لیے ۶ر)

سفرنامہ مصر و شام و روم

مولانا شبلی کا مشہور سفرنامہ جو ان ممالک کے متعلق بہترین تاریخی، علمی، معاشرتی معلومات فراہم کرتا ہے۔ قیمت ۶ر

(خریداران الناظر کے لیے عہ)

میکفرن و رلوسی

حضرت شوق قدوائی کا لاجواب ڈراما

قیمت ۲ر

(خریداران الناظر سے ۱ر)

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر

سلسلے ۸ ، ۶۳

رسالۂ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ، مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر :- اسحاق علی علوی

مطبوعات الناظر پریس لکھنؤ

الہام

قرآن مجید کے الہامی کلام ہونے پر مضمون

قیمت ۴ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

تاریخ عرب

مصنفہٴ

موسیو سیدیو فرانسیسی

عربوں کے متعلق یہ کتاب اُن تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے جو یورپ ایشیا کے کتبخانوں کی زینت ہیں۔ مسلمانوں کی ترقیات اور عربوں کے کمالات کا یہ آئینہ ہے اور یورپ کے افترا و کذب کا بہترین جواب۔

قیمت مجلد چرمی ۱عہ مجلد پارچہ ۱صہ

[illegible]

قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

قواعد المنتخب

جلال لکھنوی کا لاجواب رسالہ۔ جو زبان کے متعلق بہترین تحقیقات سے لبریز ہے

قیمت ۴ر (خریداران الناظر سے ۳ر)

ترقی زبان بذریعۂ تراجم

پروفیسر گھوشال ایم اے کا وہ قیمتی لکچر جو لکھنوی کی اُردو کانفرنس میں پڑھا گیا

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

موازنہ انیس و دبیر

مولفہٴ

مولانا شبلی مرحوم

جس میں میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا موازنہ کیا گیا ہے۔

قیمت ۱ے ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۱ے)

شوکیہ اور دو مظلوم بہنیں

قیصر بھوپالی کے دو مختصر افسانے

قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

مثنوی صبح اُمید

مولانا شبلی کی سب سے پہلی سادہ نظم

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

مولانا شبلی کے متفرق مضامین

زیب النسا ۱ر

جہانگیر اور تزک جہانگیری ۲ر

اسلامی حکومت ۲ر

اسلامی مدارس ۴ر

(خریداران الناظر سے نصف قیمت)

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر ماہ جون سنہ ۱۹۲۵ء

نمبر ۱۶۸ — جلد ۲۸

اثرستان — نواب جعفر علیخاں اثر بی اے لکھنوی ڈپٹی کلکٹر کا قابل دید دیوان جسکے شروع میں جناب مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کا دلچسپ مقدمہ ہے۔ قیمت عہ (منیجر الناظر ایجنسی لکھنؤ)

کافوری جنتری سنہ ۱۹۲۵ء کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کے کارخانہ کی یہ مفید کارآمد جنتری اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپی ہے اور درخواست پر مفت بھیجی جاتی ہے

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی

اصلی عرق کافور

وقت پر صلاح

جو دوست ہوتے ہیں وہ خطرہ سے بچنے کے لیے وقت سے پہلے نیک صلاح دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی صلاح ہے کہ موسم گرما آگیا ہے اور اس موسم میں بے ترکیب کھانے پینے کے باعث ہیضہ ہونے کا خوف ہر وقت پر رہتا ہے۔ ہیضہ عام طور سے بے وقت آدھی رات کے قریب صبح یعنے ایسے وقت میں جبکہ حکیم ڈاکٹر مشکل سے ملتے ہیں ہوا کرتا ہے۔ اسلیے اس سے بچنے کیلیے پہلے ہی ایک شیشی اصل عرق کافور کی منگوا کر اپنے گھر میں ڈال رکھیں جس سے آپ کو آپ کے دوست احباب اور پڑوسیوں کو وقت پر کام آئے۔ یہ عرق کافور گرمی کے دست پیٹ کے درد متلی وغیرہ کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ ۴۱ سال سے تمام ہندوستان میں دوکانداروں دوافروشوں اور ایجنٹوں کے پاس ملتی ہیں قیمت فی شیشی چھ آنہ محصولڈاک چھ آنہ ۶؍

پرانے سوزاک کی دوا

سوزاک پرانا ہو جانے پر پیشاب میں جلن نہیں ہوتی لیکن پیشاب رک رک کر ہوتا ہے اور کبھی کبھی مواد بھی تھوڑا تھوڑا گرتا ہے۔ گرم چیزوں کے کھانے اور مزاج میں گرمی آجانے سے مواد زیادہ گرنے لگتا ہے اور کبھی بند بھی ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں پرانے سوزاک کی دوا استعمال کرنا چاہیے۔ اگر اس حالت میں معقول علاج نہ کیا گیا تو آخر میں پیشاب کی دھار باریک پڑجاتی ہے پیشاب قطرہ قطرہ ہونے لگتا ہے اور کبھی اکبارگی بند بھی ہو جاتا ہے جس سے زندگی محال ہو جاتی ہے قیمت فی شیشی ۱۲؍ محصولڈاک ۶؍ دیکھیے جناب راجہ پرتھوی سنگھ صاحب امری کیا فرماتے ہیں۔ جناب من۔ آپکی سوزاک کی دوا سے بہت فائدہ ہوا۔ مجھے پانچ ماہ سے سوزاک کا مرض تھا۔ حکیم رامچندر گوناکھنو رہنومنت سنگھ جی رگھونسی۔ ویش آگرہ۔ ڈاکٹر حکیم غلام نبی زبدۃ الحکما لاہور کی دوائیاں حسب دستور استعمال کیا مگر کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا آپکی دوا کے صرف سات روز کے استعمال سے بالکل آرام ہو گیا۔ قیمت بھی ارزاں ہے

ڈاکٹر ایس کے برمن [illegible] تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ :۔ ڈاکٹر گنگا رام جیلی ۔ چوک ۔ لکھنؤ

مطبوعات جدیدہ

علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کے مندرجۂ ذیل رسائل کے تراجم حال ہی میں شایع ہوئے ہیں:۔

اسوۂ حسنہ ۔ ابن قیم کی کتاب زاد المعاد کا اختصار الموسوم بہ ہدی الرسول کا ترجمہ ۔ سیرۃ رسولؐ میں یہ بہترین کتاب کہی جا سکتی ہے ۔ مترجمہ مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی ۔ قیمت ۱۲؍

العروۃ الوثقیٰ ۔ اس میں ابن تیمیہ نے خالق اور مخلوق کے تعلقات پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ آدمی کو خدا کے سوا کسی بندہ سے طلب حاجت نہ کرنا چاہیے ۔ قیمت ۶؍

اصحاب صفہ ۔ اس رسالہ میں ابن تیمیہ نے بارگاہ رسالت کے اُن متوسلین کے مستند حالات لکھے ہیں جنکو اصحاب صفہ کا لقب حاصل تھا ۔ قیمت ۱۰؍

الوصیۃ الکبریٰ ۔ جسکے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ابن تیمیہ کے نزدیک اہل سنت والجماعت کے اصلی عقائد کیا ہیں ۔ قیمت ۸؍

الوصیۃ الصغریٰ (مع متن عربی) ابن تیمیہ نے ایک شخص کو چند باتیں بتائی ہیں جو ہر شخص کو گرہ میں باندھنا چاہیے ۔ قیمت ۴؍

العقیدۃ الواسطیۃ (معہ متن عربی) ابن تیمیہ کی رائے میں اہل سنت والجماعت کا کیا مسلک ہونا چاہیے قیمت ۶؍

درجات الیقین ۔ (معہ متن عربی) اس میں ابن تیمیہ نے یقین کی حقیقت و نوعیت بیان کی ہے قیمت ۲؍

زیارۃ القبور ۔ (معہ متن عربی) پیروں کے نام پر نذر ماننا، اُن سے استعانت چاہنا، اُنکے مزاروں کو بوسہ دینا، حاجات کے وقت اُنکو پکارنا، قبروں پر مجلس سماع منعقد کرنا وغیرہ مسائل کے متعلق ابن تیمیہ کی رائے ۔ قیمت ۹؍

تفسیر سورۃ الفلق والناس (معہ متن عربی) از علامہ ابن تیمیہ ۔ قیمت ۹؍

اُردو کلیات شبلی ۔ جسمیں الناظر بک ایجنسی کے مجموعہ کلام شبلی کے علاوہ متعدد قابل دید نظمیں ہیں اور حال ہی میں مطبع معارف سے بکمال صفائی و خوبی شایع ہوا ہے ۔ قیمت عہ

نورجہاں بیگم ۔ مولانا ابو السعید محمد عبد اللطیف صدیقی منشی فاضل ۔ مختصر سوانحعمری مگر نہایت خوبصورت چھپی ہوئی ۔ شروع میں نورجہاں کی عکسی تصویر ۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ :۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

وہ لوگ اب ہاتھ مل رہے ہونگے

جو

ابتدا ہی میں

سچ

کا سالانہ چندہ بھیجکر اُسکے خریدار نہیں بنگئے۔ کیونکہ اب ملک بھر کے مشہور اور مقتدر اخبارات میں اُسکے نقل شدہ مضامین دیکھکر اور اُسکی "سچی باتیں" سُن کر خریدار بنے تو پچھلے پرچے نہیں رہے۔ مگر ابھی کچھ نہیں گیا صرف ایک ششماہی گذری ہے، جلدی خریدار بنجائیے ورنہ بہت زیادہ پچھتائیے گا۔ کیونکہ ایسے اعلیٰ درجہ کے مضامین، ایسے نیک مشورے، ایسی مزہ مزہ کی باتیں کسی اخبار میں نہیں مل سکتی ہیں۔

اخبارات صرف ایک دو مضمون نقل کرتے ہیں، پورا پرچہ صرف خریداروں کے ملاحظہ سے گذرتا ہے۔ پھر چندہ کچھ بھی نہیں صرف **تین روپئے** بھیجدیجیے اور انشاءاللہ سال بھر تک

ہرچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر

کا لطف حاصل ہوتا رہے گا۔

مہتمم اخبار سچ لکھنؤ

ایک نادر تحفہ

سیرۃ ابن ہشام - عربی کی ایک نہایت ہی مشہور و مستند کتاب ہے۔ اسکا اردو ترجمہ دس برس ہوے جب شایع ہوا تھا۔ اتفاق سے کچھ نسخے ہیں ہاتھ لگ گئے ہیں۔ شایقین فوراً طلب کرلیں ورنہ پھر ممکن ہے کہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے۔ قیمت ۱۲؍

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۸ جلد ۲۸ — ماہ جون سنہ ۱۹۲۵ء

حسین شریف مکہ

دو سال ہوئے جب مکۂ معظمہ (زاداللہ شرفہا) حاضر ہونے کا شرف میرے نصیب میں آیا۔ تو شریف حسین سابق ملک الحجاز کے حالات سے آگاہ ہونے اور اُن سے متعدد ملاقاتیں کرکے اُنکی ذہنیت کا کسی قدر اندازہ کرنے کا مجھے موقع ملا۔

لکھنؤ سے روانگی کے وقت تک اُن خبروں کی بنا پر جو کہ اخبارات کے ذریعہ سے سالہائے ماسبق میں وصول ہوئی تھیں شریف حسین کی طرف سے میرے دل میں ناگواری اور ناراضی کے جو خیالات جاگزیں تھے، قطعاً ارادہ نہ تھا کہ میں شریف صاحب سے ملوں گا۔ اسی لیے جب جناب مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی نے جنکے تعلقات شریف مذکور سے عالم آشکارا ہیں، ایک تعارفی تحریر دینے کا از خود ارادہ ظاہر فرمایا تو میں نے اُسے قبول نہ کیا، اور اُن سے صاف عرض کردیا کہ میں شریف سے ملنا نہیں چاہتا۔

مکہ معظمہ حاضر ہونے کے بعد مجھے دو قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ ایک وہ لوگ تھے جو شریف حسین سے دلی نفرت رکھتے تھے اور شریف صاحب کی جملہ کارروائیوں کو بعینہٖ اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے جس سے ہم لوگ ہندوستان میں دیکھنے کے عادی ہوگئے تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو شریف صاحب کو اعلیٰ درجہ کا مدبر خیال کرتے تھے۔ خصوصاً حجاز کے معاملات میں شریف صاحب کا

طرزِ عمل ایسا بتایا گیا کہ مجھ کو اپنے ہمخیال دوستوں کی تمام باتوں کے باوجود یہ خیال پیدا ہوگیا کہ جنگ کے دوران میں شریف صاحب نے دھوکا کھاکر، یا ذاتی اغراض سے متاثر ہوکر جو کچھ کارروائی کی اُسکے بعد شاید اُنکی آنکھیں کھُل گئیں اور اب وہ حجاز کو غیر اسلامی تسلط سے ہر طرح آزاد رکھ کر ایک پائدار و مستحکم عربی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

بیس سال سے زیادہ زمانہ گذرا کہ جب علامہ جلال الدین سیوطی کی مشہور تصنیف تاریخ الخلفا کا انگریزی ترجمہ میرے مطالعہ میں تھا۔ اُس میں ایک مقام پر ایک حدیث قدسی درج تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ ملتِ محمدیہ کی بربادی کا سبب ترکی قوم ہوگی۔ میں تاریخ یا حدیث کا طالب علم نہ تھا جو اس روایت کی جانچ کرتا۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ میرے دل میں اُسی وقت سے یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ جمیع ممالک عربیہ کو ایک عربی تاجدار کے اقتدار میں رہنا چاہیے۔ اور یہ امر بطور ایک عقیدہ کے میرے ذہن میں راسخ ہوگیا تھا کہ صرف ایک مستحکم عربی سلطنت ہی ملت محمدیہ کے بقا و تحفظ کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔ گذشتہ جنگ نے جب عرب کے تمام اجزا کو ترکی حکومت سے جدا کردیا تو اگرچہ ترکی حکومت کی بربادی کا مجھے حد درجہ غم تھا، مگر ساتھ ہی میرے دل میں وقتاً فوقتاً یہ خیال ضرور پیدا ہوتا تھا کہ عربی حکومت کے قیام کا جو خواب میں عرصہ سے دیکھ رہا ہوں، اُسکی تعبیر اب رونما ہونے والی ہے۔

اسلام کی عظمت کی طرف سے میرے دل میں ایک لمحہ کے لیے کبھی مایوسی پیدا نہیں ہوئی چنانچہ اِنھیں اوراق میں سنہ ۲۰ء کے نہایت تیرہ و تار زمانہ میں میں اپنے اس عقیدہ کو نہایت وضاحت و صراحت سے ظاہر کرتا رہا ہوں۔

ان خیالات کی بنا پر شریف حسین کے متعلق جو حالات میں نے سُنے اُنکی وجہ سے بجائے اسکے کہ میری نفرت و ناراضی میں اضافہ ہوتا، میرے دل میں شریف صاحب کی ذات سے اچھی امیدیں پیدا ہونے لگیں۔ اور جب میں مدینۂ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوکر واپس آیا اور حج سے فراغت پائی تو میں نے ارادہ کیا کہ میں شریف صاحب سے ملوں۔ حجاج و زائرین کی تکالیف جو میرے مشاہدہ میں آئی تھیں بیان کروں اور اُنکو رفع کرنے پر متوجہ کروں اور ساتھ ہی اُنکے دلی ارادوں کا حتی المقدور پتہ لگاؤں۔ اور اگر واقعۃً وہ ملک عرب میں ایک مستحکم و پائدار حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو میں ہندوستان واپس جاکر اہل ہند کو یہ خوشخبری سناؤں کہ جزیرۃ العرب کے متعلق ان کا جو مطمح نظر ہے اُسکی تکمیل کا سامان شریف حسین کررہے ہیں جسکے بعد مجھے یقین واثق تھا کہ کم سے کم ہماری خلافت کمیٹی کے تعلقات حکومت حجاز کے ساتھ نہایت دوستانہ ہوجائیں گے۔

شریف حسین کے جو حالات مجھے معلوم ہوئے اُنکا اجمالی تذکرہ یہاں نامناسب ہوگا۔ شریف حسین نہایت فطین ہے
اپنے عنفوان شباب ہی میں جب سے ہاتھ پاؤں نکالنے تو اُس زمانہ کے شریف مکہ نے جو اسکے چچا ہوتے تھے اس اندیشہ سے کہ مبادا
اسکی وجہ سے کوئی فتنہ اُٹھ کھڑا ہو حسین کو قسطنطنیہ بھیجدیا جہاں وہ بڑی قدر و منزلت سے بطور شاہی مہمان کے رہا۔
اسکی فطانت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ میں سلطان عبد الحمید خاں
اور نوجوان ترکوں کے درمیان سخت کشاکش ہو رہی تھی تو یہ شخص جہاں ایک طرف سلطان ممدوح
کا منظور نظر اور معتمد الیہ تھا وہیں انجمن اتحاد و ترقی کا ایک سرگرم اور با اثر رکن بھی تھا۔ پھر جب
قسطنطنیہ سے وہ شریف مکہ بنا کر بھیجا جانے لگا تو سلطان عبد الحمید خاں نے جنکی ذہانت اور تدبر
کا تمام اسلامی دنیا پر سکہ بیٹھا ہوا ہے اپنی نظر بندی کے مقام سے حکومت قسطنطنیہ کے ارباب حل و
عقد کے پاس یہ پیام بھیجا کہ تم لوگوں نے حسین کو شریف مکہ بنا کر بھیجا تو ہے، مگر تم کو سمجھ لینا چاہیے
کہ تم نے صوبجات عرب کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ زمانۂ حال کے واقعات سے ہر شخص نتیجہ نکال سکتا
ہے کہ سلطان عبد الحمید خاں کا یہ خیال کس قدر صحیح ثابت ہوا۔

مکہ معظمہ میں آنے کے بعد حسین نے ابتداءً ایسی پاکیزہ زندگی بسر کی کہ تمام اہل مکہ پر اُسکی دھاک
بندھ گئی۔ اُسکے زہد و ورع کو دیکھ کر لوگ سمجھتے تھے کہ سلف صالحین کے زمانہ کا کوئی شخص اس
عہد میں پیدا ہو گیا ہے۔ اُس زمانہ میں مکہ معظمہ میں ایک ترکی گورنر رہا کرتا تھا۔ جب لڑائی چھڑی
اور شریف حسین نے انگریزوں سے خفیہ مراسلت شروع کی تو ترکی گورنر کو لوگوں نے اطلاع دی۔
گورنر نے ایکبار جبکہ دونوں مسجد الحرام میں موجود تھے حسین سے کہا کہ آپ انگریزوں سے ساز کر رہے ہیں
تو شریف صاحب نے قطعاً اس سے انکار کیا اور اُسکے مزید اطمینان کے لیے ملتزم شریف (در کعبہ)
پر کھڑے ہو کر کعبۃ اللہ شریف کی قسم کھائی اور اُسے یقین دلایا کہ حسین ترکی حکومت کا دل سے وفادار
ہے، اور یہ جو کچھ اُسکے متعلق کہا جاتا ہے اسکی کچھ اصلیت نہیں، بلکہ محض اُسکے دشمنوں کی افترا
پردازی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب انگریزوں سے تمام پخت و پز ہو چکی اور حسین نے اعلان بغاوت
کا ارادہ کیا تو اُس سے چند روز قبل پھر خبر رسانوں کے اطلاع دینے کی بنا پر ترکی گورنر نے حسین کو
حرم شریف ہی میں ٹوکا۔ اب کی دفعہ حسین نے اپنی معصومیت کا اطمینان دلانے کے لیے خانۂ کعبہ کو کھلوایا اور
اندر جا کر ترکوں کے ساتھ وفاداری کا حلف لیا۔ جسکے بعد ترکی گورنر کو حسین کی طرف سے کوئی اندیشہ
نہ رہا، اور وہ موسم گرما بسر کرنے کے لیے طائف شریف چلا گیا۔ اور بیچ ہی میں حسین نے بغاوت کر کے
ایک طرف مکہ معظمہ کی مختصر سی ترکی فوج کو اور دوسری طرف طائف شریف میں گورنر اور اُسکی فوج کو

گھیر لیا۔ مکہ معظمہ کی ترکی فوج کو جس شقاوت اور سنگدلی سے حسین نے ذبح کرایا ہے اُسکا بیان تو اسقدر دردناک ہے کہ اُن واقعات کو سنکر سخت سے سخت دل والے انسان کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ جنگ کے ابتدائی زمانہ کی باتیں ہیں۔ جنگ کے دوران میں اس نے انگریزوں سے بے حساب روپیہ حاصل کیا اور بدوؤں اور اپنے ہواخواہوں کو بے دریغ اشرفیاں دیتا رہا۔ جنگ کے بعد اُس نے حکومت کا نظم و نسق اس طرح کیا کہ ایک متمدن حکومت کے طرز پر جملہ محکہ جاتِ حکومت قائم کیے اور اُنپر اپنے خاص چیلوں کو مقرر کیا۔ اس طریقہ پر ظاہر میں اگرچہ ہر شعبۂ حکومت بجائے خود موجود ہے مگر در اصل کسی کو ذرہ برابر کوئی اختیار نہیں۔ تمام وزراء اور بڑے بڑے عمال صرف نام کے لیے ہیں۔ اُنکی اصلی خدمت صرف حسین کے دربار کی حاضری اور اُسکے ہر حکم کی بجا آوری ہے۔ کام سارا اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

اسی سال کے قریب حسین کی عمر ہے۔ مگر جس مستعدی سے وہ کام کرتا ہے ایک نوجوان سے بھی اُسکی توقع نہیں کی جا سکتی۔ نصف شب کے بعد اُٹھتا ہے۔ کبھی تہجد کے وقت طواف کرتے دکھائی دیتا ہے، اور کبھی اول وقت جماعتِ شافعی کے ساتھ نماز میں شریک نظر آتا ہے، کبھی تبدیل لباس کرکے شہر کا گشت لگاتا ہے، صبح کو آٹھ بجے قصر الملوکی میں آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاہی دفتر ہے۔ جملہ وزرا و ارکینِ سلطنت حاضر رہتے ہیں۔ اور ۸ بجے صبح سے ۸ بجے شب تک حسین یہیں بیٹھکر تمام امور سلطنت انجام دیتا ہے۔ وہ اپنے اخبار القبلہ کا خود ایڈیٹر ہے۔ اخبار پر جس ایڈیٹر کا نام لکھا رہتا ہے وہ محض دنیا کے دکھانے کے لیے ہے ورنہ اُسکی حیثیت ایک محرر یا کاتب سے زیادہ نہیں۔ تمام اخبارات پڑھواکر خود سنتا ہے اور ہر قسم کے مضامین خود ہی لکھوا دیتا ہے۔

محاصل کی توفیر کے لیے ہر وقت نت نئے طریقے نکالتا رہتا ہے۔ جدہ کے چُنگی خانہ کی آمدنی ترکی عہد حکومت میں کبھی ایک لاکھ پاؤنڈ سے زائد نہیں ہوئی اب اُسکی بدولت پانچ لاکھ پاؤنڈ سے بڑھ گئی ہے۔ مکہ معظمہ کے اندر پہلے کسی قسم کے محاصل نہ تھے، مگر اب آئے دن نئے نئے ناموں اور حیلوں سے محصول عائد کیے جاتے ہیں۔

شریف نے ایک دوکان کھول رکھی ہے جو شہر بھر سے ارزاں نرخ پر اشیا فروخت کرتی ہے جسکی وجہ سے ہر وقت دوکان پر ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ کوئی شریف انسان جسے اپنی آبرو عزیز ہو وہاں نہیں جا سکتا۔ ارزاں نرخ پر فروخت کرنے کی وجہ سے عوام الناس میں یہ دوکان جہاں

بہت ہر دلعزیز ہے وہاں شہر کے تاجروں کو اس سے سخت نقصان ہے۔ اور پھر اس دوکان کے عاملین کو نہایت وسیع اختیارات دیدیے گئے ہیں کہ جس تاجر کا جو مال جب چاہے بغیر اُس سے معاملہ کیے ہوے، بغیر قیمت ادا کیے براہِ راست جدہ کے محصول خانہ سے لے لے، اور پھر سال دو سال میں جب چاہے اور جس شرح سے چاہے اُس مال کی قیمت ادا کردے۔

ابتدا میں اہل مکہ پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر اب جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے سختی بڑھتی جاتی ہے۔ جب کسی سے ناراض ہوتا ہے فوراً گیوہ (بندی خانہ) میں ڈالدیتا ہے۔ یہ گیوہ مکانوں کے نیچے تہ خانوں کی صورت میں ہیں، جہاں نہ ہوا کا گذر ہے نہ روشنی کا۔ گیوہ میں بند کرنے کے لیے نہ کسی پر مقدمہ چلایا جاتا ہے نہ کوئی عدالتی کارروائی ہوتی ہے۔ نہ حکومت کی طرف سے قیدی کو خوراک ملتی ہے۔ یا تو اُسکے اعزا و احباب کھانا بھیجیں یا مخیر لوگ ترس کھاکر خوراک کا انتظام کریں۔

پھر جس دوکاندار سے ناخوش ہوے اور مکہ معظمہ میں زیادہ تر دوکاندار ہی ہیں فوراً اُسکی دوکان پر قفل لگوادیا۔ اب نہ وہ بیچارہ تجارت کرسکتا ہے، نہ اپنا مال اُٹھالیجا سکتا ہے۔ اور پھر یہ بھی کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ قصور کیا ہے اور تعطل کی میعاد کتنی ہے۔

نہر زبیدہ کی صفائی کے لیے چندہ سے جو رقم کثیر فراہم ہوتی ہے اُسکو حسین نے اپنی تجارت میں لگادیا ہے اور دو تجارتی جہاز خرید لیے ہیں جو ساحل عرب کے مختلف چھوٹے چھوٹے بندرگاہوں کے درمیان مالِ تجارت اور مسافروں کو لاتے لیجاتے ہیں۔

غرضکہ ہر طرح پر باشندگان حجاز کو لوٹ کر حسین اپنا گھر بھر رہا ہے۔ اور جو کام کرنا چاہتا ہے اُسکے کرڈالنے میں اُسے ذرا باک نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی اپنا ظاہری تقدس بنائے رہتا ہے، بات بات پر قرآن و حدیث نوک زباں ہے۔ اور جب کوئی بیرونی شخص آتا ہے تو اُس سے خود ہی درخواست کرتا ہے کہ اگر شہر میں کوئی بات خلافِ شریعت دیکھو تو اُس سے مجھے مطلع کرکے داخل حسنات ہو۔ باہر والوں کو اس طرح اپنی چرب زبانی سے اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے اور موقع پڑے تو دو چار کو سزائیں دیکر اپنی نیک نیتی اور خواہش اصلاح کا بھی یقین دلا دیتا ہے۔

بدوؤں کے جتنے بڑے بڑے قبائل ہیں اُنکے سرداروں کو روپیہ دیکر اور شہر میں بلا کر اپنا مقرب مہمان اور حقیقتاً اپنا قیدی بنا کر اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ اور تھوڑی سی فوج اور پولیس کے ذریعہ ایسی دھاک بٹھا رکھی ہے کہ کوئی شخص چوں نہیں کرسکتا۔

حجاج پر کبھی کسی قسم کا محصول نہ تھا - اس نے بھی ظاہر میں حجاج پر کوئی محصول نہیں باندھا لیکن تمام مطوفین کو اپنے قابو میں کرکے اونٹوں کے متعلق جملہ انتظامات اپنے تحت میں کرلیے ہیں اور اونٹ کے کرایہ میں کثیر اضافہ کردیا ہے۔ اس طریقہ پر باہر کے آنے والے حجاج سے تقریباً ما صدعت فی کس حکومت کو مل جاتا ہے - اسکے علاوہ اگر کوئی حاجی مرجائے تو اُسکا کل سامان بیت المال میں داخل کرالیا جاتا ہے۔ اب اگر اُسکا کوئی وارث موجود ہے اور وہ اُس مال کو واپس لینا چاہے تو اول تو یہ کوئی آسان کام نہیں، دوسرے جب اُسکو واپس ملتا ہے تو مختلف رسومات کے نام سے ایک حصہ اُس کا خزانہ سرکاری میں داخل کرالیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی وارث نہ کھڑا ہوا یا پوری کوشش واپسی کی نہ کرسکا تو پھر سب کا سب مال ہضم ہوجاتا ہے۔

انگریزوں کا بظاہر دوست ہے مگر اُنکو بھی دن رات پریشان رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُسکی مرضی کے مطابق چلیں - عربی زبان کی تحریر و تقریر دونوں میں اس درجہ کمال حاصل ہے کہ جب اُسکی کوئی تحریر یا تقریر سند کے طور پر پیش کیجاتی ہے تو ہمیشہ اُسکے نئے معنے بتا کر اپنا مطلب پورا کرلیتا ہے۔

ایک سال حجاج کی خدمت کے بہانہ سے انگریزوں نے ایک فوجی اسپتال بھیجا۔ حسین نے جملہ مطوفوں کو بلا کر حکم دے دیا کہ اگر کسی مطوف کا کوئی حاجی اس اسپتال میں جائیگا تو اُسکی جان کی خیر نہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری اسپتال خالی پڑا رہا اور دوسرے سال انگریزوں کو اسپتال بھیجنے کی جرأت نہ ہوئی۔

پھر انگریزوں نے اپنا ایک نائب قنصل (کپتان عجب خاں سرحدی) مکہ معظمہ میں رکھنا چاہا۔ اور ان صاحب نے ہندوستانی حجاج کے معاملات میں مداخلت کرنا چاہی تو ایک طرف تو اُسنے انکے اوپر جاسوسوں کا ایسا سخت پہرہ بٹھایا کہ اہل مکہ میں سے کسی کو ان سے ملنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ حرم شریف تک میں لوگ اُن سے بچکے بچکے رہتے تھے، اور دوسری طرف مطوفین کو اشارہ کردیا کہ ذرا کسی معاملہ میں یہ دخل دیں اور فوراً انکی خدمت کردی جائے - چند ہی ماہ کے بعد جناب خاں صاحب بہادر کو اپنی آبرو لیکر ہندوستان بھاگ جانے میں ہی اپنی خیریت نظر آئی اور اس طرح کہ معظمہ کے نائب قنصل یا نمایندۂ حکومت برطانیہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

دربار میں حسین جس وقت بیٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کا دربار ہے۔ دروازہ پر ایک پہرہ دار ضرور کھڑا رہتا ہے مگر وہ صرف نمائش سطوت کے لیے ہے۔ اُسکو کسی کے روکنے کا

حق حاصل نہیں ہے۔ ہر شخص بغیر کسی روک ٹوک کے حسین کے پاس جا سکتا ہے اور حسین سے اپنا مطلب و مدعا بیان کر سکتا ہے۔ دربار کے کمرہ میں بھی سوائے سادگی کے کوئی بات قابل لحاظ نہیں معلوم ہوتی عام شرفائے مکہ کی مجلسوں یا ملاقات کے کمروں کی طرح چاروں طرف یہاں بھی اونچے اونچے کوچ بچھے ہوئے ہیں۔ ایک دریچہ کے پاس حسین اپنے سادہ لباس میں جو عام شرفائے مکہ سے صرف حریر کی عدم موجودگی کی وجہ سے ممتاز ہے بیٹھا رہتا ہے۔ پاس ہی قلمدان رکھا رہتا ہے۔ لوگ آتے رہتے ہیں اور یا سیدی یا سیدی کہکر ہاتھ کو بوسہ دیتے اور سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ علما اور معززین کو حسین اشارہ سے یا اجلس کہکر کوچوں پر بٹھا دیتا ہے باقی لوگ کھڑے کھڑے جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہتے ہیں اور جواب پا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ جب ذرا ملاقاتیوں کا ہجوم کم ہو جاتا ہے تو خدام و پیشکاران دربار کاغذات لاتے ہیں اور حسین اپنے قلم سے سب پر احکام لکھتا ہے۔ صبح سے ظہر تک ملاقاتیوں اور کاغذات دونوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دربار کے کمرہ کے متصل ایک کمرہ ہے جس میں سے ہو کر لوگ دربار میں آتے ہیں۔ یہیں چند سیہ فام غلام کمر میں سنہرے روپہلے اور رنگا جمنی قبضوں اور رنگ برنگ مخملی میانوں کے پیش قبض (خنجر) لگائے اور حریر کے لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے حاضر رہتے ہیں۔ جب حسین کو ضرورت ہوتی ہے تو ذرا آہستہ سے تالی بجاتا ہے اور ان میں سے کوئی ایک اندر آکر حکم سن لیتا ہے اور فوراً ہی تعمیل ارشاد کے لیے بھاگتا ہے۔

حسین کے دربار میں آنے سے پہلے لوگ اسی کمرہ میں بیٹھ کر حسین کی آمد کا انتظار کرتے ہیں۔ میں جب پہلی مرتبہ گیا تو ہجوم بہت زیادہ تھا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ اس ہجوم میں کوئی اطمینانی ملاقات نہیں ہو سکتی، واپس چلا آیا۔ دوبارہ گیا تو ہجوم میں کمی تھی، پھر بھی اتنا مجمع تھا کہ جب میں دربار کے کمرہ میں داخل ہوا تو حسین کے سامنے بدووں کی ایک ٹولی کی ٹولی کھڑی تھی۔ ایک عہدہ دار کے اشارہ کرنے پر میں ایک کوچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب سب بدو سامنے سے رخصت ہو گئے تو میں پاس گیا۔ شریف نے اپنے قریب کے ایک کوچ پر بٹھا لیا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا کہ میں آپ سے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے تھوڑا مخصوص وقت چاہتا ہوں اور ایک ترجمان ——— فوراً تالی بجی، ایک غلام آیا اور اسکے ہمراہ میں روانہ کیا گیا۔ اس نے لیجا کر مجھے صدر المطوفین سے ملایا جنھوں نے ایک ترجمان (مطوف) کے ذریعہ پہلے تو مجھ سے دیر تک میری ملاقات کا مقصد دریافت کیا۔ مگر جب میں نے اپنا مقصد با وضاحت ظاہر نہ کیا تو پھر مجھ کو مشورہ دیا کہ دار القضا میں جا کر عبد اللہ سراج قاضی القضاۃ سے ملوں۔ صدر المطوفین

کے انداز و گفتگو سے مجھ کو یہ محسوس ہوا کہ وہ ڈرتے ہیں کہ مجھ کو اپنے مطوف سے کچھ تکلیف پہونچی ہے اور اسکی شکایت حکومت سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُنکو یقین دلایا کہ میرے تعلقات اپنے مطوف عبدالقادر سکندر اور اُنکے بیٹوں سے بہت اچھے ہیں اور مجھ کو اُنکے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے۔ مگر غالباً اُنھوں نے اسکو باور نہیں کیا اور اسلیئے مجھ کو ٹالنا چاہا۔ جب بعض احباب سے ذکر آیا تو اُنھوں نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور اُنکے مشورہ سے میں فواد خطیب وزیر خارجہ سے ملا اور اُن سے ملکر کہا کہ میں شریف صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ فواد خطیب انگریزی جانتے ہیں اسلیئے اُن سے ملاقات میں بہت آسانی ہوئی۔ وہ بہت اخلاق سے ملے۔ میرے کھدر کے لباس کو دیکھکر اپنی پسندیدگی و مسرت کا اظہار کیا۔ اور ہندوستان کے حالات پر دیر تک گفتگو کرتے رہے اور وعدہ کیا کہ میں آپ کی ملاقات صاحب جلالۃ الملک سے جلد کرا دوں گا۔ مگر اسکے بعد بھی کئی دن تک شریف صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ غلاف کعبہ کے ساتھ مصر سے جو قافلہ آتا تھا اُسکی واپسی کے باعث معاملات کسی قدر پیچیدہ ہو رہے تھے اور شریف صاحب بہت مصروف تھے۔ اسی اثناء میں ایک دن کے لیے اُنکو جدہ جانا پڑا۔ میرے لیے یہ موقع اچھا تھا کہ میں اسی بہانے متعدد بار وزارت خارجہ میں گیا اور ہر دفعہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہرا۔ اور اس اثنا میں نہ صرف فواد خطیب سے اطمینانی گفتگوئیں ہو سکیں بلکہ متعدد دوسرے ارکین حکومت سے ملنے، اُنکی بات چیت سننے اور آپس کے طور طریقوں کو دیکھنے کا بھی موقع ملا۔

بالآخر کئی دن کے بعد شریف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایک مطوف ترجمانی کر رہا تھا۔ معمولی مزاج پرسی اور رسمی باتوں کے بعد جب میں نے اصل مدعا پر گفتگو شروع کی تو مجھے جلد محسوس ہوا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں مترجم صاحب اُسکا آٹھواں حصہ بیان کرتے ہیں اور سات حصے غائب کر دیتے ہیں۔ اور خود شریف صاحب میرے ہر ایک جملہ کے جواب میں تقریباً پانچ سات منٹ گفتگو فرماتے ہیں۔ اور اُس میں جیسا کہ مجھ سے دوستوں نے کہا تھا زیادہ حصہ قرآن و حدیث کے حوالوں کا ہوتا ہے۔ میں نے یہ خیال کرکے کہ حجاج کی تکالیف کے متعلق جو کچھ مجھ کو کہنا ہے وہ اس مطوف ترجمان کی معرفت شریف تک نہیں پہونچ سکتا، نصف گھنٹہ کی ملاقات کے بعد یہ کہا کہ بہتر ہوگا کہ جو کچھ اس بارہ میں مجھے کہنا ہے اُسکی تحریری یادداشت میں آپ کو دیدوں اور کوئی ایسا مترجم تلاش کروں جو پوری طرح حق ترجمانی ادا کر سکے۔ شریف صاحب نے اسکو پسند کیا اور کہا کہ پھر جب چاہو آؤ اور جس مترجم کو مناسب سمجھو ساتھ لاؤ۔

(باقی دارد)

حضرت محبوب الٰہی محمد نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جاں ہا خراب کردہ

ارباب مشاہدہ کے سردار۔ اصحاب مجاہدہ کے سالار۔ خواجہ راستاں۔ ملک الفقرو المساکین۔ سلطان المشائخ والمحبوبین۔ قطب وقت مجمع اسناد وارشاد۔ حجۃ اللہ علی العباد۔ مبین فرع واصول، جامع معقول ومنقول۔ وارث انبیا ومرسلین شیخ نظام الحق والشرع والدین قدس سرہ العزیز۔ آپکا اسم مبارک محمد بن احمد بن علی البدایونی البخاری ہے۔ صاحب نفحات الانس نے آپ کو خالدی لکھا ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت خالد کون تھے جن کی طرف آپ کی نسبت کی ہے۔ صاحب سفینۃ الاولیا آپ کا نسب یوں لکھتے ہیں "نام ایشاں محمد بن احمد بن دانیال بدایونی ست" صاحب مرأۃ الاسرار نے بجائے دانیال کے علی لکھا ہے۔ دانیال ممکن ہے کہ آگے چل کر اس سلسلہ میں کسی کا نام ہو گا مگر انکے دادا کا نام علی صحیح ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب سید جلال الدین مخدوم جہانیاں گشت سے ملتا ہے۔ آپ کے اجداد بخاری تھے لیکن ہندوستان تشریف لاکر بدایوں (روہیلکھنڈ) میں سکونت اختیار کی اس لیے بدایونی کہے جاتے ہیں۔

شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ مرأۃ الاسرار میں آپ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "وہ محبوب خدا وسرحلقۂ اولیا، اہل صفا تھے اور عشق کامل، شوق وافر، وجد صادق، قوی حال اور بلند ہمت رکھتے تھے۔ انبیا علیہم السلام کے بعد اس قسم کے صوری ومعنوی تصرفات اس طائفہ میں کسی کو میسر نہ ہوئے۔ آپ تمام مقامات غوثی وقطبی وفردانیت سے گذر کر مرتبہ محبوبی پر پہونچے۔ آپ کے اقوال وافعال جمیع مشائخ کے لیے حجت قاطع ہیں اور اس فن میں الیٰ یومنا سب آپ کی پیروی کرتے ہیں اور جب تک عالم ہے کیے جائیں گے۔ اس چاردانگ وسعت آباد ہندوستان کو نور ولایت سے آپنے منور فرمایا اور ایک عالم کے لیے سبب ہدایت ہوے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو سلطان المشائخ کے خطاب سے ممتاز فرمایا اور کرامت کا تاج آپ کے اور آپ کے پیروؤں کے سر پہ رکھا۔ آپ کے تصرفات اظہر من الشمس ہیں اور کوئی اُن سے انکار نہیں کر سکتا۔"

میر سید محمد کرمانی قدس سرہٗ نے آپ کے مفصل حالات کتاب سیر الاولیا میں لکھے ہیں۔ وہ

کاتب حروف کی نظر سے نہیں گزری۔ دوسری کتابوں میں اسکے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ اور جو کچھ مرأة الاسرار۔ اخبار الاخیار۔ نفحۃ الانس۔ مرأة ضیائی۔ راحت القلوب۔ فوائد الفواد۔ افضل الفوائد اور سفینۃ الاولیاء میں نظر سے گذرا اُن سے یہ مختصر گلدستہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

دل خواست کہ در عبارت آرد وصفِ رخ او بہ استعارت
شمع رُخ او زبانہ زد ہم عقل بسوخت ہم عبارت

آپ کے اجداد نے بخارا سے تشریف لاکر لاہور میں سکونت اختیار فرمائی۔ وہاں سے آپ کے دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب معہ اہل و عیال بدایوں تشریف فرما کر سکونت پذیر ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں میں باہم قرابت واقع ہوئی۔ خواجہ عرب کی ایک صاحبزادی بی بی زلیخا تھیں وہ خواجہ احمد بن علی کے نکاح میں آئیں۔ خواجہ احمد زیورِ دیانت و صلاح سے بدرجۂ کمال آراستہ تھے۔ اسلیے سلطان عہد نے بدایوں کی قضاۃ آپ کے تفویض فرمائی۔ آپ کا مزار پاک بدایوں میں اس وقت تک زیارتگاہ خاص و عام ہے۔ صاحب مرأة الاسرار فرماتے ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ ازاں دو صدف پاک دُرِ کانِ کرامت و سرمایۂ عشق و محبت سلطان المشائخ را بہ وجود آورد۔

آپ کی ولادت مبارک ۲۷۔ صفر ۶۳۶ھ (چھ سو چھتیس ہجری) کو بمقام بدایوں واقع ہوئی۔ ابھی آپ صغیر سن ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا

آفریں از خدائے بر پدرے کہ از و ماند ایں چنیں پسرے

غرضکہ اس دُرِ یتیم نے اپنی ماں کے گود میں پرورش پانی شروع کی۔ جب کسی قدر بڑے ہوئے تو مکتب میں بٹھایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے قرآن پاک ختم کر لیا اور کتب متداولہ شروع کیں بارہ سال کی عمر میں علم لغت پڑھتے تھے۔ مولانا شمس الملک جو اس زمانہ میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے اُن سے مقامات حریری پڑھی اور سند حاصل کی۔ حدیث میں مشارق الانوار حفظ فرمائی اور محدثینِ وقت سے گوئے سبقت لے گئے۔ علم تفسیر، ہیئت، ہندسہ، فقہ اور اصول بھی اپنے زمانہ کے مشاہیر سے حاصل کیا۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ آپ علما اور فضلاء وقت کی صحبت میں ہمیشہ رہتے تھے۔ اور نظام الدین بحاث کہلائے جاتے تھے۔ لیکن باوجود اسکے آپ کا دل حق منزل ہمیشہ علوم باطن کی تحصیل کی طرف جھکا رہتا تھا اور چاہتے تھے کہ اس صحبت سے نکل کر نور حقیقی کا نظارہ کریں۔

حضرت سلطان المشائخ خود فرماتے ہیں کہ "میں ابھی چھوٹا ہی تھا۔ کم و بیش اندازاً بارہ سال کی عمر ہوگی کہ علم لغت پڑھتا تھا ابوبکر خراط (جنھیں ابوبکر قوال بھی کہتے ہیں) ملتان سے میرے اُستاد

کی خدمت میں آئے اور پہلے شیخ بہاء الدین زکریا کے کمالات بیان کیے، مگر میرے دل پر کچھ جمے نہیں۔ اسکے بعد حضرت گنجشکرؒ کی بزرگی بیان کی۔ آپ کا نام پاک سنتے ہی میں بے اختیار ہولیا اور آپ کی محبت میرے دل پر مستولی ہوگئی۔ حتی کہ ہر نماز کے بعد آپ کے نام کی تسبیح پڑھتا تھا۔ اور دس بار شیخ فرید اور دس بار مولانا فرید نام لیکر سوتا تھا۔ جب سولہ سال کی میری عمر ہوئی تو اپنی والدہ اور چھوٹے بھائی کے ساتھ دہلی کا ارادہ کیا۔ جب شہر میں داخل ہوا تو اتفاقاً شیخ نجیب الدین متوکلؒ جو حضرت گنجشکرؒ کے بھائی تھے اُنکے پڑوس میں مکان لیا اور آپ کی صحبت کی وجہ سے روز بروز حضرت گنجشکرؒ کی پابوسی کا اشتیاق بڑھتا جاتا تھا۔ مگر تین چار سال اور شہر میں رہنا ہوا اور بڑی کوشش سے میں نے تعلیم حاصل کی اور علم حدیث کی سند لی۔"

سیر العارفین میں ہے کہ جب آپ کی تحصیل علوم ختم ہوگئی اور علماء شہر میں امتیاز حاصل ہوا تو ایک روز شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے پاس تشریف لیگئے اور التماس فاتحہ کرکے عرض کی کہ دعا فرمایئے میں کسی جگہ کا قاضی ہو جاؤں اور خلق کو نفع پہونچاؤں۔ شیخ نے فرمایا خدا نہ کرے تم قاضی ہو بلکہ تم وہ ہو جاؤ جو ہم جانتے ہیں۔ اسکے چند روز کے بعد حضرت گنجشکرؒ کی پابوسی کا شوق غالب ہونے لگا۔

منقول ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہؒ کا جب اخیر وقت قریب آیا تو آپ رونے لگے اور فرمانے لگے کہ مجھے آپ کس کے سپرد کیے جاتی ہیں۔ آپ خاموش رہیں۔ دوسرے روز علی الصباح آپکو بلایا اور ہاتھ پکڑ کر کہا اے اللہ میں تیرے سپرد کرتی ہوں۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شئی قدرا۔

صاحب نفحات الانس فرماتے ہیں کہ آپ تحصیل و تکمیل علوم دینی سے فارغ ہونے کے بعد ایک شب جامع مسجد دہلی میں مقیم تھے کہ نماز صبح کے وقت موذن نے منارہ پر چڑھ کر یہ آیت پڑھی الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ۔ یہ آیہ پاک سُن کر آپ کی حالت متغیر ہوگئی۔ جب صبح ہوئی تو بے زاد و راحلہ حضرت شیخ فرید الدین گنجشکر کی ملازمت کی نیت سے چل کھڑے ہوئے۔ اُس وقت آپ کا سن مبارک تقریباً بیس سال کا تھا عین جوش جوانی و عروج شباب کا زمانہ تھا کہ تمام مرادات سے ہاتھ اُٹھاکر اس راہ میں قدم ڈالا۔

راحت القلوب میں خود فرماتے ہیں کہ چہار شنبہ کا روز رجب کی دسویں ۶۵۵ھ (چھ سو پچپن ہجری) تھا کہ دعاگوئے مسلمانان سلطان الطریقیہ فی الارض کا ایک غلام نظام احمد بداؤنی جو اس مجموعہ کا جمع کرنے والا ہے سید العابدین حضرت شیخ فرید الدین گنجشکر مسعود اجودھنی قدس سرہ العزیز کے شرف قدمبوسی

سے بہرہ مند ہوا۔ اُسی وقت آپ نے کلاہ چار ترکی جو سر مبارک پر تھی دعا گو کے سر پر رکھدی اور خرقہ خاص و نعلین چوبیں عطا فرمائیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میں چاہتا تھا کہ نعمت سجادہ اور ولایت ہندوستان کسی دوسرے کو دوں، لیکن تو راہ میں تھا۔ اُسوقت میرے سر میں (ہاتف نے) ندا کی کہ ٹھہرو نظام بداؤنی آتا ہے یہ ولایت اُسے دینا۔ دعا گو نے چاہا کہ پا بوسی کا اشتیاق جو حد سے زیادہ تھا کچھ اُسکا حال عرض کرے مگر دہشت حضور کی اسقدر غالب ہوئی کہ کچھ عرض نہ کر سکا۔ یہ دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ تمھارا اشتیاق جتنا کہ کہتے ہو اُس سے زیادہ ہے اور دعا گو کے مناسب حال یہ بیت زبان مبارک سے فرمائی

"اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ"

حضرت سلطان المشائخ اس دفعہ اپنے پیر دستگیر کی خدمت میں ۱۵۔ رجب ۶۵۵ھ ہجری سے ۔۔ ربیع الاول ۶۵۶ھ ہجری تک یعنی سات مہینے اور سترہ اٹھارہ دن رہے۔ اس کل مدت میں حضرت گنجشکرؒ نے جو پند و نصائح فرمائیں وہ سب راحت القلوب میں موجود ہیں جو حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات ہیں اور حضرت سلطان المشائخؒ نے خود مرتب فرمائے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں تنہا تھے خود فرماتے ہیں کہ "دعا گو نشستہ کس می راند گنجشکر بیدار شد فرمود یاراں کجا اند گفتم میلولہ کردہ اند فرمود بیا تا ترا چیزے گویم۔ آغاز کرد چو در دہلی بروے در مجاہدہ باشی بیکار بودن ہیچ نیست روزہ داشتن نیمہ راہ است۔ واعمال دگر چوں نماز و حج نیمے راہ" ایک مرتبہ کا اور ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ نے فرمایا کہ "من از حق تعالیٰ خواستہ ام ہر چہ تو از حق بخواہی بیابی" ایک وقت کا حال بیان کرتے ہیں کہ حضرت گنجشکرؒ سر برہنہ۔ بشرۂ مبارک متغیر۔ حجرۂ خاص میں یہ اشعار پڑھ رہے تھے

"خواہم کہ ہمیشہ در رضائے تو زیم خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ ز کونین توئی از بہر تو میریم و از برائے تو زیم"

یہ ابیات پڑھتے اور سر مبارک سجدہ میں لیجاتے۔ میں نے یہ دیکھ کر سر قدموں پر رکھدیا۔ آپ نے کمال مہربانی سے فرمایا "مانگو کیا مانگتے ہو؟" میں نے استقامت طلب کی۔ شیخ نے عطا فرمائی۔

ایک مرتبہ کا اور ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ نے میرے دہن میں اپنا لعاب مبارک دیکر حفظ کی وصیت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ نظام۔ اللہ نے دین و دنیا دونوں دیے ہیں یہاں سب کچھ ہے۔ جاؤ ہندوستان کا ملک لو۔ اور خلافت دے کر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تجھے علم و عقل د

عشق عطا فرمایا ہے۔ جس کسی میں یہ تین صفتیں ہوں وہی شایان خلافت ہے۔

غرضکہ دوسری ربیع الاول ۶۵۶ھ کو آپ کو نعمت خلافت و سجادگی حاصل ہوئی جسکا حال راحت القلوب میں آپ خود اس طرح لکھتے ہیں "دوسری ربیع الاول ۶۵۶ھ کو دولت قدمبوسی حاصل ہوئی۔ اس بندہ کو خلعت خاص مرحمت فرمایا، دوسرے عزیز اہل صفا بھی حاضر تھے زبان مبارک سے فرمایا نظام الدین کو ہم نے ہندوستان کی ولایت دی اور صاحب سجادہ کیا۔ آپ کے ارشاد پر میں نے دوبارہ سر جھکایا اور زمیں بوسی کی۔ حکم ہوا اسے جہانگیر عالم سر اٹھا۔ آپ کے فرق مبارک پر حضرت شیخ قطب الدینؒ کی دستار تھی وہ عطا فرمائی۔ عصا دیا۔ خرقہ اپنے ہاتھ سے پہنایا۔ پھر فرمایا کہ دوگانہ ادا کر۔ جب میں روبقبلہ ہوا تو ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا تجھے خدا کو سونپا۔"

اسکے دوسرے روز آپ کو رخصت کیا اور فرمایا کہ پہلے ہانسہ جانا اور مثال خلافت شیخ جمال الدین کو دکھلانا۔ اسکے بعد دہلی جانا وہاں قاضی منتخب کو بھی دکھلانا۔ چنانچہ آپ کی خدمت سے روانہ ہوکر میں پہلے ہانسے پہونچا اور شیخ جمال الدینؒ ہانسوی کو خلافت نامہ دکھلایا۔ آپ نے بہت بشاشت و ملاطفت کا اظہار فرمایا اور یہ اشعار پڑھے

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس　　که گوہر سپارد بہ گوہر شناس

اسکے بعد تقریباً ۱۲ سال حضرت گنجشکرؒ اور بقید حیات رہے لیکن خود حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی سے جاکر تین مرتبہ عالم حیات میں قدمبوس ہوا ہوں اور سات مرتبہ بعد وفات مزار مبارک کی زیارت کی ہے۔

حضرت سلطان المشائخ تربیت حاصل کرنے کے بعد سلوک و ریاضت میں مشغول ہوئے مگر ابھی علم کا شوق باقی تھا اس لیے ایک دن حضرت شیخ علیہ الرحمہ سے التماس کیا کہ اگر حکم ہو تو ترک تعلم کردوں۔ آپ نے فرمایا میں کسی کو تعلیم سے منع نہیں کرتا دونوں کام کیے جاؤ۔ ان میں سے جو غالب ہوگا وہ رہ جائے گا۔ اسکے چند روز بعد شغل باطن میں آپ کو اسقدر استغراق ہونے لگا کہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ خود جاتا رہا۔

جائے کہ سلطاں خیمہ زد غوغا نماند عام را

سیر الاولیاء میں ہے کہ جب آپ حضرت شیخ کی خدمت سے واپس ہوکر دہلی پہونچے تو چند روز کے بعد ہی اس قدر خلائق کا ہجوم ہوا کہ تنگ آگئے خیال ہوا کہ کسی گوشۂ صحرا میں جا رہیں لیکن اتنے

نہ ملی اور اشارۂ غیبی سے موضع غیاث پور میں جو دریائے جمنا کے کنارے ہے چند جھونپڑیاں ڈال کر قیام فرمایا اور وہیں ساری عمر گذار دی۔ نواب عماد الملک کے وکیل ضیاء الدین نے آپ کے لیے ایک بڑی خانقاہ تیار کی اور آپ کے متعلقین کے لیے ایک حویلی تعمیر کرائی۔ لیکن اس سے پہلے آپ پر سخت فقر و فاقہ کا زمانہ گذرا ہے۔ چنانچہ خود ایک مرتبہ کا حال بیان فرماتے ہیں کہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ایک من خربوزے دو جیتل کو ملتے تھے۔ ساری فصل گذر گئی اور میں نے ایک پھل بھی نہ چکھا۔ اتفاقاً ایک روز ایک آدمی کئی خربوزے اور روٹیاں میرے پاس لایا۔ جسے میں نے فرستادہ خدا سمجھ کر لے لیا۔ لیکن پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ فتوحات کے دروازے کھل گئے اور بکثرت تحفۂ و تحائف خدمت مبارک میں آنے لگے۔ لیکن جو کچھ آتا آپ شام تک سب صرف فرما دیتے اور جو لوگ کوئی چیز لاتے اُس سے بہتر اُنھیں خود عطا فرماتے۔

سلطان معز الدین کیقباد کا جب زمانہ آیا تو اُس نے بھی اتفاق سے غیاث پور کو پسند کیا اور اُسکے قریب سکونت اختیار کی اس وجہ سے امیر اُمراء اور خلائق کا ہجوم اور بڑھ گیا۔ چونکہ اس سے آپ کو سخت نفرت تھی اس لیے ارادہ کیا کہ کہیں چلدینا چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اس اندیشہ میں تھا کہ ایک حسین جوان دبلا پتلا اُسی روز میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا

آں روز کہ مہ شدی نہ می دانستی کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

امروز کہ زلفت دل خلقے بربود در گوشہ نشستنت نمی دارد سود

پھر کہا کہ پہلے تو مشہور ہی نہ ہونا چاہیے لیکن اگر مشہور ہوگئے تو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ کل قیامت کے روز رسول خدا صلعم سے شرمندگی نہ ہو۔ یہ بھی فرمایا کہ یہ بھی کوئی حوصلہ ہے کہ خلق اللہ سے کنارہ کرکے گوشہ گیری اختیار کی جائے۔ قوت و حوصلہ اس کا نام ہے کہ با وجود اژدہام خلق کے مشغول بحق رہیں۔ یہ نصیحت سُن کر پھر میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ تیسری مرتبہ میں رمضان مبارک ۶۶۹ھ (۶۶۸ھ؟) میں اجودھن گیا۔ حضرت گنجشکرؒ سے وہ آخری ملاقات تھی۔ جب واپس ہونے لگا تو میری طرف منہ کرکے فرمایا اللہ تعالیٰ تجھے نیک بخت کرے اسعدک اللہ فی الدارین و رزقک اللہ علماً نافعاً و عملاً مقبولاً۔ اور فرمایا کہ تم ایسے درخت ہوگے جسکے سایہ میں ایک خلق آرام پائیگی۔ حصول استعداد کے لیے مجاہدہ برابر کرتے رہنا۔

دہلی میں آپ کا ایک گھر غیاث پور میں تھا اور ایک کیلوکھڑی میں۔ جمعرات کے دن کیلوکھڑی

آتے جمعہ کی نماز وہیں ادا فرماتے ۔ اسکے بعد غایث پور جاتے ۔ صاحب مرأۃ الاسرار بحوالہ سیرالاولیاء لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے آغاز جوانی میں تیس سال تک سخت مجاہدے کیے ہیں ۔ اسکے بعد بھی اخیر عمر تک مجاہدوں کا سلسلہ رہا ۔ اور باوجودیکہ فتوحات بکثرت آتی تھیں اور دنیا کی مال ومتاع بے اندازہ تھا لیکن ذات پاک ان سب آلائشوں سے منزہ تھی ۔ بڑھاپے میں گو اسی برس سے سن مبارک گذر چکا تھا لیکن نماز جماعت کے لیے بالائے بام سے نیچے تشریف لاتے ۔ اور صوم دوام رکھتے اور افطار کے وقت ایک روٹی یا آدھی روٹی، کچھ ترکاری یا کسی قدر چانول تناول فرماتے ۔ پھر بڑے دسترخوان پر تشریف لاتے اور ہر شخص کو دست مبارک سے کچھ نہ کچھ مرحمت فرماتے ۔

افطار کے بعد جب آپ بالائے بام تشریف لیجاتے تو جو لوگ قدمبوس ہونا چاہتے یا شہر و اطراف سے حاضر ہوتے مغرب وعشاء کی نماز کے وقت موقع پاتے اور چند ساعت اس گنجینۂ عشق وہدایت کے شرف جمال وسعادت مجالست سے بہرہ اندوز ہوتے ۔ اسکے بعد طرح طرح کے میوہ جات تر وخشک لطیف ولذیذ سامنے لائے جاتے اور ان لوگوں کو تقسیم ہوتے ۔ ہر ایک کی آپ دلداری فرماتے اور بعض اوقات ان کا ساتھ دینے کے لیے کچھ آپ بھی تناول فرما لیتے ۔ اور خود ہر ایک کا حال پوچھتے ۔ اسکے بعد نماز عشاء کے لیے نیچے جماعت خانہ میں تشریف لاتے اور بعد فراغ پھر اوپر تشریف لیجاتے اور ایک عرصہ تک مشغول بحق رہتے ۔ پھر جب استراحت کے لیے چارپائی پر قدم رکھتے تو آپ کے خادم خواجہ اقبال جنھیں پیار میں لالا کہا کرتے تھے تسبیح دست مبارک میں دیتے اس وقت سوائے امیر خسرو کے کسی کو سامنے جانے کی مجال نہ ہوتی ۔ حضرت امیر خسرو طرح طرح کی باتیں کرتے اور آپ اُن کی خاطر سر مبارک ہلاتے جاتے ۔ اور کبھی کبھی خود پوچھتے کہ اے ترک یہ کیا چیزیں ہیں ۔ خسرو اس قدر ہمت پا کر خوب گل فشانی کرتے ۔ اسی وقت خورد و قرابت دار اور مولا زادے جو محل میں ہوتے قدمبوسی کے لیے حاضر ہوتے ۔

نخفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شبہا　　　کہ دیدہ برکف پایت نہد بخواب شود

پس جب امیر خسرو اور خورد و قرابت دار باہر آجاتے تو خواجہ اقبال وضو کے لیے آفتابہ حاضر کرتے اور خود باہر چلے جاتے ۔ صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ دراں محل جز ذات باہمہ جمال حق کسے دیگر نبودے ۔ تمام شب چہ رازہا وچہ نیازہا وچہ ذوقہا با حق داشتے چنانکہ این بیت بزبان مبارک راندے ۔

عشقے کہ ز تو دارم اے شمع چگل دل داند و من دانم و داند دل

جب سحری کا وقت ہوتا تو خواجہ عبدالکریم حاضر ہو کر دستک دیتے۔ سلطان المشائخ دروازہ کھول دیتے اور کسی قدر سحری تناول فرماتے۔ باقی سحریوں کے لیے رہنے دیتے۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ کچھ نہیں تناول فرماتے اور تہجد ادا فرما کر شغل باطن میں مصروف ہو جاتے۔ جب صبح ہوتی تو ادائے نماز فجر کے لیے نیچے اُترتے اور اشراق و چاشت کے بعد جماعت خانہ میں تشریف رکھتے۔ اُس غایت استغراق شغل باطن سے چشمہائے مبارک بہت سرخ ہوتیں اور جو کوئی دیکھتا یہ سمجھتا کہ گویا شراب سے مست ہیں۔

من مست خراباتم کانجا قدح و مے نے صد شور سماع آنجا لیکن زدف و نے نے

کسی شخص سے یہ روایت نہیں پہونچی کہ آپ رات کو چار سو پانچ سو رکعت نماز پڑھتے ہونگے یا اس قدر ورد فرماتے ہونگے۔ مگر خلا و ملا میں شغل باطن سے ہمیشہ الفت رہتی تھی۔ جب سجادۂ مبارک خواجگان چشت پر جلوہ فرماتے تو ہر قسم کے لوگ کیا امرا و کیا بادشاہ کیا علما و شعرا کیا درویش و فقیر اور کیا قلندر غرضکہ ہر طرح کے لوگ آکر قدمبوس ہوتے۔ آپ ہر ایک کی دلداری فرماتے اور احوال پوچھتے اور کسی کو اپنی شفقت سے محروم نہیں رکھتے۔ محتاجوں کو زر ولباس وطعام دیتے اور جس قدر تحفہ و ہدیہ آتے سب دے ڈالتے۔ اُسکے بعد قیلولہ فرماتے۔

ظہر کی نماز کے بعد پھر جو عزیز حاضر ہوتے اُنھیں طلب فرماتے اور راہ سلوک و محبت حق جل وعلا کا تذکرہ فرماتے رہتے اور طرح طرح کے حقائق و معارف و کلمات توحید زبان مبارک سے ارشاد فرماتے آپ کے دبدبے سے کسی شخص کی یہ مجال نہ تھی کہ مُنہ سے کوئی لفظ نکالتا۔

خوباں چو بادہ خوارند من جرعہ خوار ایشاں ہر جرعہ کہ خوردہ سر بر زمیں نہادہ

حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ فرماتے ہیں کہ جب یاران محرم حاضر ہوتے اور حضرت سلطان المشائخ سماع کی طرف میل فرماتے تو پہلے امیر خسرو حاضر ہو کر سامنے بیٹھتے۔ انکے دائیں طرف امیر حسن بیٹھتے اور بائیں طرف مبشر جو آپ کے زر خرید غلام تھے۔ بیٹھتے۔ حضرت امیر خسرو غزل شروع کرتے اور جس بیت پر حضرت سر ہلاتے اُسکی تکرار کرتے۔ سماع شروع ہوتا اور آپ تواجد فرماتے۔

آپ لمبین کے زمانہ میں دہلی میں تشریف لائے تھے۔ اسکے بعد آٹھ بادشاہ اور آپ کے سامنے گزرے: معز الدین کیقباد۔ جلال الدین خلجی۔ علاؤ الدین خلجی۔ خضر خاں۔ قطب الدین۔ خسرو خاں۔ غیاث الدین تغلق۔ سلطان محمد تغلق۔ آخر الذکر کے شروع زمانہ میں آپ نے وصال فرمایا۔ تمام

بادشاہ آپ کے حد درجہ معتقد تھے، اِلّا قطب الدّین و غیاث الدّین تغلق۔ قطب الدین نے علاؤالدین کے تینوں بیٹوں خضر خاں، شادی خاں، اور شہاب الدین کو قتل کرایا تھا جو حضرت سلطان المشائخ کے مُرید تھے، اور آپ سے بھی بہ عناد پیش آتا تھا۔ پہلے آپ پر چند الزامات لگائے۔ جب وہ لغو ثابت ہوئے تو مشائخ شہر کو حکم دیا کہ ہر شب ماہ کو سب میرے پاس آیا کریں۔ آپ کو بھی دھمکایا کہ اگر تعمیل حکم نہ کروگے تو بجبر طلب کیے جاؤگے۔ ابھی اسکی نوبت نہیں آئی تھی کہ اُسکے غلام نے جسکا نام خسرو خاں تھا اُسے قتل کر دیا اور تخت شاہی پر بیٹھ گیا۔ اور حضرت کی خدمت میں بہت کچھ زر نقد و تحائف بھیجوائے۔ جب خسرو خاں کو قتل کرکے غیاث الدین تغلق سریر آرا ہوا تو اس نے اُس تمام زر نقد کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا "بیت المال کا تھا مستحقین کو تقسیم کر دیا گیا" اس جواب سے بادشاہ ناخوش ہوگیا، اور آپ کے درپے آزار ہوا۔ چونکہ آپ کو سماع کا بہت شوق تھا اسلیے علماء سے جواز سماع کی بابت فتوے لیا۔ آپ سے جواب طلب کیا۔ آپ نے حدیث نبوی پیش کی۔ علمائے ظاہر نے امام ابو حنیفہؒ کا قول طلب کیا۔ آپ نے فرمایا سبحان اللہ میں قول نبویؐ پیش کرتا ہوں، یہ لوگ قول ابو حنیفہ کو طلب کرتے ہیں۔ پھر آپ نے ایک علمی دلیل سے ان عالموں کو ساکت فرمایا لیکن سلطان کے دل سے غبار نہ نکلا۔ اتفاقاً لکھنوتی میں کچھ فساد کی خبر سُنکر اُس طرف گیا۔ جب وہاں سے واپس ہوا تو کہنے لگا کہ دہلی پہونچکر حضرت شیخ کو باہر نکال دوں گا۔ حضرت سلطان المشائخ کو جب اطلاع ہوئی تو فرمایا ہنوز دلی دُور است۔ قضائے الٰہی سے واقعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ یعنی ابھی دلی میں قدم نہیں رکھا تھا کہ بجلی گری اور اُسکے اثر سے بادشاہ کی ہلاکت واقع ہوئی۔

ایک مرتبہ علاءالدین خلجی نے پانچ سو دینار سُرخ آپ کی خدمت میں بھیجے۔ اُسوقت ایک قلندر اسفندیار نام جو خراسان سے آیا تھا بیٹھا ہوا تھا۔ اشرفیوں کو دیکھکر التماس کرنے لگا کہ الھدایا مشترک آپ نے فرمایا تنہا خوشترک۔ قلندر سمجھا کہ کچھ اور مطلب ہے لیکن آپ نے کل کی کل اُسی کو دیدیں۔

ضیاءالدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتے ہیں کہ عہد علائی کے آخری دس سال کا زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا۔ سلطان نے جمیع منکرات و مناہی و اسباب فسق و فجور کو روک دیا تھا۔ تمام معاصی بند ہوگئے تھے۔ اس زمانہ میں حضرت سلطان المشائخ نے عالم کی بیعت کے لیے دست مبارک کشادہ فرما دیا تھا۔ گنہگار و ہوا پرست آ آکر توبہ کرتے اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہوتے۔ عامۂ خلائق بھی بہ تقلید اعتقاد و عبادات کی طرف راغب ہونے لگے۔ مرد و زن، پیر و جوان، امراء و ارکان دولت، چاکر و غلام، بازاری و عامی، حتٰی کہ کودک خوردسال سب حضرت سلطان المشائخ

کے ہاتھ پر توبہ کرکے نفل نمازیں اور صوم دہر شروع کرتے اور شہر دہلی سے غیاث پور تک صوفیانِ اہل صفا کے سوا کوئی دوسرا فرقہ نظر نہ آتا۔ مسلمان ایک دوسرے سے شرم کرتے اور اصلاً دنیا اور عیش کا ذکر نہ کرتے۔

زین فن مطالب لمبنہ نامی کان ختم شدہ است بر نظامی

صاحب مرأۃ الاسرار کہتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نے اپنی وفات سے تین چار ماہ قبل دس بزرگوں کو مثال اجازت و خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔ اور میر حسین کرمانی کو حکم دیا کہ فرامینِ خلافت پر اپنی مہریں ثبت کریں۔ اور تمام خلفا میں سے حضرت شیخ نصیر الدین محمود اودھی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ تم دہلی کی غمخواری کرو۔ بقول صاحب سیر العارفین جب آپ کا سن مبارک چورانوے سال اور آٹھ ماہ کا ہوا تو بیمار پڑے۔ چند ماہ بیمار رہے۔ مگر سید محمد کرمانی سیر الاولیا میں لکھتے ہیں کہ حضرت کی علالت چالیس روز سے زیادہ نہیں رہی۔ اور وہ بھی کل زمانہ تحیر و مشاہدۂ ذات مطلق میں گذرا۔ علالت کا آغاز یوں ہوا کہ جمعہ کے روز آپ پر حالت وجد طاری ہوئی۔ نمازیں پڑھتے اور سجدہ پر سجدہ فرماتے۔ اسی عالم تحیر میں بخار آ گیا اور رقت طاری ہوئی۔ اور ہر روز چند مرتبہ بے خبری سی پیدا ہونے لگی۔ جب ہوش آتا تو استفسار فرماتے کہ کیا آج جمعہ ہے؟ میں نے نماز پڑھ لی ہے؟ لوگ کہتے کہ پڑھ لی ہے۔ آپ فرماتے کہ پھر پڑھ لوں۔ ایک ایک نماز مکرر ادا فرماتے اور یہ مصرعہ زبان مبارک پر لاتے۔

میرویم و میرویم و میرویم

حضرت امیر خسروؒ اسوقت نہیں تھے بادشاہ کے لشکر کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اگر وہ ہوتے تو نہ معلوم یہ حالت اُن پر کس قدر شاق گذرتی۔ اسی عالم میں حضرت سلطان المشائخ نے تمام اقربا و خدمتگار اور مریدوں کو طلب فرمایا اور خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ جو کچھ نقد و جنس ہو سب تقسیم کر دو۔ ایک پیسہ بھی باقی نہ رہے۔ الغرض چالیسویں روز بعد طلوع آفتاب روز چہارشنبہ اٹھارویں ماہ ربیع الآخر ۷۲۵ھ (سات سو پچیس ہجری) مشاہدۂ حق میں جان تسلیم کی اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

نظام دو گیتی شہ ماو طین سراج دو عالم شدہ بالیقین
چو تاریخ فوتش بجستم زغیب ندا داد ہاتف شہنشاہ دین

۷۲۵ھ

سفینۃ الاولیا میں ہے کہ گو آپ کے خلفا سب ہی ممتاز تھے لیکن ان چار کو سب پر فوقیت حاصل تھی حضرت امیر خسروؒ، حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ (چراغ دہلی)، حضرت برہان الدین غریبؒ اور امیر حسن علاء سنجریؒ۔

آپ نے چونکہ عقد نہیں فرمایا تھا اس لیے کوئی اولاد ظاہری نہیں چھوڑی۔ مولانا عبدالرحمٰن چشتی مرأۃ الاسرار میں فرماتے ہیں کہ آپ کے روضۂ متبرکہ کی خدمت چار فرقوں کے ذمہ ہے۔ ایک خواجہ محمدؒ اور خواجہ موسیٰ بن حضرت شیخ بدرالدین اسحاق قدس سرہٗ کی اولاد، دوم فرزندان خواجہ رفیع الدین ہارون اور خواجہ تقی الدین نوح جو آپ کے خواہرزادہ تھے۔ سوم خواجہ ابوبکر مصلہ دار کی اولاد۔ جنھیں قرابت قریبہ بھی حاصل تھی۔ چہارم فرزندان خواجہ مبشر جو آپ کے خدمتگار و محرم اسرار تھے۔

اب آپ کے چند کلمات طیبات افضل الفوائد اور فوائد الفواد سے تبرکاً و تیمناً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں

لفظ متیں خواجہ را جبل متیں گر فتہ ام — کس نہ رسد بہ چاہ غم جز بسعی ایں رسن
گفتۂ شیخ کردہ شد جمع اُمید آنکہ حق — درگذراند از کرم گفتۂ و کردۂ حسن

(حسن سنجریؒ)

آپ کا ارشاد ہے کہ صوفی کے لیے چار چیزوں سے بچنا ضروری ہے اول دنیا صحبت اغنیا۔ دوم ماسوی اللہ کی یاد اور اُن کا تذکرہ۔ سوم غیر کی طرف نظر کرنا۔ چہارم دل کا میل۔ یعنی حبِّ دنیا سے دل کو پاک و صاف رکھنا چاہیے۔ پھر آبدیدہ ہو کر فرمایا کیا ہی اچھا ہو اگر حجاب درمیان سے اُٹھا دیں۔ بھید ظاہر کردیں اور غیریت دور ہو جائے اور یہ آوازیں کہ بی یبصر بی یسمع دلی ینطق۔

ایک مرتبہ آپ نے زبان مبارک سے فرمایا کہ جب بندہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اُس سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اُسکی قربت میں مست ہو جاتا ہے تو اپنے نفس کو اور ماسوی اللہ کو بھول جاتا ہے۔ اُس وقت اگر اُس سے پوچھا جائے کہ تو کیا چاہتا ہے اور کہاں جا رہا ہے تو وہ اس سے زیادہ جواب نہیں دے سکتا کہ اللہ۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ گناہ سے ایک مرتبہ توبہ کی جاتی ہے مگر طاعت سے ہزار مرتبہ۔ یعنی جس طاعت میں ریا کا میل ہو وہ گناہ سے بھی بدتر ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ جو شخص کسی شیخ یا عالم دین کی بے عزتی کریگا وہ دنیا و آخرت میں منافق یعنی ہوگا۔ نعوذ باللہ منہا۔

ایک مرتبہ اعانت حقوق ہمسایہ کا ذکر تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جب ہمسایہ قرض مانگے تو اُسے دو۔ اگر اُسے کوئی ضرورت ہو تو پوری کرو۔ بیاری میں اُسکی عیادت کرو۔ مصیبت میں غمخواری کرو۔ اور جب مر جائے تو اُسکے جنازہ کی نماز پڑھو اور میت کے ساتھ جاؤ۔

آپ نے فرمایا شرط عیادت یہ ہے کہ تین دن بعد بیار پُرسی کو جائے اور بیٹھ کر نصیحت کرے کہ بیاری کفارۂ گناہاں ہے۔ جس سے اللہ جل شانہٗ محبت نہیں کرتا اُسے بیار نہیں ڈالتا۔ بیار کو صدقہ دینے کی ترغیب دینی چاہیے۔ یہ بھی کفارۂ گناہاں ہے۔

ایک مرتبہ عشق کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی تو زبان مبارک سے یہ شعر فرمایا،

فلو لاکم ما عرفنا الھوےٰ　　　ولولا الھویٰ ما عرفنا کم

یعنی اگر تم نہ ہوتے تو ہم عشق و محبت کو پہچانتے ہی نہیں، اور اگر عشق و محبت نہ ہوتی تو تمھیں بھی نہ پہچان سکتے۔ پھر غلبات شوق میں یہ رباعی زبان مبارک سے ارشاد فرمائی۔

گر عشق نہ بودے و غم عشق نہ بودے　　　چندیں سخن نغز کہ گفتے کہ شنیدے
ور باد نہ بودے سر زلفش کہ ربودے　　　رخسارۂ معشوق بہ عاشق کہ نمودے

پھر آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ عشق کا سُرمہ ایسا ہے کہ جس آنکھ میں ڈالا جاتا ہے وہ عرش سے فرش تک سب کچھ دیکھتی ہے۔

عشق آئینہ است کاندر زنگے نیست　　　نامراداں را ازیں گُل رنگے نیست

ایک مرتبہ شیخ برہان الدین غریبؒ نے پوچھا کہ محبت کی اصلیت کیا ہے۔ فرمایا کہ دوستی کی صفائی۔ محبان حق دنیا و آخرت کے حاصل کرنے میں اپنا شرف نہیں جانتے بلکہ وصول حق کو اپنا شرف سمجھتے ہیں۔

حضرت امیر خسروؒ نے پوچھا کہ محبت میں مصیبت کیوں ہوتی ہے۔ فرمایا اس لیے کہ ہر ایک کمینہ اسکا دعوے نہ کرے۔ پھر فرمایا کہ عشق میں صبر اس بات کا نام ہے کہ رنج و راحت دونوں حالتوں میں اُسے آرام رہے۔ صوفی صادق وہی ہے جو صفا دہوا دونوں میں صوف پہنے۔ جفائے دنیا کا مزہ چکھے۔ تارک دنیا رہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ تمام چیزوں کی کنجی صبر ہے۔ ارادت میں صبر سے کام بنتا ہے۔ جب ارادت درست ہوجاتی ہے تو برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اہل محبت ایسے لوگ ہیں کہ انکے اور حق کے مابین کوئی حجاب نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ کیسے اچھے ہیں جو پہلے ہی روز باخبر ہوجاتے ہیں اور

دوسرے تیسرے دن انکا نشان بھی نہیں رہتا۔ مگر کامل وہ ہے جو آغاز و انجام عشق میں قائم رہے اور ہل من مزید ہی پکارتا رہے۔ جو شخص راہِ محبت و معرفت میں کامل ہے اُس سے ظاہر و باطن میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی۔ آپ سے پوچھا گیا کہ لوگ اس مرتبہ پر کس طرح ہو پہنچتے ہیں۔ فرمایا جب سب سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور صرف اللہ جل شانہ کے ہو رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب محبوب کے دل میں نماز کے وقت دنیا کا خیال آئے تو از سرِ نو نماز پڑھتے ہیں اور اگر عاقبت کا خیال آجائے تو سجدۂ سہو بجا لاتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جو لوگ دوست کے عشق میں مستغرق ہیں وہ صبح سے شام تک بڑی آرزو سے بلا کے خواستگار رہتے ہیں۔ کیونکہ جو مصیبت دوست کی طرف سے ہوتی ہے وہ مصیبت نہیں ہوتی بلکہ عین نعمت ہوتی ہے۔

هر جا که بلائے تست بر جانم باد — چون در رضائے تست بر جانم باد
گر بر سرِ عاشقاں بلا ہا باشد — آنجملہ بلائے تست بر جانم باد

آپ نے فرمایا کہ اس راہ میں عاشق اُسی کو کہتے ہیں جسکی جو حالت حضوری میں ہو وہی غیبت میں ہو۔ ہر حال میں طالب وصال رہے۔ جو لوگ مرد کامل ہیں وہ خلقت میں رہ کر دوست کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اس راہ میں خواجگی اور غلامی کی کوئی تمیز نہیں۔ جو عالم محبت میں راست آتا ہے اُس کا کام بن جاتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ عشق و عقل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علما اہل عقل ہیں اور درویش اہل عشق۔ ارشاد ہوا کہ جب تک اللہ جل شانہ کی محبت قلب کے غلاف میں ہوتی ہے تب تک گناہ کا صادر ہونا ممکن ہے لیکن جب قلب کے گرد و نواح میں آجاتی ہے تو پھر ممکن نہیں کہ گناہ صادر ہو۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک بزرگ نے شیطان سے پوچھا کہ تیرے نزدیک کونسا کام افضل ہے؟ اُس نے کہا (۱) جھوٹی قسم (۲) زنا (۳) مومن سے شرارت کرنا۔

آپ نے فرمایا کہ صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ صحبت اگر رہے تو نیک لوگوں اور اولیاء اللہ کی

با بداں کم نشیں کہ صحبتِ بد — گرچہ پاکی ترا پلید کند
آفتابے بدیں بزرگی را — قطرۂ ابر ناپدید کند

آپ نے فرمایا کہ دانا وہی شخص ہے جو پیش آنے والے سفر یعنی موت کے لیے تیاری کرے اور اپنے ساتھ توشہ رکھ لے۔

ایک مرتبہ درویشوں کی دعا کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ فرمایا درویشوں کے پاس آگ بھی ہے اور پانی بھی۔ یعنی رحم بھی ہے اور قہر بھی۔

ایک مرتبہ آرزوئے نفس کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ آپ نے زبان مبارک سے فرمایا کہ حق تعالیٰ کے اولیا اور دوستوں نے سالہا سال نفس کی آرزو پوری نہیں کی اور اسے بُری طرح مارا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ طریقت میں عارف وہ شخص ہے جو ہر لحظہ عالم تفکر میں رہے اور آنے جانے والے لوگوں اور خلق کی اُسے خبر نہ ہو۔ اور عالم غیب سے ہر وقت اُس پر ایک خاص حالت طاری ہوتی رہے۔ آپ نے فرمایا کہ توحید کے معنی اللہ جل شانہ کو ایک کہنا ہے اور معرفت سے مراد اُسکی شناخت ہے۔ عارف ہمیشہ خاموش رہتا ہے اور صرف حسب ضرورت کلام کرتا ہے۔ فرمایا کہ عارف کے ستر مقام ہیں، اُن میں سے ایک اس جہان کی مُرادوں کا نہ ملنا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ جب انسان کو کوئی تکلیف پہونچے تو اُسے بد دعا نہ کرنی چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ اُس کا بدلہ لے۔

خرقۂ درویشی کے بارے میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ محض خرقہ قابلِ اعتبار نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ساری دنیا خرقہ پہن لیتی۔ اعتبار اُس خرقہ پوش کا ہے جو خرقہ پہنکر اُسکا حق ادا کرے۔ پس اگر وہ کام میں کوتاہی کرے گا تو ماخوذ ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت جنید قدس سرہٗ سے کہا گیا کہ اے پیر طریقت! کیا ہی اچھا ہو اگر آپ ہماری خاطر سے گدڑی پہن لیں۔ فرمایا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ صرف گدڑی سے کام چل جاتا ہے تو لوہے اور آگ کی بھی گدڑی پہن لیتا۔ لیکن نہیں الاعتبار بالخرقہ۔

آپ نے فرمایا کہ مُریدوں کو جو نعمت حاصل ہوتی ہے وہ سب پیر کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔ پس جو کچھ پیر سے سُنے ہمہ تن گوش ہوکر سُنے اور اس پر عمل کرے تاکہ نعمت اُس سے ضایع نہ ہو جائے۔

ایک مرتبہ سماع اور اہل سماع کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ آپ کے کچھ یار جمع ہوئے ہیں اور بانسریاں بھی لائے ہیں۔ فرمایا میں نے تو منع کیا تھا کہ بانسریاں اور نیز اور حرام چیزیں جو ہیں نہ آنی چاہییں کیونکہ یہ سب کھیل تماشے ہیں۔ جب تالی بجانے کی ممانعت ہے تو بانسری کی ضرور ہوگی۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی مقام سے گرے

تو شروع میں گرے - اور اگر یہاں سے بھی گر گیا تو پھر اُسکا ٹھکانا نہیں - پھر فرمایا کہ جو اہل سماع اور صاحب درد ہیں اُنھیں قوال کے صرف ایک شعر پر رقت طاری ہوجاتی ہے اور جو لوگ درد و ذوق نہیں رکھتے اُنھیں خواہ کتنی ہی بانسریاں ہوں کچھ اثر نہیں ہوتا - پھر فرمایا کہ جب کبھی میں نے سماع سُنا مجھے خرقۂ شیخ کی قسم ان سب باتوں کو میں نے حضرت شیخ کے اوصاف پر محمول کیا - چنانچہ ایک مرتبہ قوالوں نے جب یہ شعر پڑھا

خرام بریں صفت مسبا دا　　کز چشم بدت رسد گزندے

یہ سُن کر مجھے حضرت شیخ قدس سرہٗ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ یاد آگئے اور اسی شعر کی بار بار تکرار کرواتا رہا -

آں مطرب از کجاست کہ برگفت نام دوست　　تا جان و جامہ پارہ کنم من بنام دوست

دل زندہ می شود بہ اُمید وفائے یار　　جاں رقص می کند بہ سماع کلام دوست

تا نفخ صور باز نہ آید بہ خویشتن　　ہر کو فتاد و مست ز شربت بجام دوست

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مومن کے دل کو ستانا اللہ تعالیٰ کو ستانا ہے - پس اے درویش مومن وہ شخص ہے کہ اگر وہ مشرق میں ہے اور مغرب میں ایک مومن کے پانوں میں کانٹا چبھے تو اُسکو یہاں درد محسوس ہو -

آپ نے فرمایا کہ درویش کو پردہ پوش ہونا چاہیے - پردہ پوشی سب عبادتوں سے افضل ہے - اے درویش واضح رہے کہ جہان میں کوئی شخص سعادت سے خالی نہیں - جو یہاں آیا ہے اُس میں کچھ نہ کچھ دینی یا دنیوی سعادت ضرور موجود ہے - لیکن خوش وقت وہ لوگ ہیں جن میں دونوں ہوں - آپ نے فرمایا کہ انبیاء و اولیاء سے اگر سہواً خدمت بجالانے میں کوئی تقصیر ہوجاتی ہے تو اسکے کفارہ میں وہ بکثرت گریہ وزاری کرتے ہیں - پس اے درویش لوگوں کو ہر حالت میں خوف و اُمید رکھنی چاہیے اور خوف سے تو کسی حالت میں خالی نہیں رہنا چاہیے -

اے درویش راہ سلوک میں کامل وہی مرد ہے کہ دوست کے عالم انوار سے جو کچھ اُس پر ظاہر ہو افشا نہ کرے - مرد وہی ہے جو ازل و ابد کے دریا پی کر بھی ہل من مزید ہی پکارتا رہے -

آپ نے فرمایا کہ توبہ کرنے والا متقی کے برابر ہوتا ہے - جس نے گناہ اور نافرمانیاں کی ہوں اور اُن نافرمانیوں سے حظ اُٹھایا ہو جب وہ توبہ کرکے طاعت کرے گا تو اُسے طاعت میں بھی حظ آئے گا - ممکن ہے کہ راحت طاعت کی ایک چنگاری اُسکے نافرمانیوں کے سارے کھلیان

کو جلا دے۔

ایک مرتبہ تزکیۂ نفس کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی آپ نے فرمایا کہ مرد میں چار چیزوں سے کمال پیدا ہوتا ہے۔ کم کھانا۔ کم بولنا۔ لوگوں سے کم میل جول رکھنا۔ کم سونا۔

آپ نے فرمایا کہ جب تک دل میں دنیا کی محبت رہے گی ورد و وظیفے کچھ فائدہ نہ دیں گے اسلیے دُنیا ترک کر دینا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ ترک دنیا سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان اپنے تئیں ننگا رکھے، لنگوٹا باندھ کر بیٹھ جائے۔ بلکہ لباس بھی پہنے اور کھائے بھی، لیکن جو کچھ اُسے ملے اُسکی طرف راغب نہ ہو اور اُس سے دل نہ لگائے۔ فرمایا کہ مرد کو ہمت بلند رکھنی چاہیے اور دنیادی آلائشوں میں پھنسنا نہ چاہیے۔ حرص و شہوتِ نفس ترک کر دینی چاہیے۔

ہر لحظہ ز شہوتے کہ داری برخیز تا بنشیند ہزار شاہد در پیش

جب کسی ادنیٰ چیز کو بندہ خدا کے واسطے چھوڑتا ہے تو اُس سے شریف تر چیز ضرور ملتی ہے۔ خدا کے لیے اگر ترک دنیا کریگا تو سمجھ لینا چاہیے کہ کیا کچھ ملیگا۔ آدمی کا حوصلہ وسیع ہونا چاہیے تاکہ اسرار کے برداشت کرنے کی قابلیت اُس میں پیدا ہو۔

آپ نے فرمایا کہ سالک جبتک سلوک میں ہے حصول کمال کا اُمیدوار رہتا ہے۔ بعد ازاں فرمایا کہ ایک سالک ہوتا ہے ایک واقف اور ایک راجع۔ سالک کی طاعت میں جب فتور آتا ہے تو وقفہ پڑتا ہے اور ذوق رُک جاتا ہے، اسلیے چاہیے کہ فوراً توبہ کرلے۔ اگر توبہ نہ کریگا تو رجعت کا اندیشہ ہے۔ پھر فرمایا اس راہ کی لغزش سات قسم کی ہوتی ہے، اعراض، حجاب، تفاصل، سلب مزید، سلب قدیم، تسلی اور عداوت۔ عاشق کو چاہیے کہ فوراً معافی مانگ لے، ورنہ اعراض حجاب سے بدل جائے گا وقس علی ہذا حتیٰ کہ محبت دشمنی سے بدل جائیگی نعوذ باللہ منہا۔ آپ نے فرمایا، اول خطرہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر عزیمت پھر فعل ہے۔ عوام سے جب تک ارتکاب فعل نہ ہو مواخذہ نہیں کیا جاتا، لیکن خواص سے خطرہ کا بھی مواخذہ کرتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرے۔ سب اُسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہر حال میں اُسی کی پناہ ڈھونڈھنی چاہیے۔

آپ نے فرمایا زندگی اس کا نام ہے کہ درویش ذکر حق میں مشغول رہے۔ آپ نے فرمایا کہ مرد کے لیے کشف و کرامات بمنزلۂ حجاب ہیں۔ اگر کبھی اُن سے کچھ ظاہر ہو جاتا ہے تو سُکر کی وجہ سے۔

ایک روز صبر و رضا کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ صبر اسکا نام ہے کہ جب بندہ کو کوئی خلافِ طبع امر لاحق ہو تو اُسکی شکایت نہ کرے۔ اور رضا اس بات کا نام ہے کہ اس

مصیبت سے کسی طرح کی کراہیت نہ کرے اور ایسا معلوم ہو کہ گویا اُس پر کوئی مصیبت ہی نہیں نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ دعا کے وقت نہ گناہوں کا خیال دل میں لانا چاہیے اور نہ عبادت و طاعت کا۔ گناہ کے خیال سے دعا کے ایقان میں سُستی ہوتی ہے۔ اُسوقت صرف اللہ جل شانہٗ کی رحمت پر نظر رکھنی چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ دعا ضرور قبول ہو جائے گی۔

ایک بار اطوار کے بارے میں گفتگو ہوئی آپ نے فرمایا اطوار تین طرح کے ہوتے ہیں۔ حسی، عقلی، قدسی۔ حسی جیسے سونگھنا، کھانا وغیرہ۔ عقلی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کسبی دوسرے بدیہی لیکن جو عالم قدس میں پہونچ چکا ہوتا ہے وہ کسبی کو بھی بدیہی جانتا ہے۔ فرمایا کہ روح جب طاقتور ہوتی ہے اور کمال کو پہونچ جاتی ہے تو قلب کو جذب کر لیتی ہے اور قلب جب قوی ہوتا ہے تو قالب کو جذب کرتا ہے۔ پس جو بات دل پر اثر کرتی ہے اُس کا اثر قالب پر بھی ہوتا ہے۔ آپ کا قول ہے کہ مومن کبھی ناپاک نہیں ہوتا۔ فرمایا کہ اصلی کام یادِ حق ہے اور اسکے سوا جو کچھ ہے سب یادِ حق کا مانع ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا حق تعالیٰ پر بھروسہ کر لینا چاہیے اور اُسکے سوا کسی سے اُمید نہ رکھنی چاہیے۔ پھر فرمایا کہ ایمان اُس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اُسکی نگاہ میں تمام خلقت مچھر سے بھی کم حقیقت نہ معلوم ہو۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ خلقت کی چار قسمیں ہیں۔ ایک وہ جنکا ظاہر آراستہ اور باطن خراب ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جنکا ظاہر خراب اور باطن آراستہ ہوتا ہے۔ تیسرے وہ جنکا ظاہر و باطن دونوں خراب ہوتے ہیں۔ چوتھے وہ جنکے ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کا ظاہر آراستہ اور باطن خراب ہوتا ہے وہ متعبد ہیں جو طاعت تو بہت کرتے ہیں مگر اُنکے دل دنیا میں مشغول ہوتے ہیں۔ جنکا ظاہر خراب و باطن آراستہ ہوتا ہے وہ مجذوب ہوتے ہیں۔ جنکا ظاہر و باطن دونوں خراب ہوتے ہیں وہ عالم (ظاہر) ہوتے ہیں۔ اور جنکا ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتا ہے وہ (سچے) مشائخ ہوتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ شعر ایک لطیف چیز ہے۔ لیکن جب تعریف میں کہا جائے اور کہیں پیش کیا جائے تو سخت بے لطف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح علم بھی بہت شریف چیز ہے لیکن اُسے حاصل کر کے دَر دَر کا چکر لگایا جائے تو اسکی عزت جاتی رہتی ہے۔

ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ سعادت کے قفل کی کنجیاں کئی ایک ہیں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ کس کنجی سے کھُلے گا۔ اگر ایک سے نہ کھُلے تو اس اُمید میں کہ دوسری سے کھُل جائے گا تمام کنجیوں سے

کھولنا چاہیے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ جو شخص پیر کا ہاتھ پکڑتا ہے وہ گویا خدا سے عہد کرتا ہے۔ اُسے چاہیے کہ اپنے عہد پر ثابت قدم رہے ورنہ بیعت سے کیا فائدہ؟

ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ ولایت دو طرح کی ہے ایک ولایت ایمان دوسری ولایت احسان۔ ایمان کی ولایت ہر مومن کو حاصل ہے اللہ ولی الذین آمنوا۔ مگر ولایت احسان یہ ہے کہ کسی کو کشف و کرامت یا اور کوئی اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو۔

عاشقا خیز و گام در رہ زن — عشق خواہی بہ عافیت آہ زن
جاں دراندازد در او جاناں گیر — بر تر از کائنات خرگہ زن
جاں بکف کردہ در سراچہ عشق — لیس فی جبتی سوی اللہ زن
مصر خواہی چو یوسف کنعاں — خیمۂ اعتکاف در چہ زن

"عبداللہ"

انسان کون ہے؟

کون ہے وہ جسے دعویٰ ہو کہ انسان ہیں ہم؟ — سچ اگر کچھ ہے تو بس یہ ہے کہ حیوان ہیں ہم!

وہ ہے انسان کہ جو دینِ متیں رکھتا ہو — اپنی آزاد خیالی کا یقیں رکھتا ہو
وہ ہے انسان کہ جو چاہے دل اُسکا وہ کرے — پاک دنیا کی ہوا و رو رسم نہ غلامی کا بھرے
وہ ہے انسان کہ آزاد خیال اُسکا ہو — قیدِ مشرب سے نہ وابستہ مقال اُسکا ہو
وہ ہے انسان کہ جو سب کو برادر سمجھے — اپنے کمتر کو بھی جو اپنے برابر سمجھے
وہ ہے انسان کہ جو دے نہ کسی کو ایذا — عام ہمدردیِ انساں رہے جس کا شیوا
وہ ہے انسان کہ ہو حبِ وطن اُس کا شعار — الفتِ قوم پہ ہو اُسکے تخیل کا مدار
وہ ہے انسان کہ تکلیف کو سمجھے آرام — اپنی ہمت کو نہ توڑے جو کبھی ہو ناکام
وہ ہے انسان کہ جو قوم کی خاطر مر جائے — نام دُنیا میں ہمیشہ کو جو زندہ کر جائے

اپنی آزادی پہ جو آپ کو قرباں کر دے
صدقہ اِس حسن کی دیوی پہ دل و جاں کر دے

فہیم الدین احمد

نجاتُ الرَّشید

مُلا عبدالقادر البدایونی (جن کو یوروپین مصنفین صرف البدایونی کے نام سے یاد کرتے ہیں) شروع ہی سے وہ غیر معمولی دل و دماغ لیکر آئے تھے کہ جوہر شناس نگاہیں دیکھتے ہی اس جوہرِ قابل کو سر آنکھوں پر جگہ دینے کو آمادہ ہوتی تھیں۔ خوش قسمتی سے خاندان پایا تو علمی۔ انکے والد اور نانا دونوں اپنے وقت کے ممتاز اہلِ علم میں گنے جاتے تھے۔ جب ہوش سنبھالا تو ملک کے بہترین اساتذہ اور شیوخ کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کیا اور شریعت و طریقت کے علوم میں سرآمد روزگار ہوئے۔ اُس پر طرہ یہ کہ مسکن ٹھہرا بدایوں۔ جہاں علوم شریعت کے دریا بہتے اور معارف حقیقت کے چشمے اُبلتے تھے۔ وہی بدایوں جو قدیم ایام سے مرکز علم و ہنر رہا ہے۔ جس کی شان میں خسروِ شاعراں علیہ الرحمہ کا شعر مشہور ہے

زبس کز مرقد اہلِ بصیرت چشمۂ نور ست
بجاے سرمہ در دیدہ کشم خاکِ بدایوں را

مصحفی نے بھی ایک موقع پر غزل میں بدایوں کے مدینۃ الاولیا ہونے کی طرف عجیب لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا ہے

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں　　جسکی گلی گلی میں مزارِ شہید ہے

یہاں بدایوں کی تاریخی عظمت کی داستان یا مُلا کی مکمل لائف لکھنا مقصود نہیں، صرف یہ دکھانا ہے کہ مُلا کے نطری جوہر استعداد کو بروے کار لانے میں اس علمی ماحول نے کس قدر حصہ لیا۔ مختصر یہ کہ جیسے ہی مُلا عبدالقادر نے شیخ مبارک کے حلقۂ درس سے قدم باہر نکالا، اکبر کی قدر شناس نگاہوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ معاش کی طرف سے قدرے اطمینان حاصل ہونے پر اُنکی افتادِ طبیعت نے جو کبھی نچلا نہ بیٹھنے دیتی تھی، اُنکو علمی مشاغل میں لگا دیا۔ اور متعدد کتابوں کی

عـــہ روہیلکھنڈ کی قسمت میں بدایوں ایک چھوٹا سا گر تاریخی شہر ہے۔ یہ اسلام سے قبل تعلیم وید کا سرچشمہ رہا ہے۔ جیسا کہ اسکے قدیم نام ویدا مئو سے ظاہر ہے۔ حکومت اسلام کے عہد میں۔ بدایونی، ضیاءالدین نخشبی، علاءالدین اصولی، جیسے علما اور محبوب الٰہی، شیخ شاہی جیسے صلحا کا مسکن رہا۔

عـــہ مبارک کے علاوہ مُلا کو جن اکابر سے تلمذ رہا وہ مُلا عبداللہ بدایونی اور میاں حاتم سنبھلی تھے۔

تصنیف[1] و ترجمہ کا کام اُنکے سحر کار قلم سے لیا - مگر منتخب التواریخ (یا تاریخ بدایونی) نے جو شہرت حاصل کی وہ انکی اور کسی کتاب کو میسر نہیں ہوئی - نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ و امریکہ بھی آج تک اسکی صدائے بازگشت سے گونج رہے ہیں - یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جب تک اوراقِ تاریخ میں اکبر اعظم کا نام زندہ ہے تب تک بدایونی اور تاریخ بدایونی بھی زندہ ہیں

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یہ کتاب تعریف سے مستغنی ہے اور اسوقت ہمارا موضوع نگارش بھی نہیں ہمارا مقصد انکی دوسری کتاب سے پبلک کو روشناس کرانا ہے جو نجات الرشید کے نام سے موسوم اور نسبتہً کمیاب اور گمنام ہے

یہ کتاب جیسا کہ اُسکے نام سے ظاہر ہے تہذیب اخلاق اور تزکیۂ باطن کے بحث پر لکھی گئی ہے تاکہ لوگ ذمائم اخلاق سے پرہیز کریں اور محاسن اعمال کی طرف راغب ہوں -

زمانۂ تصنیف و کتابت وغیرہ

ملا صاحب نے اپنی کتاب کا تاریخی نام نجات الرشید رکھا ہے جس سے ۹۹۹ھ برآمد ہوتے ہیں - یہی اُسکا سال آغاز تصنیف ہے - کتاب چار سال میں ختم ہوئی[2] - کتاب کی ضخامت ۳۸۴ بڑی تقطیع کے صفحوں تک پہونچتی ہے - راقم سطور کے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ غالباً کالکتہ سے نقل ہوکر آیا ہے اور الہ آباد یونیورسٹی کی لائبریری میں ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء کو موصول ہوا ہے - خط نستعلیق اور صاف ہے - مگر بیشتر اغلاط کتابت رہ گئی ہیں -

موضوع کتاب

جس طرح امام غزالیؒ اور بعض دوسرے اکابر نے روح کی بیماریوں اور اُنکے علاج پر کتابیں لکھی ہیں اُسی طرح ملا صاحب نے اس میں کبائر کی مذمت اور اُن سے بچنے کی ضرورت جتائی ہے - سوء اتفاق سے یہ وہ زمانہ ہے کہ دربار اکبری کا ایک ایک فرد صاحب تاج و اورنگ سے لیکر معمولی امیر تک اور عالم سے لیکر عامی تک الحاد اور اباحت کی ترویج میں سرتاپا مصروف ہے - ائمہ کفر اور علمائے سوء ہر بدعت اور احداث کو دل و جان سے وحی منزل سمجھ کر خیر مقدم کرتے ہیں -

ان نامساعد حالات کے اندر ملا عبد القادر جہاد لسانی کے جذبہ سے بیقرار ہوکر میدان میں آتے ہیں - اور سطوتِ شاہی کا مقابلہ کرتے ہیں - جسوقت تمام زبانیں گونگی ہو جاتی ہیں انکی تیغ زبان

---

[1] ان کی علمی یادگاروں کے لیے منتخب التواریخ دیکھو - جس میں مفصل تذکرہ ہے - ضیا

[2] ملا صاحب نے سال تصنیف ۹۹۹ھ لکھا ہے اور آخر میں نظام الدین کے مرنے کا ذکر کیا ہے - جنکی وفات ۱۰۰۳ھ میں ہوئی - اس لیے لازماً یہ کتاب چار سال میں ختم ہوئی ہوگی -

اپنا جوہر دکھاتی ہے، اور جسوقت تمام قلم سرنگوں ہو جاتے ہیں اُنکا نیزۂ کلک اپنا جوہر کمال آشکار کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مُلّا صاحب اس کتاب میں شروع سے آخر تک عقائد اشعریہ کی تعلیم دیتے ہیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں اعمال و اخلاق حسنہ کا پیغام پہونچاتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ "مُلّا کا شمار نسبت فقر کے باوجود علما سے ظاہر نہیں کیا جاتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ انکی تصانیف میں تصوف کے مخصوص مباحث و مسائل نظر نہیں آتے بلکہ ضمناً اُن کا رد کر جاتے ہیں۔

سببِ تصنیف | تصنیف کی وجہ اُنھوں نے خود یہ لکھی ہے کہ" بندۂ شرمسار (عبد القادر بن ملوک شاہ بدایونی) سے دوست صادق (خواجہ نظام الدین احمد) نے ایک رسالہ دیکر کہا کہ اس میں عیوبِ دل اور آفات نفس کا بیان ہے، بہتر ہو کہ اس میں اضافہ کر کے اس اجمالی بحث کو مفصل اور مدلل پیرایہ میں ترتیب دیا جائے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ایجاز مخل اور اطناب ممل سے اجتناب کیا جائے چنانچہ بمضمون اِن اُستنصرُوکُم فی الدین فعلیکم النصر تعمیل کی گئی اور باوجودیکہ لاہور میں کوئی کتاب پاس نہ تھی، محض یادداشت سے یہ کتاب مرتب کی گئی"

ترتیبِ کتاب | نجات الرشید متعدد فصول پر مشتمل ہے۔ مثلاً ذکر توبہ۔ بیان رجا۔ تفصیل و تقسیم معاصی۔ الحاد و اقسام الحاد۔ خاتمہ (تصحیح توبہ)۔ ہر بحث میں نصوص قرآن و حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اجماع اور قطعیت اجماع پر بیشتر زور دیا ہے۔ اعمال کے سلسلہ میں قیاس مجتہدین سے بھی اکثر استناد کرتے ہیں۔ خصوصاً حنفی فقہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی عقلی دلائل اور تجربہ کی شہادتیں بھی اس دلکش اسلوب سے لاتے ہیں کہ پڑھنے والا تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ موقع بموقع حکایات سے بحث کی اہمیت اور کتاب کی دلچسپی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

خاتمہ میں مُلّا صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی عمر کی بربادی پر افسوس کیا ہے اور لکھا ہے کہ توسن عمر خمسین (۵۰) سے تجاوز کر کے ستین (۶۰) کی منزل میں داخل ہو رہا ہے۔ دیکھیے آئندہ تقدیر کیا دکھاتی ہے۔ اُنکے دلی دوست اور مربی خواجہ نظام الدین احمد جو اس تصنیف کے محرک اول تھے انتقال کر چکے ہیں اور ملا صاحب قدرۃً اس سانحہ کی وجہ سے

ـــه خواجہ نظام الدین احمد بخشیہ اُن چیدہ بزرگوں کے ہیں جنسے ملا صاحب خوش ہیں۔ بخشی کے عہدہ پر مامور تھے۔ صاحب سیف و قلم اور مصنف طبقات اکبری ہیں۔ یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ وہ رسالہ نظام الدین کی تصنیف سے تھا یا کسی اور کی۔ واللہ اعلم

ـــه ملا صاحب کی ولادت ۹۴۷ھ میں اور وفات ۱۰۰۴ھ میں ۵۷ سال کی عمر میں واقع ہوئی۔ مزار عطاپور ضلع بدایوں میں ہے

دل شکستہ نظر آتے ہیں۔ تاریخ وفات بھی لکھی ہے "گو ہر بے بہا ز دنیا رفت"۔

مضامین کتاب کتاب مذکور کی ابتدا اس طرح کی ہے۔ الحمد للہ غافر الذنب وقابل التوب الخ۔ اور انتہا کی عبارت یہ ہے۔ انت مولٰنا فانصرنا علی القوم الکافرین یا ارحم الراحمین۔ حمد و نعت کے بعد جیسا کہ اوپر بیان ہوا چند سطروں میں سبب تحریر درج کیا ہے۔ اور اسکے بعد ہی اصل مضمون آغاز کر دیا ہے۔ سب سے پہلے توبہ کی ضرورت اور فضیلت پر بحث کی ہے۔ توبہ جیسا کہ خود حضرت مصنف نے تصریح کی ہے "اولیں پایۂ سلوک" ہے۔ یہ واضح رہے کہ توبہ کے بارے میں اُنکا معیار اعتقاد بہت بلند ہے۔ اُنکے نزدیک یہ کافی نہیں کہ انسان گناہ سے نادم ہو کر رجوع کرے بلکہ انھوں نے حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کی طرح توبہ کی تین قسمیں کی ہیں۔ ماضی۔ حال۔ استقبال۔ اور تینوں صورتوں کو سلوک کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ یعنی انسان کو گذشتہ گناہوں سے ندامت اور ممکن ہو تو رد مظالم ضروری ہے۔ ساتھ ہی موجودہ حالت میں تلافی اور فراموشی لذت گناہ اور آیندہ کے لیے محترز رہنے کا عہد بھی توبہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اسکے ثبوت میں انھوں نے جابجا قرآن و حدیث سے استشہاد کیا ہے جو اُنکے تبحر علمی اور توغل مذہبی کی روشن دلیل ہے۔ اسکے بعد رجاء (رحمت الٰہی کی اُمید) کا بیان ہے۔ پھر کبائر کی تقسیم اور تفصیل ہے جس میں مختلف گناہوں کا ذکر اُنکی قباحت اور شناعت اور اُن پر وعید کی تشریح کی ہے۔ جو کتاب کا اصل موضوع ہے۔ اسی سلسلہ میں الحاد اور بے دینی کی مختلف شکلیں اور اُن کا رد نہایت زبردست مناظرانہ انداز میں کیا ہے۔ معراج کا ذکر آگیا ہے تو بہت شرح و بسط سے اُسکے متعلق عقیدۂ حقہ پر روشنی ڈالی ہے اور منکرین پر قیامت ڈھائی ہے۔ اکثر مواقع پر اپنے دعوے کی شہادت میں روایات و حکایات نقل کر کے مضمون کی دلکشی کو دوچند کر دیا ہے۔

اس موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم کتاب مذکور سے جستہ جستہ چند مقامات نقل کریں تاکہ ناظرین کرام کو کتاب کے مبحث اور صاحب کتاب کے عقائد کے متعلق صحیح طور سے اندازہ کرنے میں آسانی ہو۔

ایمان کی درمیانی حالت حضرت مصنف نے کفر و معاصی کی مذمت کے ساتھ ساتھ رحمت الٰہی کی وسعت اور اُس سے اُمیدوار رہنے (رجا) کی ضرورت کو نہایت بسط و وضاحت سے لکھا ہے۔ عقیدۂ اسلام کے بموجب ایمان خوف اور امید کے درمیان میں ہے۔ عذاب سے بیخوف ہونا، یا رحمت سے ناامید ہونا کفر شریعت ہے۔ اس دعوے کے ساتھ ہی اُنھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ

اسلام کی تعلیم رحمت کی تعلیم ہے اور اُسکی آغوش ہر خطاکار کے لیے کھلی ہوئی ہے جو ندامت کے ساتھ اُسکی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس میں ضمناً عیسائیوں کے اس بیجا اعتراض کا جواب ملتا ہے کہ اسلام خوف کا مذہب ہے۔ مُلا صاحب فرماتے ہیں کہ جس کی نظر قرآن پر وسیع ہوگی اُسکو معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں آیات رحمت آیات عذاب سے زیادہ ہیں اور اسماے جمالی اسماے جلالی سے بیشتر۔ سبقت رحمتی علیٰ غضبی (میری رحمت غضب پر غالب ہے)

الحاد کی دُرگت مصنف علیہ الرحمہ نے الحاد و زندقہ کے رد میں ایک علٰحدہ باب باندھا ہے جس میں قائلین تناسخ و قدم عالم اور منکرین حشر پر عجیب انداز سے قیامت برپا کی ہے۔ اُنکے عقائد کو عقل و نقل سے کاٹتے جاتے ہیں اور موقع موقع سے اپنے معاصرین[ع] کے اس خوبی سے ٹیکی لے لیتے ہیں کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ اسی سلسلہ میں دہریوں کا اعتقاد نقل کیا ہے کہ وہ وجود ملائکہ و نزول وحی کے منکر ہیں۔ اُن کا زعم ہے کہ بالفرض اگر فرشتے آسمان سے زمین پر آتے تو کرۂ نار کے حائل ہونے کی وجہ سے جل جاتے۔ ملا صاحب فرماتے ہیں کہ فرشتے نورانی ہونے کی وجہ سے لطیف ہیں۔ اسلیے نور کو نار سے ضرر نہیں پہونچ سکتا۔ ایک موقع پر سوفسطائیوں کا مذہب بیان کیا ہے اور عقل و مشاہدہ سے اُسکا جواب دیا ہے۔ اسی تمثیل میں ایک حکایت نقل کی ہے کہ ایک سوفسطائی (جو حقائق اشیاء کا منکر تھا) امام اعظم[رح] کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے اعتراضات پیش کیے۔ امام صاحب نے ہر طریقہ سے جوابات شافی دیے مگر وہ نہ مانا۔ آخر امام نے ایک شاگرد کو حکم دیا کہ اس کا گھوڑا دروازۂ مسجد سے لیجا کر کہیں چھپا دو۔ جب وہ چلنے لگا اور اُسکو نہ پایا تو پریشان ہوکے ڈھونڈھنے لگا۔ امام اعظم نے فرمایا کہ کیا تلاش کرتے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ میرا گھوڑا کسی شخص نے چھپا دیا۔ آپ نے فرمایا گھوڑا کسے کہتے ہیں۔ شخص کیا ہوتا ہے۔ چھپانا کس چیز کا نام ہے۔ جب تم کائنات کو محض دھوکا سمجھتے ہو تو یہ سب خواب و خیال ہیں۔ آخر وہ اپنے عقیدہ سے تائب ہوا اور اپنی سواری لیکر چلا گیا۔

اسلاف کرام کے متعلق ایک نکتہ صحابہ کرام کے مناقشات اور مشاجرات کے ضمن میں بعض ایسے امور منقول ہوے ہیں جو سطحی نظر والوں کے نزدیک باعث طعن ہیں۔ اس امر خاص میں ملا صاحب کا مسلک یہ ہے کہ اُن حضرات کا ایمان اور صحابیت تو قطعی ہیں اور یہ روایات ظنّی۔ اور یہ ظاہر

ع یہ واضح رہے کہ اکبر اور اُس کے اکثر درباری تناسخ اور اسی قسم کے اباطیل کے قائل تھے۔ گویا اُس زمانہ میں دربار اکبری ہر طرح کی ملحدانہ تحریکات کا جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔

ہے کہ الیقین لایزول بالشک (یقین محض شبہ کی بنا پر زائل نہیں ہوتا) اُنکی رائے ہے کہ ان نزاعات کو خدا کے حوالہ کیا جائے اور اپنی دین و دنیا کی درستی میں وقت صرف کیا جائے تاکہ غیروں کو ہنسنے کا موقع نہ ملے۔ اسی تمثیل میں اُنھوں نے بغداد کا واقعہ لکھا ہے کہ وہاں سُنّی اور شیعہ باہم لڑتے رہے۔ آخر سُنّی غالب آئے۔ چند روز میں خود اُن میں تفرقہ پڑ گیا اور حنفی اور شافعی جماعتوں کی باہمی زور آزمائیاں ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایک فریق کمزور ہو گیا تو دوسرے کو تاتارکو کے ٹڈی دل نے آدبایا۔ اور آناً فاناً خلافت اسلامیہ کو تہ وبالا کر دیا۔

علمائے عصر پر تعریض۔ مُلّا صاحب کی عادت ہے کہ جسکو برسرِ خطا دیکھتے ہیں، چُوکتے نہیں فوراً ٹوک دیتے ہیں۔ اُس زمانہ کے اکثر علما میں مُداہنت، ریاکاری، خود پسندی کا عیب تھا۔ مُلّا جسکو پاتے ہیں ایسا بھرپور وار کرتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ہمارے صدر[1] عالی قدر شیخ عبد النبی کو حج بیت اللہ کا اتفاق ہوا۔ وہاں معلم لوگ حسبِ عادت مناسک حج تسلیم کرتے تھے اور وہ چپ چپ ہوتے تھے۔ آخر صدر نے جھنجلا کر کہا "اِنّی عالم" یعنی مجھے کیا سکھاتے ہو میں خود عالم ہوں۔ اسپر ایک عرب نے کیا پیارا جواب دیا کہ یَا اَیُّہا الشیخ اِن کنتَ عالمًا فاَینَ طلاقۃ الوجہ۔ (جناب اگر آپ عالم ہیں تو کشادہ پیشانی اور خندہ روئی کہاں ہے)۔ در اصل اس واقعہ میں ہمارے علما کے لیے بڑا درسِ عبرت ہے۔

ایک موقع پر میر سید محمد جونپوری کا ذکر آگیا ہے جنھوں نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا اُنکے صلاح و سداد، ورع و تقوےٰ، اتباعِ سنت اور امر بالمعروف کا مُلّا صاحب نے نہایت صداقت کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ جس سے ناواقف آدمی کو خود اُنکے مہدوی ہونے کا شبہہ ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مُلّا صاحب نے اُنکے اس غلط عقیدہ کی بنا پر تعصب سے اُنکی خوبیوں پر پردہ ڈالنا پسند نہیں کیا۔ اگرچہ اس سلسلہ کے بعض حضرات سے اُنھوں نے فیض بھی حاصل کیا ہے تاہم اُنکی کمزوریوں کو آشکارا کرنے میں کبھی تامل نہیں کرتے۔ یہ اُنکی حق پسندی کی بیّن دلیل ہے۔

اسی کے ساتھ بدعت کیش اور باطل کوش گور پرست مولویوں کے مقابلہ میں اُنکا قلم ایک ایسی بے نیام تلوار بنجاتا ہے جس سے کہیں پناہ نہیں۔

---

[1] شیخ عبد النبی اکبر کے زمانہ میں صدر الصدور اور صاحب اختیار تھے جب بادشاہ انکی بے عنوانیوں کی وجہ سے منحرف ہوا تو حج کو چلے گئے۔ واپسی پر تباہی کی حالت میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی ۹۹۲ھ۔

ایک عجیب واقعہ جنات کے وجود پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے قرآن و حدیث سے استناد کیا ہے۔ اور آخر میں یہ لکھا ہے کہ عدم علم سے علم عدم لازم نہیں آتا۔ جب خدا قادر ہے تو اس میں یہ بھی قدرت ہے کہ ایک ایسی لطیف مخلوق پیدا کردے جو عام آنکھوں کو نظر نہ آئے۔ اُسکے بعد انھوں نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے جو آجکل کی طبائع مشکل سے باور کرینگی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک قافلہ صحرا میں کہیں جارہا تھا، راستہ میں ایک نوجوان نے ایک اژدہا دیکھا اور اسکو پتھر سے مار ڈالا۔ تھوڑی دیر میں آندھی کا طوفان اُٹھا اور وہ نوجوان غائب ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اژدہا دراصل جنوں کا سردار تھا، اور جنات اُسکے قصاص میں قاتل کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ جب اس شخص نے اپنی لاعلمی اور معذوری ظاہر کی تو معاملہ قاضی جنات (جنکا نام عبد الحی تھا) کے حضور میں پیش ہوا۔ یہ بزرگ ایک نہایت معمر صحابی تھے جو عہد رسالت میں ایمان لائے تھے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے کانوں سے یہ حدیث حضور سرورِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سُنی ہے کہ مَنْ تَزَيَّ بِزِيِّ غَيْرِهٖ ثُمَّ قُتِلَ فَلَا دِيَةَ وَلَا قِصَاصَ۔ یعنی جو دوسرے بھیس میں ہو اور دھوکے سے قتل کردیا جائے تو نہ خوں بہا لازم آتا ہے نہ قصاص۔ آخر ملزم رہا کردیا گیا۔ اس موقع پر مُلا صاحب کا دعویٰ ہے کہ میں نے اس حدیث کی روایت کی اجازت اپنے شیخ یعقوب[1] محدث کشمیری سے لی اُنھوں نے اپنے اُستاد سے اور اُنھوں نے اس حدیث کو صحابی مذکور سے سُنا۔ گویا اس طریقہ سے ملا صاحب کا سلسلۂ روایت جناب رسول مقبولؐ تک صرف تین ۳ سطور سے پہونچتا ہے۔ ان متفرق مضامین کو کہیں کہیں سے خلاصۃً نقل کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب کے اسلوب تحریر کی نسبت کچھ رائے ظاہر کی جائے۔

اسلوب تحریر کتاب مذکور کا اسلوب کوئی خاص جدت نہیں رکھتا۔ عبارات کہیں کہیں مقفیٰ ہیں اور مرادفات کی کثرت بعض موقعوں پر ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ جہاں سادگی اور سلاست کو برتا ہے وہاں البتہ عبارت میں خاص دلآویزی آگئی ہے۔ خصوصاً خاتمہ میں جبکہ اُنکو اپنا خاتمہ بھی قریب معلوم ہوتا ہے۔ اور پیری کی سحر شام ہوتی نظر آتی ہے۔ دنیا کی ناپائداری اور عمر کی ہرزہ کاری کا ماتم اس سوزوگداز کے ساتھ کیا ہے کہ پڑھنے والوں کا دل بھر آتا ہے۔ پھر بھی یہ صاف کہنا چاہیے کہ نجات الرشید کا اسلوب تحریر، چستی عبارت، زورِ قلم، منتخب التواریخ

---

[1] ملا یعقوب، ملا صاحب کے معاصر اور بڑے محدث و مفسر گزرے ہیں اور صرفی کشمیری کے لقب سے مشہور ہیں۔ اُنکے استاد کا نام تحقیق نہ ہوسکا۔ کوئی گجرات کے عالم تھے۔

سے بہت فروتر ہے۔ نمونہ کے لیے ہم نجات الرشید کے چند جملے حوالۂ قلم کرتے ہیں۔ اگرچہ اس جزو سے کُل کے اندازِ بیان کی معرفت مشکل ہے، تاہم بخوفِ اطناب اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

نمونۂ عبارات مسلمانوں کے باہمی نزاعات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "بعد از تامل معلوم می شود کہ ہر جا کہ دریں اُمت خرابی واقع شدہ از شامتِ جدلِ علما بودہ و چہ سرہا و چہ خاندانہا کہ بر بحث بباد فنا نہ رفتہ است"۔

زمانہ کی بے ثباتی کی تمثیل میں ایک حکایت اس طرح آغاز کی ہے "در باغے بلبلے بر شاخِ درختے آشیانہٴ داشت۔ اتفاقاً مورے در زیرِ آں درخت وطن ساختہ و از بہر چند روزہ مقامے و مسکنے پرداختہ۔ بلبل شب و روز گردِ گلستاں در پرواز آمدہ و بر ابطِ نغمات دلفریب در ساز آوردہ با گل رمزے می گفت و باد صبا درمیان غمزے می کرد۔ ...... خار جائے گُل گرفت و زاغ در مقامِ بلبل نزول کرد۔ بادِ خزاں در وزیدن آمد و برگ از درخت پریدن گرفت"۔

آخر میں فرماتے ہیں۔ "دریغ کہ آفتابِ عمرِ من بہ زردی رسیدہ از دیوار گذشت و سنینِ از خمسین بہ سرحدِ ستین کشیدہ کہ آں را در عرب دقاقۃ الرقاب می نامند۔

در وا کہ رحیلِ زندگی داد نوید	ویں موے سیاہ گشتہ از غصہ سپید
عمرے کہ رسد ز حدِ پنجاہ بہ شصت	اے وائے خود ازوے چہ تواں داشت امید

ضیاء احمد ایم اے بدایونی

یوں ہی تڑپا کروں کاوش بڑھے ہونٹوں پہ جاں آئے
نہ یارب چارہ گر کو چارۂ دردِ نہاں آئے

خجالت سے جھکی تھی آنکھ ہونٹوں پہ تبسم تھا
وہ کس انداز سے سوئے مزارِ کشتگاں آئے

تجلی کہہ رہی طور پر اُس برق پیکر کی
جسے ارمان ہو بیہوش ہونے کا یہاں آئے

سمجھ لینا وہی ہے قاتلِ سفاک کا کوچہ
جہاں مٹی سے قاصد بوئے خونِ کشتگاں آئے

تمہارا دم گھٹے گا بھیڑ میں آنا نہیں اچھا
ہجومِ یاس و حسرت میں دمِ آخر کہاں آئے

قفس صیاد لٹکائے وہاں ہم نوا اسیروں کا
نظر کچھ کچھ جہاں سے ہم کو اپنا آشیاں آئے

نگاہ واپسیں در پر رہی جب تک نہ دم نکلا
اُنھوں نے کہہ دیا تھا آئیں گے لیکن کہاں آئے

جگر دیر و حرم میں کیوں بھٹکتے کام ہی کیا تھا
نہیں معلوم کس کی جستجو میں ہم یہاں آئے

حکیم جگر صدیقی

"گلِ رعنا"

اُردو زبان کے شعرا کا تذکرہ ہے۔ مولانا حکیم عبد الحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلما نے تالیف کیا اور حال میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے چھپ کر شایع ہوا ہے

حضرت مولف ہمارے زمانے کے مشہور و معروف عالم تھے اور حدیث و فقہ، سیر و تاریخ، میں کئی ضخیم کتابیں مرحوم کے فضل و کمال اور عربی زبان میں تبحر کی یادگار ہیں۔ اُردو زبان میں بھی ایک رسالہ "یادِ ایام" کے نام سے مشاہیر گجرات کے حالات پر لکھا تھا جو ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی طرف سے شایع اور تاریخی مذاق رکھنے والوں میں عام طور پر مقبول و ممدوح ہوا۔ لیکن غالباً اس بات کی مرحوم کے دوستوں کو بھی اطلاع اور توقع نہ تھی کہ وہ اُردو شاعری کے متعلق اس شوق و دلچسپی، اور تحقیق و تفحص کے ساتھ کوئی کتاب تحریر فرمائیں گے۔

کتاب کو ایک ہی نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب و تقسیم مضامین کے اعتبار سے "گلِ رعنا" تذکرۂ آبِ حیات کا نقش ثانی ہے۔ اور اگرچہ بیان کی رنگینی اور وہ عبارت آرائی تو اب کسی اُردو تحریر میں کہاں، جو آزاد کا طرۂ امتیاز مانی گئی ہے۔ تاہم بیشی معلومات، تحقیقِ حالات اور اشعار کے عمدہ انتخاب کے لحاظ سے اسے یقیناً آبِ حیات پر فوقیت ہے۔ تنقید کے میدان میں بھی مولف مرحوم آزاد سے زیادہ آزاد اور صائب الرائے ہیں۔ اور مقدمۂ کتاب میں طبقۂ متاخرین کی شاعری پر (صفحہ ۶۳ سے ۶۷ تک) جو بحث اُنھوں نے کی ہے اُس میں لکھنؤ کے نام نہاد اساتذہ پر ناسخ سے لیکر تحر تک بڑی آزادی سے نکتہ چینی کی ہے کہ ان سب حضرات کا بیشتر کلام اس قسم کے شرمناک عاشقانہ بلکہ شُہدیانہ مضامین پر مشتمل ہے جو تہذیب و اخلاق کے لیے موجب عار ہیں، دوسرے طرزِ بیان میں اس قسم کے بے لطف تصنع اور مبتذل ضلع جگت سے کام لیا گیا ہے کہ بقول مؤلف "شاعری اچھا خاصا سُوانگ بن گئی"۔

پھر مثال کے طور پر ناسخ و آتش، وزیر و صبا، نیز و بحر وغیرہ حضرات کے بہت سے شعر نقل کیے ہیں۔ امانت کی نسبت لکھا ہے کہ اُنکی شاعری کا دارومدار اسی ضلع جگت پر ہے مشکل سے کوئی صاف شعر انکے ہاں مل سکتا ہے۔ خصوصاً واسوخت کی شہرت کی بنیاد اسی پر ہے جسکی

ہمارے بچپن میں بڑی دھوم تھی۔ نمونے کے طور پر صرف ایک بند اسکا بھی سن لو:

"چکنی باتوں سے اُسے چھالیا سبنے ایسا حال دوہرا یا کوئی میں نے تو منہ پھیر لیا
جی میں کُڑھتا رہا کچھ صاف زباں سے نہ کہا بات کی ایسی چبا کر کہ ہُوا دل چُورا
عطر کی بُو سے معطر ہوے گھر گلیوں کے
خاصدان آنے لگے عطر لگی ڈلیوں کے

مولوی حالی مرحوم نے اپنے مقدمۂ دیوان میں ضلع جگت کی مثال میں یہ عجیب و غریب شعر نقل کیا ہے:

"مُرغِ دل کو توڑ گئی بلّی تمے دروازہ کی رخصت تن کو کترے گا چوہا تمھاری ناک کا"

میں اسے محض فرضی مثال سمجھا کرتا تھا کہ کسی نے ضلعِ جگت کی ہجو کے لیے ازراہِ طنز نظم کر دیا ہوگا مگر گلِ رعنا کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ اُستاد رشک انلی اللہ مقامہٗ کی باقاعدہ غزل کا شعر ہے! اور اسی پر کیا منحصر ہے' بقول مؤلف مرحوم "ان لوگوں میں سے جس کا جی چاہے جسکا دیوان اُٹھا کر دیکھو، بغیر کاوش کے بہت سے اشعار اسی قسم کے مل رہیں گے۔"

اس نکتہ چینی کے باوجود مولف مرحوم نے اُن واقعی یا خیالی خدمات کی جا بجا نہایت فراخ حوصلگی سے داد دی ہے جو شعرائے لکھنؤ نے اُردو زبان کے صاف کرنے میں انجام دیں۔ اور اپنے ذوقِ صحیح اور تلاش و محنت سے انکے بہترین کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ متنِ کتاب میں دوسرے تمام شعرا کے بھی صرف منتخب اور عمدہ اشعار نقل کیے ہیں۔ کیونکہ اصل میں گلِ رعنا مولف مرحوم کی ایک بیاض یا کچکول تھی جس میں قدیم رواج کے مطابق صرف اچھے شعر جمع کیے گئے تھے۔ شعرا کے حالات اور زبان اُردو کی تاریخ و شاعری پر مقدمہ لکھنے کا خیال بعد میں پیدا ہوا۔

بہترین کلام کا انتخاب کرنا بلاشبہ علم ادب کی بہت مفید خدمت ہے۔ مولف مرحوم کی تنقید میں دلسوزی اور اعتدال و نرمی بھی مشرقی تہذیب کی قابلِ قدر خصوصیت ہے۔ لیکن مغربی معیار کی رو سے تنقید کا حق اس طرح ادا نہیں ہوتا۔ اور عجب نہیں کہ زمانۂ جدید کے خردہ بین گلِ رعنا میں اس کمی کا احساس کریں۔ بعض مقامات پر جو پُرانے تذکرہ نویسوں کی رائیں مولف مرحوم نے نقل کر دی ہیں، اُنھیں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید فاضل مؤلف نے اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کیا کہ ہمارے بعض تذکروں کا معیارِ تنقید پست ہے اور تذکرہ نویس، شعرا کی

مفرط ستایش کرنا بھی شرائطِ سخن سنجی میں داخل سمجھتے ہیں۔

گل رعنا میں اُردو شعرا کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر طبقہ کے تین حصّے یا "دَور" ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ مرثیہ گو شعرا کے حالات میں ہے، اور دوسرے میں اپنے والد حکیم سید فخرالدین المتخلص بہ خیالی کے سوانح اور منتخب کلام تحریر کیا ہے۔ شعرا کے تذکرے میں آبِ حیات کی سی تفصیل نہیں ہے مگر تحقیق و اختصار کے ساتھ قریب قریب سب ضروری باتیں جمع کر دی ہیں۔ اور طرزِ بیان ایسا بلیغ و دلچسپ ہے کہ کتاب ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ شعرا کی تعداد جنکا تذکرہ کیا ہے آبِ حیات سے کہیں زیادہ ہے اور دسویں صدی ہجری کے بعض دکنی سخن طرازوں سے لیکر عہدِ حاضر کے اکبر و حالی تک تقریباً سبھی مشہور و معروف شعرا کا ذکر آگیا ہے لکھنؤ کے شعرا ناسخ و آتش سے لیکر اسیر و سحر تک طبقۂ متاخرین کے دَورِ اول میں شامل کیے گئے ہیں اور قدرتی طور پر انکا ذکر آبِ حیات کی نسبت زیادہ مفصل ہے۔ اسی ضمن میں لکھنؤ کے عہدِ بادشاہی کے بعض مشاہیر کا حال آگیا ہے جسکے لکھنے میں فاضل مؤلف خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔

متاخرین میں سے بعض صاحب دیوان شعرا کو (جیسے راسخ، نظام، تعشق) گل رعنا میں جگہ نہ ملی تو چنداں شکایت کی بات نہیں، لیکن حیرت ہے کہ فاضل مؤلف نے متوسطین میں، نظیر اکبرآبادی کو بھی فراموش کر دیا ہے۔ حالانکہ تاریخ اُردو کے طالب علم کو اُسکے کسی معاصر کا کلام پڑھنا اسقدر مفید اور ضروری نہیں ہے جسقدر نظیر اکبرآبادی کا۔

گل رعنا کے شروع میں اُردو زبان اور شاعری کی تاریخ پر آبحیات کے مثل ایک مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ آبِ حیات کا یہ مقدمہ اس تذکرہ کا سب سے ناقص اور لچر حصہ سمجھا جاتا ہے، مقدمۂ گل رعنا میں شعرا کے کلام پر جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ کافی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ لیکن شاعری اور زبان کی تاریخ کے متعلق فاضل مؤلف کی تحقیقات بہت تشنہ اور غیر مربوط ہے آصفی ملکاپوری کے تذکرۂ شعرائے دکن اور تاریخ فرشتہ وغیرہ تین مآخذوں سے مؤلف نے قطب شاہ، نصرتی، ہاشمی وغیرہم کُل سات آٹھ قدیم دکنی شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ بے شبہہ ان قدیم اُردو مصنفین کے حالات میں ابھی تک کوئی بہتر کتاب تحقیق اور تفصیل کے ساتھ ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ تاہم گل رعنا کی تکمیل (۱۳۴۲ھ) کے وقت فاضل مؤلف کو اجمالی طور پر آشنا

معلوم ہونا چاہیے تھا کہ دکنی زبان کے مصنفین کی تعداد سات آٹھ سے کہیں زیادہ ہے۔ ارباب شوق گذشتہ بیس پچیس برس میں دکنی تصانیفِ نظم و نثر کا بہت کافی ذخیرہ فراہم کر چکے ہیں اور ان میں غالباً سب سے زیادہ اور قابل قدر ذخیرہ مخدومی جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے جمع کیا ہے۔ پھر قدیم دکنی کو سمجھنے اور مختلف تغیراتِ لسانی کا زمانہ وار تعین کرنے میں جو حیرت انگیز مہارت بہم پہونچائی ہے وہ حضرت ممدوح کا حصہ ہے۔ یقین ہے کہ ممدوح کی زیر تالیف تاریخ اُردو شایع ہوگی تو اہلِ تحقیق کو ادبِ اُردو کی قدامت اور وسعت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ یہاں اس بارے میں کچھ زیادہ لکھنا بے محل ہوگا لیکن اُردو کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے حضرات کو میں ایک صریحی امر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ دہلی، اجمیر، اور قنوج (یعنی "ہندوستانِ خاص") کے سارے علاقہ کو جن مسلمانوں نے چند سال کے اندر اندر فتح کر لیا تھا اُنکی کُل تعداد ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ اُسی میں سے دو دو چار چار ہزار سپاہی اقطاع ہندوستان کے صدر مقامات میں چھاؤنیاں بنا کے آباد ہو گئے۔ اکثر افراد نے اسی ملک کی عورتوں سے شادیاں کیں اور آبائی وطن سے انکا تعلق منقطع ہو گیا۔ دیسی باشندوں کے مقابلے میں اس نو وارد مسلم آبادی کا اوسط ایک فی صدی بھی نہ تھا۔ ان اسباب کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ایک دو پشت ہی کے بسے ہوئے ہندی مسلمان ہندوستان کی مقامی بولیاں بولنے لگے جو ہندی کی شاخیں تھیں۔ اس نتیجہ کی ادبی شہادتیں بہم پہونچانا زبان اُردو کے تاریخ نگار کا کام ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک ان میں ایک سب سے قدیم اور عمدہ شہادت امیر خسروؒ کی فارسی آمیز ہندی شاعری ہے اور یہ نکتہ خاص طور پر یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اُن کی خالق باری ہندوستان کے ہندی بولنے والے مسلمان بچوں کو فارسی پڑھانے کی غرض سے لکھی گئی تھی نہ کہ ہندوؤں کو! گل رعنا کے فاضل مؤلف خالق باری کے زمانۂ تصنیف کے متعلق شک ظاہر کرتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ امیر خسروؒ سے جو زبانی پہیلیاں اور گیت منسوب ہیں، اُنکی نسبت وہ یقین رکھتے ہیں کہ اصلی زبان میں محفوظ رہے۔ اسکے بعد اُنھوں نے سلطان حسین شرقی کی بعض ہندی راگنیوں کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر بابر کا ایک ہندی مصرع نقل کیا ہے۔ حالانکہ امیر خسروؒ ہی کے زمانے کی دوسری تصانیف، جیسے فوائد الفواد، اور تاریخ فیروز شاہی میں ہندی الفاظ ملتے ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ عادت کی وجہ سے تعلیم یافتہ مسلمان تک اپنی فارسی تحریر میں برت جاتے تھے۔ امیر خسروؒ کے پیر بھائی شیخ نصیر الدینؒ کا یہ ہندی فقرہ صوفیہ کے تذکروں میں کافی مشہور ہے کہ "تم اُپر دے تل"

امیر خسروؔ سے بابر بادشاہ تک بہت بُعد ہے۔ لیکن بیچ کے زمانہ سے قطع نظر کر لی جائے تو بھی عہد بابر کی تصنیفات سے بہت سی دلچسپ شہادتیں اس بات کی اخذ کیجا سکتی ہیں کہ اُن دنوں ہندوستان کے مسلمانوں کی عام زبان ہندی یا ہندوستانی تھی۔ خود تزک بابری میں یہ قابل ذکر واقعہ میری نظر سے گزرا کہ فتح دہلی سے پہلے جب دولت خاں لودھی گرفتار ہو کر بابر کے سامنے لایا گیا تو اُس سے بابر نے ترجمان کے ذریعہ سے گفتگو کی۔ اسی ایک شہادت سے ظاہر ہے کہ اُن دنوں شمالی ہندوستان کے مسلمان شرفا اور اُمرا تک یہیں کی مقامی بولیاں بولتے تھے اور غالباً بہت سے تو فارسی زبان کے بولنے سے بھی قاصر رہ گئے تھے۔ بابر کے بعد کی کتابوں سے اس قسم کی اور دلائل بہم پہونچانا کچھ دشوار نہیں مگر مولف گل رعنا نے مغل بادشاہوں کے زمانے میں ہندی الفاظ استعمال ہونے کی جو نظیریں پیش کی ہیں وہ ایسی سرسری اور سطحی ہیں کہ اس بارے میں کچھ لکھنا تبصرہ کو مستقل تصنیف بنانا سمجھا جائے گا۔ گجرات کے مسلمانوں کی نسبت کسی قدر وضاحت سے کام لیا گیا ہے مگر اس میں بھی ملکی تاریخوں کے سوا بظاہر گجراتی صوفیہ کے تذکرے اور ملفوظات جیسے "جمعات شاہی" وغیرہ مشہور کتابیں فاضل مولف کے سامنے نہ تھیں ورنہ شاید وہ اُن گجراتی بزرگوں کے فرمودہ گجراتی اور ملتانی زبان کے بہت سے قول نقل کر سکتے تھے۔ کیونکہ قطبؒ عالم اور شاہ عالمؒ گجراتی کا نامور خاندان ملتان سے گجرات منتقل ہوا تھا۔

تذکرہ آبِ حیات کے بیانات کی جو غلطیاں فاضل مولف گل رعنا نے پکڑی ہیں، ان کی دو ایک مثالیں نقل کیے بغیر یہ مختصر تبصرہ اور بھی ادھورا رہ جائیگا۔ محمد حسین آزاد مرحوم کے ان تعصبات سے قطع نظر جن کے چھپانے میں اُس نے نعمت خاں عالی سے زیادہ سلیقہ دکھایا ہے، یہ سب جانتے ہیں کہ اسکی زبان جتنی میٹھی ہے اُتنی سچی نہیں ہے۔ نکات الشعرا کے حوالے سے میر تقی میرؔ سے جو غلط رائیں صاحب آب حیات نے منسوب کر دی ہیں، حال ہی میں مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب (المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ) شروانی مدظلہم جیسے متین و معتدل نقاد اُن کی پرزہ دری کر چکے ہیں۔ علامہ ممدوح کے مقدمہ نکات الشعرا کے حوالہ سے آزاد کی ان غلط بیانیوں کو موقع بہ موقع ظاہر کرنے کے علاوہ، گل رعنا میں آب حیات کی اور بھی متعدد روایتوں کی ناراستی عیاں کر دی گئی ہے، مثلاً صاحب آب حیات نے میر حسن دہلوی کو جا بجا درد اور سودا کا شاگرد لکھا ہے، حالانکہ مولف گل رعنا کی تحقیق کے مطابق وہ بارہ برس کی عمر میں دہلی سے رخصت ہو گئے

تھے اور اپنے تذکرۂ شعرا میں بھی اپنے آپ کو میر ضیا دہلوی کا جو خود بھی فیض آباد اور پھر پٹنہ چلے آئے تھے، شاگرد بتاتے ہیں۔ (گل رعنا۔ صفحہ ۲۳۵)

یا مثلاً آب حیات میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کے دیوان کی نسبت لکھا ہے کہ وہ تمام وکمال اُستاد ذوق کا اصلاح داده ہے۔ ممکن تو ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن جیسا کہ مولف گل رعنا نے بتایا ہے (حاشیہ صفحہ ۲۰۴) جس وقت معروف کی شاعری کا فی مشہور ہو چکی تھی اور وہ لکھنؤ میں کچھ روز رہے اور وہاں کے مشاعروں میں غزلیں پڑھیں، اُس وقت شیخ ابراہیم ذوق کی عمر صرف ایک سال کی تھی۔

گل رعنا کی ضخامت ۵۴۶ صفحے۔ قیمت صمہ ر اور کاغذ سفید چکنا ہے۔ لیکن خط معمولی اور کتابت کی بےشمار غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ کارپردازان مطبع معارف (اعظم گڑھ) اب بھی ایک صحت نامہ چھاپ کر کتاب کے آخر میں لگا دیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا معنوی خوبیوں کے اعتبار سے یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر صاحبِ ذوق اس کا مطالعہ کرے۔

سید ہاشمی (فرید آبادی)

پا بہ زنجیر ہوں میں قیدیِ زنداں ہوں میں — اتنے ساماں ہیں مگر بے سر و ساماں ہوں میں

میں چھپاؤں تو بہت دست درازی جنوں — خود گریباں نہیں کہتا کہ گریباں ہوں میں

شب ہے در اصل مرے غم کی بلاؤں کا ہجوم — معنیِ صبح ہیں چاک گریباں ہوں میں

ذکرِ شکر اگر کوئی زباں سے کرے — آنکھ کہتی ہے کہ شرمندۂ احساں ہوں میں

پی کے اک گھونٹ مرے ہاتھ سے چھٹتا نہیں جام — ساقیا اس نگہِ مست کے قرباں ہوں میں

خاک اُڑاتا ہوا جاتا ہوں جدھر جاتا ہوں — ورقِ دہر پہ تصویرِ بیاباں ہوں میں

یوں تو جانے کو گئے آپ مگر یہ تو سنیں — رات بھر دل یہ پکارا کیا ویراں ہوں میں

آ گیا حشر بھی جلدی سے سنوار و گیسو — سعد کو پوچھنا کا ہیکو پریشاں ہوں میں

دامنِ گل پہ نظر آتی ہیں نازک شکنیں — نہیں معلوم کس انداز سے نالاں ہوں میں

درِ جاناں پہ ہوں لیکن نہیں بڑھتا ہے قدم — نا امیدی مری کہتی ہے کہ درباں ہوں میں

تلشا بائی اور ملہار راؤ دوم

ملہار راؤ ہولکر نے مدبری و دانشمندی سے ریاست اندور کا بنیادی پتھر رکھا۔ اہلیا بائی کی جفاکشی و رعایا پروری، ٹکوجی کی شجاعت اور محسن شناسی نے ایک مختصر ریاست کو سلطنت کا ہم پلہ بنایا۔ اور بہادر جسونت راؤ نے عالی ہمتی اور استقلال سے اپنی فوجی قوت کا دبدبہ تمام ہمعصر فرماں روایانِ ہند کے قلوب پر بٹھا دیا۔ یہ داستان کسی قدر تفصیل سے بیان ہو چکی اور ناظرین اُس سے کافی لطف اُٹھا چکے۔ اب تباہی کی دردناک کہانی سننا چاہیے۔

نالۂ بلبلِ شیدا تو سُنا ہنس ہنس کر اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

مانڈو میں مجیبا نام ایک فقیر رہتا تھا۔ جسکی کرامات و ریاضات کی قرب و جوار میں شہرت تھی۔ اُسکی ایک لڑکی "تلشا بائی" حسن و جمال میں بے نظیر اور "چندے آفتاب چندے مہتاب" تھی۔ خوبصورتی کی داستان بادِ صبا کے دوش پر چلتی ہے! جسونت راؤ ہولکر نے یہ خبر سُنی اور غائبانہ عاشق ہو گیا۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

یہ پیکرِ حُسن دوسرے کی ملکیت ہو چکی تھی، مگر جسونت راؤ کے کارپرداز مصاحب جو زمانہ حال کے "مانکڑیوں" سے زیادہ خوش تدبیر تھے، حکمتِ عملی سے اُس پری کو اُڑا لائے۔ شوہر قید کیا گیا اور تلشا بائی رنواس میں داخل ہو گئی۔ چند روز کے بعد بیوی کی سفارش نے مستعفی شوہر کو آزادی ملی۔ وہ گھوڑا، خلعت اور نقد لے کر دکن کی طرف راہی ہوا اور تلشا بائی جسونت راؤ کے دل پر فتح کامل حاصل کرکے اندور کی نور جہاں بن گئی۔!!

شب وصل کی گھڑیاں بہت جلد کٹ جاتی ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں راجہ کے دماغ میں فتور پیدا ہوا۔ اور دیوان ریاست بلرام سیٹھ نے انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُس وقت تلشا بائی کی حکومت محل میں اتنی راسخ ہو چکی تھی کہ دیوان اس تصویرِ حسن کے اشاروں پر کام کرنے کو مجبور تھا۔ تمام بدعنوانیاں اور انتظامی خرابیاں دیوان کے سر تھوپی جاتی تھیں مگر در اصل وہ اسی خوبصورت ناگن کے احکام کا ثمرہ ہوتی تھیں۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں میگویم

اہلیا بائی کی یاد مرہٹوں کے دلوں میں ہنوز تازہ تھی اسلیے تلشا بائی کا دریدہ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینا رعایا کو کچھ انوکھا نہ معلوم ہوا۔ وہ روزانہ دربار کرتی مگر اہلیا بائی کی طرح بے نقاب سب کے سامنے نہ آتی تھی۔ چلمن ڈال کر اجلاس کرتی، اور وزیروں افسروں سے مینا بائی[۵] کی معرفت گفتگو ہوتی تھی۔

ابتدا میں اُس نے بلرام سیٹھ پر پورا اعتبار کیا اور جسونت راؤ کا شریک غم و شادی نواب امیر خاں بلرام کی حمایت پر تھا۔ تلشا کی حکومت خوب جم گئی۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد فوج رانی کے احکام سے بیزار ہوئی۔ سپاہیوں نے مشہور کیا کہ دشمنوں نے جادو سے جسونت راؤ کو دیوانہ بنایا ہے۔ اور موقع پاکر مجنون راجہ کو اپنے کمپ میں اُٹھالے گئے۔ امیر خاں نے بمشکل اس بغاوت کو فرو کیا۔ لیکن اپنی ذاتی ضروریات سے اُسکو بہت جلد راجپوتانہ واپس جانا پڑا۔ اور وہ اپنی طرف سے ایک مسلمان غفور خاں کو جو اُسکا ہم زلف بھی تھا بطور نائب کے دربار اندور میں چھوڑ گیا۔ بلرام سیٹھ نے غفور خاں کو نواب[۶] کا خطاب دیا۔ اور بیس ہزار روپیہ کی جاگیر اُسکو عطا کی۔ جسکے عوض میں نئے نواب نے ریاست کی حفاظت کے لیے ہزار سوار مہیا رکھنے کا وعدہ کیا۔

جسونت راؤ کے آخری زمانہ میں ریاست کی مالی حالت بہت درست ہوگئی تھی۔ دس لاکھ روپیہ نقد خزانہ میں موجود تھا اور فوج باقاعدہ مرتب تھی بلرام نے راجہ کے مخبوط ہونے کے بعد ریاست کے ایک قدیم ملازم دھرما کنور کو کرنیل کا خطاب دیکر کُل فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا لیکن اس محسن کش نے بلرام کو معطل کرکے حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہی۔ اُس نے جسونت راؤ، تلشا بائی اور دوسری رانیوں کے ڈیروں پر سپاہی تعینات کردیے اور حکم جاری کیا کہ اسکی اجازت کے بغیر کوئی شخص ان لوگوں سے نہ مل سکے۔ تلشا بائی یہ قید کیونکر گوارا کرسکتی تھی اُس نے غفور خاں سے مدد مانگی اور نواب نے حکمت عملی سے فوج کو دھرما کے خلاف کردیا۔ سپاہیوں نے بقایا تنخواہ کا تقاضا کیا اور جسونت راؤ کے ڈیرے کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ جب فوج نے کرنیل کی اطاعت چھوڑدی تو دھرما کنور نے اول تو غفور خاں کو اس سازش سے الگ کرنا چاہا اور جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو غفور خاں کو فوجی کیمپ سے باہر چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ غفور خاں

[۵] مہرراؤ کی ایک آشنا موریکا بائی اپنے چاہنے والے کے وقت میں بہت معزز ہوگئی تھی۔ یہ مینا بائی اُسی موریکا کی سہیلی تھی اور مجیبا نقیر کی چیلی بھی تھی۔

[۶] یہ واقعات جسونت راؤ کے مجنوں ہونے سے سات آٹھ ماہ کے اندر واقع ہوگئے۔

اپنی جاگیر کی طرف جس کا صدر مقام "جاورہ" تھا چلا گیا اور وہاں سے کرنیل کے خلاف کارروائیاں شروع کیں۔

دھرما کنور جاورہ پر قبضہ کرنے کو بڑھا لیکن بڑی ساوڑی تک پہونچا تھا کہ امیر خاں اپنی فوج لیے ہوئے اُسکے سر پر آگیا اور لڑائی شروع ہوئی جس کا سلسلہ پندرہ دن تک جاری رہا جب دھرما بہت عاجز ہوا تو اُس نے مجنون راجہ اور تلشا بائی کے قتل کا ارادہ کیا اور اُنکو جنگل کی طرف بھجوایا تاکہ پوشیدہ طور پر اُنکے سر کاٹ لیے جائیں۔ مگر جسونت راؤ کے ایک نمک حلال خادم نے بگاہ کے ایک مرہٹہ سردار رتو پٹیل کو اس دردناک خبر سے آگاہ کیا۔ وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر پہونچا اور دھرما سے پوچھا کہ راجہ کو جنگل میں کیوں لایا ہے۔ تلشا بائی چیخیں مار کر رونے لگی اور بولی کہ "ہماری گردنیں مارنے کو لایا ہے" اس عرصہ میں رتو پٹیل کے سوار بھی موقع واردات پر پہونچ گئے۔ تختہ اُلٹ گیا۔ دھرما گرفتار ہوا اور دوسرے دن تلشا بائی کے سامنے بطور قیدی کے پیش کیا گیا۔ تلشا نے حکم دیا کہ "دھرما اور اُسکے ساتھیوں کو ہنگلیس پہونچا دو" چونکہ ہنگلیس کے قلعہ میں مجرم شاہی نظر بند رکھے جاتے تھے اسلیے دھرما کے ہمراہی مجرم کو شک ہوا کہ اُنکو سزائے موت نہیں دی گئی بلکہ حبس دوام کا حکم ہوا ہے۔ دھرما اُس سے زیادہ تجربہ کار اور عقلمند تھا وہ بات کی تہ کو پہونچ گیا اور اپنے ساتھی سے بولا کہ "بھائی تم غلط سمجھے۔ ہم لوگ آسمانی ہنگلیس[1] کو بھیجے جا رہے ہیں"

کہتے ہیں کہ جب جلاد نے دھرما کی گردن پر ایک ہاتھ سے وار کرنا چاہا تو وہ جھڑک کر بولا کہ "دونوں ہاتھ لگا! یہ دھرما کنور کا سر ہے، ایک ہاتھ سے نہ کٹے گا!!"

دھرما سے فراغت ہوئی تو امیر خاں نے دو لاکھ روپیہ تقسیم کرکے سپاہیوں کی بغاوت کو فرو کیا اور اپنے قدیم ولی نعمت کی ریاست کا انتظام درست کرنے کے لیے دو مہینے تک ہولکر کے دربار میں حاضر رہا۔

اس عرصہ میں ایک جدید شگوفہ نکلا۔ یعنی ایک چالاک برہمن "تانتیا آلکر" نام رانیوں پر ہستہ حاوی ہوگیا اور اُس نے دیوان کے اختیارات سلب کرنے کی کوشش کی۔ جب امیر خاں راجپوتانہ واپس جانے لگا تو اس اندیشہ سے کہ اُسکی غیر موجودگی میں بلرام سیٹھ پر عتاب نازل ہونا ضروری ہے، کیپ چھوڑنے کے قبل تلشا بائی کے پاس گیا اور عرض کی کہ اگر کسی وقت

[1] ہنگلیس۔ بھوانی کا نام ہے جو موت کی دیوی ہے۔

آپ بلرام سے ناراض ہوں اور اُسکو دفع کرنا چاہیں تو میرے پاس بھیج دیجیے گا ہیں بشرط ضرورت اُسکو قتل کردوں گا - تلسا بائی نے یہ گزارش منظور کی تو امیر خاں بلرام سے بھی کہتا گیا کہ رانی تمکو میرے پاس بھیجیں تو فوراً چلے آنا -

امیر خاں کا قیاس بالکل صحیح ثابت ہوا - اُسکے جانے کے چند ہی روز بعد تلسا بائی نے دیوان کو بلا کر حکم دیا کہ وہ امیر خاں کے پاس جائے اور اُس سے وعدہ پورا کرنے کی تاکید کرے بلرام نے حکم کی تعمیل کی - لیکن نتیجہ تلسا بائی کی مرضی کے خلاف ہوا - امیر خاں نے بلرام کو عزت سے رکھا - اپنی چال اُسکو سمجھائی اور تلسا بائی کا وہ خط بھی دکھا دیا جس میں بلرام کے قتل کا حکم تھا - بلرام نہایت ممنون ہوا - امیر خاں کو روپیہ کی ضرورت تھی - اُس نے تقریباً ایک کروڑ چونسٹھ لاکھ کی ہُنڈیاں امیر خاں کے سرداروں اور افسروں کے نام مختلف تاریخوں میں لکھدیں - بعد ازاں امیر خاں ریاست کی طرف چلا کہ تلسا بائی کی اُسکے دیوان سے صفائی کرادے اور بہت مشکل سے اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا - یعنی بلرام سیٹھ پھر دیوان ہوگیا اور اُس نے ہُنڈیوں کی عوض میں امیر خاں کی فوج کو ڈھائی لاکھ روپیہ نقد اور تقریباً دو لاکھ کا کپڑا عنایت کیا -

یہ زمانہ ریاست ہولکر میں نہایت تباہی کا تھا - صوبہ دار اور عامل ہر طرف لوٹ مار کرتے تھے اور فوج سندھیا اور پوار کے علاقوں پر دھاوے مارا کرتی تھی - تلسا بائی نہایت خود غرض تھی اور عورتوں کے تمام عیوب اُس میں جمع تھے - وہ تعلیم یافتہ اور خوبصورت تھی لیکن مزاج میں بہت غصہ تھا اور چال چلن نہایت خراب - ظلم اور بے رحمی اُسکی عادت تھی - اور اپنی رائے کے خلاف کوئی مشورہ سننا اُسکو گوارا نہ تھا - مینا بائی اُسکی رازدار تھی جسنے رشوت سے لاکھوں روپیہ جمع کر لیا تھا اور پھر بھی اُسکا جی دولت سے نہ بھرا تھا - بلرام سیٹھ ذات کا بنیا اور نیک طبیعت تھا - اُسکی خصلت فرماں برداری کی تھی - اور وہ تلسا بائی کے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا تھا - تاہم ریاست میں وہ بہترین افسر تھا - تلسا بائی کے خود کوئی اولاد نہ تھی - اُس نے جسونت راؤ کے لڑکے ملہر راؤ کو جو کیسری بائی (ایک کمہاری) کے پیٹ سے تھا، متبنیٰ کر لیا تھا - جب جسونت راؤ کا انتقال ہوا تو یہ لڑکا مسند پر بٹھا دیا گیا اور کل رعایا نے اُس کے حقوق تسلیم کیے - کوٹہ کا ظالم سنگھ بم پورہ آیا اور اس لڑکے کے سامنے نذر پیش کی - لیکن دو ہی مہینے کے بعد دولت راؤ سندھیا نے تلسا بائی کو ہٹانے کے لیے سازش کی - اپنے ایک عزیز

کو راجہ کی ملازمت میں رکھوایا اور اُس کی معرفت کچھ فوج اندور کی طرف روانہ کی۔ مقتول ملہر راؤ کی بیوہ ایا بائی اور جسونت راؤ کی بیوہ لارا بائی کو سازش میں شریک کیا اور تجویز کی کہ ہولکر کے خاندان سے کوئی دوسرا لڑکا مسند پر بٹھایا جائے۔ غفور خاں نے مدد کی۔ راجہ کو اپنی حفاظت میں لیا۔ سندھیا کی فوج کو شکست دی۔ اور بدنصیب ایا بائی اور لارا بائی قتل کی گئیں۔ اس بغاوت سے امن ہوا تو تلسا بائی نے ریاست کا کچھ حصہ رہن رکھ کر سندھیا سے قرض لینا چاہا۔ دوست راؤ چاہتا ہی تھا کہ اُسکو ہولکر کی ریاست میں دست اندازی کا موقع ملے۔ لہذا فوراً قرض دینے کو راضی ہوگیا۔ لیکن غفور خاں نے اس واقعہ کی امیر خاں کو اطلاع دی۔ وہ فوراً ریاست ہولکر میں آیا اور اُس شرمناک عہد نامہ کو منسوخ کرایا۔ اس نے تلسا بائی سے بھی چال چلن درست کرنے کی استدعا کی۔ لیکن تلسا بائی نے کہا کہ فوجی سردار تانتیا جوگ سے اسکی عداوت ہے اور اُسی نے یہ بے بنیاد قصہ مشہور کیا ہے۔ جب امیر خاں کیپ سے چلا گیا تو سندھیا سے قرض لینے کی کوشش پھر کی گئی۔ بلرام سیٹھ اور مینا بائی کے مشورہ سے تانتیا[1] آلکر گوالیار بھیجا گیا اور وہاں یہ معاہدہ طے ہوا کہ سندھیا چوبیس لاکھ روپیہ سالانہ ہولکر کو دیا کرے اور اسی قدر آمدنی کی جائداد اپنے قبضہ میں رکھے۔ لیکن فوج نے بغاوت کردی اور اس عہدنامہ پر عملدرآمد ہونے سے قبل تلسا بائی کو اپنی جان بچانے کے لیے گنگرور کے قلعہ میں پناہ لینا پڑی۔

اُسوقت دربار ہولکر میں دو پارٹیاں تھیں۔ ایک کا لیڈر تانتیا[1] جوگ تھا اور دوسری کی مینا بائی تھی جو ایک ملازم رام[2] دین کو فوج کا سپہ سالار بنانا چاہتی تھی۔

اُدھر تلسا بائی کا چال چلن پہلے سے بھی زیادہ بگڑ گیا۔ اور دیوان گنپت راؤ سے اُسکی آشنائی ہر شخص کی زبان پر تھی۔ دیوان گنپت راؤ کی خوبصورت بیوی کسی زمانہ میں جسونت راؤ

---

[1] تانتیا جوگ خاندیش کا ایک برہمن تھا، نوعمری میں مہیسر آیا جہاں اُس کا بھائی ایک ساہوکار کا گماشتہ تھا۔ اہلیا بائی کے مرنے کے بعد ساہوکار کا کام بگڑ گیا۔ لیکن تانتیا فوج میں ملازم ہوگیا وہ بلرام سیٹھ کا خیر خواہ تھا اور دھرما کنور کے قتل کے بعد فوج کا انتظام اُسکے سپرد تھا۔

[2] رام دین ذات کا برہمن ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقہ کا رہنے والا تھا۔ وہ ابتدا میں جسونت راؤ کا اردلی تھا اور بعد کو ترقی کرکے مہیسر کا عامل ہوگیا۔ اُس نے مینا بائی کو بہت رشوتیں دلائی تھیں لہٰذا تلسا بائی کی حکومت میں اُسکو صوبہ داری کا خلعت بھی عطا ہوا تھا۔

ہولکر کی منظور نظر تھی اور اپنے شوہر کی ترقیوں کا ذریعہ ہوئی تھی مگر اب اُس نے تانتیا جوگ سے محبت پیدا کر لی۔ اور اس وجہ سے دیوان گنپت راؤ کا تعلق تانتیا جوگ کی پارٹی سے ہوگیا۔ تلشا بائی دیوان کے عشق میں غرق ہی تھی تو مینا بائی کا پلہ کمزور ہوگیا۔ تلشا بائی کے حکم سے مینا بائی اور رام دین دونوں قید کر لیے گئے اور اُن سے روپیہ وصول کر کے فوج کی بغاوت فرو کی گئی۔ غفور خاں نے مینا بائی کے آزاد کیے جانے پر اصرار کیا۔ تانتیا جوگ نے مخالفت کی اور اب یہ ترکیب سوچی جانے لگی کہ تلشا بائی کو معزول کر کے مینا بائی کو اختیار حکومت دیا جائے۔ رانی کی بدچلنی سے شرمندہ ہوکر بلرام سیٹھ بھی سازش میں شریک ہوگیا۔ گنپت راؤ نے مینا بائی کو ایسا تنگ کیا کہ اُس نے زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ تب یہ چال کی گئی کہ کم عمر راجہ تلشا بائی کے قبضہ سے نکال لیا جائے۔ تانتیا جوگ اور گنپت راؤ کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ دیوان گرفتار ہوا مگر تانتیا بھاگ گیا۔ اور چالیس ہمراہیوں کے ساتھ گنگرور کے قلعہ میں پہونچا۔ جہاں اُسوقت تلشا بائی موجود تھی۔ اور اُس نے ارادہ کر لیا تھا کہ فوج نے اگر زبردستی ملہر راؤ کو چھیننا چاہا تو وہ اُس لڑکے کو خنجر سے ہلاک کر دیگی۔ مگر دشمنوں کے سپرد نہ کریگی۔ تانتیا جوگ اور دوسرے مرہٹہ سرداروں نے قلعہ کی خوب نگہبانی کی۔ اور فوج کی رسائی ملہر راؤ تک نہ ہو سکی مگر دیوان گنپت راؤ سپاہیوں کی قید میں تھا۔ اُسپر تشدد کیا گیا اور اُسکی تکلیفیں سنکر تلشا بائی جو اُسکے عشق میں مبتلا تھی بیتاب ہوگئی۔ اپنا زیور فروخت کر کے اُس نے فوج کی پچھلی تنخواہ ادا کی۔ اور اپنے عاشق کو آزادی دلائی!!

تلشا بائی بلرام سیٹھ سے پہلے ہی بیزار تھی۔ آدھی رات کے وقت اُس نے بلرام کو بلوایا اور اپنے اردلی کے سپاہیوں کو اُسکا سر کاٹنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے حکم کی اطاعت سے انکار کیا اور کہا کہ وہ سپاہی ہیں جلاد نہیں۔ اس جواب کو سُن کر گنپت راؤ نے تلوار کھینچی اور بلرام پر پہلا وار کیا۔ پھر اُسکے ہمراہیوں نے خاتمہ کر دیا اور لاش کھینچکر ایک تاریک کمرہ میں ڈالدی۔ صبح کو مشہور ہوا کہ سیٹھ کہیں بھاگ گیا۔ مگر اس خبر پر کسی نے اعتبار نہیں کیا اور سب کو یقین ہوگیا کہ گنپت راؤ اور تانتیا جوگ نے اُسکو ہلاک کر دیا ہے۔

غفور خاں نے دریافت حال کے لیے قاصد بھیجا۔ رانی نے بگڑ کر کہا کہ غفور خاں میرا نوکر ہے یا نک۔ اُس سے کہو کہ اگر بلرام کی اُسے بہت فکر ہے تو یہاں آوے میں اُن دونوں کی ملاقات کرادونگی۔ غفور خاں اس پیام سے بہت خوفزدہ ہوگیا اور اپنا رسالہ کسی قدر فاصلہ پر ہٹا لے گیا۔ تین دن کے بعد تلشا بائی اپنی فوج لے کر قلعہ سے نکلی۔ غفور خاں کے آدمیوں سے کچھ جھگڑا ہوا اور فریقین میں

لڑائی شروع ہوگئی۔ توپوں کے فیر ہونے لگے۔ اور ایک گولہ اتفاق سے ہاتھی کے اُس ہودے کے قریب آیا جس پر ملہار راؤ بیٹھا ہوا تھا۔ تلسا بائی بہت گھبرائی اور راجہ کو گنپت راؤ کے گھوڑے پر بٹھاکر ۱۶ میل پچھم کی طرف بھاگ گئی۔ غفور خاں کے رسالہ سے گنگرور پر قبضہ کرلیا۔ وہاں بلرام کی سڑی ہوئی لاش ملی۔ جسکی کریا کی گئی۔ مگر اس عرصہ میں گنگرور کے قلعہ کا کُل سامان لوٹ لیا گیا۔ اور اُسی دن سے غفور خاں اور تلسا بائی میں کھلم کھلا مخالفت ہوگئی۔

تانتیا جوگ کا پلّہ بوجہ ملہار راؤ پر قبضہ ہونے کے بھاری تھا اُسنے سندھیا کے عامل مندسور سے سازش کرکے وہاں سے ایک فوجی دستہ بلایا اور اُسکو ایک مقررہ رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ سندھیا نے امیر خاں کو لکھا کہ وہ خاندان ہولکر کو پریشان نہ کرے اور غفور خاں کو وہاں سے بلالے۔ امیر خاں نے اپنے نائب کو ہدایت کی کہ وہ ہولکر کی ریاست میں جنگ کرے اور تلسا بائی کو لکھا کہ اگر وہ ادھر اُدھر پھرنا چھوڑ دے اور اُسکو حاضری کی اجازت دے تو یہ سب قصہ فرو ہو جائے گا۔ اور غفور خاں اُسکی ریاست سے ہٹا لیا جائے گا۔ کوٹہ کے ظالم سنگھ نے بھی امیر خاں کی تجویز سے اتفاق کیا۔ لیکن تلسا بائی کو خطرہ تھا کہ یہ لوگ اُسکی حکومت سے معزول کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے جب تک غفور خاں واپس نہ بلا لیا جائے اور فوج کی بغاوت فرو نہ کردی جائے وہ امیر خاں کو دربار میں حاضری کی اجازت دینے سے منکر رہی۔ آخر کار یہ قصہ پنچایت کے ذریعہ سے ظالم سنگھ کے سپرد کیا گیا۔ تانتیا جوگ اور غفور خاں اپنی اپنی شکایتیں لیکر اُسکے پاس پہونچے اور تین مہینے تک باہم گلے شکوے ... ہوتے رہے۔ اسی زمانہ میں خبر ملی کہ انگریزوں کی فوج ایک ڈاکو کے تعاقب میں وسط ہند کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور خطرہ پیدا ہوا کہ یہ لشکر موقع پاکر ریاست پر قبضہ کرلے گا۔ تب ان دونوں سرداروں میں صلح ہوئی اور باہمی اتفاق سے ریاست کی اصلاح کی کوشش کی گئی۔ اسی عرصہ میں پیشوا باجی راؤ (جو انگریزوں کی مدد سے پونا میں مسند نشیں ہوا تھا) اپنے مددگاروں سے ناراض ہوگیا اور سندھیا اور ہولکر وغیرہ مرہٹہ سرداروں کی اعانت سے اُس نے دوبارہ آزادی و خودمختاری حاصل کرنا چاہی۔ اُسکے قاصد ہولکر کے دربار میں بھی آئے لیکن یہاں ایسی بدنظمی پھیلی ہوئی تھی کہ کسی زبردست امداد کا اقرار نہ کیا جا سکتا تھا۔ امیر خاں کے پاس بھی پیشوا کے ایلچی پہونچے اور اُس نے فوج کی آراستگی کے لیے چار لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا۔ روپیہ کے پہونچنے میں دیر ہوئی انگریزوں نے ہر طرف سے اپنی فوج کو حرکت دینا شروع کی اور اُن سے لڑنے کی قوت نہ دیکھ کر امیر خاں نے انگریزوں کے شرائط صلح[1] منظور کرلیے۔ باجی راؤ کے قاصد کو واپس کردیا اور غفور خاں کو لکھا

[1] حاشیہ کے لیے صفحہ آیندہ ملاحظہ ہو۔

کہ وہ تلسا بائی کو پیشوا کی امداد کے لیے فوج روانہ کرنے سے باز رکھے۔ لیکن یہاں پھر خانہ جنگی شروع ہوگئی تھی۔ تانتیا جوگ اور دیوان گنپت راؤ میں بگاڑ ہوگیا۔ اور تلسا بائی ہر معاملہ میں دیوان کے ساتھ تھی۔ نومبر ۱۸۱۷ء میں تلسا بائی نے باجی راؤ کے وکیل سے ایک لاکھ روپیہ لیکر اپنی اپنی فوج کو دکن کی طرف بڑھانے کا وعدہ کیا اور دوسرے مہینے میں مہدپور کی طرف کوچ کر دیا۔ مگر اُسی وقت خبر ملی کہ انگریزی فوج کا ایک دستہ مہدپور سے پچاس میل اُدھر آگر تک پہونچ گیا ہے، اور دوسرا دستہ مالوہ میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ انگریزی فوجیں ظاہرا تو ڈاکوؤں کے تعاقب میں آئی تھیں اور مشہور کیا گیا تھا کہ چیتو نام ایک پنڈاری ڈاکو جو ہولکر کی پناہ میں ہے اُسکی گرفتاری منظور ہے، لیکن درحقیقت ان فوجی کارروائیوں کی غرض یہ تھی کہ ہولکر اور سندھیا باجی راؤ کا ساتھ نہ دے سکیں اور پیشوا کی سازش انگریزوں کے خلاف ناکام ثابت ہو۔ تانتیا جوگ نے صلاح دی کہ انگریزوں سے نامہ و پیام شروع کیا جائے مگر فوج نے اُسکو گرفتار کرلیا۔ انگریزوں کے کمانڈر سرجان ملکم نے آگر پہونچکر ملہر راؤ کے نام ایک دوستانہ خط لکھا اور دیوان گنپت راؤ کے نام بھی ایک تحریر بھیجی کہ اگر وہ خطرہ سے بچنا چاہتا ہے تو فوراً انگریزوں سے صلح کرلے۔ لیکن تمام ریاست میں بدامنی تھی۔ گنپت راؤ انگریزوں کی شرائط منظور بھی کرتا تو فوج کب راضی ہوتی۔ لشکر کا کوئی سپہ سالار نہ تھا۔ ہر ایک رسالہ کا کمانڈر اپنے کو جداگانہ حاکم سمجھتا تھا۔ غفور خاں گنپت راؤ اور تلسا بائی کو تباہ کرنا چاہتا تھا اور رام دین بھی اسکی مدد پر تھا۔ پگاہ کے سواروں میں سے ایک حوالدار نے نو عمر ملہر راؤ کو بہکا کر فوجی کیمپ میں پہونچا دیا۔ اور اُسی وقت سے تلسا بائی کے ڈیرے پر نگرانی قائم ہوگئی۔ گنپت راؤ نے بھاگنا چاہا لیکن وہ گرفتار کرلیا گیا۔ تلسا بائی تمام دن فاقہ سے رہی۔ لیکن فوج اُسکے مظالم سے عاجز آچلی تھی، رات کے وقت اُسکو بالجبر پالکی میں بٹھا کر دریا کی طرف لیگئے اور ندی سپرا کے کنارے اُسکا سر کاٹ کر جسم پانی میں پھینکدیا۔
تلسا بائی کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اُسکے حسن و جمال میں کچھ فرق نہ آیا تھا۔ اُسکی گفتگو میں جادو کی سی تاثیر تھی اور اُسکی شیریں گفتاری ہر دشمن کو رام کرلیتی تھی۔ وہ شہسوار بھی تھی۔ اور جب گھوڑے پر چڑھکر نکلتی تو حسین سہیلیوں کا جھرمٹ گھوڑوں پر سوار اُسکے ساتھ

سلہ (حاشیہ صفحہ ۴۷) یہ معاہدہ ۹ نومبر ۱۸۱۷ء کو ہوا۔ اس صلحنامہ کے ذریعہ سے انگریزی گورنمنٹ نے اُس علاقہ کی ضمانت کی جو نواب امیر خاں کے قبضہ میں تھا اور اُس کی حفاظت اپنے ذمہ لی۔ ریاست ٹونک کا آغاز اسی تاریخ سے سمجھنا چاہیے۔

ہوتا تھا۔ وہ اگرچہ جسونت راؤ کی بیوی نہ تھی لیکن رعایا نے اُسکو رانی کے برابر سمجھا۔ نو عمر راجہ اُسکی سرپرستی میں تھا، اسلیے ہولکر کا تمام خاندان اُسکی عزت کرتا تھا۔ لیکن اپنے افعال و حرکات سے اُس نے سب حرمت خاک میں ملادی۔ اور ایسی حسرتناک موت اُسکو نصیب ہوئی کہ کسی نے اُس کے غم میں دو آنسو بھی نہ بہائے۔ سنتے ہیں کہ روما الکبریٰ کے ظالم بادشاہ نیرو کی قبر پر کسی نے پھولوں کا ہار چڑھا دیا تھا، مگر اس بے رحم رانی کی کریا کسی نے نہ کی۔

مرتے ہیں تیرے سب پہ نہ اس بیکسی کے ساتھ
ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر

اس عرصہ میں انگریزوں کا لشکر ہولکر کے کیمپ سے دس میل کے فاصلہ پر مہدپور تک پہونچ چکا تھا۔ قتل سے فراغت کے بعد رات کو مشورہ ہوا۔ اور ۲۱- نومبر ۱۸۱۷ء کو مرہٹوں کی فوج انگریزوں سے مقابلہ کے لیے بڑھی۔ سواروں پر رام دین حاکم تھا اور غفور خاں اپنے خاص ہمراہیوں کے ساتھ فوج کے پیچھے نو عمر راجہ کے پاس تھا۔ انگریزوں نے مرہٹوں کے توپخانہ پر دھاوا کیا۔ اور بے سری فوج ہر طرف بھاگنے لگی۔ سوار جنھوں نے شروع میں بہت بہادری دکھائی تھی سب سے پہلے بھاگے۔ اُسکے بعد پیدل فوج فرار ہوئی۔ اور پھر توپخانہ بھی خاموش ہوگیا۔ جب سپاہی ہر طرف بھاگنے لگے تو نو عمر ملہر راؤ روتا اور منت سے اُنکو واپس بلانے لگا۔ اُسکے چچا زاد بھائی ہری راؤ ہولکر نے بہت جوانمردی دکھائی، لیکن مٹھی بھر خاک سے سمندر کیسے پٹ سکتا تھا۔ ہولکر کا لشکر بھاگ کر سیتا مئو پہونچا اور وہاں ملہر راؤ کی ماں کیسری بائی نے تانتیا جوگ کو وزارت کا خلعت دیا۔ اور اپنے خاندان کی حفاظت اُسکے سپرد کی۔ اب انگریزوں سے مقابلہ بیکار تھا۔ صلح کا پیام بھیجا گیا اور ۶- جنوری ۱۸۱۸ء کو مندسور کے مقام پر اُس قابل یادگار صلحنامہ پر دستخط ہوے جس نے ریاست اندور کو بیرونی حملوں سے محفوظ کردیا۔ اس صلحنامہ کے خاص شرائط یہ تھے:۔

اول- ایسٹ انڈیا کمپنی کسی دوسری ریاست کو ہولکر کے علاقہ پر حملہ نہ کرنے دیگی اور اس علاقہ کی ویسی ہی حفاظت کریگی جیسی کہ اپنے مقبوضات کی کرتی ہے۔

دویم- انگریزی گورنمنٹ نے نواب امیر خاں سے جو جداگانہ معاہدہ کرلیا ہے ہولکر اُس سے اتفاق کرتا ہے۔ اور اُن تمام علاقوں سے دست بردار ہوتا ہے اس معاہدہ کے مطابق امیر خاں کو دیے گئے ہیں۔

سوئم۔ چچھار، ڈوگ، گنگرور، اور اوہ کے پرگنوں سے ہولکر دست بردار ہوتا ہے۔ اور یہ علاقہ راجہ ظالم سنگھ کوٹہ کو دیا جاتا ہے

چہارم۔ ملہر راؤ ہولکر اُن تمام حقوق سے دست بردار ہوتا ہے جو اُسکو راجہ اودیپور، جے پور، جودھپور، کوٹہ، بوندی اور کرولی وغیرہ پر حاصل تھے۔

پنجم۔ ملہر راؤ ہولکر اُن تمام علاقوں سے دست بردار ہوتا ہے جو بوندی پہاڑیوں کے اندر یا اسکے شمال میں واقع ہیں۔

ششم۔ ہولکر ست پڑھ پہاڑی کے جنوب کا کل علاقہ بشمول قلعہ سندوا کے انگریزی گورنمنٹ کی نذر کرتا ہے۔ اور خاندیش وغیرہ کے مقبوضات بھی چھوڑتا ہے۔

ہفتم۔ انگریزی گورنمنٹ ہولکر کی ریاست میں اندرونی و بیرونی امن قائم رکھنے کے لیے ایک فوجی دستہ ریاست کے حدود کے اندر کسی مناسب جگہ پر قائم رکھے گی۔

ہشتم۔ ہولکر کمپنی کے کسی اتحادی سے دشمنی نہ کرے گا اور نہ کسی دوسری ریاست سے بغیر منظوری رزیڈنٹ کے نامہ و پیام کرے گا۔

نہم۔ ہولکر اپنی زائد فوج برطرف کر دے گا۔

دہم۔ مہاراجہ نواب غفور خاں کو اُسکی موجودہ جائداد پر جو اضلاع ملہار گڈھ، تال منڈاول، جاورہ اور بڑود وغیرہ میں واقع ہے بحال کرتا ہے اور انگریزی گورنمنٹ اسکی ضمانت کرتی ہے پیلود کا خراج اور سائر بھی اُسکو ملیگا۔ اور یہ اضلاع نسلاً بعد نسلٍ نواب کے پاس رہیں گے بشرطیکہ وہ چھ سو سوار مہیا رکھے۔

یازدہم۔ ملہر راؤ ہولکر گورنمنٹ کی اجازت کے بغیر کسی یوروپین یا امریکن کو اپنے ہاں ملازم نہ رکھے گا۔

دوازدہم۔ انگریزی گورنمنٹ پیشوا یا اُسکے وارثوں کو ریاست میں کوئی دست اندازی کرنے نہ دیگی۔

⁂

مندسور کا صلح نامہ مرہٹوں کی جنگی تاریخ کا آخری ورق تھا۔ پونا، ناگپور، و گوالیار کی ریاستیں پہلے ہی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی ماتحت ہو چکی تھیں، صرف اندور کا علاقہ جسونت راؤ ہولکر کی ہمت و دلیری کی بدولت انگریزی حکومت سے آزاد تھا۔ یہاں نہ تو انگریزی فوج کی چھاؤنی تھی اور نہ کوئی رزیڈنٹ رہتا تھا۔ مگر اس صلحنامہ نے یہ خودسری بھی ختم کر دی۔ اور مرہٹوں کی کوئی آزاد حکومت باقی نہ رہی۔

صلح نامہ کی آخری دفعہ یہ تھی کہ معاملاتِ ریاست میں پیشوا کو دست اندازی کا حق نہ ہوگا۔ لیکن یہ شرط چند ہی روز کے بعد بیکار ہوگئی۔ کیونکہ ایک ہی سال کے بعد پیشوا گرفتار کرکے کانپور بھیجدیا گیا اور پونا کا علاقہ بھی انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔ صلحنامہ نے اگرچہ فوجی قوت وجنگی قابلیت کا خاتمہ کردیا لیکن اس میں شک نہیں کہ ریاست کو بہ نسبت سابق کے زیادہ امن نصیب ہوا۔ تلشا بائی کی حکومت میں جو اندھیر تھا وہ مٹ گیا۔ غفور خاں جاورہ گیا اور پارٹی بازی کا بازار سرد ہوا۔ راجہ کی ماں کیسری بائی نے صلح سے پہلے ہی تانتیا جوگ کو خلعتِ وزارت سے سرفراز کیا تھا وہی حکومت کا افسر اعلیٰ بنا۔ اور ریاست کا دار السلطنت جو کبھی مہیسر اور کبھی بھانپورہ سمجھا جاتا تھا مستقل طور پر اندور میں قائم ہوا۔ فوج کی تعداد کم کی گئی۔ اور مالگزاری کی وصولی پر پوری توجہ کی گئی۔ تلشا بائی کی بدانتظامی سے ۱۸۱۸ء میں ریاست کی آمدنی صرف پانچ لاکھ رہ گئی تھی، وہ نو سال میں تیس لاکھ تک پہونچ گئی۔ ۱۸۱۹ء میں دو بلوے ہوے۔ جن میں سے ایک راجہ کے چچازاد بھائی ہری راؤ ہولکر نے کیا تھا۔ مگر یہ دونوں بغاوتیں آسانی سے فرو کی گئیں۔ ہری راؤ نے خود ہی اطاعت قبول کرلی اور مہیسر میں نظر بند کردیا گیا۔ ۱۸۲۱ء میں پھر بغاوتیں ہوئیں لیکن انگریزی فوج کے دبدبہ سے زور نہ پکڑ سکیں۔ ۱۸۲۶ء میں تانتیا جوگ مرگیا اور ملہر راؤ نے انتظام حکومت خود اپنے ہاتھ میں لیا۔ بہت ہی جلد خزانہ خالی ہوگیا اور فوج نے تنخواہ کا مطالبہ شروع کیا۔ جسکے ادا کرنے کے لیے کیسری بائی کو اپنی جیب خاص سے روپیہ دینا پڑا۔ ۱۸۲۹ء و ۱۸۳۰ء میں پرگنہ نندواس پر ٹھاکروں نے چڑھائی کی لیکن انگریزی فوج کی مدد سے وہ بھی کچل دیے گئے۔ ۱۸۳۱ء میں ایک فقیر نے فساد برپا کرنا چاہا مگر قتل کردیا گیا۔ ۲۷-اکتوبر ۱۸۳۳ء میں ملہر راؤ دنیا سے رخصت ہوگیا۔

مارتنڈ راؤ

(۱۸۳۳ء - ۱۸۳۴ء)

ملہر راؤ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ لہذا اُسکی بیوہ گوتما بائی اور اُسکی ماں کیسری بائی نے باپو ہولکر کے لڑکے مارتنڈ راؤ کو گود لیا اور جنوری ۱۸۳۴ء میں وہ مسند نشین کیا گیا۔ ہری راؤ ابھی تک مہیسر میں قید تھا۔ اور اُسکے حقوق وراثت فائق تھے۔ بھیلوں اور میواتیوں نے سازش کرکے اسکو قید سے چھڑایا۔ مارتنڈ راؤ کے طرفداروں نے انگریزی گورنمنٹ سے مدد مانگی لیکن اُدھر سے صاف جواب ملا اور کہا گیا کہ ملہر راؤ کی بیوہ نے انگریزوں سے دریافت کیے بغیر ایک لڑکے کو گود لیا ہے، اس لیے اُسکی حفاظت کی ذمہ داری کمپنی پر نہیں ہے۔ ریاست کی فوج نے

بھی ہری راؤ کا ساتھ دیا۔ اور کیسری بائی کو مجبور ہو کر ہری راؤ کی گدی نشینی تسلیم کرنا پڑی۔ ہری راؤ ۱۷۔ اپریل ۱۸۳۴ء کو اندور آکر مسند نشین ہوا۔ اور غریب مارتنڈ راؤ پنشن دے کر دکن بھیج دیا گیا۔

ہری راؤ

(۱۸۳۴ء - ۱۸۴۳ء)

ہری راؤ نے مسند نشین ہوتے ہی جسونت راؤ کے قدیم ملازم ریوا جی پھانسے کو دیوان بنایا۔ لیکن یہ انتخاب غلط ثابت ہوا کیونکہ ریوا جی کو ریاست کے کام کا تجربہ نہ تھا اور وہ شراب کا بہت عادی تھا۔ ریوا جی نے دیوان ہوتے ہی اپنے لڑکے راجہ بھاؤ کی شادی مہاراجہ کی ایک لڑکی سے کردی اور ایک لاکھ سالانہ کی جاگیر اُسکو دلائی۔ چند روز میں مالگزاری گھٹ کر نو لاکھ رہ گئی۔ اور سالانہ خرچ چوبیس لاکھ تک پہونچ گیا۔ رعایا میں بد امنی پیدا ہوئی اور مارتنڈ راؤ کو دوبارہ گدی نشین کرنے کی سازش شروع کی گئی۔ ریاست کی فوج کا کچھ حصہ بھی اِن باغیوں کا شریک ہو گیا۔ اور ۸۔ ستمبر ۱۸۳۵ء کو مرہٹوں نے راج محل پر چڑھائی کی مگر کیسری بائی نے باغیوں کو مدد نہ دی۔ لہذا وہ جلد منتشر کر دیے گئے۔ یہ سازش ناکام رہی، البتہ ہری راؤ بہت خوفزدہ ہو گیا اور اُس نے محل سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ ریوا جی سیاہ و سپید کا مختار تھا۔ اور آمدنی روز بروز گھٹتی جاتی تھی۔ ۱۸۳۸ء میں حالت ایسی نازک ہو گئی کہ انگریزی گورنمنٹ کو مداخلت کرنا پڑی۔ اور راجہ کو تنبیہ کی گئی کہ انتظامات کی اصلاح نہ ہوئی تو اندور کا علاقہ سرکار اپنے ہاتھ میں لے لیگی۔ اس تنبیہ کے بعد کچھ حالت سنبھلی مگر چند ہی روز میں پھر بدنظمی کا بازار گرم ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں راجہ نے خود اپنے ہاتھ میں کام لیا، لیکن اُس کی صحت بہت خراب تھی اور تمام انتظامی معاملات راجہ کا داماد کرتا تھا۔ رزیڈنٹ نے اصرار کیا کہ مہاراج اپنی ریاست کا کوئی وارث نامزد کریں۔ اور ۲۔ جولائی ۱۸۴۱ء کو گیارہ سال کا ایک لڑکا کھانڈے راؤ نام جو باپو ہولکر زمیندار جوتش کھیڑہ کا بیٹا تھا متبنیٰ کیا گیا۔ مارتنڈ راؤ کے طرفداروں نے دوبارہ سازش شروع کی اور گورنر جنرل کو ۱۸۴۳ء میں اعلان کرنا پڑا کہ سوائے کھانڈے راؤ کے کوئی دوسرا شخص وارثِ جائز نہ سمجھا جائے گا۔ مہاراجہ کی علالت کا سلسلہ عرصہ سے قائم تھا۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۴۳ء کو وہ بیہوش ہو گئے۔ اور اس زمانہ میں بدنیت معززوں نے خزانہ سے بہت سا روپیہ اُڑا لیا، اور بہت سندیں بھی راجہ کی مُہر لگا کر مصنوعی مرتب کر لیں۔ ہر حال آٹھ روز غافل رہ کر ۲۴۔ اکتوبر ۱۸۴۳ء کو اس کمزور راجہ کا خاتمہ ہو گیا۔ — نظامی خاں

خیالاتِ عالیہ

(ترجمہ از مسٹر ایمرسن)

کل میں نے ایک مشہور و معروف شاعر کے چند اشعار پڑھے تھے ، وہ اشعار فطری تھے رسمی یا رواجی نہ تھے۔ اس قسم کے اشعار سے روح مسرور ضرور ہوتی ہے اشعار کا عنوان چاہے کچھ ہو۔ ان اشعار میں جو جذبات مرکوز ہوتے ہیں، وہ ان خیالات سے حقیقت میں بالاتر ہوتے ہیں جو اُن میں پائے جائیں۔ اپنے خیالات پر اعتماد کرو یعنی یہ کہ اپنے ضمیر کی آواز کو غور سے سنو اور جو صداقت اُس وقت عیاں ہو، وہ ہی ہر فرد بشر کے لیے قابل تقلید صداقت ہو جاتی ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ اسی کو فراست کہتے ہیں۔ کسی بات کے تجربہ کے بعد، اُس بات کے متعلق جو تمہارا یقین ہو، اُسکو مخاطب کر دو اور پھر وہ ہی یقین سب کے لیے عام مفہوم ہو جائیگا۔ اسوجہ سے کہ جس شخص کا باطن بہ نسبت ظاہر کے اچھا ہوتا ہے تو چند روز میں اُسکا ظاہر باطن کی مثل ہو جایا کرتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کا ظاہر اور باطن ایک ہی تھا اور اسی وجہ سے ہم اُنکی تعریف بھی کرتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ خاص اپنے خیالات کے ترجمان تھے سُنی سنائی باتیں نہیں کہا کرتے تھے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے ضمیر کی صدا کو جانچتا اور تولتا رہے۔ یہ بات بھانڈوں اور دانشمندوں کی بے تکی باتوں کو وزن کرتے رہنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ پھر بھی ایک شخص کسی خیال کو اپنا خیال سمجھ کر چھوڑ دیا کرتا ہے۔ چنانچہ جب ہم کوئی کام کریں اور اُس کام کے متعلق کوئی خیال پیدا ہو تو اس خیال کو ہم کمزور خیال سمجھ کر اس سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور جب ہمارے کام میں اس روش سے کوئی نقص واقع ہو جاتا ہے تو پھر وہی خیال (جسکو ہم نے بیکار سمجھا تھا) باکار معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور اس طرز عمل سے ہم کو ایسا سبق حاصل ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تجربوں سے بھی ہونا مشکل ہے۔ یعنی یہ کہ اس بات سے ہم پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ اگر دوسری طرف ہزاروں صدائیں بھی مل کر ہم پر ایسا اثر ڈالنا چاہیں تو نہیں پڑ سکتا۔ آج ایک خیال کو ہم نے ناقابل توجہ سمجھ کر ترک کر دیا ہے اور کل ایک شخص اسی خیال کو بہت وثوق اور تجربہ سے بیان کرے تو ہم کو شرم و حجاب کے ساتھ اپنے اسی خیال پر پھر کاربند ہونا پڑتا ہے۔

اس خصوص میں ہمیں جو سبق بچوں کی صورتوں، اُنکے انداز اور جانوروں سے ملتا ہے ویسا

کسی اور چیز سے کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا فطرت ہم سے باتیں کر رہی ہے۔ اس لیے کہ ان معصوم بچوں کا دماغ بالکل ساکن اور ایک حالت پر ہوتا ہے۔ انکی آنکھیں کسی کے حُسن زاہد فریب سے بھی مرعوب نہیں ہو سکتیں نہ اُن پر کسی کی نازک خرامیوں کا چلتا ہوا جادو اثر کر سکتا ہے اور نہ اُن کا دل کسی کی زلف بلا میں پھنس کر مبتلائے رنج ومحن ہو سکتا ہے۔ غرض یہ تو ان معصوم بچوں کی حالت ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی جب ہم انکے چہروں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ سرسری ہی ہوا کرتی ہے۔ بچپن کو کوئی شخص مطیع نہیں کر سکتا بلکہ وہ خود اُسکے مطیع ہو جایا کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی سمجھدار آدمی بچوں سے کھیلتا یا اُن سے تتلا کر باتیں کرتا ہے تو عموماً بچہ ایک کو چار یا پانچ کو ایک باوجود سمجھانے کے بھی کہہ جایا کرتا ہے۔ اسی لیے خدا نے بچپن کو بھی ایسی باتوں سے آراستہ کر رکھا ہے جو زمانۂ بلوغ یا عالم جوانی میں انسانوں میں پائی جائیں اور اس آراستگی میں ایسی کشش پنہاں رکھی ہے کہ اس پر بولتے ہوئے جادو کا گمان ہوتا ہے اور اسکو ایسا قابل رشک اور پُرشوکت بنایا ہے کہ اگر وہ اسکے متعلق کوئی دعویٰ بھی کر بیٹھے تو تھوڑی دیر کے لیے تو اسکی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔ بچہ چونکہ تم سے کوئی بات چیت نہیں کر سکتا اس بنا پر کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ قوت گفتار سے عاری ہے۔ دیکھو! دیکھو! ذرا غور سے سنو! دوسرے کمرہ میں وہ ہی بچہ کیسا صاف صاف اور بیدھڑک باتیں کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ اپنے ہمعصروں (یعنی اپنی عمر والے بچوں) سے خوب بات چیت کر سکتا ہے۔ اسکی باتیں خواہ شرمیلی ہوں یا جرأت آمیز تاہم وہ ہم لوگوں کو باعتبار سن بڑا ہی سمجھتا ہے۔

بچوں کی حالت اُسوقت قابل رشک اور قابل دید ہوتی ہے جب انکو اچھا کھانا ملنے کی توقع ہو۔ وہ اس کھانے کے مقابلہ میں تمام چیزوں کو ایسا بے حقیقت اور قابل نفرت سمجھتے ہیں جس طرح ایک متمول آدمی اپنے مرصع کمرہ میں بیٹھکر غریب اور مفلوک الحال آدمیوں کو قابل نفرت اور گردن زدنی سمجھا کرتا ہے۔ ایک لڑکا کوٹھے کے اوپر کمرہ میں گھروندا بنا کر بیٹھا ہوا ہے، اُسکی حالت اسوقت بالکل خود مختارانہ، غیر ذمہ دارانہ ہوتی ہے اور باہر کے آنے جانے والوں کو اُنکی حیثیت دیکھکر کے مطابق وہ اُن پر حکم لگاتا رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ کسی کو اچھا کہہ دیتا ہے، کسی کو بُرا، کسی کی طرف دلچسپی سے دیکھنے لگتا ہے، کسی کو بیوقوف کہہ دیتا ہے، کسی کو احمق اور کسی کو مردم آزار۔ غرض اس قسم کا فیصلہ صادر کرتے وقت وہ خود کسی نتیجہ پر غور نہیں کرتا اور نہ اُسکو اس وقت کسی مفاد کی اُمید ہوتی ہے۔ وہ تمھارا ادب اور لحاظ نہیں کرتا بلکہ تم کو خود اُسکا کرنا چاہیے۔ برخلاف اسکے

انسان کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ گویا وہ اپنی ریاکاریوں کے باعث خود مقید ہو رہا ہے۔ جب انسان کوئی ظاہری یا نمائشی کام کرتا ہے یا یہ کہ جب وہ کوئی قابل تعریف بات کہتا ہے تو اُسکی حالت اُسوقت ایک مجرم کی سی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ سینکڑوں آدمی اسکے اسوقت ہمدرد ہوجاتے ہیں اور ہزاروں اُس سے متنفر۔ اور جو لوگ اس سے ہمدردی کرتے ہیں وہ اُسکے ہمدرد ہی رہتے ہیں اور جو اُس سے نفرت کرتے ہیں وہ متنفر ہی رہتے ہیں۔ اور پھر اس شخص کو غیرجانبدار ہونے کا اپنی زندگی میں کبھی موقع نصیب نہیں ہوتا۔

یہ وہ صدائیں ہیں جن کو ہم تنہائی میں سُنا کرتے ہیں لیکن جوں جوں ہم دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں یہ صدائیں دھیمی پڑتی جاتی ہیں۔ دنیا میں ہر متنفس کے خلاف سوسائٹی سازش کرتی رہتی ہے۔ سوسائٹی ایک متحدہ جماعت کا نام ہے۔ اس میں متحد ہو کر ہر فرد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ روٹی کمانے کے لیے ہر ممکن جد و جہد کرے اور اس متحدہ جماعت میں ہر شخص کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ اپنے سے زیادہ فارغ البال شخص کی آزادی اور تربیت کو کسی نہ کسی طریقہ سے مسدود اور محدود کردے یا یہ کہ اسکی آزادی اور تربیت کے ذرائع کو بہ جبر چھین لے۔ گر سب سے بہتر بات یہ ہے کہ ان سے موافقت کی جائے لیکن موافقت کو خود اعتمادی سے بیر ہے۔

جس شخص کا ایسا خیال ہو تو اُسکی نسبت یہ سمجھنا چاہیے کہ گویا وہ سوسائٹی سے متنفر ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص نیکیوں سے کوسوں دُور ہے مگر اس نے نیکی کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ اور اس بناء پر اُسے سُنی سنائی بات کی حقیقت کی تلاش و جستجو تو ضرور کرنی چاہیے۔ خیالات کی پاکیزگی بہت ہی اچھی چیز ہے۔ جو بات کرنی چاہیے اُسے ضرور کرو۔ پھر جو تمھاری حیثیت ہوگی اُسکی دنیا خود تصدیق کردیگی۔ میری کمسنی کے زمانہ میں، میرے والدین نے ایک بزرگ شخص کو میری تربیت کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہ بزرگ ناصح مجھے اچھی اچھی نصیحتیں کیا کرتے اور میں اُنکو جواب بھی دیتا۔ چنانچہ وہ سوال و جواب میرے حافظہ میں اب تک محفوظ ہیں۔ جب وہ مجھ سے کوئی نصیحت کی بات کہتے تو میں اُنکو یہی جواب دیتا کہ اگر میں صادق ہوں تو اس صورت میں مجھے کسی کے اقوال سے کیا فائدہ ہوگا؟ اس پر ناصح مشفق نے جواب دیا کہ تمھارا عمل سطحی ہوگا دیرپا نہ ہوگا۔ میں نے اس بات کا اُنکو یہ جواب دیا کہ عمل کے سطحی اور دیرپا ہونے سے اسوقت بحث نہیں۔ ہاں! اگر میری فطرت خراب ہے تو میں یقینی گمراہ رہوں گا اور کوئی قانون قدرت مجھے مقدس معلوم نہ ہوگا۔ حق تو یہ ہے کہ نیکی اور بدی اس طرح ایک دوسرے میں تبدیل ہوسکتی ہیں جیسے یہ یا وہ۔ میرا ضمیر جس بات

کی صداقت کی گواہی دے وہی نیکی ہے اور جو اسکے خلاف ہو وہ بدی کہلاتی ہے۔ انسان کا یہ کام ہے کہ وہ ہر مخالفت کا مقابلہ کرے اور یہ سمجھے کہ گویا یہ چیزیں برائے نام ہیں اور آتی جاتی ہیں۔ لوگ کس قدر جلد عہدوں اور مشہور و معروف ناموں، بڑی بڑی سوسائٹیوں اور گذشتہ تعلیم گاہوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیا کرتے ہیں۔ مگر مجھے تو یہ بات کہتے بھی شرم آتی ہے۔ مجھے ہر حال میں صادق القول اور مستقل مزاج رہنا چاہیے۔ اور ہر صورت میں سچی بات کہنی چاہیے۔ اگر کوئی بدنفس اور مغرور آدمی رفاہ عام کے کاموں میں حصہ لینے والوں کا بھیس بدل لے تو کیا وہ یہ کام کر سکتا ہے؟ نیکی کی حد تک نیکی بھی کرنی چاہیے ورنہ وہ کچھ بھی نہیں رہتی۔ محبت کے اصول جب نفرت اور بیزاری کی حد تک پہونچ جائیں تو اس وقت محبت کے اصولوں کی اس طرح مخالفت کرنی چاہیے جس طرح نفرت کے اصولوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ کبھی مجھے سوسائٹی سے محبت ہو جاتی ہے اور کبھی نفرت۔ انکے اسباب کی وضاحت کی مجھ سے امید رکھنا لاحاصل ہے۔ اور ساتھ ہی اسکے مجھ سے یہ بھی نہ کہو جیسا ایک صاحب نے مجھے خوش کرنے کے لیے یہ کہا تھا کہ تمام غریب آدمی اگر دولتمند ہو جائیں تو کیسی اچھی بات ہے۔ یہ غریب لوگ کیا واقعی غریب ہیں؟ اے بیوقوف ہمدردی کا دم بھرنے والے سن! میں تجھ سے کہتا ہوں کہ روپیہ پیسہ سے مجھے نفرت ہے۔ جو کچھ میرے پاس فاضل رہتا ہے اُسکو میں ایسے شخص کو دیدیتا ہوں جس سے میں ناواقف ہوں یا جو مجھے نہ جانتا ہو۔ برخلاف اسکے بعض روحانی نسبت سے ایسے رشتہ دار بھی ہوتے ہیں جن کے لیے میں بک سکتا ہوں، حتیٰ کہ ضرورت کے وقت میں اُنکے لیے قید بھی بھگت سکتا ہوں۔ لیکن تم لوگوں کی ہردلعزیز متفرق سخاوتوں میں تھوڑے بہت چندہ سے اکثر میں بھی شریک ہو گیا ہوں۔ اور وہ چندہ اس قسم کے تھے۔ یعنی کالج میں بیوقوفوں کی تعلیم کے لیے چندہ، غیر ضروری جلسوں کے لیے تعمیر عمارت کا چندہ ایسی عمارتیں ابتک بہت سی بیکار کھڑی ہوتی ہیں۔ لنگڑوں کی امداد کے لیے چندہ۔ اور اسی طرح اور بہت سے چندے ہیں، مجھے شرم کے ساتھ اس بات کا اعتراف ہے کہ مجبور ہو کر میں نے ایک آدھ پیسہ دیا ضرور ہے۔ اور کمبخت یہ وہی پیسہ تھا جسکو میں نے دل پر جبر کر کے کسی اتفاقی ضرورت کے لیے رکھ لیا تھا۔

محمد نجم الغنی قریشی

(دارالترجمہ۔ حیدرآباد دکن)

جگناتھ

ہند منظلمہ کی ایک داستان

ہم اور یار میں قطب کی شاندار چاندنی رات میں سطح چھت پر اپنی لمبی کرسیوں پر لیٹے ہوئے تھے کہ میرے دوست مسٹر ڈی صوبہ راؤ نے کہا آپ یو۔ پی لوگوں کو جگناتھ کا مطلق حال معلوم نہیں آپ کے سیاح اور مبلغ اس ہولناک پوجا کے پجاریوں اور عالموں کے بیانات سے دھوکہ میں آتے رہے ہیں۔ یہ بیانات بلاشک وشبہہ عمداً گمراہ کرنے والے ہیں۔ حضرت، میں نے خود آپ لوگوں کی ایک کتاب میں یہ فقرہ دیکھا کہ یہ زیر بحث عبادت محض وشنو کی عبادت کی دوسری شکل ہے! شاید زمانۂ بعید میں ایسا ہو لیکن اب تو صدیوں سے یہ محض ایک نہایت ہی خونخوار قسم کے ارضی جن کی پرستش ہے۔

میں آپ کو اسکی سچی سچی کیفیت سناؤں گا جس میں میرا کچھ حرج بھی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نے اسے کسی کو سنایا بھی تو وہ آپ کو باور نہ کریگا ہاں ایسا شخص تو یقین کرلے گا جسے اسکا پہلے سے کچھ حال معلوم ہو۔ اور وہ فوراً اسکی صداقت سے انکار کردے گا مبادا اسکی وحشتناک ہیبت حکومت کے علم میں آجائے۔ جس سے اسکو ہمیشہ آج تک اور آئندہ بھی نہایت احتیاط و رازداری سے پوشیدہ کیا گیا ہے۔ مغربی سنکر کو یہ خواہ کیسی ہی لغو اور ناقابل یقین معلوم دے، لیکن یہ بالکل سچ۔ جسکے میرے پاس زبردست وجوہ ہیں۔

اپنی کہانی کو قابل فہم بنانے کے لیے مجھے اسے شروع سے بیان کرنا پڑیگا۔ بہت مدت کا ذکر ہے یعنی اس سے بھی کہیں پہلے کا جب سے تاریخ کے شروع ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ کسی بعید ترین براعظم میں ایک زبردست تہلکہ نے قدیم فطرت پرست مذہب کے بعض مقتداؤں کو بے خانماں کرکے آوارہ کردیا۔ بہتیری خاک چھان کے وہ تھکے ماندے آخر اس مقام پر آبسے جو اب جگناتھ کہلاتا ہے۔ ... یہ انھیں جو دسترس حاصل تھی اُسے وہ برسوں تک صرف بھلائی کے لیے استعمال کرتے رہے۔ اس سے باشندوں میں اُنکا خوف ووقار بیٹھ گیا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، اُنکے جانشین سخت خودغرضیوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے کہ انکی درسگاہ ناپاک جادو کا مکتب بنگیا۔ آخرکار ایک ذی اقتدار شخص جو اپنے پیشرووں کی نسبت زیادہ غیر مآل اندیش یا

زیادہ دلیر تھا، خوفناک طاقت کے ایک خبیث ارضی دیو کو بلانے اور کسی قدر مطیع و فرمانبردار بنانے میں
کامیاب ہو گیا۔ اُسکی مدد سے وہ ایسے نفرت انگیز مظالم کرنے لگا جنسے اُسکے خارج از برادری مُرید
بھی اُسکے خلاف ہو گئے۔ آخر ایک روز اُنھوں نے اُسے مار ڈالا۔ اُس شخص کو تو اُنھوں نے مار ڈالا
لیکن اُس بھتنے کو جسے اپنے جادو کے زور سے لا کھڑا کیا تھا وہ دُور نہ کر سکے۔ اس کمبخت نے علاقہ
بھر میں دُور دُور وہ تباہی اور غارتگری پھیلائی کہ ہیبت زدہ پیشوا بھی گھبرا گئے کہ کیا کریں
کیا نہ کریں۔

آخر اُنکو یہ سوجھی کہ شمالی ملک کے ایک مشہور و معروف جادوگر سے مدد مانگیں جو اُن لوگوں
کے برعکس ہمیشہ اپنی طاقت کو پاک اور شریفانہ مقاصد کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ بڑی منت سماجت
کے بعد وہ اُنکے لیے نہیں بلکہ چاروں طرف کی بیکس و بےبس مخلوق کی خاطر رضامند ہو گیا کہ اس
وقت جس طرح بن پڑے اس پلید اثر کی روک تھام کرے جسے نہایت نا عاقبت اندیشی سے اُنکے
سروں پر ڈالدیا گیا تھا۔ لیکن اچھی سے اچھی بات بھی جو کی جا سکتی تھی بُری تھی۔ کیونکہ خواہ
آپ کو یہ عجیب و غریب بات معلوم ہو جادو کے قواعد کا اقتضا یہ ہے کہ اس قسم کے دیو، جن، بھوت
کے ساتھ بھی پورا انصاف برتا جائے۔ جو کچھ ممکن العمل نظر آیا یہ تھا کہ اس آفت کو محدود کیا جائے۔
یعنی یہ انتظام کیا جائے کہ وہ پوجاری اس دیو سے ایک قسم کا معاہدہ کریں کہ ایسی بیدھڑک تباہی
کے عوض وہ صرف اُن جانوں کے لینے پر قناعت کرے جو برضامندی اس کی بھینٹ چڑھیں۔
اسکے بعد صدیوں سے اس عجیب و غریب وحشیانہ معاہدہ کی بخوبی تعمیل و تکمیل ہوتی رہی ہے۔

جب میں اصل واقعہ کو بیان کروں گا اُس سے آپ کو اُس صلحنامہ کی قراردادیں معلوم
ہو جائیں گی کہ ہر سات سال بعد جو بڑا میلہ اس نام نہاد دیوتا کی عظمت و شان میں باقاعدہ لگتا ہے
اُس میں کیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلی وہ رسم ہے جو لکڑی کے دن کے نام سے مشہور ہے۔ ایک
خاص صبح کو پَو پھٹنے سے پہلے ایک بہت بڑی لیکن چپ چاپ بھیڑ ساحل سمندر پر اکٹھی ہوتی ہے۔ کنارہ
کے پتھروں پر مندر کے پوجاری اپنے پیشوا کے گرد حلقہ باندھ کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اُن سے کچھ
ہی آگے پانی کے قریب تر وہ اجل رسیدہ آدمی، پوجاری اور بڑھئی کھڑے ہوتے ہیں جو اس
خوفناک عہدنامہ کی قراردادوں کے بموجب موت کے منہ میں جانے کے لیے کمربستہ ہوتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جب پہلے پہل یہ ناپاک عہدنامہ ہوا، موروثی پوجاریوں کے سات خاندانوں اور
بڑھئیوں کے سات کُنبوں نے (آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں پیشے بھی موروثی ہیں) دنیاوی آسودگی

کے وعدہ کے معاوضہ میں جسے ہمیشہ عزت و احترام سے پورا کیا جاتا رہا ہے۔ قسم کھائی کہ ہفت سالہ میلوں پر ہر ایک باری باری ایک قائم مقام دیوتا کے حضور میں پیش کرے گا۔ چنانچہ دونوں جو اس موقع کی پُر خوف عزت حاصل کرنے کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں الگ الگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لوگ ان کو بیم و ہراس کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ پہلے ہی سے اس دنیا سے بالاتر عالم میں آدھ پہونچے خیال کیے جانے لگتے ہیں۔

جیسے ہی سورج سمندر سے باہر نکلتا ہے سب کی ٹکٹکی مشرقی اُفق پر لگ جاتی ہے۔ وہ شخص قابل رشک ہوتا ہے جو سب سے پہلے سمندر میں کہیں دُور دراز مقام پر ایک چھوٹا سا سیاہ دھبہ دیکھ پاتا ہے، جو کنارہ کے اس خوفزدہ مجمع کے برابر قریب آتا جاتا ہے۔ جب یہ چیز پاس پہونچ جاتی ہے تو تین لکڑیوں کے شہتیر نظر آتے ہیں جو بندھے ہوئے نہ ہونے کے باوجود برابر بہتے چلے آتے ہیں۔ ذرا آگے پیچھے نہیں ہٹتے۔ حالانکہ بظاہر انکو چلانے والی کوئی قوت نہیں دکھائی دیتی۔ آپ خیال کریں گے کہ یہ بھی پوجاریوں کی کوئی چال ہے۔ میرے دوست! اگر آپ خود اسکو دیکھتے ہرگز ایسا نہ کہتے۔ ممکن ہے آپ کی مایۂ ناز مغربی سائنس پیچیدہ اور قیمتی کلوں کی بدولت اس کیفیت کی نقل کرنے میں کامیاب ہو جائے، لیکن یہ بات اُن پوجاریوں سے کیسے بن پڑ سکتی ہے جو اس قسم کے ذرائع سے بالکل ناواقف ہیں۔ اور علاوہ ازیں ایسے گروہ کے نرغہ میں ہوتے ہیں جو ان کی ہر نقل و حرکت کو بغور دیکھتا رہتا ہے۔

خیر جو کچھ بھی ہو، یہ لکڑ آخر ساحل پر پہونچ جاتے ہیں اور انھیں پوجاری بڑے ادب و احترام سے اُٹھا لیتے ہیں اور مندر کے احاطہ کی ایک جھونپڑی میں لیجاتے ہیں جہاں اس منتخب بڑھئی کو اپنا کام سرانجام دینا ہوتا ہے۔ وہ ذوق و شوق سے اپنے کام میں لگ جاتا ہے جو یہ ہوتا ہے کہ وہ ان پُر اسرار لکڑیوں سے تین مورتیں بناتا ہے جو بعینہ ویسی ہوتی ہیں جو مندر کے سب سے اندر کے عبادت خانہ میں پہلے سے کھڑی ہوتی ہیں۔ وہ روزمرہ اپنے کام میں خاص سرگرمی سے اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ اُسے کھانے یا سونے کے لیے بھی مشکل ہی سے وقت ملتا ہے۔ وہ پہلے دو برابر کی مورتیں یا سہارا دینے والیاں طیار کرتا ہے۔ پھر وہ بیچ کی مورت بنانا شروع کرتا ہے جو خود ذی بحشت دیوتا کی شبیہ ہوتی ہے۔ پاس والے پھولی ہوئی سانس سے کہتے ہیں کہ اپنی کٹھن محنت کے اس مرحلہ پر خود دیوتا کا سایہ برابر اسکی ہمت بندھاتا رہتا ہے۔ یہ سایہ اسے ہی نظر آتا ہے اور اسکے بعد کبھی اسکے حواس سے جاگتے سوتے میں محو نہیں ہوتا۔ جو جو اس کا کام

قریب الاختتام ہوتا جاتا ہے وہ وہ بالاستقلال دیوتا کا سایہ اسکے نزدیک آتا جاتا ہے۔

انجام کار مورت بن چکتی ہے اور محنت کرنے والا جو اس پر اپنی اس قدر محبت بھری توجہ اور پُراز محویت دیدہ ریزی صرف کر چکتا ہے اسکے برابر لیٹ جاتا ہے اور اپنے آپ کو بالکل اس خوفناک بھتنے کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ برابر اس غریب کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اور اس شدید مقناطیسی کشش کا فعل تیز ہونے لگتا ہے جو اس آدمی کی زندگی کو چوسے چلی جاتی ہے۔ آپ کہیں گے یہ خیال کا نتیجہ ہے؟ شاید! لیکن نتیجہ وہی ہے۔ کسی صورت میں بڑھئی اپنے کام کے پورے ہونے کے بعد بارہ گھنٹے بھی نہیں جیا۔

تقریبًا اسکے فورًا بعد جلوس کا دن آتا ہے جو اس میلہ کی انتہائی کیفیت ہے۔ اس موقعہ پر وہ شامت کا مارا پوجاری اُس خوفناک عہدنامہ میں کا اپنا حصہ پورا کرتا ہے۔ مقررہ دن کو صبح ہی بہت بڑے مجمع کے سامنے پوجاری نہایت عزت و احترام سے ان نئی مورتوں کو بالکل اندر کی عبادت گاہ میں اُٹھالے جاتے ہیں اور اُس چبوترہ کے سامنے جس پر پچھلے سات سال سے پرانی تینوں مورتیں کھڑی ہوتی ہیں زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ منتخب پوجاری کے سواسب عبادت گاہ سے باہر نکل جاتے ہیں اور بڑے دروازے جو اس حصہ کو اصلی مندر سے علٰحدہ کرتے ہیں بند کردیے جاتے ہیں اور اس دیوتا کے خاص خادم کو ان پُراسرار مراسم کی ادائگی کے لیے جن کو سوائے اُسکے اور کسی انسان کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی، تن تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ان بند دروازوں میں جو کچھ ہوتا ہے کسی کو آج تک معلوم نہیں ہوا اور نہ آیندہ کبھی معلوم ہوگا کیونکہ اُن میں سے کوئی بھی جو صرف خود اس بات کو بیان کرسکتا اتنا نہ جیا کہ اس پُرخوف راز پر سے پردہ اُٹھاتا۔ پوجاری دروازہ کے باہر سر بسجود محافظ پہرہ کا کام دیتے ہیں کہ کسی قسم کی خلل اندازی نہ ہو۔ ان کا یہ کام محض برائے نام ہے۔ کیونکہ کوئی ہندوستانی اس سناٹے کے گھنٹہ میں اس عبادت گاہ میں داخل ہونے کے لیے کسی قسم کا لالچ قبول نہیں کر سکتا۔ خواہ اُسے گولکنڈہ کے خیالی زر و جواہرات ہی کیوں نہ دیدیے جائیں۔ مندر کے اصلی حصہ کا ہجوم ایک عمیق سکوت میں مستغرق رہتا ہے۔ حتٰی کہ گھنٹہ ختم ہوجاتا ہے اور بڑا پوجاری زمین سے اُٹھ کے موداِنہ خوف وہراس سے ان بڑے دروازوں کو ایکدفعہ پھر کھولدیتا ہے۔

اِدھر ہی لگے ہوے کانوں کو باہر ذرا سی بھی آواز نہیں سنائی دیتی با ینہمہ پجاری مورتوں کی جگہ تبدیل ہوچکتی ہے۔ نئی تو چبوترہ پر قائم ہوتی ہیں اور پرانی الگ زمین پر پڑی ملتی ہیں۔ اور

انکے برابر ہی وہ پوجاری زبان بند لیٹا ہوا دم توڑتا نظر آتا ہے - یہ بتایا جاتا ہے کہ دروازہ کھولنے کے چند لحظہ بعد ہی وہ ختم ہو جاتا ہے - آج تک ان میں سے کوئی مرنے والا بات سے یا اشارہ سے اتنا بھی تو نہ بتا سکا کہ آخر اُس پر کیا بیتی!

صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ بڑھئی کو ان بتوں کے بناتے وقت یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ہر مورت میں ایک خاص قطر کا گول سوراخ بنائے جو اندازاً آدمی کی ریڑھ کی ہڈی کے برابر ہوتا ہوگا - اور کانوں کان یہ روایت مشہور ہے کہ اس مرنے والے پوجاری کا ایک فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ پرانی مورتوں کی اس عجیب نالی میں سے کوئی چیز ——— جسے دیکھ کے کوئی زندہ نہیں رہ سکا ——— نکال کے نئیوں کے اُسی مقام میں رکھے - کہا جاتا ہے کہ اسکے بعد اس دیوتا کی طبیعت اپنے قربان خادم کے دل پر اُس رنج رحم کا القا کرتی ہے جو واجب الادا ہوتی ہے -

اس اثنا میں مندر سے باہر بڑے جلوس کا پورا سامان ہو چکتا ہے اور دیوتا کی بڑی چوبی گاڑی دروازہ تک کھینچ کے لائی جاتی ہے - یہ گاڑی کچھ عجیب صورت کی ہوتی ہے جسکو تصویر یا مجسمہ کے بغیر بیان کرنا دشوار ہے - اس کا نچلا حصہ ایک بڑے مستطیل صندوق سے مشابہ بتایا جا سکتا ہے - جسکے پہلوؤں کے اردگرد دیوتاؤں کی تصویریں اپنی علیحدہ علیحدہ چھتری میں گہرے گڑھوں میں کھدی ہوتی ہیں اور وہ عمدہ گھڑے ہوے ستونوں سے محفوظ کی ہوئی ہوتی ہیں اور اس چبوترہ یا کرسی نما جگہ پر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہوے ایک شیر کا بڑا بھاری بت ہوتا ہے جسکی پشت پر چھتری دار منبر سا ہوتا ہے -

جب وہ وقت آتا ہے بڑا پوجاری نئی مورتی کے سامنے زمین تک جھک کے معمولی ہندوانی طریقہ سے اسکی گردن میں پھولوں کا ہار ڈالتا ہے اور اسکی کمر میں نہایت مرصع پیٹی لگاتا ہے - اپنے شکاروں کے خون سے تر و تازہ ہوکے یہ دیو اپنے وفادار جاتریوں کو از راہِ عنایت اپنی غیر معمولی طاقت کا حیرت انگیز کرشمہ دکھاتا ہے - بیس فٹ لمبا ریشمی فیتہ بت کی پیٹی میں سے نکالا جاتا ہے - اور اُسکے سرے دو پوجاری پکڑ لیتے ہیں جو اسکے راستہ کی سیدھ میں تو نہیں ہوتے البتہ دس فٹ آگے ہوتے ہیں - مندر کا وسطی راستہ خالی کر دیا جاتا ہے اور دونوں پوجاری آہستہ سے فیتہ کو کھینچ کا لگاتے ہیں - اس ٹھمکے کے لگنے سے بھاری بھرکم بت اس خالی کیے ہوے راستہ پر لمبی لمبی فلانگیں لگاتا ہے پوجاری اسکے سامنے آگے بڑھو جاتے ہیں اور ہر قلانچ پر ویسا ہی نرم بھوکا لگاتے جاتے ہیں - آپ کہیں گے بالکل ناممکن؟ یا اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پوجاریوں کی کوئی

عیاری ہے! جو آپ کا جی چاہے خیال کیجیے۔ لیکن بھلا یہ تو بتائیے کہ یہ ہوتا کس طرح ہے؟ پوجاری جو ٹھکی دیتے ہیں انگلی اور اشارہ کی ایک ذرا سی حرکت ہوتی ہے جو فیتہ کو کسنے اور تاننے کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ اور کوئی جرِ ثقیل کی قسم کی قوت بھی استعمال نہیں کیجاتی۔

لیکن اس سے بھی بڑی حیرت انگیز بات اب پیش آتی ہے۔ جب بت اُدھر والے طریقہ سے دروازہ پر جہاں اسکی گاڑی اُس کے لیے کھڑی ہوتی ہے پہونچ جاتا ہے۔ دونوں پوجاری اسی طرح اس فیتہ کے سرے ہاتھوں میں لیے چبوترہ پر چڑھ جاتے ہیں۔ اُنکے پھر ٹھکی دینے پر مورت لُڑھک کے انکے برابر چبوترہ پر آ کھڑی ہوتی ہے اور پھر کسی مزید رہنمائی کا انتظار کیے بغیر وہ ایک قلانچ مار کے اُسکے منبر پر چڑھ جاتی ہے اور اپنے آپ کو آدھا موڑ لیتی ہے تاکہ گاڑی کے سامنے کی طرف اُس کا مُنہ رہے! عقل میں یہ بات نہیں آتی۔ یہی بات ہے نا؟ لیکن ہزاروں آدمی ہیں ہزاروں، جو اسکی گواہی دے سکتے ہیں۔ آخر معلوم تو ہو کیوں اس پر اعتبار نہیں آتا؟ اگر مغرب میں ایک بھاری میز اِدھر اُدھر کو دسکتی ہے، جیسا کہ آپ کے بعض سائنس دانوں نے ہوتے دیکھا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ایک بھاری مورتی مشرق میں ویسا ہی نہ کرے؟ زمین و آسمان میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جنکا آپ کے فلسفہ کو خواب و خیال بھی نہیں آیا! اور ایک واقعہ بہت سے نظروں سے اچنبھا ہے۔

طاقت کے اس حیرت انگیز تماشہ کے بعد بڑا جلوس چلنا شروع ہوتا ہے اور مورت بڑی دھوم دھام سے شہر کے چاروں طرف پھرائی جاتی ہے۔ اسکے چلتے میں ہر قسم کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ بہت سے گھنٹے اور گھنٹیاں جو اس میں ٹنگی ہوتی ہیں عجب مزے کی ٹن ٹن کی آواز نکالتی ہیں اور ہجوم عقیدت سے جے کارے لگاتا ہے۔ اس گشت کے وقت معتقد لوگ بعض اوقات گاڑی کے پہیوں کے نیچے خود جا پڑتے اور اُسکے نیچے کچل کے جان دینے کو اپنے خونخوار دیوتا پر رضامندی کی قربانی چڑھانا سمجھتے ہیں اور اپنے لیے اس میں بہتری خیال کرتے ہیں۔ آپ کی حکومت سمجھتی ہے کہ اُس نے ان سب باتوں کا انسداد کر دیا ہے لیکن جاں نثاری اور عقیدتمندی ایک حکم سے نہیں مٹ سکتی۔ اور غالباً ایک نہ ایک طرح جگناتھ اتنی ہی جانیں لیتا ہے جتنی وہ کبھی لیا کرتا تھا۔ جس اقرارنامہ کی رُو سے وہ کھلم کھلا کشت و خون سے رُک گیا وہ اسے ان جانوں کو قبول کرنے جو برضا و رغبت اسکی نذر ہوں یا ضعیف الاعتقاد عبادت گزاروں پر اپنے مندر میں بھینٹ چڑھنے کا اثر ڈالنے سے نہیں منع کرتا۔ بلا شبہہ جب ممکن ہوتا ہے وہ اس قسم کا اثر ڈالتا ہے

رہتا ہے۔

حقیقت میں نہایت حیرت انگیز و ہیبت ناک کہانی ہے۔ کیوں ہے کہ نہیں؟ لیکن ہندستان کے دُور دُور گوشوں میں بہت سی عجیب باتیں ہوتی رہتی ہیں جنکا علم اس جماعت کو شان وگمان بھی نہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو اسکے لیے بالکل ایسی ہی ناقابل یقین ہیں جیسے ملگنا تھ کے میلے کے من وعن حالات۔

محمد ظفر

رباعیات نازش

کیا لالۂ و گل میں ہے مہک آپ سے آپ
ہے بلبل شیدا کی چہک آپ سے آپ
ہیں یہ حرکات ایک خالق کا ثبوت
کیا شاخِ چمن میں ہے لچک آپ سے آپ

رونق پہ ہو اختلاف سے علم و عمل
آسان ہو عقدہ ہائے دشوار کا حل
حُسّاد کے رشک سے نہ ہو فن کو زوال
گُل ہو نہ ہو اُسے مہر و مہ کی مشعل

نشۂ میں کہاں توبہ کا یارا مجھکو
کس طرح ہو وعظ تو گوارا مجھکو
میرے سر ہوں تمام رندوں کے گنہ
تیری رحمت کا ہے سہارا مجھکو

طوبےٰ بھی ہیں ہے شورِ بلبل بھی ہیں
فردوس کے نغمے بھی ہیں گُل بھی ہیں
فکر عقبےٰ نہ کر پیے جا نازش
ہے گردشِ ساغر بھی ہیں مُل بھی ہیں

محمد مبین نازش بدایونی

دیوان جگر

حکیم افتخار علی صاحب جگر بسواں ضلع سیتاپور کے مشہور شاعر ہیں آپ حضرت امیر مینائی کے خاص تلامذہ میں ہیں اور خود بھی کثیر التلامذہ ہیں۔ حال میں آپ کا دیوان شایع ہوا ہے۔ دیوان حسب امید ضخیم ہے۔ اور حسب معمول آخر میں کئی ورق قطعاتِ تاریخ ہیں۔ جو نہ صرف دیوان بلکہ صاحبِ دیوان کی مبالغہ آمیز قصائد خوانی ہیں

قدیم انداز کے کہنے والوں، اور اسی زلف و کمر اور وصالِ یار کی محاکاۃ (جو لکھنؤ کی شاعری کا طرۂ امتیاز رہی ہے) کرنے والوں سے جو کچھ امیدیں قائم کی جا سکتی ہیں وہ سب اس دیوان سے پوری ہو رہی ہیں۔ اور یقیناً اس طبقہ میں اسکو مقبول ہونا چاہیے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو لکھنؤ کی شاعری کا جزوِ لازم ہے۔

مراعات لفظی اور محض لفظی تناسبات کے دلکش مناظر یہ ہیں۔ ناظرین نشان دادہ الفاظ کے تناسب پر غور فرمائیں:—

بت جگر دیر سے اٹھنے نہیں دیتے شاید — تجھکو مسجد میں نہ اے مردِ مسلمان دیکھا

فلک سے آکے عیسیٰ بھی یہ اکثر پوچھ جاتے ہیں — برا ہے حال یا اچھا ہے بیمار محمد کا

اس شہِ حسن سے لاتا جو مرے خط کا جواب — کم نہ رتبہ میں ہما سے وہ کبوتر ہوتا

یاد آنکھوں کی اٹھاتی ہر شب غم فتنہ — تو نے آکر نہ کبھی فتنۂ دوراں دیکھا

ضد سے صبح شب غم دیگا موذن نہ اذاں — آج اللہ کو یہ مردِ خدا بھول گیا

بتا خدا کے لیے برہمن کوئی تدبیر — کہ مجھ سے اک بتِ کافر ہے سال بھر سے خفا

غرض اس طرح سے سیکڑوں اشعار ملیں گے جس میں شیفتگانِ رنگِ استاد امانت کے سوا اور کسی کے لیے کوئی خاص کشش نہیں اور مراعات و تناسباتِ لفظی کے سوا شعر میں کوئی خاص لطف نہیں۔

شب وصل کی سرگذشت بے دھڑک نظم کر دینا، جذباتِ بوالہوسی کے ہیجان میں شوق سے اظہار مدعا کرنا، خلاف تہذیب شوخیاں یعنی اسی قدیم رنگ پر ہیں ملاحظہ ہوں:—

کہہ رہا ہے نیند میں تھا کیوں گلے لپٹا لیا — روٹھنے کا بمروت کو بہانہ مل گیا

دیکھ کر آپ کو ہم جان گئے رات کا حال — سر جھکا لینے سے گھبرانے سے شرمانے سے

وصل کی شب ہے جگر سے بے تکلف ہو سکیں — او گلے لپٹانے والے اب حجاب آیا تو کیا

کس زور پہ کس جوش پہ ہے اُنکی جوانی — تھمتے کبھی سینہ پہ دوپٹا نہیں دیکھا

جی چاہتا ہے دوڑ کے رخسار چوم لوں — پھینکا ہے پھول یار نے مجھ پر گلاب کا

سوقیت اور پست مذاقی بھی باوجود دنیا کے معیار تہذیب کے بلند ہو جانے کے اب تک وہی ہے :-

بزم دل میں حسرتِ دیدار کا قُل ہو گیا — وہ کب آئے جب چراغِ زندگی گُل ہو گیا

خفتگانِ خاک چیا گل کی صدا سے چونک اُٹھے — کون ہے گورِ غریباں کی طرف آیا ہوا

گُدگُداتے رہے زلفیں جو بنانے بیٹھے — دیر تک آج اُنھیں ہنسنے پہ پریشاں دیکھا

اُلٹ پلٹ کر اُسی پامال مضمون کو پھر کہنا جسکو ہمارے شعرا توارُد کہتے ہیں اور دوسرے کے شعر کو ادنیٰ تغیر سے اپنا کر لینا، عیب ہو یا ہنر، اس دیوان میں بھی ہے - ناظرین ایک کالم میں حضرت جگر اور دوسرے کالم میں دیگر اساتذہ کے اشعار دیکھکر خود فیصلہ فرمالیں :-

حضرت جگر	دیگر شعرا
بھولتی ہی نہیں ساقی کی وہ مستی بھری آنکھ حسن ہے جسمیں چھلکتے ہوئے پیمانے کا	ہم نے دیکھی ہے کسی شوخ کی مستی بھری آنکھ ملتی جلتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانے سے
وہ نسیم سحری ہو کہ مرا مشت غبار جسکو دیکھا ترے کوچے میں پریشاں دیکھا	بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (غالب)
کعبہ میں بھی نہیں ہٹتا کوئی کافر دل سے سجدہ کرتے ہیں جدھر سامنے تو آتا ہے	نہ نماز آتی ہے ہم کو نہ وضو آتا ہے سجدہ کر لیتے ہیں جب سامنے تو آتا ہے
زباں کو چوم لیتے ہیں مرے ہونٹ جب اُسکا نام آتا ہے زباں پر	زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلیے (غالب)
ہماری بات جھوٹی ہم بھی جھوٹے جو کچھ تم کہہ رہے ہو ہے وہی سچ	میں بھی جھوٹا مرے دعوے بھی سراسر جھوٹے تمھیں سچے، چلو اس بات کا جھگڑا کیا ہے
خاک میں دل کو ملاتے ہوئے دیکھا پہلے پھر اُسی زود پشیماں کو پشیماں دیکھا	کی مرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا (غالب)

بعض الفاظ اور محاورے سراسر غلط نظم ہو گئے ہیں

میری بالیں سے وہ یہ کہکر اُٹھے ہے قریب المرگ یہ بیمار اب

قریب المرگ کی صحت مشتبہ ہے؟

دیکھکر آپ کو ہم جان گئے رات کا حال سر جھکا لینے سے شرمانے گھبرانے سے

گھبرانے اور شرمانے کا عطف بذریعہ واو عاطفہ قطعاً غلط اور مہمل

پی کے دو گھونٹ چھلکا دیتا ہے ساغر سرِ دور کوئی انداز تو دیکھے مرے مستانے کا

مستانہ ایسی صورت میں بغیر کسی مضاف الیہ کے اچھا نہیں ہے۔

دن ختم ہوا طول تھا افسانہ ہمارا دنیا سے ہوا حشر جدا گانہ ہمارا

افسانہ طول تھا، غلط ہے، افسانہ طویل کہنا چاہیے۔

دیکھا کیے وہ دیکھنے والے کو تھا سے موسیٰ جو پھر سے دیکھئے دیدار تمھارا

اُردو میں دیدار دیکھنا غلط ہے' دیدار ہونا یا دیدار کرنا صحیح ہے۔

اس سے زیادہ عجیب تر ایسے کہنہ مشق اُستاد کے لیے یہاں ردیف کی بے ربطی اور شعر میں شترگربہ کا پایا جانا ہے۔ متروکات بھی بے دریغ استعمال کیے گئے ہیں۔

اسی کے ساتھ ناظرین پر ظلم ہوگا اگر دیوان جگر کے ان اشعار سے ضیافت نہ کی جائے جن پر بے اختیار دل سے صدائے تحسین بلند ہوتی ہے۔

ہو چکا ہونا تھا جو انجام حسن و عشق کا شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا

حسرت دیدار میں آنسو نکلتے ہی رہے وقت آخر دیکھنے پائے نہ صورت آپکی

باز پرس خون ناحق سے وہ گھبرائے ہوئے آرہے ہیں حشر میں جھوٹی قسم کھائے ہوئے

ادھر سے جائینگے محبس عشق کے مجرم اُدھر سے رحمت پروردگار آئے گی

یوں نہ جائے گی گلستاں سے بہار پھیر کر پھولوں پہ پانی جائے گی

یوں ہی منہ پہ تو یہ مرے آگئی تھی کئی دن سے منہ بد مزا ہو رہا ہے

آیا ہے ساتھ لے کے محبت کی آفتیں جائے گا جان لیکے زمانہ شباب کا

بعض غزلیں پوری مرصع ہیں، اور اُنکو دیکھ کر بے اختیار حضرت جگر کی کہنہ مشقی اور خوشگوئی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دیوان اگر مذاق سلیم اور علو خیال کے اصول کا لحاظ رکھکر انتخاب

کیا جاتا تو یقیناً موجودہ حالت سے بہت بہتر ہوتا۔ ورنہ بحالت موجودہ اسکے متعلق ہم عرض کریں گے کہ یہ حضرت مصنف کی مسلمہ شہرت کے خلاف ہے۔

اس دیوان کی قیمت ۱؎ ہے۔ اور غالباً حضرت مصنف سے بسواں ضلع سیتاپور کے پتہ سے مل سکے گا۔

"انصاری"

تازہ کلام محشر

(یعنی وہ غزل جو انجمن معین الادب کے مشاعرہ منعقدہ ۶۔ جون میں پڑھی گئی)

لکھنؤ میں اس گئے گزرے زمانہ میں بھی شعر و شاعری کا اس قدر چرچا ہے کہ ہندوستان کا کوئی دوسرا شہر اس بارہ میں اسکا مقابل نہیں ہو سکتا مگر بدقسمتی سے ہمیں اس فن شریف سے کوئی بہرہ نہیں ملا۔ اور یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ الناظر کو جیسے اعلیٰ درجہ کے ادیب و انشاپرداز میسر آئے ویسے بلند پایہ ناظم و شعرا نہ مل سکے۔ بیرونی شعرا کا کیا ذکر ہے، خاص لکھنؤ کے ارباب فن اور اڈیٹر کے اعزا و احباب نے اس معاملہ میں ہمیشہ بے التفاتی برتی، جسکے بعد اُسے بھی صبر آ گیا۔ جناب مرزا کاظم حسین محشر کا دلی شکریہ کہ اُنھوں نے التفات خاص توجہ فرمانے کا وعدہ کیا ہے اور وعدہ ہی نہیں بلکہ اُسپر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ کیا دیگر شعرائے کرام ایک غیر شاعر نیازمند کو ممنون کرم نہیں بنا سکتے؟ اڈیٹر

رازِ دل کھل گیا تقدیر سے نالاں ہوں میں
بول اُٹھی نبض مریضِ غمِ پنہاں ہوں میں

یہ خبر جب سے سنی کیا ہی پریشاں ہوں میں
زلف کہتی ہے جوابِ شبِ ہجراں ہوں میں

نگہِ شوق کو گستاخ کیا تھا کس نے
تم پشیمان نہ ہو بلکہ پشیماں ہوں میں

رخ نکلی تو ہوا عالم پیکر بیکار
اتنے سامان پہ بھی بےسر و ساماں ہوں میں

کہیں ایسا نہ ہو آجائے ہنسی وقتِ جواب
یہ نہ پوچھے کوئی کس واسطے گریاں ہوں میں

کہتے ہو جھوٹ ہے دعوائے جنونِ الفت
اتنے سے جرم پہ بس قابلِ زنداں ہوں میں

بدشگونی ہے ارے زلفِ بنانیوالے
تیرے منہ پر کہوں کیونکر کہ پریشاں ہوں میں

دل بلا روز ازل اور وہ غم کے قابل
کم ہے جتنا بھی کہ تقدیر پہ نازاں ہوں میں

مرضِ عشق میں گو آپ کے ہاتھوں ہی شفا
پھر بھی حالت ہی وہ نازک کہ ہراساں ہوں میں

کام آتا نہیں بیمار کے الفت میں کوئی
آپ ہی درد ہوں اور آپ ہی درماں ہوں میں

اُٹھ رہی کوئی نہ تدبیر بھی آگے تقدیر
اس جنوں میں کہ ترے نام پہ قرباں ہوں میں

آئینہ ہو گئی بیتابیِ دل کی حالت
تم پریشان کہو جس کو وہ پریشاں ہوں میں

دل میں درد اور بیاں میں ہو اثر لے محشر
کیوں نہ مانند فغانی کے غزلخواں ہوں میں

قوافی جوش

مکرمی - السلام علیکم۔ الناظر ماہ اپریل و مئی میں جناب سید محمد صاحب نقوی نے حضرتِ جوش کی تائید فرما کر میرے شبہات رفع کرنے کی سعی فرمائی ہے - میں سید صاحب کی توجہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواباً حسب ذیل گزارش کرتا ہوں -

---

الناظر فروری ۱۹۲۵ء میں جوش صاحب کی نظم پر اڈیٹر صاحب نے نوٹ اپنے الفاظ میں دیا تھا - اور یہ الفاظ میرے خط سے لیے گئے ہوں گے مجھے یاد نہیں کہ میں نے کن الفاظ میں اپنے شبہہ کا اظہار کیا تھا - الفاظ "قافیہ مقید" اپنے اصلی اور حقیقی معنی میں استعمال کیے گئے ہیں نہ کسی اصطلاحی معنی میں - بہر حال سید صاحب صحیح نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں اور اب اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے -

---

نقوی صاحب نے بہت سے اسناد اور امثال سے یہ ثابت کیا ہے کہ حرف روی کے متحرک ہونے کی صورت میں شعرائے عجم توجیہ و اشباع کا اختلاف قافیہ میں جائز قرار دیتے ہیں - یہ ایک عام اور مشہور مسئلہ فن قوافی عجم کا ہے جس سے نہ مجھے اختلاف ہے نہ کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے - لیکن یہ امر بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ یہ جملہ صورتیں عیوب قافیہ میں بیان کی گئی ہیں - رسالہ مرأۃ القوافی شیخ بخشش حسین عظیم آبادی مطبوعہ مطبع حسنی سنہ ۱۳۱۲ ہجری میں بصفحہ ۱۲ تحریر ہے " و نزد بعضی اختلافِ اشباع یعنی حرکت حرفِ دخیل نیز داخل نہادہ بود - و ہرگاہ روی بالحاق حرف دخیل متحرک گردد عیب این ہم کمتر باشد" مثال میں سعدیؒ کے وہی دونوں شعر ~ اے بادشاہ وقت الخ تحریر کیے ہیں جن کو نقوی صاحب نے استدلال میں پیش کیا ہے - صاحب مرأۃ القوافی برابری اور شاطری کے قافیہ کو معیوب نہیں کمتر معیوب بتاتے ہیں - چونکہ مجھے اِس وقت قوافی عجم کی تنقید کرنا نہیں ہے اس لیے اس مسئلہ کے طے کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ معیوب قافیہ صحیح قافیہ کا درجہ حاصل کر سکتا ہے یا نہیں -

---

مجھے افسوس ہے کہ جوش صاحب کی نظم اُردو ہے، فارسی نہیں ہے۔ اور سوال یہ ہے کہ اُردو نظم میں اختلافِ توجیہ و اشباع کسی کراہت کے ساتھ بھی جائز ہے یا نہیں۔ جملہ اصنافِ قافیہ مجوزۂ شعرائے عرب یا عجم کو شعرائے اُردو نے عمومیت کے ساتھ مقبول نہیں کیا ہے۔ عربی ادیب کے واسطے قافیہ کا میدان ایک عجمی شاعر کے بہ نسبت بہت زیادہ وسیع ہے۔ عربی شاعر نصیر و امیر کے قافیہ میں بے تکلف عذر ریاز ہو سکتا ہے، لیکن عجمی شاعر کو یہ قدرت نہیں ہے۔ عبد اللہ ابن زبعری کے قصیدہ سے دو شعر پیش کرتا ہوں کیا کسی فارسی یا اُردو نظم میں اس قسم کے قوافی جائز ہیں۔ ہرگز نہیں

یا خیر من حملت علی اوصالہا — غیر ان سرح السید بین غشوم
انی لمعتذر الیک من التی — اسدیت اذ انا فی الضلال اہیم

میں اپنے ثبات کی تائید میں کتاب تقویۃ الشعرا مولفہ جناب امام الدین طالب شاگرد ملک الشعرا حضرت نصیر دہلوی مطبوعہ سلطان المطابع ۱۲۶۶ ہجری صفحہ ۲۸ سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں بیان حرکاتِ حروفِ قافیہ میں فاضل مصنف تحریر فرماتے ہیں کہ "اختلافِ اشباع قافیۂ اُردو میں ہرگز جائز نہیں ہے خواہ روی ساکن ہو یا متحرک ہو اگرچہ فارسی میں قافیہ برابری اور ظاہری کا روا ہے۔" اور تحریر فرماتے ہیں کہ "اختلافِ توجیہ کا بھی اُردو میں جائز نہیں ہے۔" پھر سلسلۂ تشریح حذو تحریر فرماتے ہیں کہ "اختلاف حذو کا بھی اُردو میں جائز نہیں ہے اگرچہ فارسی میں قافیہ آہستہ اور بستہ کا باندھا ہے۔"

میرا خیال ہے کہ اُردو نظم میں اختلافِ اشباع یا اختلافِ توجیہ قافیہ میں جائز نہیں ہے۔ لیکن میں نے مکرمی حضرت جوش کی معلومات پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے اس خیال کو شبہ کے درجہ سے آگے نہیں بڑھنے دیا ہے۔ اور امید ہے کہ نقوی صاحب یا کوئی اور علم دوست کسی ماہرِ فنِ ادبِ اُردو کی تالیف کے حوالہ سے یہ ثابت فرما کر کہ اُردو شعر میں ایسے قوافی صحیح قرار دیے جانے کے قابل ہیں مجھے مطمئن کر دیں گے۔

والتسلیم

فقیر امیر (بدایونی)

سفرِ حجاز کی مختصر روداد

(بسلسلۂ الناظر ماہ جنوری ۳۵ء)

دستوں سے طبیعت مضمحل ہو رہی تھی، اسی حالت میں اطلاع ملی کہ حضرت شمس کا قافلہ دوسرے دن روانہ ہونے والا ہے۔ میں نے بھی سید زین العابدین کو اونٹ کا کرایہ دیدیا، اور حافظ شبراتی اور مولوی یٰسین کی معرفت ضروری چیزیں خریدی گئیں۔ حافظ شبراتی نے چونکہ ہمراہ چلنے کا تہیہ کیا اسلیے مجھے دوسرے ساتھی کی فکر بھی نہ رہی۔ راستہ بھی انشاء اللہ لطف سے کٹے گا۔ ظہر تک طبیعت اتنی سنبھل گئی کہ ہمت کر کے لباس تبدیل کیا اور عصر کی نماز ادا کرنے حرم شریف میں حاضر ہوا۔ اور عشا تک برابر احباب سے رخصتی ملاقاتیں کرتا رہا۔

دوسرے دن سویرے ہی سے رختِ سفر درست کیا گیا۔ شغدف پر چٹائیاں اور کمل منڈھوایا۔ صراحیوں کے لیے زنبیلیں بندھوائیں، اور سامان بھی تیار ہو رہا تھا کہ سید زین العابدین آئے اور یہ خبر سنائی کہ جس اونٹ کا کرایہ دیا گیا تھا وہ نہیں آیا۔ قافلہ باب العنبریہ پر پہونچ گیا تھا جو تبرز کا مقام معین کیا گیا تھا۔ لہذا دوڑتا ہوا وہاں گیا کہ کوئی دوسرا اونٹ خالی ہو تو اُسپر جانے کا انتظام کر دوں۔ وہاں پہونچکر پہلے تو کورا جواب ملا۔ پھر ایک صاحب نے اطلاع دی کہ ایک جگہ خالی ہے اگر تنہا جانا ہو تو کرایہ طے کر لو۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ حافظ شبراتی کو چھوڑ دوں، اسلیے ناچار تھکا ماندہ واپس آیا۔ مگر حضرت شمس کی ہمراہی میں نہ جاسکنے کا بہت رنج ہوا۔ اور جب سید زین العابدین سے سہپر کو ملاقات ہوئی تو غصہ کی وجہ سے بہت درشت گفتگو کی اور اُن سے صاف کہ دیا کہ آپ کرایہ کا روپیہ واپس لا دیں میں اب خود انتظام کروں گا۔ وہ شام کو روپیہ لانے کا وعدہ کر کے گئے مگر وقت معینہ پر نہ آئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ دوڑا ہوا مولوی سید احمد کے پاس گیا اور اُنکے بھائی سید محمود کے مشورہ سے ایک درخواست عربی زبان میں لکھوا کر احمد بن منصور قائم مقام شریف کے پاس لے گیا۔ قائم مقام صاحب اپنے حوالی موالی سمیت بڑی بڑی لگنوں میں اُبلا ہوا پلاؤ اُڑا رہے تھے۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تب مجھے باریابی کا موقع ملا۔ درخواست لیکر رکھ لی اور دوسرے دن صبح کو مع مترجم کے حاضر ہونے کی ہدایت کی۔ واپس آ کر سب کیفیت سید محمود سے بیان کی اور اُنھوں نے ازراہ محبت مترجم کا انتظام کر دینے کا وعدہ کیا

صبح ہوئی تو سید محمود کے پاس پھر گیا اور وہیں سے مترجم کو لیکر قائم مقام صاحب کی بارگاہ پر حاضر ہوا۔ یہ صاحب بدوی ہیں اور اپنی تمام نوع کی طرح جہالت کو مایۂ افتخار جانتے ہیں۔ شریف مکہ نے چونکہ بدویوں ہی کے بل بوتے پر ترکی حکومت سے بغاوت کی اور انھیں کی قوت سے حجاز پر تسلط حاصل کیا، اسلیے قائم مقامی یعنی گورنری جیسے ذمہ دار عہدہ پر بھی بدو ہی مقرر کیے ہیں۔ قائم مقام صاحب اپنے ملاقات کے کمرہ یا مجلس میں لیٹے ہوے حقہ نوش فرما رہے تھے۔ میں حاضر ہوا تو آپ نے میری درخواست ایک اردلی سے منگائی اور مترجم صاحب سے پڑھوا کر سُنی۔ سید زین العابدین پہلے ہی طلب کیے جا چکے تھے، تھوڑی دیر میں وہ بھی ہانپتے کانپتے پہونچے تو اُن سے کسی قدر درشت لہجہ میں بازپرس کی گئی اور فوراً مجھے روپیہ دلوا دیا گیا۔ ساتھ ہی مترجم کے ذریعہ سے مجھے اطمینان دلایا گیا کہ حکومت کی طرف سے اونٹ کا بندوبست کردیا جائے گا۔ اور میں دوسرے قافلہ کے ساتھ روانہ ہو سکوں گا۔ چنانچہ ایک بدو میرے ساتھ کیا گیا جو باب المصری کے باہر بلدیہ (میونسپلٹی) کے دفتر میں مجھے لایا۔ یہاں میں نے کرایہ جمع کیا اور رسید حاصل کی۔ تب جان میں جان آئی، ورنہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں وقت پر مکہ معظمہ نہ پہونچا تو حج رہ جائے گا۔ عصر کے بعد پھر بلدیہ گیا اور مقوم کو ساتھ لاکر اپنا مکان دکھایا تاکہ اونٹ یہیں بھیجا جائے۔ میرے ساتھ دو پیپے بھی تھے جنھیں کھجورا اور خاک شفا تھی۔ چاہتا تھا کہ مقوم کی معرفت مناسب کرایہ پر ان پیپوں کے ساتھ جانے کا بندوبست ہو جائے مگر مقوم نے کرایہ بہت مانگا لهذا اس بارے میں بھی مولوی سید احمد صاحب سے رجوع کرنا پڑا۔ اُنھوں نے ازراہ ہمدردی وعدہ کیا کہ پیپے رابغ کے ذریعہ براہ راست جدہ پہونچا دیے جائیں گے۔

حضرت سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر فاتحہ خوانی نہیں کرسکا تھا۔ اتفاق سے ٹھہر گیا تو سید زین العابدین کے ہمراہ گاڑی پر سوار ہو کر اُس بارگاہ عالی میں حاضری دے آیا۔ وہاں سے واپس آیا تو جمّال کی صورت دکھائی دی اور معلوم ہوا کہ فوراً روانگی کا سامان کرنا چاہیے وضو کرکے حرم شریف حاضر ہوا۔ اور حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ مبارک پر سلام و دعائے وداع پڑھی اور چاشت کے وقت روانہ ہوا۔ اونٹ تھوڑی دور چل کر مسجد سیدنا عمرؓ کے سامنے رُکا اور شقدف وہیں اتار دیا گیا۔ ظہر تک وہیں رہنا ہوا، ظہر کے بعد جمّال اونٹ لیکر آیا تو روانگی ہوئی۔ روانگی کے وقت سید زین العابدین اور اُنکے شرکا سب رخصت کرنے کو موجود تھے۔ اُن کا حق مزدوری ۲ مجیدی تو پہلے ہی ادا کردیا گیا تھا، کچھ خدمت اس وقت بھی کی

بلکہ اس خیال سے کہ ان کی ٹرانزٹ کے بارے میں اُن سے کافی ناگواری کا اظہار کیا گیا تھا اُنکو اُنکی توقع سے زائد ملا۔ جس سے وہ بہت خوش خوش رخصت ہوئے۔

مدینہ منورہ میں کوئی بڑی آبادی نہیں ہے۔ لوگوں کے بیان سے معلوم ہوا کہ ترکی حکومت کے زمانہ میں ساٹھ ستر ہزار کی آبادی تھی۔ جنگ کے ابتدائی ایام میں حکومت نے مدینہ منورہ کو جنگی مستقر قرار دیا۔ اور اس خیال سے کہ اہالی مدینہ منورہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو تمام شرفا و معززین کو حکومت کے خرچ سے ریل پر سوار کرکے دمشق بھیجدیا۔ حضرت شیخ احمد شمس سے بھی دمشق تشریف لیجانے کے لیے کہا گیا۔ آپ نے پہلے عذر کیا، جب اصرار زیادہ ہوا تو آپ نے آستانۂ نبوی پر حاضر ہوکر استخارہ فرمایا۔ اور عامل مدینہ کو اطلاع دی کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر گورنر نے کچھ نہ سُنی اور آپ کو بحکم جانب دمشق روانہ کردیا۔ دمشق کے حاکم نے آپ کی بہت تکریم کی اور پھر مدینہ منورہ واپس پہونچادیا۔ مدینہ منورہ کی مستقل آبادی میں کچھ تو اس سبب سے کمی ہوئی تھی، باقی جب شریف حسین کا یہاں تسلط ہوا تو بدوی فوج کے مظالم نے ہزاروں باشندوں کو خانماں برباد کردیا۔ بہت سے لوگ جان و آبرو بچانے کے خیال سے بھاگ گئے۔ اب بمشکل دس ہزار کی آبادی ہوگی۔ آبادی کی کمی کے ساتھ جو لوگ رہ گئے ہیں اُنکی مالی حالت بھی خراب ہوگئی ہے۔ کیونکہ ترکی حکومت کی طرف سے جو وظیفے اور انعام ملتے تھے وہ سب بند ہوگئے۔ صرف زائرین ذریعۂ آمدنی رہ گئے۔ اور جنگ کے بعد سے انکی تعداد بھی بہت قلیل ہوگئی تھی۔ اب صلح کے بعد سے خیر پھر یہ سلسلہ جاری ہوا ہے مگر ترکی کے دولتمند زائرین اب بھی نہیں آتے۔

آبادی کا بیشتر حصہ قدرۃً حرم نبوی کے اطراف میں آباد ہے۔ اسلیے یہاں آبادی گنجان ہے۔ شہر پناہ کے باہر جو مکانات بنے ہوئے ہیں وہ تو اب بالکل ہی غیر آباد رہتے ہیں۔ شہر کے اندر بھی جب تک زائرین کے بڑے قافلے رہے اچھی چہل پہل تھی، اُنکے جانے کے بعد ہر طرف سناٹا معلوم ہوتا تھا۔ حرم نبوی کے جنوبی دو پھاٹکوں کے سامنے دورویہ بازار ہے۔ اصلی بازار باب السلام کے سامنے ہے جہاں سے روضۂ مبارک کے پاس حاضر ہونے کا راستہ ہے۔ اس بازار کے ختم پر باب المصری ہے جسکے باہر مدینہ کے مقابل غلہ، کھجور اور دیگر اشیائے خوردنی کا بازار ہے جب ریل جاری تھی تو باب العنبریہ سے جہاں اسٹیشن بنا ہوا ہے ریل کی ایک پٹری حرم شریف کے قریب تک بچھادی گئی تھی۔ جو اب تک علیٰ حالہٖ ہے۔ ریل جنگ کے زمانہ میں بند ہوگئی تھی۔ مگر اب پھر جاری ہونیوالی ہے۔ شہر پناہ کی شمالی دیوار کے حصۂ زیریں میں باب المکہ ہے جس میں داخل

ہوتے ہی داہنی جانب ایک مختصر سا قلعہ ہے۔ شریف علی حاکم مدینہ جب یہاں آتے ہیں تو اسی میں رہتے ہیں۔ آجکل شریف علی یہاں نہیں ہیں۔ قلعہ کے مقابل پوستہ یعنی ڈاکخانہ ہے۔ اور جوانب میں اندر اور باہر مناخہ ہے جہاں قوافل آکر اترتے ہیں۔ باب المکہ سے جبل اُحد تک جسکے دامن میں حضرت سید الشہداء کا مزار مبارک ہے کوئی ایک کوس کا فاصلہ ہوگا۔ مگر امن کا یہ عالم ہے کہ سوائے چہارشنبہ کے جبکہ کثیر تعداد میں لوگ وہاں زیارت کے لیے جاتے ہیں یا ایسی صورت میں کہ زائرین کی معقول تعداد ہو عام طور پر بغیر سرکاری محافظ کی ہمراہی کے کوئی شخص وہاں تک نہیں جا سکتا۔ اسی راستہ میں ایک جانب ترکی حکومت کے زمانہ کا بے تار کی تار برقی کا اسٹیشن بنا ہوا ہے جس پر اب شریف صاحب متصرف ہیں۔ شہر پناہ کی شمالی دیوار کے بالائی حصہ میں ایک دروازہ ہے جسکے باہر "جنۃ البقیع" ہے۔ یہ مشہور قبرستان بہت وسیع ہے۔ اس سے متصل ہی ایک نخلستان ہے جہاں ایک جلیل القدر صحابی کا مزار مبارک ہے۔ میں وہاں فاتحہ خوانی کے لیے جانا چاہتا تھا مگر معلوم ہوا کہ راستہ محفوظ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ جگہ شہر پناہ سے غالبًا دو فرلانگ بھی دور نہیں۔

شریف علی جو یہاں کے مستقل گورنر ہیں عمومًا یہاں رہتے نہیں، اسلیے قائم مقام صاحب ہی کو یہاں کا گورنر یا عامل سمجھنا چاہیے۔ شریف حسین کو مدینہ منورہ سے کس قدر دلچسپی ہے، اسکا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ خاص حرم نبوی کے مجاوروں اور خدمتگزاروں کو پندرہ پندرہ مہینے تنخواہ نہیں ملتی۔ حرم نبوی کی تعمیر پر شاہان آل عثمان نے جس قدر بے دریغ روپیہ صرف کیا اُسکا اندازہ ہر شخص حرم شریف کی زیارت کے بعد کر سکتا ہے۔ مگر آج یہ عالم ہے کہ حرم شریف کی شمالی دیوار عین اُس مقام پر جسکے نیچے عورتوں کی جالی ہے شق ہو گئی ہے اور اُسکی مرمت نہیں ہو سکتی۔ مسجد نبوی کے وسیع دالان کے تمام ستون، محرابیں، اور ساری چھت خوشنما پھول بوٹوں سے منقش ہے مگر اب جہاں کہیں چونہ اُکھڑ گیا ہے اُسکی درستی نہیں کی جا سکتی۔ مسجد نبوی کے اندر جو چٹائی کا فرش ہے کہیں کہیں وہ بھی شکستہ نظر آیا۔

مسجد نبوی، حرم کعبۃ اللہ کے خلاف مستطیل بنی ہوئی ہے۔ وسیع دالان کے جنوبی کونے پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ اطہر ہے۔ جس کا سبز گنبد سقف مسجد سے باہر نمایاں ہونے کی وجہ سے زائرین کو دور سے زیارت کا موقع دیتا ہے۔ روضۂ مقدس سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ممبر شریف ہے۔ اور درمیان میں وہ مبارک جگہ ہے جسے روضۃ من روضات الجنان کا لقب ملا ہے۔ روضۂ اطہر کے گرد کسی دھات کی وسیع جالی لگی ہوئی ہے جس پر گنگا جمنی بھری ہے۔ اس جالی کے اندر

پائین کی جانب ایک پردہ کی جالی ہے جسکے قریب ہی حضرت فاطمہ زہرا کا مزار مبارک بنا ہوا ہے۔ جالی میں متعدد دروازے ہیں مگر مغربی سمت کے دروازہ سے عموماً اغوات یا خوجے صفائی اور روشنی وغیرہ کے لیے اندر حاضر ہوتے ہیں۔ مسجد نبوی کے اندر رات کو عموماً برقی روشنی ہوتی ہے جو عشا کے بعد بجھا دی جاتی ہے البتہ روضۂ اطہر کے اندر رات بھر شمعیں روشن رہتی ہیں۔ روضۂ مبارک کی جالی کے پائین میں کچھ فاصلہ پر ایک چبوترہ خوجوں کی نشست کے لیے بنا ہوا ہے۔ اور اسکے بعد ایک درجہ کا شمالی دالان ہے جو عورتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس دالان کا اگلا حصہ تو کھلا ہوا ہے مگر پیچھے نصف سے زائد دالان میں لکڑی کی جالی لگی ہوئی ہے۔ جنوبی دالان میں جب مجمع زیادہ ہوتا ہے تو مرد نماز پڑھتے ہیں۔ مغربی دالان کی پشت پر طہارت خانہ اور وضو خانہ ہے اور دروازہ سے متصل ایک مدرسہ ہے جس میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے۔ مسجد نبوی کے پانچ دروازے ہیں شمال و جنوب میں بالمقابل دو دو اور ایک مغرب میں۔ مشرق میں ایک کھڑکی ضریح روضۂ اطہر کے مقابل ہے۔

مدینہ منورہ میں پانی بہ افراط ملتا ہے اور اس میں جتنی خوبیاں ہونا چاہیے سب موجود ہیں میں نے اس سے قبل ایسا خوش ذائقہ پانی کہیں نہیں پیا، جو صراحی میں رکھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور اس قدر سبک ہے کہ خواہ کتنی ہی مقدار میں پیا جائے کسی قسم کی گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ اس پانی کی خصوصیت ہے جو نہر کے ذریعہ باہر سے آتا ہے۔ ورنہ کنوؤں کا پانی عموماً کھاری ہے۔ البتہ مسجد نبوی کے کنوئیں کا پانی کھاری نہیں، گو تازہ پیا جائے تو ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

یہاں جملہ اشیائے خوردنی بھی بافراط ملتی ہیں اور بمقابلہ مکہ معظمہ کے اچھی اور ارزاں ہیں۔ عموماً سب چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ ہر قسم کی ترکاریوں کے علاوہ خربوزے، تربوز، کھجور، انگور، انار، اور انجیر وغیرہ نواح میں ہوتے ہیں۔ کھجور تو یہاں کا مشہور ہی ہے مگر میری حاضری کے زمانہ میں کھجور کی فصل نہ تھی اسلیے تازہ پھل نہ ملے۔ اور رکھے ہوئے بھی نسبتاً گراں ملتے تھے۔ دودھ، دہی وغیرہ بھی عمدہ اور ارزاں ملتا ہے۔ قہوہ خانوں کی کثرت ہے۔ اور کھانے کی دوکانیں بھی جگہ جگہ ہیں۔ اگرچہ زائرین کے رخصت ہو جانے پر یہاں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ یہاں ہر شخص تنوری روٹی کھاتا ہے۔ جو لوگ بازار سے نہیں مول لیتے وہ اپنا آٹا بھیجکر پکوا لیتے ہیں۔ یہاں کی روٹی ذائقہ میں مکہ معظمہ اور جدہ کی روٹیوں سے بھی بہتر ہوتی ہے۔

یہاں کی آبادی ویسی مخلوط نہیں جیسی مکہ معظمہ کی۔ کچھ بخاری اور ہندوستانی ہیں اور باقی

سب عرب۔ البتہ عربوں میں مغربی خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ مکہ معظمہ کی طرح یہاں بھی اصل باشندے بہت کم ہیں۔ بدوؤں کے سوا تقریباً سب بیرونی لوگ ہیں۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے بھی عموماً وہی ہیں جو مکہ معظمہ میں برتے جاتے ہیں، مگر اخلاقی حیثیت سے یہاں کے لوگوں کا مرتبہ بلند معلوم ہوتا ہے۔ ایک نمایاں فرق تو لب ولہجہ کی نرمی اور شیریں گفتاری میں نظر آتا ہے، اسکے علاوہ میخواری اور دیگر فواحش بھی یہاں عام نہیں۔

تعلیم کی بہت کمی ہے۔ حرم شریف میں بعض علما درس دیتے ہیں یا اپنے گھروں پر کچھ لوگوں کو پڑھاتے ہیں۔ ایک مکتب بھی ہے جس میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے گر یہ بالکل ناکافی ہے۔

مدینہ منورہ کوئی تجارتی منڈی نہیں۔ گو گرد و نواح کے قبائل یہیں سے احتیاج زندگی حاصل کرتے ہیں۔ ینبوع کی راہ سے جملہ اشیاے ضرورت یہاں آتی ہیں۔ ترکی وظائف وانعامات کی بندش اور حکومت ہاشمیہ کی بے اعتنائی کے باعث ہر طرف غربت و افلاس کے آثار نظر آتے ہیں اور مخصوص طبقات کے سوا عام طور پر مذہبیت یہاں بھی زیادہ نمایاں نہیں۔ سب سے زیادہ اُن فقرا و مہاجرین کو دیکھ کر حسرت معلوم ہوتی ہے جو یہاں رہ کر طرح طرح کے جسمانی مصائب و تکالیف برداشت کرتے ہیں گر اتنی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ پانچوں وقت حرم نبوی میں نماز با جماعت ادا کریں۔ جب تک زائرین کے بڑے قافلے رہے مسجد اوقات نماز میں بھری رہتی تھی، قوافل کے جانے کے بعد جمعہ کے دن بھی اتنا مجمع نہیں ہوتا تھا کہ صدر دالان پُر ہو سکے۔

نظرے خوش گذرے

پچھلے پرچہ میں جناب منشی احمد علی شوق قدوائی اور مولوی عبداللہ خاں تپش خورجوی کے انتقال پُر ملال پر کچھ نہ لکھا جا سکا جسکا مجھے بہت افسوس ہے۔

جناب شوق مرحوم میرے عزیز بھی تھے گر یہاں اس حیثیت سے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، البتہ زبان اُردو سے جو اُنکا گہرا اور دیرینہ تعلق تھا اُسکے لحاظ سے یہ کہنا بجا ہوگا کہ قدیم دور کا ایک رُکن اعظم ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا۔ منشی مظفر علی اسیر کے شاگردوں میں شاید اُنکے جانشین ونعت جناب افضل اور حضرت ریاض کے سوا اب اور اصحاب باقی نہیں رہے۔

جناب شوق نہ صرف ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے بلکہ ایک بلند رتبہ ادیب اور شوخ نگار انشا پرداز بھی تھے۔ اور فن شعر کے متعلق تو اُنکا سینہ معلومات کے بیش بہا خزینہ سے معمور تھا۔ غزل گو شعرائے عہد کی روش عام کے خلاف وہ جدید طرز کی نظمیں بھی لکھتے تھے۔ اور اُنکا بڑا کمال کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی نظموں میں بھی اُسی طرح جملہ آداب سخنوری ملحوظ رکھتے تھے جس طرح غزل میں۔ اُنکی تصانیف قدیم میں مثنوی ترانۂ شوق، اور جدید نظموں میں عالَم خیال بہت مقبول ہوئیں۔ مگر غالباً محاسن شاعری اور قدرت کلام کا بہترین نمونہ اُن کا ڈراما قاسم و زہرہ ہے۔ جس میں ایک قابل لحاظ التزام یہ ملحوظ رکھا گیا کہ کہیں کوئی ایسی فارسی ترکیب نہیں آنے دی جس میں اضافت کا استعمال ضروری ہو۔

اودھ پنچ اور آزاد میں سالہا سال تک لکھنے کے بعد درمیان میں عرصہ تک اُنھیں اخباری دُنیا سے کچھ سروکار نہ رہا تھا، مگر پچھلے چند سالوں سے وہ پھر مضمون نگاری پر متوجہ ہوے تھے۔ آخر عہد کی تحریروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ سیاسی خیالات کے ارتقا میں وہ اپنی دوسری معروفیتوں کی وجہ سے پیچھے رہ گئے۔ اس بنا پر یہ مضامین سوائے حکومت پسندوں کی محدود جماعت کے عام طور پر پسند نہیں کیے گئے۔ بلکہ ادبی حیثیت سے یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ اُن کی مضمون نگاری کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ خدا اُن کو غریق رحمت کرے۔

تپش مرحوم الناظر کے پُرانے قدردانوں میں تھے۔ اُنکی شاعری ادبی ذوق کی اسقدر رہین منت نہ تھی جس قدر اُنکے جوش قومی اور غیرت ملی سے متاثر تھی۔ وہ دل میں درد رکھتے تھے۔ اور اُسی سے بیتاب ہوکر شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں میں کہتے تھے نامانوس اور غریب ترکیبوں کے بکثرت استعمال کی وجہ سے اُنکے اکثر اُردو اشعار بھی فارسی ہی کے معلوم ہوتے تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

خیال تھا کہ اس نمبر میں نئے انعامی مقابلہ کا اعلان کیا جا سکیگا مگر عنوان کے متعلق جن احباب سے مشورہ کیا گیا اُن سب کے جوابات ہنوز وصول نہیں ہوے۔ امید ہے کہ یہ مرحلہ بھی جلد طے ہو جائیگا اور جولائی کے پرچہ میں اعلان شایع کرنے کا موقع ملے گا۔ ایک کرمفرما نے یہ تجویز کی ہے کہ ایک کی جگہ دو انعام رکھے جائیں اور ازراہِ محبت دوسرے انعام کی پوری رقم اپنے ذمہ لے لی ہے۔ لہذا یہ تجویز شکریہ کے ساتھ قبول کی جاتی ہے۔

ظفر الملک

کلام حالی

مولانا حالی کی متفرق نظمیں جو بیحد مقبول ہیں
شکوہ ہند۔ بیوہ کی مناجات ۲؍ عرض حال
مسدس ۸؍ خدمت مناظرہ رحم و انصاف
حب وطن ۲؍ چپ کی داد اور [illegible] کا مناظرہ ۱؍
(خریداران الناظر کے لیے تین چوتھائی قیمت)

مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر و انشاپرداز و فلسفی
مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم
جسے اردو میں اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ خیالات
کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا۔ قیمت ۸؍
(خریداران رسالہ کے لیے ۶؍)

کلام اقبال

ڈاکٹر اقبال کی مقبول عام نظمیں۔
شکوہ ۴؍ جواب شکوہ ۴؍ شمع و شاعر ۴؍
بلال ۱؍ فریاد امت ۴؍ تصویر درد ۴؍
(خریداران رسالہ کو تین چوتھائی قیمت پر)

مسلمانان اندلس

نامور مورخ اسٹینلی لین پول کی کتاب
مورس ان اسپین کا اردو ترجمہ از مولوی
سید عبد الغنی وارثی قیمت عہ
(خریداران رسالہ سے [illegible])

خوان دعوت

لڑکیوں کو کھانا پکانا سکھانے کیلیے
م ب صاحب لکھنوی نے افسانہ کے دلکش
پیرایہ میں یہ کتاب مرتب کی ہے جسمیں
باورچی خانہ کے ضروری انتظامات
اور عمدہ و لذیذ کھانوں کی مجرب
ترکیبیں ذاتی تجربہ کی بنا پر تحریر
کی ہیں۔
قیمت ۱۲؍
(خریداران رسالہ کے لیے ۸؍)

تذکرہ حزیں

شہنشاہ شیخ علی حزیں۔ جو ایران
سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے
انکی دلچسپ سوانحعمری قیمت ۴؍
(خریداران رسالہ سے ۳؍)

دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خدا پرست ۱؍ دنیا داری
کہانی ۱؍ مساوات ۱؍ از مسٹر سلطان
حیدر جوش ۱؍ اتفاقات زمانہ ۱؍
(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

حیات نظامی

مشہور شاعر حضرت نظامی گنجوی
کی سوانحعمری۔
قیمت ۸؍
(خریداران الناظر کے لیے ۶؍)

جمیل و بثینہ

عرب کے حسن و عشق کا
دلچسپ افسانہ
قیمت ۳؍
(خریداران الناظر کے لیے ۲؍)

عورتوں کی انشا

خواتین اور لڑکیوں صاحبزادیوں کو خطوط
نویسی سکھلانے والی کتاب مصنفہ بیگم
صغرا علی صاحبہ۔ قیمت ۸؍
(خریداران رسالہ کے لیے ۶؍)

مصنوعی شوہر

انقلاب ایران کی ایک ظریفانہ داستان
ہنستے ہنستے لوٹ جا بیگے گا
قیمت ۱؍
(خریداران الناظر کے لیے ۱؍)

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مسلمانوں کی تہذیب

یعنی مسلمانوں کی تمدنی ترقی کے
متعلق نواب محسن الملک مرحوم
کا ایک فاضلانہ لکچر۔ ۴ر
قیمت ۶ر
(خریداران الناظر سے ۵ر)

میلاد النبی

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ
علیہ کے اصل عربی متن کے مقابل اس کا
نہایت فصیح اردو ترجمہ۔
قیمت ۴ر
(خریداران الناظر سے ۳ر)

الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم
جس میں لفظ صوفی کی تحقیق تصوف کی ابتدا
اور اسکی درجہ بدرجہ ترقیاں کا ذکر ہے اور آخر
میں تصوف کے تمام شعبوں کو اسلام سے تطبیق دیگئی ہے
قیمت ۸ر (خریداران رسالہ کے لیے ۵ر)

مقدمہ شعر و شاعری

خطاب

(از "ملا" جی)
سرکاری خطابات کے آرزومند کوشش
کرنے سے پہلے اسکو ملاحظہ فرمالیں ۴ر
(خریداران الناظر کیلئے ۳ر)

ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کی تاریخ
مولفہ مسٹر عنایت اللہ بی اے رجسٹرار
عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۴ر
(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

گرامر اردو

تسخیر فرانس

شکسپیر کے لاجواب ڈرامہ ہنری دی
ففتھ کا اردو ترجمہ۔ از منشی تفضل حسین
صاحب ناظر۔ قیمت ۸ر
(خریداران الناظر کے لیے ۶ر)

سفرنامہ مصر و شام و روم

مولانا شبلی کا مشہور سفرنامہ جو ان ممالک
کے متعلق بہترین تاریخی، علمی، معاشرتی معلومات
فراہم کرتا ہے۔ قیمت ۱۲ر
(خریداران الناظر کے لیے ۱۰ر)

میکفرن و رلوسی

حضرت شوق قدوائی کا لاجواب
ڈراما
قیمت ۲ر
(خریداران الناظر سے ۱ر)

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

رسالہ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ، مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

مطبوعات الناظر پریس لکھنؤ

طالب علم کی زندگی کا مقصد

خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نہایت سبق آموز و مفید لکچر

قیمت ۳ر (خریداران الناظر سے ۲ر)

تاریخ عرب

مصنفہ

موسیو سیدیو فرانسیسی

عربوں کے متعلق یہ کتاب اُن تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے جو یورپ ایشیا کے کتبخانوں کی زینت ہیں۔ مسلمانوں کی ترقیات اور عربوں کے کمالات کا یہ آئینہ ہے اور یورپ کے افترا و کذب کا بہترین جواب

قیمت مجلد چرمی عہ مجلد پارچہ ۱۲

اسلام

نواب محسن الملک کا قابل دید مضمون

قیمت ۱ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

مثنوی صبح اُمید

مولانا شبلی کی سب سے پہلی مطبوعہ نظم

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

موازنہ انیس و دبیر

مؤلفہ

مولانا شبلی مرحوم

جس میں میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا موازنہ کیا گیا ہے۔

قیمت عہ ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۱ع)

قواعد المنتخب

جلال لکھنوی کا لاجواب رسالہ۔ جو زبان کے متعلق بہترین تحقیقات سے لبریز ہے

قیمت ۴ر (خریداران الناظر سے ۳ر)

مولانا شبلی کے متفرق مضامین

زیب النسا ۱ر

جہانگیر اور تزک جہانگیری ۲ر

اسلامی حکومت ۲ر

اسلامی مدارس ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳/۴ قیمت)

شوکیہ اور دو مظلوم بہنیں

قیصر بھوپالی کے دو مختصر افسانے

قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

ترقی زبان بذریعہ تراجم

پروفیسر کمٹا شاہ ایم اے کا وہ قیمتی لکچر جو لکھنؤ کی اُردو کانفرنس میں پڑھا گیا

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر ماہ اپریل و مئی ۱۹۲۵ء

نمبر ۱۶۶ و ۱۶۷ جلد ۲۸

سچی بات

اگر آپ کا قلب سکون و اطمینان کی تلاش میں ہے اگر آپ کی روح کو حقیقی راحت و مسرت کی جستجو ہے اگر آپکے دماغ میں زندگی کی صحیح منزل مقصود کی کرید ہے تو ان سب ضرورتوں کی تشفی ہفتہ وار سچ کے پڑھنے سے انشاء اللہ ہو جائے گی۔ قیمت سالانہ ۲ بھیجکر خریدار بن جائیے۔

مہتمم اخبار سچ لکھنؤ

کافوری جنتری ۱۹۲۵ء کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کے کارخانہ کی یہ مفید کارآمد جنتری اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپی ہے اور درخواست پر مفت بھیجی جاتی ہے۔

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی

اصلی عرق کافور

وقت پر صلاح

جو دوست ہوتے ہیں وہ خطرہ سے بچنے کے لیے وقت سے پہلے نیک صلاح دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی یہ صلاح ہے کہ موسم گرما آگیا ہے اور اس موسم میں بے ترکیب کھانے پینے کے باعث ہیضہ ہونے کا خوف ہر وقت پر رہتا ہے۔ ہیضہ عام طور سے بے وقت آدھی رات قریب صبح یعنی ایسے وقت میں جبکہ حکیم ڈاکٹر مشکل سے ملتے ہیں ہوا کرتا ہے۔ اسلیے اس سے بچنے کے لیے پہلے ہی ایک شیشی اصل عرق کافور منگواکر اپنے گھر میں ضرور ڈال رکھیں۔ جس سے آپ کو آپ کے دوست احباب اور پڑوسیوں کو وقت پر کام آئے۔ یہ عرق کافور گرمی کے دست، پیٹ کے درد متلی وغیرہ کیلیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے ۱۴ سال سے تمام ہندوستان میں دوکانداروں دوا فروشوں اور ایجنٹوں کے پاس ملتی ہیں۔ قیمت فی شیشی چھ آنہ ۶؍ محصولڈاک چھ آنہ ۶؍

پرانے سوزاک کی دوا

سوزاک پرانا ہوجانے پر پیشاب میں جلن نہیں ہوتی لیکن پیشاب رک رک کر ہوتا ہے اور کبھی کبھی مواد بھی تھوڑا تھوڑا گرتا ہے۔ گرم چیزوں کے کھانے اور مزاج میں گرمی آجانے سے مواد زیادہ گرنے لگتا ہے اور کبھی بند بھی ہوجاتا ہے۔ ایسی حالت میں پرانے سوزاک کی دوا استعمال کرنا چاہیے۔ اگر اس حالت میں معقول علاج نہ کیا گیا تو آخر میں پیشاب کی دھار باریک پڑجاتی ہے پیشاب قطرہ قطرہ گرنے لگتا ہے۔ اور کبھی اکبارگی بند بھی ہوجاتا ہے جس سے زندگی محال ہوجاتی ہے قیمت فی شیشی ۱۲؍ محصولڈاک ۶؍ دیکھیے جناب راجہ پرتھوی سنگھ صاحب امری کیا فرماتے ہیں۔ جناب من۔ آپکی سوزاک کی دوا سے بہت فائدہ ہوا مجھے پانچ ماہ سے سوزاک کا مرض تھا حکیم رامچندر گوناگوں مہونت سنگھ جی رگھونسی۔ ویش آگرہ۔ ڈاکٹر حکیم غلام نبی خاں زبدۃ الحکما لاہور کی دوائیاں حسب دستور استعمال کیا مگر کچھ فائدہ بھی نہیں ہوا۔ آپکی دوا کے صرف سات روز کے استعمال سے بالکل آرام ہوگیا قیمت بھی ادا اس کی

ڈاکٹر ایس کے برمن پوسٹ بکس ۵۵۴ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ۔ ڈاکٹر کنڈا رام جیتلی۔ چوک۔ لکھنؤ

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اسلام (جلد اول)

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کئی جلدوں میں ایک تاریخ اسلام لکھ رہے ہیں۔ یہ پہلی جلد باریک کتابت کے ۳۷۶ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ عربوں کے عربوں کے حالات قبل از اسلام اور حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر حضرات خلفائے راشدین کے عہد مبارک تک کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ قیمت سے ر

میزان عمل

(مترجمہ ملک نصراللہ عزیز بی اے ایڈیٹر اخبار مدینہ)

یہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جسمیں امام صاحب نے نہایت قوی دلائل سے دکھایا ہے کہ جن لوگوں کو سعادت یا نجات کی طلب ہو اُنکے لیے ایک ہی راہ ہے کہ علم اور عمل کو جمع کردیں۔ حجم ۱۶۸ صفحہ قیمت ۱۲

انشاے بشیر

جناب مولوی بشیر الدین احمد خلف مولوی نذیر الدین احمد دہلوی مرحوم نے صرف لڑکیوں اور بہو بیٹیوں کیلئے خطوط کا مجموعہ مرتب کیا ہے جسمیں خود اپنے اور بہت سی خواتین کے خطوط درج کرنے کے علاوہ خط لکھنے اور بھیجنے کے جتنے متعلقات ہیں حتیٰ کہ ڈاکخانہ اور ریل کے تمام ضروری قاعدے تک سب لکھ دیے ہیں حجم ۳۲ صفحے قیمت ۱۲

ناٹک ساگر

یعنی دنیاے ڈرامہ کی تاریخ جسمیں دنیا بھر کے مشاہیر ڈرامانگاروں اور ایکٹروں کے سوانح حیات، اقطار عالم میں اسٹیج کے عروج و زوال کے اسباب اور فن ڈراما کی ارتقائی کیفیت بیان کرکے ڈراما اور اسٹیج کے محاسن و عیوب آئینہ کیے گئے ہیں۔ از نورالٰہی و محمد عمر صاحبان - حجم ۴۴۶ صفحے قیمت ؎

دیوان رنگین

یعنی مرزا سعادت یارخاں رنگین اور سید انشاءاللہ خاں کا وہ مشہور کلام جو دہلی کی بیگماتی زبان اور عہد مغلیہ کے آخری دور کی معاشرت کا آئینہ ہے۔ شروع میں محاورات بیگمات کی فرہنگ لگا دی گئی ہے۔ قیمت ۸ ر

مینیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کیجیے

مقدمہ ابن خلدون

علامہ ابن خلدون مغربی جسکی لاجواب تاریخ کے ترجمہ کی شہرت ہے اُس کا مقدمہ فلسفۂ تاریخ میں ایک لاجواب تصنیف کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ اس میں اُس نے اُن اصولوں کی توضیح وتشریح کی ہے جو اپنی لاجواب تاریخ کے لکھنے میں اُسکے پیش نظر رہے - اس مبسوط مقدمہ کا ترجمہ تین جلدوں میں علیحدہ چھپا ہے - قیمت معہ

جدید دنیائے اسلام

گذشتہ نصف صدی کے اندر آہستہ آہستہ اور محاربۂ یورپ کے دوران میں اور اُسکے بعد سرعت اور تیزی کے ساتھ اسلامی ممالک میں جو حرکت و بیداری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں اُنکی بنا پر امریکہ کے ماہر سیاسیات ڈاکٹر لوتھراپ سٹاڈرڈ نے یہ کتاب مرتب کی ہے جسمیں ممالک اسلامی کے باشندوں کے حالات پر معاشرتی، مذہبی، تمدنی، سیاسی و اقتصادی حیثیت سے بحث کرکے اُنکے موجودہ رجحانات، تخیل اور مطامح نظر کے اسباب و علل کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کتاب کا ترجمہ مولوی جمیل الدین صاحب بی اے (علیگ) نے بڑی دیدہ ریزی وجگر کاوی سے کیا ہے - حجم چار سو صفحے سے زائد - قیمت للعہ

تاریخ خاندان عثمانیہ

ابتدائے عہد سے اس مبارک و مظفر خاندان کی مفصل تاریخ نویسی کے مطابق مبصرین کی رائے ہے - کہ گذشتہ سو سال میں اس پایہ کی کوئی اسلامی تاریخ کسی اسلامی ملک میں آج تک نہیں لکھی گئی - جلد اول عہ جلد دوم عہ سالم کتاب چار روپے چار آنے -

واقعات روم

ایک انگریز منصف مزاج کی تالیف کا اردو ترجمہ معہ حواشی ہے - اس میں سلطنت عثمانیہ کے ہر صیغہ کی ترقیات کا سلسلہ وار بیان ہے - قیمت ۱۲ ار

محاربات پلیونا

غازی عثمان پاشا کا نام کون مسلمان نہیں جانتا - انہی کے کارناموں کی یہ مفصل تاریخ ہے - جس میں ضمناً سنہ ۱۸۷۷ء کے جنگ روم و روس کے حالات بھی پلیونا کے قیامت تک یاد رہنے والے معرکوں کے ہمراہ بیان کئے گئے ہیں - طبع جدید میں بہت ایزادی کی گئی ہے - ہر سہ حصہ طبع سوم قیمت ہے - معروضہ مظالم آرمینیا و دول ثلاثہ بزبان اردو عمر - بزبان انگریزی ار

ٹرکی کی موجودہ حالت اور اس کی باجگذار ریاستیں

اس میں سلطنت عثمانیہ کے مفصل حالات کے علاوہ معہ ٹیونس - بلگیریا - بوسینیا - ہرزیگونیا - قبرس و طرابلس الغرب وغیرہ کی موجودہ کیفیت معہ تشریح ضوابط اور آئین درج ہے - طبع دوم میں ضخامت قریباً دوگنی ہوگئی ہے - قیمت عمر

دختر وزیر

اردو داستان جنگ ہزارہ مؤلفہ مس ہملٹن لیڈی ڈاکٹر دربار کابل امیر عبد الرحمن مرحوم کے دربار و طریق انتظام اور جنگ ہزارہ اور میر منشی سلطان محمد خاں صاحب کے دربار کابل سے قطع تعلق ہونے کے مفصل حالات ناول کے پیرایہ میں قیمت صرف عہ -

ترکوں کی موجودہ ترقیات اور اسلامی دنیا کا فوٹو

اسم بامسمیٰ کتاب ہے - کوئی اسلامی خطہ - کوئی اسلامی فلاح و ترقی کا مسئلہ نہیں جس پر اس میں مفصل بحث نہ کی گئی ہو - تقریر یہ کہ تمام اسلامی ممالک کی موجودہ حالت اور جدید اسلامی تحریک کی مکمل بالتصویر ہے طبع دوم قیمت ہے -

منیجر الناظر ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۶ و ۱۶۷ جلد ۲۰

اپریل و مئی سنہ ۱۹۲۵ء

فیہ ما فیہ

(اثر خامہ: چلپی)

دو بھائیوں کی بے بسی

تاریخ کی زبان میں آج سے ہزارہا سال قبل کا زمانہ ہے لیکن یہی زمین اور یہی آسمان، یہی رات اور یہی دن، یہی آفتاب اور یہی ماہتاب اُسوقت بھی موجود ہیں، نیکی و بدی، نور و ظلمت، حق و باطل کی کشمکش جیسی آج ہے، اُسوقت بھی جاری ہے، قدرت کے قانون اور اللہ کے بنائے ہوئے دستور آج کی طرح اُسوقت بھی کارفرما ہیں۔ ایک بڑی شایستہ قوم جو ہر طرح کے نعماتِ الٰہی سے سرافراز ہو چکی ہے، اپنی بدکرداریوں اور نافرمانیوں کی پاداش میں اسوقت مبتلائے گردش وادبار ہے۔ خدا کی غلامی کو چھوڑ کر اس نے اپنے نفس کی غلامی اختیار کر لی ہے، نتیجہ یہ ہوا ہے، کہ ایک زبردست اجنبی حکومت کو اس پر مسلط کر دیا گیا ہے، اور وہ شامت زدہ قوم ایک ایک کر کے اُن تمام لعنتوں اور بدبختیوں کا شکار ہو رہی ہے، جو ہر محکوم و مفتوح قوم کے نصیب میں ازل سے لکھی چلی آرہی ہیں۔ جب جفا و جور، جبر و ستم کا پیمانہ لبالب ہو کر چھلکنے لگتا ہے، تو خدائے علیم و قدیر اس قوم کی فلاح و بہبود، بیداری و آزادی، اصلاح و تجدید کے لیے اُسی کے دو فرزندوں کو، جو آپس میں بھائی ہوتے ہیں چُن لیتا ہے، اور اُنھیں خلعت رسالت سے مشرف، اور تمغۂ نبوت سے مزین کر کے اُسکی جانب روانہ کرتا ہے

بیگانوں کی طرف سے اس سفارت الٰہی کا جو استقبال ہوتا ہے، اسکی داستان انھیں اوراق میں اس سے پیشتر دوہرائی جا چکی ہے، لیکن خود "اپنوں" کی طرف سے جو سپاس نامہ ان پیامبران برحق اور علمبرداران حریت کی خدمت میں پیش ہوتا ہے، اُسکے عنوان کی عبارت یہ ہے:-

"خدا تم کو دیکھے اور انصاف کرے، تم ہی نے ہمیں فرعون کی نظر میں اور اُسکے کارکنوں کی نگاہوں میں ایسا قابل نفرت بنا دیا ہے، کہ اُنکے ہاتھ میں تلوار دیدی ہے، جس سے وہ ہمکو قتل کریں" (توریت، کتاب خروج، باب پنجم، آیت ۲۱)

قوم کے یہ سچے محسن، اسکے پیر سے غلامی کی بیڑیاں کاٹنے میں دل وجان سے لگے ہوئے ہیں، اور بشارت حق، انکے حلق و دہن سے پیہم برآمد ہو رہی ہے، کہ

"میں خداوند ہوں، میں تمھیں مصریوں کے بوجھ سے نجات دونگا، اور اُنکی خدمتگزاری سے تمھیں آزاد کروں گا، اور میں اپنا ہاتھ لمبا کرکے بڑی مصیبتیں اُنکو دکھا کر تمھیں رہائی دوں گا، اور میں تمھیں اپنی قوم کروں گا، اور میں تمھارا خدا ہوں گا" (خروج، باب ششم، آیت ۶)

لیکن سنگدل قوم کا دل ذرا نہیں نرم ہوتا، اپنے محسنوں کا ادب واحترام تو الگ رہا، اسکے افراد انکی آوازوں پر کان تک دھرنا گوارا نہیں کرتے:-

"دل تنگی سے اور محنت کی شدت سے موسیٰ کے سننے والے نہ ہوے" (ایضاً، آیت ۱۰)

آزادی کا پیمبر، مایوس و دل شکستہ ہو کر جناب باری میں عرض کرتا ہے، کہ اجنبی وظالم حکومت پر میری سفارت کیا اثر کریگی، جو خود میری ہی برادری والوں کا یہ حال ہے:-

"موسیٰ نے خداوند کے آگے یوں کہا، کہ دیکھ، بنی اسرائیل نے تو میری نہ سُنی، پس میں جو نامختون ہونٹ رکھتا ہوں، فرعون میری کیونکر سنے گا" (ایضاً، آیت ۱۲)

مدتوں کی غلامی نے قوم کی غیرت وحمیت کو ملیا میٹ کر دیا ہے، آزادی وخودداری کے جذبات فنا ہو چکے ہیں۔ "سرکار عظمت مدار" کا رعب دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ اپنے حقوق کی واجبیت، پیمبر کے وعدے، اللہ کی تائید غیبی، ان سب خیالات پر "اقبال سرکار" کی دہشت غالب ہے۔ یہاں تک کہ جب اپنے سچے سردار و رہبر کی رہنمائی میں دریائے نیل کو عبور کرکے سرزمین مصر سے قدم باہر نکال چکتے ہیں، تو بھی دھڑکتے ہوے دلوں کو سکون نہیں نصیب ہوتا، بلکہ جوں ہی لشکر مصر تعاقب میں آتا ہو دکھائی دیتا ہے، معاً ان جواں مردوں کے جسم لرزنے لگتے ہیں، چہرے پیلے پڑجاتے ہیں، اور زبانوں پہ

دہشت کی تھرتھراہٹ اور اضطراب کی ہکلاہٹ کے ساتھ یہ الفاظ آنے لگتے ہیں، کہ اے موسیٰ

"کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی، جو تو ہم کو وہاں سے بیابان میں مرنے کے لیے لایا؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ ہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت میں لگے رہیں، کہ ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرتے رہنا بیابان میں مرنے سے کہیں بہتر تھا" (ایضاً، باب چہاردہم آیت ۱۲-۱۳)

یہ باہمت و حوصلہ مند و عالی ظرف افراد، فرعون اور اُسکے لشکر کو اپنی آنکھ سے غرق و ہلاک ہوتے دیکھتے ہیں، اور موسیٰ وہارون (علیہما السلام) کی رفاقت میں نصرت غیبی کو کام کرتا ہوا صریح طور پر مشاہدہ کرتے ہیں، پھر بھی طبائع، طویل غلامی کے اثر سے اس درجہ مسخ ہو چکی ہیں، کہ بات بات پر اپنے سچے سرداروں سے بدگمان ہوتے ہیں، خواہ مخواہ اپنے ان محسنوں کی دل شکنی کرتے رہتے ہیں، اور اُٹھتے بیٹھتے دونوں بھائیوں پر طعن و تعریض کرنے میں لگے رہتے ہیں، چنانچہ بیابان میں جب کھانے پینے کی تکلیف ہوتی ہے، تو

"ساری جماعت بنی اسرائیل کی موسیٰ وہارون پر جھنجلا اُٹھتی ہے۔" (ایضاً، باب شانزدہم آیت ۱)

اور کہنے لگتی ہے، کہ

"کاش ہم سرزمین مصر ہی میں ..... مارے جاتے، کیونکہ تم ہم کو بیابان میں اسی لیے نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔" (ایضاً، آیت ۲)

اسکے بعد خدا کے جو اوامر و احکام اس قوم تک پہونچائے جاتے ہیں، ایک ایک کرکے سب کی نافرمانی کرتی ہے۔ شعائر الٰہی کی توہین کرتی ہے، احترام یوم سبت سے انکار کرتی ہے، رزق غیبی کا ذخیرہ باوجود ممانعت شدید جمع کرنے لگتی ہے، پیمبروں کی نافرمانی کو اپنا شیوہ بنالیتی ہے، انکی دلشکنی اوران پر طنز و تعریض ایک معمولی بات بن جاتی ہے، ہوتے ہوتے اُنکی جان تک کے درپے ہوجاتی ہے، مجبوراً موسیٰ کلیمؑ کو بارگاہ ایزدی میں مناجات کرنی پڑتی ہے، کہ

"پروردگارا میں اُن لوگوں سے کیا کروں۔ یہ سب تو ابھی مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں"

(ایضاً باب ہفدہم، آیت ۴)

جھوٹی امت کے مقابلہ میں سچے پیامبروں کی، بدبخت ناشکروں کے مقابلہ میں خوش نصیب محسنوں کی، اور غدار سپاہیوں کے مقابلہ میں حق پرست سرداروں کی، بےبسی اور بیکسی کی یہ کس قدر دردناک و عبرت انگیز مثال ہے! اور یہ کوئی استثنائی یا منفرد مثال نہیں، جب تک دونوں بھائی زندہ رہے، قوم کی طرف برابر ضد و سرکشی، شرارت و فساد، بدعہدی و غداری، بغاوت و نافرمانی ہی کے واقعات سے دوچار

ہوتے رہے ۔ یہاں تک کہ باوجود ظرفِ نبوت، وحوصلۂ رسالت کے، ان برادرانِ محترم کی زبان تک حرفِ شکایت وکلمۂ یاس آہی جاتا ہے! بالآخر اس بدبخت قوم کو مسلسل بدکرداریوں کے پاداش میں سزائے لعنت نصیب ہوتی ہے، جس سے ہزارہا سال گزر جانے کے بعد بھی کیفرِ کردار و پاداشِ عمل کے اٹل قوانین نجات ورہائی نصیب نہیں ہونے دیتے!

یہ صورت واقعہ، روایاتِ توریت کے مطابق ہے ۔ دنیا کی مستندترین کتاب اسی واقعہ کو ایجاز وتاثیر کی بلندتر خصوصیات کے ساتھ یوں بیان کرتی ہے، کہ اسرائیلیوں نے اپنے رہبرِ صادق سے صاف کہہ دیا، کہ ہمیں تو آپ کی اس تحریکِ آزادی سے کچھ نفع پہونچا نہیں، بلکہ ہم تو یہ

قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ما جئتنا ۔ (اعراف، ع ۱۵)

دیکھتے ہیں، کہ آپ کے آنے سے پیشتر بھی ہمیں تکلیف ہی تکلیف تھی، اور اب بھی تکلیف ہی تکلیف ہے! داعیِ حق نے سمجھایا، کہ آزادی کی جنگ لڑکوں کا کھیل نہیں، مادی ذرائع وفوری کامیابی کی توقعات کے بجائے، اپنا اعتماد خدا پر رکھو، اُسی سے مدد چاہو، اور صبر واستقلال

قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ، یورثہا من یشاء من عبادہ، والعاقبۃ للمتقین ۔ (اعراف، ع ۱۵)

سے کام لو ۔ ملک وزمین اللہ کی ہے، حکومتوں کا اُلٹ پھیر اُسی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسکو چاہے، حکومت دے ۔ ہاں یہ خیال رہے، کہ آخری کامیابی اُسی کی ہونا ہے، جو شیطانی ترغیبات سے بچتا رہے، اور رضائے حق میں کوشاں رہے ۔

اس برگشتہ بخت قوم کی نالایقی وسرکشی کی کوئی انتہا نہیں ۔ اپنے سچے رہبروں کو اس نے ہر طرح ستایا، متعدد انبیاء کرام کو قتل کر ڈالا، احکام شریعت کے ساتھ توہین وتمسخر کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ۔ گوسالہ پرستی اختیار کی ۔ کلام پاک کے اوراق اُسکی نافرمانیوں اور بیہودگیوں سے لبریز ہیں، خوفِ خدا وخشیتِ الٰہی سے اُن کے دل ایسے خالی ہوگئے، کہ قرآن نے انھیں بجائے

فہی کالحجارۃ او اشد قسوۃ

مضغۂ گوشت کے پتھر کے ٹکڑوں سے تعبیر کیا، بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت قرار دیا، جن میں نیکی کی کوئی صلاحیت ہی نہیں! آخر میں جب داعیِ حق (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے اس قوم پر جو احسانات الٰہی ہوتے رہے، اُنھیں یاد دلا کر اُس سے ملک شام میں داخل ہونے کو کہا، تو یہ قوم صاف انکار کر بیٹھی، اور کہنے لگی، کہ ایسی زبردست و

قالوا یا موسیٰ ان فیہا قوما جبارین - وانا لن ندخلہا حتی یخرجوا منہا فان یخرجوا منہا فانا داخلون (مائدہ - ع ۴)

پُر قوت قوم ہے ہمیں بھڑا دینا چاہتے ہو! ہم ایسے احمق نہیں، جو اپنی جان دینے کے لیے اُنسے جا بھڑیں! وہ لوگ اس ملک سے چلے جائیں، اسکے بعد البتہ ہم اس میں داخلہ کے لیے تیار ہیں!

انکے دو سچے ناصحوں اور محسنوں نے ہر چند انکی ہمت بندھائی، لاکھ انھیں آمادہ کرنا چاہا لیکن "مصلحت اندیش" قوم کب ان "شوریدہ سروں" کے کہنے سننے میں آنے والی تھی، اسکے قدم نہ اُٹھنا تھے نہ اُٹھے، اور زبان انکار ہی پر کھلتی رہی، یہاں تک کہ عقل و دانش، مصلحت شناسی و انجام بینی کے پُتلوں نے یہ ارشاد فرمانا شروع کر دیا، کہ لے جناب موسیٰ، اگر ایسا ہی دعوے

قالوا یا موسیٰ لن ندخلہا ابدًا مادامو فیہا، فاذہب انت وربک فقاتلا، انا ہٰہنا قاعدون (مائدہ - ع ۴)

اور ایسی ہی ہمت ہے تو آپ مہربانی کر کے آپ خود اور آپ کا خدا جا کر اُس ملک میں قبضہ کرائیں، اور ہم کو یہیں انتظار کے لیے چھوڑے جائیں - جب تک وہ زبردست قوم وہاں موجود ہے، اُسوقت تک ہم تو اپنی جان بازی پر لگانیوالے نہیں!

شوخ چشمی و تمرد، خیرہ سری و گستاخی کا یہ انتہائی نمونہ دیکھ کر موسیٰ کلیم کا قلب کانپ اُٹھا ہے، اور تمام قوم کے مقابلہ میں اپنے اور اپنے بھائی کی انتہائی بے بسی، بے کسی، و بے چارگی کا احساس انکے پیمانۂ حلم و تحمل کو بھی چھلکا دیتا ہے، اور اُس بڑے بے نیازی کی بارگاہ میں بہ کمال نیاز عرض کرتے ہیں کہ پروردگار، میں اپنی اس قوم سے عاجز آگیا، اور میں صاف اقرار کرتا ہوں، کہ

قال رب انی لا املک الا نفسی واخی فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین - (مائدہ - ع ۴)

بجز اپنی ذات خاص اور اپنے بھائی کے، باقی سب کے معاملہ میں اپنے تئیں بے بس پاتا ہوں پس تو ہی ہم دونوں بھائیوں اور اس بدکردار قوم کے درمیان فیصلہ کر دے!

حق و باطل کا معرکہ آج بھی درپیش ہے، آزادی و اسیری، خواجگی و غلامی کی جنگ آج بھی اُسی زور و قوت کے ساتھ جاری ہے، خدا کی ایک محبوب و مقبول قوم آج بھی ایک سخت ترین دورِ ابتلا سے گزر رہی ہے، خدا کے بتائے ہوئے قوانین پر چلنے سے اسے بھی ویسا ہی گریز ہے، اپنی غلامی و اسیری کے ساتھ اسے بھی آج ایسا عشق ہے، کہ اپنے ہاتھوں کی ہتکڑیوں اور پیروں کی

بیڑیوں کو بار بار چومتی جاتی ہے۔ مخلوق کی اطاعت سے گردن باہر نکالنا اسے بھی ویسا ہی بار معلوم ہو رہا ہے، محکومی و غلامی کی ذلت کا احساس اس سے بھی اُسی طرح جاتا رہا ہے، کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنے نفس کو تکلیف میں ڈالنا اسکے لیے بھی اُسی طرح ناممکن ہو گیا ہے، جہاد سے بے رغبتی بلکہ نفرت اسکے دل میں بھی جاگزیں ہو چکی ہے، اپنے پیمبر برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات پاک کے ساتھ تمسخر و طنز اسکا بھی شعار ہو چکا ہے، ان حالات کے درمیان اگر اسکی فلاح و بہبود، اصلاح و آزادی کی کوشش میں "دو بھائی" اپنے تئیں بیکس اور بے بس پاتے ہیں، تو کیا تاریخ عالم میں یہ کوئی انوکھا واقعہ ہے؟

علیگڈھ

عاشقان دیرینہ سال اور سخنوران باکمال کا یہ تجربہ، کہ آہ اگر دل سے نکلتی ہے، تو کسی کے حریم ناز تک میں روزن پیدا کر دیتی ہے، آخر ایک مرتبہ پھر صحیح ثابت ہوا۔ پچھلے نمبر میں "کہتے کیا تھے، اور کرتے کیا ہیں" کے زیرعنوان جو کچھ عرض کیا گیا تھا، اُس پر یونیورسٹی کی ایک بڑی ذمہ دار شخصیت نے توجہ کرنا ضروری خیال فرمایا، اور اُن معروضات کے جواب میں اپنے سرکاری پرچہ میں ایک طویل مضمون شایع فرمایا ہے۔ اس توجہ فرمائی پر صدہا شکریہ۔ اور اس سے بھی زیادہ شکر و ستایش کے قابل یہ امر ہے، کہ جواب سنجیدہ و متین لہجہ میں شایع ہوا ہے۔ ورنہ پچھلے دنوں "بزرگان قوم" کی نازک مزاجی تو اس درجہ ترقی کر گئی تھی، کہ ہم "خوردان قوم" کو زبان کشائی کرتے وقت اپنی عزت سنبھالنی دشوار تھی۔ اس جوابی مضمون کی زبان وہ ہے، جو عموماً بھلے آدمیوں کے درمیان استعمال ہوتی ہے۔ کاش خدا، علیگڈھ کے اکھاڑے کے شہ زور پہلوانوں کو یہ سمجھنے کی توفیق دیتا، کہ بغیر بازاری زبان اختیار کیے، شرفائی زبان میں بھی سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے!

نفس مضمون کسی طویل بحث کا محتاج نہیں۔ فاضل مقالہ نویس سے صرف اسقدر دریافت کرنا ہے، کہ جس قسم کی صفائی اُنھوں نے پیش کی ہے، کیا اُس سے خود اُن کا ضمیر بھی مطمئن ہے؟ کالج میں کئی پیش نماز مقرر ہیں، نماز کے وقت حاضری کا قاعدہ مقرر ہے، غیر حاضری پر جرمانہ ہے، اس قسم کے جتنے جوابات اُنھوں نے تحریر فرمائے ہیں، کیا اُنھیں خود اُنھیں کی دیانت کافی سمجھتی ہے؟ اسوقت فوجداری عدالت میں کوئی مقدمہ نہیں پیش ہے، جو قانونی جوابات، اور ضوابط کالج کی دفعات کا حوالہ دے کر کامیابی حاصل کر لیجائے محض حق و انصاف، صداقت و دیانت کا سوال ہے۔

کیا براہ کرم ارشاد ہوگا، کہ یونیورسٹی کے ذمہ دار عہدہ داروں اور اعلیٰ کارکنوں میں سے کتنے بزرگوار

نماز کے پابند ہیں؟ کالج کے "مسلمان" اساتذہ میں سے کتنے، مسجد میں حاضر ہوتے ہیں؟ طلبہ کی فی صدی
کتنی تعداد پابند جماعت ہے؟ ہر نماز کے وقت مسجد میں کتنے نمازی ہوتے ہیں؟ کتنے اساتذہ کا طرز معاشرت،
کسی معنی میں بھی، اسلامی کہا جا سکتا ہے؟ کالج کی فضا پر فرنگیت چھائی رہتی ہے یا اسلامیت؟ "مسلم یونیورسٹی"
میں کن کن "اسلامی" علوم کی تعلیم ہوتی ہے؟ "علوم اسلامیہ" کے کتنے طلبہ موجود ہیں؟ سائنس کی ایک ایک شاخ
پر جو زر کثیر صرف ہوتا رہتا ہے، اسے دینیات و اسلامیات کے بجٹ سے کوئی مناسبت ہے؟ کالج کے در و دیوار
فلسفہ و سائنس، تاریخ و معاشیات کے لکچروں سے گونجتے رہتے ہیں یا قرآن کی تلاوت احادیث کی روایت،
و اسلامیات کے درس سے؟ عزت و وقعت یورپ کی اعلیٰ ڈگریوں کی ہوتی ہے یا قرآن فہمی و حدیث دانی کی؟
کالج میں جشن عید کس روز ہوتا ہے، لارڈ ریڈنگ اور سر ولیم میرس کے ورود کے موقع پر، یا رسول خدا کے یوم
ولادت، اور یوم حج پر؟ طلبہ کا مطمح نظر کیا رہتا ہے، ڈپٹی کلکٹری، بیرسٹری، انجینیری، ڈاکٹری یا خدمت اسلام،
تحقیق دین، فہم قرآن، ذوق جہاد؟ طلبہ کے دل و زبان کن سے مانوس ہیں، شکسپیر و ملٹن، نیوٹن، و
آئنسٹائن، کمینٹ و برگسان، مارشل و مارسین سے، یا صدیق و مرتضیٰ، بایزید و جنید، مالک و ابو حنیفہ، بخاری
و مسلم سے؟ دلوں میں ولولہ کس شے کا موجود ہے، زیارت کعبہ و خاک بوسی مدینہ کا، یا لندن و پیرس کی سیر کا؟

اس قسم کے صدہا سوالات یونیورسٹی گزٹ کے فاضل مضمون نگار کے ذہن میں از خود پیدا ہو سکتے ہیں،
اور انکے جوابات بھی، دوسروں سے بہتر وہ خود ہی دے سکتے ہیں۔ موجودہ وائس چانسلر اصلاح حال کی
جو کوششیں کر رہے ہیں، اُن سے بیخبری نہیں، ان کوششوں کا پورا اعتراف ہی ہے، لیکن سوال اُنکی ذاتی
کوشش سے متعلق نہیں، بلکہ کالج کی عام فضا سے متعلق ہے۔

ایک جگہ فاضل مقالہ نگار کی قوت ایمانی، آخر انکی مصلحت سنجیوں پر غالب ہی گئی، اور انہیں لکھنا پڑا، کہ

"یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ جس اسلامی رنگ و تربیت کی ضرورت ہے، اور جسکے لیے مسلم یونیورسٹی کی
ضرورت تھی، اُس میں کامیابی ہو سکی ہے"

با ادب گزارش ہے، کہ اس اعتراف کے بعد بھی چلپی کی تردید میں قلم اُٹھانے کی ضرورت باقی تھی؟ اگر تسلیم ہے، کہ مسلم
یونیورسٹی اسلامی فضا پیدا کرنے میں ابتک ناکام رہی ہے، تو پھر آخر اختلاف کس شے سے ہے؟ یا ایڈیٹر صاحب
یونیورسٹی گزٹ نے اپنے اس فلسفہ کا سب کو معتقد بنا رکھا ہے، کہ وہی شے اگر اُنکے اخبار میں چھپے تو صحیح و
درست، لیکن اگر الناظر میں چھپ جائے، تو غلط و لغو؟

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں، بجا　　　　میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں، غلط!

<u>"دورِ عمل" کا ایک نادر نمونہ!</u> مصالحت و آشتی کی کوششوں کی حد ہو چکی، نامہ و پیام میں اسقدر وقت ضایع ہو چکا، صبر و تحمل کی انتہا ہو چکی، خدا کو اپنی کبریائی پر تاب بڑا دعویٰ رہا ہے، اُسے کیا خبر تھی کہ بیسویں صدی کا ترقی یافتہ انسان (جسے وہ حقارت سے اب تک نرا بندہ کہتا آیا ہے) اپنی قوت و جمعیت، اپنے ساز و سامان اپنی عقل و دانش پر پورا اعتماد کر کے، پوری دلیری و مردانگی کے ساتھ اُسکے مقابلہ میں صف آرا ہو سکتا ہے! چنانچہ ولایت منزل (علیگڈھ) کا مورچہ جو اُدھر عرصہ سے سرد تھا، اکی ہو گیا کے آغاز کے ساتھ ہی خود بھی گرما اُٹھا، اور مشہور سورما منشی طفیل احمد صاحب مسب رجسٹرار نے آخر کار اپنا الٹیمیٹم (پیام جنگ) ایک عرش نشین خدا اور اُسکے رحمۃ للعالمین رسول کو دے ہی دیا! (فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ) تا ایک خیال مسلمانوں، دقیانوسی مولویوں، آرزوے جنت کی حماقت میں پھنسے رہنے والوں، کی مروت کب تک کیجا سکتی تھی، خدا پرستوں کی خام خیالیوں کی کہاں تک پروا کیجا سکتی تھی، خوش اعتقادوں کے ساتھ کبتک رواداری ممکن تھی، آخر اعلانِ جنگ ہونا تھا، سو ہو کر رہا۔ اب خدا اور رسول کی فوج کے ہر سپاہی کو چلے گولہ کے سر ہونے کا ہر لمحہ منتظر رہنا چاہیے! خدا ہی ہے، جو بیسویں صدی میں خدا اور بندہ کے درمیان اس محاربہ عظیم کے بعد خدا کی عظمت و کبریائی کا پردہ باقی رہ جائے!

اعلان جنگ کا شاندار عنوان "مسئلہ سود کا عملی دور" ہے۔ گویا دورِ استدلال ختم ہو چکا، اتمام حجت ہو چکی، اور اب بجز عمل جنگ کے کوئی چارہ کار باقی نہیں۔ دورِ استدلال کی انتہائی کامیابی کا نمونہ یہ تھا، کہ چونکہ قرآن میں "حرّم الربٰو" وارد ہوا ہے "حرّم السود" وارد نہیں ہوا ہے، اسلیے سود کی حرمت ثابت نہیں! دورِ عمل کا نمایاں کمال یہ ہے، کہ برکات سود و حصول زر کے اسرار کی تشریح کے لیے ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری ہوگا، جسکا پہلا نمبر شایقین "بلا قیمت" طلب فرمائیں!! آج معلوم ہوا کہ ملک میں سب سے زیادہ "عملی" گروہ وہ ہے، جو اپنی اشتہاری دواؤں کی فہرست "بلا قیمت" لاکھوں کی تعداد میں شایع کرتا رہتا ہے!

"استدلال" کا نمونہ "ماضی" پیش کر چکا، "عمل" کا نمونہ "حال" پیش کر رہا ہے، ماضی و حال کے ان تجربات کے بعد، کیا "مستقبل" اسکے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے، کہ پندرہ روزہ رسالہ کی "بلا قیمت" تعداد اشاعت اور چند تائیدی خطوط شایع کر کے اپنی فتح عظیم کا بھی اعلان کر دیا جائیگا! کون کہتا ہے، کہ خدا اور رسول کے محاربہ کے لیے، کسی مشین گن، کسی قلعہ شکن توپ، کسی ہوائی جہاز کی ضرورت ہوگی؟ اس مقصد کیلیے تو بشرات کی سچی بچائی آتشبازی بالکل کافی ہو سکتی ہے! سچ کہا ہے اُسنے، جو ہمیشہ سچ اور صرف سچ ہی کہتا ہے، کہ جو لوگ حرام پیشوں اور ناجائز مشغلوں میں پڑے رہتے ہیں، اُن پر ایک شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے، جو انکا جلیس و رفیق ہوتا ہے، یہ شیاطین ان لوگوں کو براہ راست سے دور ہی کرتے جاتے ہیں، اور یہ لوگ اپنی جگہ پر یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ گویا کوئی کار ثواب و خدمت مفید انجام دے رہے ہیں! (ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین، وانھم لیصدونھم عن السبیل ویحسبون انھم مھتدون — زخرف ع ۴)

یوں تو فرزند اکبر ہونے کے فائق تھے لیکن اُس کا دماغ کمزور تھا۔ صحت جسمانی درست نہ تھی اور لکھیری کی لڑائی میں اُس کا طرز عمل نہایت مشتبہ ثابت ہوا تھا۔ اہلیا بائی کو یقین تھا کہ یہ لڑکا ریاست کا مستقل حاکم ہونے کے قابل نہیں ہے اور اُس کی تجویز تھی کہ ٹوکوجی کے بعد کاشی راؤ مہیسر میں رہے اور دفتر و خزانہ کی نگرانی جو اہلیا بائی کے ذمہ تھی اس لڑکے کے سپرد کی جائے اور فوج کی سرداری ملہر راؤ کو دی جائے۔

جب تک اہلیا بائی زندہ رہی ٹوکوجی نے اس رائے سے مخالفت نہیں کی مگر اپنی مربیہ کی وفات کے بعد اُس کا خیال بدل گیا۔ اور اُسکے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند خطوط دستیاب ہوئے جو اُس نے اپنی بیماری کے زمانہ میں کاشی راؤ کو لکھے تھے اور ایک میں یہ عبارت تھی کہ "میں نے سندھیا کو تمھاری مدد کے لیے ہموار کر لیا ہے۔ تم فوراً آؤ تاکہ میری زندگی میں حکومت تمھارے سپرد کردی جائے"۔ اس ارشاد کی تعمیل میں کاشی راؤ مہیسر آیا اور خلعت ولیعہدی سے سرافراز ہوا۔ اُس کا ایک خط مورخہ "۸۔ نومبر ۱۷۹۶ء روز سہ شنبہ" ریاست میں موجود ہے جس میں اُس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ "میرا باپ سخت بیمار ہے اور میں تیزی سے کوچ کرکے اُسکے دیدار کو آیا ہوں۔ باپ نے مجھ کو خلعت ولیعہدی عطا فرمایا ہے۔ لیکن میرا بھائی ملہر راؤ خفا ہو کر کہیں چلا گیا۔ معلوم نہیں کہ اُس کا کیا ارادہ ہے۔ اگر پیشوا کی خدمت میں شکایت لیکر پہونچا ہو تو اُس کی نگرانی کرتے رہو"۔

ٹوکوجی کا خاتمہ ہوا تو اُسکی وصیت کے مطابق کاشی راؤ مسند نشین کیا گیا مگر ملہر راؤ نے دربار پونا کے رکن اعلیٰ "نانا فرنویس" سے اپنی مدد کا وعدہ حاصل کر لیا تھا اور ریاست کی فوج کا بڑا حصہ اُسی کا طرفدار تھا۔

کاشی راؤ نے دیوان سرجی راؤ گھٹگیا کو (جو اپنی خوبصورت لڑکی دولت راؤ کے رنواس میں دینے کا وعدہ کرکے ریاست سندھیا کے سیاہ و سفید کا مختار ہو گیا تھا) منت سماجت سے اپنا ہوا خواہ بنا لیا تھا اور پونا کے دربار میں کاشی راؤ کے حقوق بہت زور شور سے بیان کیے گئے۔ کاشی راؤ خود بھی پونا پہونچا اور وہاں نانا فرنویس اور گھٹگیا کی مخالفت کاشی راؤ اور ملہر راؤ کی آڑ میں ظاہر ہونے لگی!!

گھٹگیا فطرت و چالاکی میں نانا سے بہت زیادہ تیز تھا۔ اُس نے اپنے فریق کی کامیابی کے لیے یہ داؤں کیا کہ کاشی راؤ اور ملہر راؤ کے درمیان صلح کرادی اور "بیل بھنڈار" لے کر قسم کھائی گئی کہ

دونوں بھائی باہم اتفاق سے رہیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف فتنہ پردازی نہ کریں گے۔
نانا مطمئن ہو گیا مگر جس دن یہ عہد و پیمان ہوئے اُسی رات کو سندھیا کی قواعد داں فوج نے ملہر کا خیمہ گھیر لیا۔ جب صبح کو ملہر راؤ بیدار ہوا تو پتہ چلا کہ اُس نے دھوکا کھایا۔ قول قرار نمائشی تھے۔ اور دشمن نے موقع پاکر اُسکے ڈیرہ پر پہرا بٹھادیا ہے۔ وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا۔ مگر قبل اسکے کہ مدافعت کے لیے اپنے ہمراہیوں کو آواز دے سکے اُس کی پیشانی پر ایک گولی لگی۔ جس نے اُس کی پر ارمان زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اُسکے جان نثار سپاہی بھی قتل کیے گئے۔ اور اُنھیں میں ایک بہادر روی راؤ تھا جس کی حسرتناک موت تاریخ کے صفحوں پر اس وجہ سے مشہور ہوئی کہ اُسکی وفادار بیوی اپنے شوہر کی ناگہانی خبر موت سنتے ہی چیخ کھاکر زمین پر گر پڑی اور اُسی وقت اپنے مقتول شوہر کے پاس دوسرے عالم میں پہونچ گئی۔

ملہر راؤ کی جس قدر فوج پونا میں موجود تھی (اور جسکی تعداد تین چار ہزار کے درمیان تھی) منتشر کر دی گئی۔ خیمہ و خرگاہ لوٹ لیا گیا۔ اور اُسکی حاملہ بیوی کو سندھیا نے اپنی حراست میں لیلیا۔ البتہ تُکوجی کے دو لڑکے جسونت راؤ اور ایٹوجی اس قتل عام سے جان بچاکر بھاگ گئے۔[1]

اس دغابازی کے انعام میں کاشی راؤ نے ۳۶ لاکھ کی دستاویزیں جنکا اہلیا بائی[2] کے وقت سے ریاست اُجین پر بار تھا سندھیا کو واپس کر دیں اور گولی بارود کی قیمت کے نام سے پندرہ لاکھ روپیہ نذر کیا۔

کم عقل کاشی راؤ سمجھا ہوگا کہ بیگناہ بھائی کا خون بہا کر وہ باطمینان مہیسر میں راج کرے گا لیکن اُس نے خیال نہ کیا کہ سب راجوں کا راجہ جو اپنے ایک اشارہ سے تمام دنیا کی سلطنتیں بناتا اور بگاڑتا ہے اس دغابازی و بدعہدی کو دیکھتا تھا اور اس کی سرکار میں دادخواہوں کی فریادرسی کے لیے کسی رشوت کی ضرورت نہ تھی!!!

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

احکم الحاکمین نے رنجیدہ و افسردہ جسونت راؤ کو اس خونی میدان سے محفوظ نکال کر ایسی بہادری

---

[1] ڈف گرانٹ۔ تاریخ مرہٹہ جلد سوم۔ صفحہ ۱۴۸

[2] اہلیا بائی نے اپنے ابتدائی عہد میں مادھوجی سندھیا کو ۳۰ لاکھ روپیہ قرض دیا تھا اور ۶ لاکھ روپیہ ملہر راؤ کی آشنا ہور نکا بائی سے دلایا تھا۔ مادھوجی نے اس قرض کی رسید لکھ دی تھی لیکن روپیہ واپس کرنے کا غالباً ارادہ نہ تھا۔ یہی دستاویزیں اُسوقت کاشی راؤ نے واپس کر دیں۔ ۱۲

اور جوانمردی عطا فرمائی کہ چند ہی روز میں کاشی راؤ اور اُسکے تمام ہوا خواہوں کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا!!

بہرحال اسوقت تو کاشی راؤ فتحمندی کے نشہ سے جھومتا تھا۔ عاقبت کی خبر خدا جانے!!

جسونت راؤ یہاں سے فرار ہوکر گنتی کے چند سواروں کے ساتھ گرتا پڑتا ناگپور پہونچا اور وہاں کے راجہ رگھوجی بھونسلا سے پناہ چاہی۔ گر بھونسلا کو شک تھا کہ اس مظلوم راجکمار کے پاس کچھ قیمتی جواہرات ہیں جو ناگپور کے تخت و تاج کی زینت بڑھا سکتے ہیں۔ اور اسکے علاوہ دربار پونا اور ریاست سندھیا کے مسرور کرنے کے لیے جسونت راؤ سے بیش قیمت کوئی تحفہ نہ تھا۔ اس لیے ان مصالح مالی و ملکی کو پیش نظر رکھ کر بھونسلا نے اس بیکس کو گرفتار کر لیا!!

جسونت راؤ چھ مہینے تک قید خانہ میں رہا۔ گر ہوا مٹھی میں کیونکر بند ہو سکتی ہے۔ وہ موقع پاکر بھاگا۔ لیکن پھر گرفتار ہو گیا۔

جلتے ہیں تو اک روز لپٹ جائیگا یا نسیم ہمت نہیں ہارا ہے دل زار ابھی تک

چند ہی روز کے بعد اُس نے نگران محافظوں کو غافل پایا اور ایسی احتیاط سے فرار ہوا[۱] کہ راجہ کو خبر بھی نہ لگی اور وہ خاندیس پہونچ گیا!! وہاں گرگاؤں میں ملہر راؤ کا گرو چمنا بھاو رہتا تھا۔ اُسکو یہ ہمت تو نہ تھی کہ جسونت راؤ کو اپنی حمایت میں رکھ سکتا لیکن اُس نے تین سو روپیہ نقد اور ایک گھوڑی "لنکا" نام جینے کی نذر کی اور مالوہ کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ اسکی ترقی کا رستہ اُدھر ہے۔ جسونت راؤ نے یہ امداد شکریہ کے ساتھ قبول کی۔ لیکن یکایک مالوہ میں داخل ہونے کی ہمت نہ کرکے دو تین مہینے تک کگر ندی کے بھیلوں کے ساتھ اپنی زندگی کی خبر چھپاتا رہا۔ جب یہاں بھی اطمینان کی صورت نظر نہ آئی تو روانی ہوتا ہوا دھرم پور پہونچا جو نربدا کے کنارے ریاست دہار کا ایک مقبوضہ شہر تھا۔

انند راؤ پوار[۲] اُسوقت دہار کا راجہ تھا۔ مخبروں نے اطلاع کی کہ جسونت راؤ دھرم پور

---

[۱] جسونت راؤ اس مرتبہ ایک مسلمان سپاہی شاہ محمد نام اور ایک محرر بھوانی شنکر کی مدد سے فرار ہوا تھا۔ شاہ محمد تو چند روز میں مر گیا لیکن بھوانی شنکر کو بہت کچھ عروج نصیب ہوا۔ ۱۲

[۲] جسونت راؤ پوار ریاست دھار کا راجہ پانی پت کی لڑائی میں کام آیا تھا، اُس کا لڑکا کھنڈی راؤ باپ کی موت کے وقت صرف ڈھائی برس کا تھا۔ ریاست کا انتظام ایک برہمن مادھو راؤ ورپکار کے ہاتھ رہا۔ اُس زمانہ میں ہمسایہ ریاستوں نے دھار کا بہت علاقہ چھین لیا۔ کھنڈی راؤ کی شادی گووند راؤ گیکوار (دیکھیے صفحہ ۳۶)

میں ہے تو راجہ نے اپنی شرافت سے اس مظلوم کے لیے خلعت و پالکی روانہ کی اور اپنے ملازموں کو ہدایت کی کہ راجکمار کو براہ مانڈو دہار پہونچا دیں اور اُسکی کل ضرورتوں کی کفالت کریں۔

اُسوقت جسونت راؤ کی مفلسی کا یہ عالم تھا کہ اُسکے پاس پوشاک بدلنے کو جوڑا نہ تھا۔ اور اُسکے ہمراہی بھی نیم برہنہ تھے۔ راجہ کی مہربانی سے انکو کپڑا میسر آیا۔ اور دو تین مہینے تک جسونت راؤ کسی قدر اطمینان سے دہار میں مقیم رہا۔ اُسکے مقتول بھائی کے پُرانے نمکخوار بھی یہاں جمع ہونے لگے۔ لیکن سب شکستہ حال تھے۔ اور اُنکی اعانت جسونت راؤ کی خالی جیب پر سخت بار تھی۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں ریاست کے سابق دیوان رنگ راؤ اوریکار نے جو بڑی مشکل سے دہار سے نکالا گیا تھا پٹھانوں اور پنڈاریوں کی جماعت لیکر راجہ پر حملہ کر دیا۔ "کسور" کے مقام پر لڑائی ہوئی اور انند راؤ حالت بگڑتی ہوئی دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے لیکن جسونت راؤ نے جو اُسوقت میدانِ جنگ میں اپنے میزبان کی مدد کے لیے موجود تھا ایک پرچہ لکھکر اوریکار کے ہمراہی پنڈاریوں کے پاس بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ "جسونت راؤ ہولکر پوار کے ساتھ ہے اور پنڈاریوں سے جو اُس کے گھرانے کے قدیم ہمدرد ہیں التجا کرتا ہے کہ وہ اوریکار کا ساتھ چھوڑ دیں" پنڈاریوں کو پہلے تو اس خبر کا یقین نہ آیا مگر جب قاصد نے قسم کھائی تو اُنھوں نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور دہار کی توپیں جو اُنکے قبضہ میں آ چلی تھیں چھوڑ دیں۔ پنڈاری پیچھے ہٹ گئے مگر پٹھان بدستور لڑتے رہے۔ جسونت راؤ نے خود اُن پر فیر شروع کیا اور اوریکار کے لشکر کو سخت ہزیمت دی۔ راجہ بیحد ممنون ہوا۔ مگر جسونت راؤ نے اس خدمت کے معاوضہ میں صرف یہ انعام مانگا کہ اُسکو دہار میں پناہ دی جائے اور وہ دشمنوں کے حوالے نہ کیا جائے!!

اس لڑائی کی شہرت دور پہونچی اور سندھیا کو معلوم ہو گیا کہ مقتول ملہار راؤ کا بھائی دہار میں زندہ سلامت موجود ہے اُس نے انند راؤ کو دھمکی دی کہ جسونت راؤ گرفتار یا خارج البلد نہ کیا گیا تو دہار کا علاقہ خاک سیاہ کر دیا جائے گا۔ انند راؤ سخت مشکل میں تھا۔ نہ سندھیا سے مقابلہ کی طاقت تھی نہ ہولکر سے وعدہ خلافی کی جرأت۔ جسونت راؤ نے یہ عقدہ سنا تو اپنی شرافت ظاہر کی اور اعلان کر دیا کہ وہ اپنے مہربان دوست کا علاقہ تباہ کرانا نہیں چاہتا اسلیے دہار سے چلا جائے گا۔ راجہ نے دس ہزار روپیہ سے مدد کی اور سات گھوڑے بھی عنایت فرمائے۔

(بقیہ حاشیہ ۳۵) کی لڑکی سے ہوئی اور اُنکا بیٹا انند راؤ جو اپنے باپ کے مرنے سے چھ مہینے بعد پیدا ہوا تھا ۱۸ سال کی عمر تک بڑودہ میں رہا وہ جب دہار واپس آیا تو یہاں کے دیوان رنگ راؤ اوریکار نے بہت مخالفت کی مگر آخر راجہ کامیاب ہوا اور دیوان ریاست سے نکالدیا گیا۔

جسونت بہت مغموم و افسردہ دہار سے رخصت ہوا - اسوقت اُسکے ساتھ صرف چودہ سوار تھے
جن میں سے سات تو اُن گھوڑوں پر تھے جو راجہ دہار نے عنایت فرمائے تھے اور سات ایک دوسرے
مرہٹہ سردار کے تھے جو اُسکی قسمت کا شریک ہوگیا تھا - ان سواروں کے علاوہ تقریباً اکیس پیدل
نیم مسلح پیادے بھی اُسکے ہمراہ تھے جو اُسکے بھائی کے نمکخوار تھے اور جنکا مال و اسباب پونا میں
لُٹ چکا تھا - یہ مختصر جماعت نہایت حسرت و فکر کے ساتھ دہار سے جا رہی تھی اور سردار سوچتا تھا
کہ دنیا میں شاید اُسکے لیے کوئی جگہ امن کی باقی نہیں ہے مگر قسمت کی دیبی مسکرا رہی تھی کہ عنقریب
ستارۂ اقبال طلوع ہوتا ہے اور مہیسر کا مسند ریاست پامال ہوا چاہتا ہے !!

ذرہ بھی چمک سکے ہو ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہے

جب یہ مصیبت زدہ گروہ دیپال پور کے قریب پہونچا (جو دریائے چمبل کے کنارے ریاست
اندور کا ایک شہر تھا) تو جسونت راؤ نے اپنی قسمت آزمانے کے لیے اس شہر پر اچانک حملہ کر دیا
یہاں کاشی راؤ کے سو مسلح سوار حفاظت کے لیے متعین تھے لیکن سرکشِ جسونت نے اس دلیری
سے دھاوا کیا کہ سواروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے - سب فرار ہوئے یا قتل کیے گئے - اور
جسونت راؤ کو اُنکے نفیس گھوڑے مالِ غنیمت میں ملے - اُس نے شہر کے باشندوں سے بھی کچھ رقم
وصول کی - اور اُسی دن سے غارتگری کے سلسلہ کا آغاز ہوا -

معترض کہتے ہیں کہ یہ لوٹ مار اُسکی شرافت کے شایاں نہ تھی - لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ اپنے
بھائی کے خون کا بدلہ لینے اور اپنی آبائی ریاست کو سندھیا کے پنجہ سے نکالنے کی اُسکے پاس کوئی
تدبیر سوا اسکے نہ تھی کہ دشمنوں سے مال چھین کر ملازم رکھے اور کاشی راؤ کو جو سندھیا اور اُسکے
دیوان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہا تھا نکال کر دیگر ملہار راؤ کے نابالغ بچے کھنڈی راؤ کو
جو باپ کے قتل ہونے کے بعد پیدا ہوا تھا اور اپنی پیدائش کے وقت سے سندھیا کا قیدی تھا
آزاد کرا کے موروثی مسند ریاست پر بٹھلائے -

سندھیا سے جسونت راؤ کو قطعاً عداوت تھی اور اسوقت اندور کی کل ریاست کاشی راؤ
کی نااہلی سے سندھیا کے قابو میں تھی - لہذا جسونت راؤ دیپالپور اور نیز دیگر اضلاع اندور
کے لوٹنے میں حق بجانب تھا - یہ سب علاقہ دشمن کا ملک تھا - اور اس کی تاخت و تاراج میں اُس
زمانہ کے جنگی اصول کے مطابق کوئی اخلاقی ممانعت نہ تھی - جسونت راؤ نے دہار چھوڑنے سے قبل
ایک مہر[1] تیار کرائی تھی جس پر "جسونت راؤ فدوی سوائی کھنڈی راؤ" کندہ تھا - اور یہ تاریخی فقرہ

[1] ملکم صاحب کی یادداشت مالوہ جلد اول ص ۱۶۱ -

اس دعوے کا ثبوت ہے کہ وہ خود ریاست کا دعویدار نہ تھا بلکہ اپنے مظلوم اور بیکس بھتیجے کو اُسکے جائز حقوق دلانا چاہتا تھا۔ اور جو دشمن اس کار ثواب میں مزاحم ہوتے تھے اُنکو قتل و غارت کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا۔

ہر حال دیپال پور کی لوٹ سے کچھ مال جسونت راؤ کے ہاتھ آیا اور اُس نے فوج بھرتی کرنا شروع کی جس میں پنڈاری۔ بھیل۔ افغان۔ مرہٹے اور راجپوت وغیرہ سب شامل تھے۔ وہ اس فوج کو لیکر جاورہ اور مہدی پور گیا۔ لیکن وہاں کے عاملوں نے امداد نہ کی۔ بلکہ جاورہ کے عامل نے تو اُسکو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ وہ یہاں سے ہٹ کر سارنگ پور پہونچا۔ یہاں ایک سید وزیر حسین نامی نے (جو پہلے ہولکر کی سرکار میں ملازم تھا) اس بہادر کا ساتھ دیا۔ اور مالوہ کے شرفا میں سے یہ پہلا شخص تھا جو جسونت راؤ کی قسمت کا شریک ہوا۔

سید کے پاس چالیس پچاس سوار اور دو تین سو پیدل تھے۔ وہ اُس نے جسونت راؤ کی خدمت میں پیش کیے اور پانچ ہزار روپیہ نقد بھی حاضر کیا۔ اور اسکے علاوہ سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ جسونت راؤ کی ملاقات سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک بہادر سردار امیر خاں سے کرا دی جو کسی زمانہ میں پیشوا کا ملازم تھا۔ اور بعد کو ریاست بھوپال میں اپنا مستقر بنا کر مرہٹوں سے جنگ و جدل شروع کی تھی۔ اور اُسوقت پندرہ سو منتخب سوار اُسکے ہمرکاب تھے جنھوں نے قرب و جوار کے علاقہ میں آفت برپا کر رکھی تھی۔

اسی زمانہ میں جسونت راؤ کو خبر ملی کہ اُس کا بھائی اٹھوجی جو پونا سے ملہر راؤ کے قتل کے بعد فرار ہوا تھا اور پیٹ پالنے کے لیے ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا تھا، پیشوا کے قبضہ میں آگیا۔ اور بے رحم باجی راؤ نے اس مظلوم بیکس کو ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا کر پہلی اپریل سنہ ۱۸۰۱ء کو شارع عام پر کچلوا دیا!!

یہ دردناک خبر سنکر جسونت راؤ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور اُس نے پیشوا اور سندھیا کو تباہ کرنے کی قسم کھائی۔ سید وزیر حسن کی سلسلہ جنبانی سے امیر خاں شجاعلپور آیا اور رانا گنج کے مقام پر جسونت راؤ اور امیر خاں سے پہلی ملاقات ہوئی۔ باہمی شرائط فوراً طے ہوگئے۔ امیر خاں نے وعدہ کیا کہ وہ جسونت راؤ کا ساتھ کسی حال میں نہ چھوڑے گا۔ اور ہولکر نے ایک تحریر دی کہ آیندہ جسقدر مال غنیمت حاصل ہو یا جو علاقے فتح کیے جائیں اُس میں امیر خاں کا نصف حصہ ہوگا۔

مالوہ دشمنوں کے قبضہ میں تھا اس لیے سب سے پہلے اُسی پر ہاتھ صاف کیا گیا۔ شجیٰ علیپور کے عامل سے ۷ ہزار وصول کیا۔ سوداگروں کے ایک قافلہ سے ۴۰ ہزار کا کپڑا لوٹ لیا۔ سندھیا کے علاقوں کو برباد کیا۔ ہنڈیا کو تباہ کر دیا۔ کسوارو میں کاشی راؤ کی فوج کو شکست دی اور چار توپیں چھین لیں جنھوں نے اُس کی فوجی قوت میں چار چاند لگا دیے۔!!

اسکے بعد مہیسر کا رخ کیا مگر کامیابی کی صورت نہ دیکھ کر ستواس گیا جہاں سات توپیں اور دستیاب ہوئیں۔ کاشی راؤ کی فوج بددل ہونا شروع ہوئی۔ اُس کا فرانسیسی افسر "شولیر ڈیوڈ رنیک" اپنی قواعدداں فوج لیکر جسونت راؤ سے آملا۔ اور چند مہینوں کے اندر جسونت راؤ کا پایہ اس قدر مضبوط ہو گیا کہ اُس نے کنڈی راؤ کی طرف سے حکومت اندور کا اعلان کر دیا۔

اب وہ بغیر کسی مزاحمت کے مہیسر پہونچا۔ راج محل پر قبضہ کیا اور اہلیا بائی کی جمع کی ہوئی دولت اُسکے ہاتھ آئی۔

تین مہینے مہیسر میں قیام کرکے وہ برکن ٹے گیا جہاں اُسکی فوجی چھاونی تھی۔ ایک روز نشانہ بازی کی مشق کر رہا تھا کہ بندوق دفعتًہ پھٹ گئی اور اُسکی ایک آنکھ جاتی رہی۔ لیکن تیز دل راجہ کو اس تکلیف کی کیا پروا تھی صحت کے بعد ہی امیر خاں کو "نواب" کا خطاب دیکر ہاتھی گھوڑے خلعت اور جواہرات سے سرفراز کیا اور اُسکو مشرقی اضلاع سے "چوتھ" وصول کرنے کے لیے روانہ کیا۔

نئے نواب نے راجہ دیواس سے ایک لاکھ روپیہ وصول کیا "اگر" کو خاک سیاہ کر دیا۔ برسیہ۔ سرونج۔ ساگر اور انکے درمیان کا کُل علاقہ لوٹ لیا۔ ساگر پیشوا کے قبضہ میں تھا اور یہاں کی فوج نے مقابلہ کی ہمت کی تھی اسلیے ہر ایک محلہ لوٹا گیا اور تیس دن تک شہر کے کسی نہ کسی حصہ میں آگ کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ چار پانچ سو آدمی قتل ہوئے لیکن سارا شہر تباہ کر دیا گیا اور رعایا کے پاس کسی قسم کا مال نہیں چھوڑا گیا۔ یہاں تک کہ کنوؤں اور تالابوں میں بھی جال ڈال کر جو کچھ مل سکا نکال لیا۔

ساگر کے عامل نے راجہ ناگپور سے مدد مانگی۔ اور وہاں سے فوج اس قدر تیزی کے ساتھ

لہ ایک معتبر راوی کا بیان ہے کہ پچاس برس پہلے تک اندور کے قرب و جوار میں بھاٹ ایک گیت گایا کرتے تھے جس میں جسونت راؤ کے اس جسمانی نقص کی طرف اشارہ تھا۔ اُسکے چند الفاظ یہ ہیں :-

"جسونت راؤ مردانا۔ اُسے کون کہے کانا　بھالے سے بھید کے روٹی کھانا"

آئی کہ جب تک وہ لشکر ساگر سے چند میل کے فاصلہ پر نہ پہونچ گیا امیر خاں کو اس امداد کی اطلاع نہ ہوئی۔ جس وقت اس لشکر کی آمد کی خبر ملی امیر خاں دو تین ہزار سوار لیکر مقابلہ کے لیے نکلا۔ لیکن اُسکی فوج کا بڑا حصہ اُس دولت کو محفوظ کرنے کے لیے جو ساگر کی لوٹ سے ہاتھ آئی تھی، بھوپال کی طرف چلا گیا۔ امیر خاں رات کو ساگر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ ساری فوج غائب ہے۔ مجبور ہو کر اُس نے اپنے خیمۂ و خرگاہ کو آگ لگا دی اور راجگڈھ کی طرف ہٹ گیا۔ اُسکے پاس نہ تو شب باشی کے لیے ڈیرا تھا اور نہ پوشاک بدلنے کو کپڑا۔ راجگڈھ کے حاکم نے مدد کی اور وہاں کے ایک ساہوکار سے بھی کچھ روپیہ لیا گیا۔ اسکے بعد امیر خاں کے بھائی کریم الدین نے شجا علپور کو لوٹ کر اس نقصان کا معاوضہ کیا۔

امیر خاں کے فتوحات دیکھ کر بعض فتنہ پردازوں نے جسونت راؤ کو بدظن کرنا چاہا۔ اور راجہ کو سمجھایا کہ یہ پٹھان مالوہ کو لوٹ کر ہولکر کے راج پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ راجہ نے ایک سردار امیر خاں کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا۔ مگر اُس بہادر کو کچھ خوف نہ تھا

تو پاک باش برادر مدار از کس باک　　　زنند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگ

وہ صرف سو سواروں کی جمعیت سے مہیسر پہونچا اور اپنی تلوار راجہ کو نذر کرکے کہا کہ "آپ سے بد باطنوں نے میری شکایت کی ہے لیکن میں تلوار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ یہ ہتھیار ہمیشہ آپ ہی کے کام میں استعمال ہوگا"۔ جسونت راؤ خاموش ہو گیا لیکن اُسکے دل میں شک باقی تھا۔ دوسرے ہی دن امیر خاں تن تنہا اُسکے حضور میں گیا اور اپنا خنجر نذر کرکے عرض کی کہ "آپ کو میری وفاداری پر شبہہ ہے تو بہتر ہے کہ اسی خنجر سے مجھ کو ہلاک کر دیں۔ میں اپنا خون معاف کرتا ہوں اور مجھ کو بہت خوشی ہوگی اگر آپ کو یقین آجائے کہ میری جان لینے سے آپ کی ریاست کو فائدہ پہونچا"۔

جسونت راؤ شرمندہ ہوا۔ امیر خاں کو گلے لگایا۔ پچھلے خیالات کی معافی چاہی اور دونوں نے باہمی مشورہ سے سندھیا سے مقابلہ کرنے کی تدبیر سوچنا شروع کی جو اس عرصہ میں جنگ کے لیے تیار ہو گیا تھا اور اُسکی فوج نے ریاست ہولکر کی طرف پیشقدمی کا آغاز کر دیا تھا۔

راجہ اور نواب نے ہمت کرکے سندھیا کی ہراول فوج کو شکست دی لیکن ستواس کے مقام پر خفیف زک اُٹھائی اور پھر پوری طاقت سے اُجین پر حملہ کیا جو سندھیا کا دارالسلطنت تھا۔ آٹھ دن تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ آخرکار سندھیا کی کُل فوج جو اُجین کے پاس تھی قتل ہوئی

دار السلطنت مفتوح ہوا اور اس دولت مند شہر سے تاوان جنگ وصول کرنے کی وہی تدبیر کی گئی جو نادر شاہ نے دہلی میں اختیار کی تھی یعنی محلہ محلہ کا نیلام کر دیا گیا اور ٹھیکہ دار جسقدر روپیہ اپنے اپنے محلہ سے وصول کر سکے شیر مادر تھا!!

سندھیا نے اس غارتگری کا عوض بڑی بے رحمی سے لیا۔ اس کا سسر دیوان سرجی راؤ گھٹگیا اندور کے تباہ کرنے پر مامور کیا گیا اور اس دختر فروش سردار کو ظلم و ستم کے آلے ایجاد کرنے اور بے زبان رعایا پر اُنکے استعمال کرنے میں خاص ملکہ تھا۔ اسکی سفاکی اور خونریزی کی عجیب و غریب حکایتیں ایک انگریز مورخ[1] نے لکھی ہیں جنکا دہرانا کاغذ کا گندہ کرنا ہے۔ لیکن اُن میں سے دس فی صدی بھی اگر سچی ہیں تو یہ شخص چنگیز اور ہلاکو خاں کی چھوٹے پیمانہ کی تصویر تھا!!

اس ظالم نے اندور کا رخ کیا تو جسونت راؤ اپنی کل فوج اور تین سو توپیں لیکر دار الحکومت کی حفاظت کو چلا۔ دس دن تک ہلکی ہلکی لڑائیاں ہوتی رہیں لیکن ۱۴۔ اکتوبر سنہ ۱۸۰۱ع کو ہولکر نے فیصلہ کن جنگ کا ارادہ کیا۔ رات کے وقت امیر خاں اور بھوانی شنکر سرداران لشکر کو حکم دیا کہ وہ دس بارہ ہزار سپاہی لیکر چکر لگاتے ہوئے طلوع آفتاب کے وقت تک دشمن کے پیچھے پہونچ جائیں اور اُدھر سے ایک توپ سر کریں جسکی آواز سن کر سامنے کے رخ سے بھی حملہ شروع کیا جائے اور دو طرفہ آتشباری سے مجروح ہو کر سندھیا کی فوج کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ چال تو درست تھی مگر بدقسمتی سے امیر خاں کو عقب تک پہونچنے میں دیر ہوئی اور گھٹگیا کی فوج نے دھاوا شروع کر دیا۔ اسکے جواب میں ہولکر کے رسالہ کو بھی حملہ کرنا پڑا۔ گھٹگیا کے سپاہی بھاگنے لگے۔ توپیں چھوڑ دیں اور بعض نے ہتھیار ڈال دیے۔ اگر جسونت راؤ اُسوقت بھی اپنی محفوظ فوج لیکر حملہ کر دیتا تو گھٹگیا کا نشان بھی نہ باقی رہتا مگر وہ امیر خاں کی توپ کے انتظار میں رہا اور چند لمحوں کے پس و پیش نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔

سندھیا کے پیادوں نے دیکھا کہ دشمن کے صرف دو تین سو سوار اُنکے مقابلہ پر ہیں میدان میں قدم گاڑ دیے اور سواروں کو پسپا کیا۔ اب جسونت راؤ نے رسالہ کی مدد کرنا چاہی مگر وقت گذر چکا تھا اور اُسکی کوشش ناکام رہی۔ امیر خاں اور بھوانی شنکر دشمن کی پشت پر پہونچے تو دیکھا کہ

[1] ڈف گرانٹ صاحب کی تاریخ مرہٹہ جلد سوم۔ ایک ترکیب دشمن کو ایذا دینے کی یہ ایجاد کی تھی کہ اُسکے سارے بدن پر ہوائی بان لگوا دیے اور اُنکو مشتعل کیا۔ جسم کا ٹکڑا ٹکڑا الگ ہو گیا!! توپ کو گرم کیا اور دشمن کو اس سے باندھ دیا۔ گرمی بتدریج بڑھاتے گئے۔ یہاں تک کہ دشمن جل کر کوئلہ ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ

ہولکر کے لشکر کو نصف شکست ہو چکی ہے اور دن بھی بہت چڑھ گیا ہے اس لیے توپ کا فیر نہیں کیا اور اپنے دستہ کی حفاظت سوچنے لگے۔ اس عرصہ میں ایک سردار نے میدان سے بھاگنے کے لیے خیمہ و خرگاہ لدوانا شروع کر دیے۔ اور یہ کم ہمتی دیکھ کر سارے لشکر کا جی چھوٹ گیا اور اندھیرا ہونے سے پہلے ہی ہولکر کی فوج ہر طرف بھاگنے لگی۔ مجبور ہو کر جسونت راؤ نے بھی منہ موڑا اور صرف چند ہمراہیوں کے ساتھ میدان سے سلامت جا سکا۔ توپیں چھن گئیں۔ سامان جنگ غارت ہو گیا۔ خیمے ڈیرے لٹ گئے اور دارالسلطنت اندور دشمن کے قبضہ میں آگیا۔ سرجی راؤ نے پونا میں جو مظالم کیے تھے اُنکی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اب اندور تو دشمن کا شہر تھا اور بزور شمشیر فتح کیا گیا تھا۔ یہاں ہر ایک سفاکی جائز و مباح تھی!! شہر لوٹ لیا گیا۔ اور اندور کے کنوئیں اُن شریف اور عصمت پرست عورتوں کی لاشوں سے پٹے ہوئے تھے جنھوں نے بے آبروئی سے بچنے کے لیے کنوؤں میں گر گر کر اپنی جانیں گنوائی تھیں۔ پندرہ دن تک قتل عام جاری رہا۔ ہر ایک باشندہ یا تو مارا گیا یا فرار ہوا اور شہر میں کوئی عمارت باقی نہ رہی جو مسمار نہ کر دی گئی ہو۔ یہ دردناک انجام ہوا اُس خوبصورت شہر کا جسکی رونق و دولت بڑھانے کے لیے اہلیا بائی نے اپنی عمر کے تیس سال وقف کیے تھے!!!

ان نینن کا یہی بسیکھ وہ بھی دکھایا یہ بھی دکھ

جسونت راؤ اندور سے بھاگ کر جام پہونچا جو بندھیاچل کے دامن میں ایک محفوظ قلعہ تھا اور اپنے شکست خوردہ لشکر کی دوبارہ آراستگی میں مصروف ہوا۔ لیکن گھٹکیا کی فوج نے رسد بند کر دی تھی اور ہولکر کے سپاہیوں کو نہ تو خوراک مل سکتی تھی اور نہ اُنکو تنخواہ دینے کی کوئی سبیل تھی۔ جسونت راؤ نے اپنا تمام ذاتی ساز و سامان فروخت کر ڈالا حتیٰ کہ عورتوں کے زیور بھی الگ کر دیے اور بڑی مشکل سے ہر ایک سوار کو پانچ پانچ روپئے دے کر بقیہ تنخواہ کے لیے آٹھ دن کی مہلت مانگی اور وعدہ کیا کہ اس میعاد کے اندر کُل سپاہیوں کی تکلیفیں دُور کر دوں گا۔

آخر کار جو کچھ سامان باقی تھا مہیسر بھیجدیا اور صرف سواروں کو ساتھ لے کر ایک دن میں اٹھتر میل کا کوچ کیا اور اچانک رتلام کے سامنے پہونچ کر اس دولتمند شہر کو لوٹ لیا۔ فوج سے کہا کہ میرا وعدہ پورا ہو گیا تم اس شہر سے جتنا مال چاہو وصول کر لو۔ تیرہ دن خوب جشن رہا۔ بھوکے سپاہیوں نے رتلام کو جی بھر کر لوٹا اور جام کی تکلیفوں کا پورا معاوضہ کر لیا۔ جب گھوڑوں پر اتنا مال غنیمت لد گیا کہ اُس سے زیادہ لیجانا ناممکن تھا تو اُس نے مہیسر کی طرف کوچ کیا اور فوج سے کہا کہ میرا ملک

دشمنوں کے قبضہ میں ہے۔ سپاہیوں کی تنخواہ دینا میرے امکان سے باہر ہے۔ جو لوٹ مار سے پیٹ بھرنے کو راضی ہو وہ میرے ساتھ رہے اور جو ماہواری تنخواہ چاہتا ہو وہ اپنے گھر چلا جائے۔ میں بخوشی اجازت دیتا ہوں۔" ایسے بلند ہمت اور عالی حوصلہ راجہ کا ساتھ کون چھوڑتا۔ ساری فوج نے جسونت راؤ کی ہمراہی قبول کی!!

رتلام کی تباہی نے دولت راؤ سندھیا کی آنکھیں کھول دیں۔ اب اُسکو سمجھ آئی کہ کاشی راؤ کا ساتھ دینا سخت غلطی تھی اور اُسکی حمایت سے ریاست اُجین کو نفع نہیں پہونچ سکتا ہے اس نے ہولکر کو صلح کا پیام دیا اور کاشی راؤ کو مہیسر واپس کردیا۔

جسونت راؤ نے بھائی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور عزت و آبرو سے رکھا لیکن اسکو بنظر حقارت دیکھتا تھا اور کسی صلاح مشورہ میں شریک نہ کرتا تھا۔ ایک مجلس میں کاشی راؤ نے دعوے کیا کہ وہ ہولکر اور سندھیا سے صلح کرا سکتا ہے تو جسونت راؤ نے بگڑکر کہا کہ" اپنی زبان بند رکھو تو بہتر ہے۔ اگر خدا تم کو عورت بناتا تو ہولکر کے خاندان پر بڑی مہربانی ہوتی، تم دوسرے کے گھر بیاہ جاتے اور وہاں بچے پیدا کرتے لیکن افسوس ہے کہ تم نے مرد کی صورت ہوکر ریاست کا ستیاناس کردیا!!"

سندھیا نے کاشی راؤ کو واپس کردیا اور وہ کھنڈی راؤ کو بھی آزاد کرنے پر تیار تھا بشرطیکہ جسونت راؤ اُجین کا علاقہ لوٹنا چھوڑ دے۔ لیکن ہولکر کو اپنے دو بھائیوں کے خون کا عوض لینا تھا اس لیے صلح پر راضی نہ ہوا۔ اور یہ شرط لگائی کہ سندھیا پہلے وہ علاقہ چھوڑ دے جو اُس نے ہولکر کا دبا لیا ہے تب لڑائی بند کرنے کی بات چیت ہو سکتی ہے۔

اس پیام کا کچھ جواب نہ ملا تو جسونت راؤ نے سندھیا اور پیشوا دونوں کی ریاستیں دن دہاڑے لوٹنا شروع کیں۔ پٹھانوں کو دکن کا علاقہ تباہ کرنے کو بھیجا اور خود شمال کی طرف "چوتھ" وصول کرنے چلا۔

اُس نے نیولی - کچرودہ - اور مندسور سے "چوتھ" وصول کیا۔ کوٹہ کے حاکم ظالم سنگھ سے سات لاکھ روپیہ لیا۔ اور راجپوتانہ کی ریاستیں ٹونک تک تباہ کر ڈالیں۔ سندھیا کی فوج مقابلہ کو بڑھی تو ہولکر نے اپنا رُخ بدل دیا اور میواڑ میں "ناتھ دوارہ" کا مشہور مندر لوٹ لیا۔ پجاریوں نے ناتھ جی کی مورت اور چار پانچ لاکھ کے جواہرات دوسری جگہ منتقل کردیے لیکن جو کچھ بچا وہ جسونت راؤ نے صاف کیا اور دو سال کے اندر کئی بار اس مندر پر چڑھائی کی۔ اگر کوئی برہمن معترض ہوتا تو راجہ جواب دیتا تھا کہ" میں تو ناتھ جی سے پرشاد لیتا ہوں۔ مجھ کو کنگال بنا دیا ہے تو میری فوج

کا پیٹ ناتھ جی کو بھرنا چاہیے"۔

میواڑ کو لوٹ کر جسونت راؤ رامپورہ کی طرف گیا اور خوش قسمتی سے ہنگلیس گڈھ کے پرانے قلعہ میں اُسکو ایک دفینہ مل گیا۔ امجھرے کے راجہ نے مقابلہ کیا تو اُسکا شہر جلا دیا گیا۔ نیماڑ میں سندھیا کی جاگیر خاک سیاہ ہوئی اور کھنڈوا جو اُسوقت بھی ایک آباد شہر تھا راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ برہان پور سے بھاری تاوان وصول کر کے وہ خاندیس کی طرف بڑھا اور اپنے عزیز بھائی کی حسرتناک موت یاد کر کے جس راستہ سے گذرتا پیشوا کے علاقوں کو ویران کرتا جاتا تھا۔ اس طرح عالمگیر تباہی کا طوفان بلند کرتا ہوا اور بھائیوں کا داغ دل پر لیے ہوئے وہ پونا کے سامنے پہونچ گیا۔

اللہ اللہ!! وہی جسونت جو پانچ برس پہلے بھائی کی مجروح لاش پونا میں چھوڑ کر تباہ و خستہ حال بھاگا تھا۔ یار اغیار رکھے ۔ دنیا میں کوئی جگہ اُسکے لیے امن کی نہ تھی۔ اُسکا سر پیشوا اور سندھیا کے راضی کرنے کی بہترین تدبیر سمجھا جاتا تھا، آج اس شوکت و دبدبہ سے اُسی قتلگاہ کے سامنے نمودار ہوتا ہے کہ تیس ہزار جرار پسینے پر لہو بہانے کو تیار رہیں، سندھیا لرزہ براندام ہے اور پیشوا کو میدان میں منہ دکھانے کی ہمت نہیں پڑتی!! سچ ہے مالک کی سرکار میں دیر ہو اندھیر نہیں ہے۔ ملہر راؤ کا بیگناہ خون رائیگاں نہیں جا سکتا تھا! ایٹوجی کی کچلی ہوئی لاش اپنی بیکسی پر فریاد کر رہی تھی!!

آ! اے بہادر جسونت!! پونا کی دھول اُڑا دے!!!

بیدار ہو!! بمبئی کی تجارتی کمپنی! پیشوا کے ظلم و ستم کا خاتمہ کر دے!!!

داد خواہوں کی بھی نالش کا کوئی دن ہوگا   میرا اور آپ کا انصاف اُسی دن ہوگا

المختصر ۲۵- اکتوبر ۱۸۰۲ء کو پونا کے پاس پیشوا اور سندھیا کی متحدہ فوج سے ہولکر کا مقابلہ ہوا۔ اُس وقت ہولکر کے ساتھ ۲۵ ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادے تھے اور پیشوا کی جماعت بھی اس سے کم نہ تھی۔ جسونت راؤ صفیں درست کر کے گھوڑے سے اُتر پڑا اور ایک ٹیلے پر کھڑا ہو کر جنگ کی نگرانی کرنے لگا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب سندھیا کے توپ خانہ نے آتشباری شروع کی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی اور قریب تھا کہ ہولکر کا رسالہ پسپا ہو جائے، اُسوقت جسونت راؤ گھوڑے پر چڑھا اور اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ" آج فتح نہ پائی تو دنیا میں پھر کہیں ٹھکانا نہیں ہے جسکو مرنا ہو وہ میرے ساتھ آئے اور جسکو جان عزیز ہو وہ اپنے بیوی بچوں کے پاس بھاگ جائے"۔ یہ کہہ کر اس زور سے حملہ کیا کہ سندھیا کے رسالہ کے قدم اُکھڑ گئے۔ پیادے بھاگنے لگے۔ توپچی کٹ گئے اور بیشمار سپاہی قتل ہوئے۔ سندھیا کا کل توپ خانہ اور ذخائر جنگ کے انبار ہولکر کے ہاتھ آئے۔

اور دشمن کے بقیۃ السیف آدمی بڑی مشکل سے زندہ وسلامت جا سکے۔

ہولکر کے خون میں پونا کی وفاداری شامل تھی اور باوجود اپنے دلی صدمہ کے وہ اس متبرک شہر کو اپنے لشکریوں سے پامال کرانا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا اُس نے فوج کو شہر میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ اور جب لشکر کا ایک حصہ اُس طرف بڑھنے لگا تو اُس نے توپوں کے فیر سے اپنے خودسر ہمراہیوں کو پونا کے لوٹنے سے باز رکھا۔

کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں امیر خاں نے زیادہ نمایاں خدمت نہیں کی تھی اور جب وہ مبارکباد کے لیے حاضر ہوا تو جسونت راؤ نے جو اُس وقت اپنے زخموں پر پٹی بندھوا رہا تھا مسکرا کر کہا کہ "بھائی آج تم خوب بھاگے"۔ امیر خاں نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ "میری زندگی تھی جو بچ گیا ورنہ گھوڑے کی کلغی ایک گولہ سے اُڑ گئی تھی اور میرے خاتمہ ہونے میں کچھ دیر نہ تھی"۔ ہولکر ہنس پڑا اور بولا کہ "تمھاری خوش نصیبی میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھو گولہ نے گھوڑے کے کانوں کو زخمی نہیں کیا مگر کلغی اُڑا لے گیا"۔ امیر خاں اس جواب سے بہت شرمندہ ہوا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

پیشوا شکست کے بعد فرار ہو گیا اور پونا کا دارالحکومت ہولکر کے قبضہ میں تھا۔ لیکن اُس نے اندور کی تباہی کا عوض نہیں لیا اور پندرہ دن تک کوشش کرتا رہا کہ باجی راؤ کا بھائی امرت راؤ پونا آ جائے تو اُسکو مسند نشین کر کے دارالسلطنت اُسکے حوالہ کر دیا جائے۔ بہت سمجھانے بجھانے سے امرت راؤ پونا آیا۔ اُس نے پیشوا کا لقب تو اختیار نہیں کیا مگر اس بنیاد پر کہ باجی راؤ کا پونا سے فرار ہونا استعفا دینے کے برابر ہے سلطنت کا انتظام ہاتھ میں لے لیا۔ انگریزوں کی طرف سے ایک سفیر پونا میں رہتا تھا اُس نے یہ کارروائی پسند نہ کی اور بمبئی چلا گیا۔ پیشوا بھی گرتا پڑتا بمبئی پہنچا اور وہاں کی تجارتی کمپنی سے وہ معاہدہ کیا جو ہندوستان کی تاریخ میں "صلحنامہ بسین" کے نام سے مشہور ہے اور جسکے ذریعہ سے باجی راؤ نے چھ ہزار انگریزی فوج اپنے ملک میں رکھنے کی اجازت دے کر پونا کی خودمختاری کا خاتمہ کر دیا!! اُس نے ۲۶ لاکھ کا علاقہ اُس فوج کے صرف کے لیے انگریزوں کی نذر کیا اور یہ بھی وعدہ کر لیا کہ وہ آیندہ کسی سلطنت سے انگریزوں کی اجازت کے بغیر جنگ و صلح نہ کرے گا۔

یہ شرائط ایسے افسوسناک تھے کہ مرہٹوں کا انگریز مورخ گرانٹ ڈف بھی اس معاہدہ کو شرمناک سمجھ کر لکھتا ہے کہ "پیشوا نے اپنی حفاظت کی قیمت میں ملک کی خودمختاری کو قربان کر دیا"[۱]

---

[۱] تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۲۶۔

یہ صلحنامہ ۳۰ - دسمبر ۱۸۰۲ء کو مکمل ہوا اور سندھیا کو اس معاہدہ نے سخت قلق پہونچایا۔
اُس نے سوچا کہ ایسے ہی دو ایک عہدنامے اور ہوئے تو سب مرہٹہ سرداروں کی حکومت ختم ہو جائیگی۔ اور انگریزوں سے شکایت کی کہ اُسکے مشورہ کے بغیر "صلحنامہ پورن دھر" منسوخ کرنا نہ چاہیے تھا۔ بھونسلا اور سندھیا جنگ کی تیاری کرنے لگے اور باجی راؤ بھی درپردہ سازش میں شریک تھا[1]

ہولکر کو اس معاہدہ سے بہت رنج ہوا۔ اور اُس نے پونا کو لوٹنا اور تباہ کرنا شروع کیا جس سے وہ ابھی تک محترز رہا تھا۔ جس قدر مال فراہم ہوسکا لیکر وہ تو مالوہ واپس گیا اور انگریزوں کی فوج باجی راؤ کو مسند پر بٹھانے کے لیے پونا کی طرف بڑھی۔

۱۳- مئی ۱۸۰۳ء کو باجی راؤ انگریزی تلواروں کے سایہ میں پونا پہونچا اور امرت راؤ فرار ہوگیا۔ کچھ عرصہ تک تو اُس نے ناسک میں لوٹ مار کی - پھر انگریزوں سے صلح کرکے آٹھ لاکھ سالانہ کی پنشن قبول کرکے بنارس چلا گیا جہاں اُسکی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ باجی راؤ کو بھی یہی دن جلد دیکھنا تھا مگر فی الحال وہ پیشوا ہوگیا۔ اور سندھیا کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے لگا۔

سندھیا اپنی فوج لیے ہوئے برہان پور میں پڑا تھا اور بھونسلا اُسکی امداد کے لیے تیار ہورہا تھا اور یہ دونوں جسونت راؤ کو اپنا شریک بنانا ضروری سمجھتے تھے۔ ہولکر کا جس قدر علاقہ سندھیا کے قبضہ میں تھا واپس کردیا گیا اور مظلوم "کھنڈی راؤ" بھی جو اپنی پیدائش کے وقت سے سندھیا کا قیدی تھا آزاد کردیا گیا۔ لیکن جسونت راؤ کو اب بھی سندھیا کی نیک نیتی پر اعتبار نہ تھا اور اُسکو شبہہ تھا کہ موقع پاکر دشمن اُس سے پونا کی بربادی کا انتقام لیں گے۔

ہولکر اسوقت مہیسر میں تھا۔ دولت راؤ نے لکھا کہ وہ اپنی فوج کا کچھ حصہ دکن کی طرف بھیجدے تاکہ دونوں طرف سے انگریزوں کی کمپنی پر شہ پڑے۔ امیرخاں کا رسالہ نربدا پار بھیجا گیا۔ اور آخری کشتیوں میں خود جسونت راؤ امیرخاں کے ساتھ دریا کو عبور کرنے لگا۔ مگر اُسی وقت ان دونوں میں معلوم نہیں کیا گفتگو ہوئی کہ دوسرے ہی دن امیرخاں کا رسالہ واپس بُلا لیا گیا اور جسونت راؤ نے سندھیا کی مدد سے انکار کردیا۔

درحقیقت جسونت راؤ کو اُس طرز جنگ سے اختلاف تھا جو سندھیا اور بھونسلا انگریزوں کے

---

[1] پونا کی پیشوائی ختم ہونے کے بعد راج محل میں چند خطوط باجی راؤ کے لکھے ہوئے دستیاب ہوئے تھے۔ جو اس دعوے کو ثابت کرتے ہیں۔

خلاف عمل میں لانے والے تھے۔ وہ ملہر راؤ کی قدیم نصیحت کا قائل تھا کہ مرہٹوں کو خیمے گاڑ کر لڑائی لڑنا مناسب نہیں ہے۔ اُنکی کامیابی اُسی وقت تک ہے کہ وہ لوٹ مار کے دھاوے کرتے رہیں اور جم کر کسی جگہ نہ لڑیں۔

اُس نے سندھیا کو صلاح دی کہ وہ توپ خانہ، پیادہ فوج، اور خیمہ و خرگاہ مالوہ میں چھوڑ دے اور صرف سواروں کی مدد سے انگریزوں پر چھاپے مارے اور اُنکی کمپنی کو ویسا ہی زچ کرے جیسا کہ کسی وقت میں اُسکے آبا و اجداد نے اورنگ زیب کو زندگی سے عاجز بنا دیا تھا۔

سندھیا نے اس تجویز پر عمل نہ کیا اور لڑائی کا وہ افسوسناک انجام ہوا جو ہندوستان کی تاریخ میں "مرہٹوں کی دوسری لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تباہی کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن اس کا خاص سبب یہ تھا کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے نواب گورنر جنرل بہادر نے ایک اشتہار جاری کر دیا تھا کہ "سندھیا کے لشکر میں جس قدر انگریزی رعایا ہے وہ دشمن کا ساتھ چھوڑ کر چلی آئے تو اُسکو وہی تنخواہ ملیگی جو ریاست کے خزانہ سے دیجاتی ہے۔ اور یہ رعایت صرف انگریزی رعایا ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ یوروپ کے کُل باشندوں کو جو سندھیا کی فوج میں ملازم ہوں اس اعلان سے فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے"[۱]

سندھیا کی قواعد داں فوج میں بیشتر سردار انگلستان یا یوروپ کے دیگر ممالک کے باشندے تھے۔ لڑائی کے وقت سب نے اپنے آقا کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور مرہٹوں کی فوج بے سری ہو گئی!!

سندھیا کا بہترین علاقہ شمالی ہند میں تھا۔ اور وہاں کی فوج کا سردار اعلیٰ ایک فرانسیسی افسر پیرن نام تھا۔ اُس نے لڑائی سے پہلے ہی انگریزوں سے خفیہ نامہ و پیام[۲] شروع کر دیے تھے۔ اسکی بدنیتی یا غفلت سے علیگڈھ کا مضبوط قلعہ کمپنی کے قبضہ میں آگیا۔ اور یہ بے وفا افسر عزت کے ساتھ لکھنؤ پہونچا دیا گیا!!

آخرکار مالوہ کا علاقہ بچانے کے لیے سندھیا کو دب کر صلح کرنا پڑی۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۰۳ء کو سرجی ارجن گانوں کے پاس عہد نامہ لکھا گیا اور سندھیا کا تمام شمالی علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تصرف میں آیا۔ دہلی مرحوم کا حسرت کدہ بھی فاتح کے حصہ میں آیا اور شاہجہاں کا بدنصیب

---

[۱] گرانٹ ڈف تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۴۴

[۲] گرانٹ ڈف تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۴۹

جانشین مرہٹوں کی حفاظت سے نکل کر انگریزوں کی پناہ میں پہونچا۔ اس تباہی کے دور میں قدیم شاہنشاہی شہر دہلی کا نام قلم کو خون کے آنسو رولاتا ہے۔ تذکرہ

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

اب دولت راؤ نے کھو کر سیکھا کہ ہولکر کا مشورہ درست تھا اور انگریزوں سے لڑائی مرہٹوں کے قدیم اصول پر مناسب تھی۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور چڑیاں کھیت کو چگ چکی تھیں اُس نے جسونت راؤ سے نامہ و پیام شروع کیا۔ اور یہ بہادر اپنی قدیم عداوت فراموش کر کے سندھیا کی حمایت پر مستعد ہوا۔ اس نے سندھیا کی اجازت لیکر سندھیا سے چندہ وصول کیا اور جنگ کے لیے تیار رہا۔

لڑائی شروع کرنے سے قبل اُس نے انگریزی فوج کے سپہ سالاروں کو اپنے مطالبات لکھ کر بھیجے جن میں سے اول یہ تھا کہ ہولکر کو ہندوستان میں "چوتھ" وصول کرنے کا اختیار دیا جائے۔ دوسرا یہ تھا کہ اُسکی خاندانی جاگیر جو دوآبہ[۱] میں واقع تھی واپس کی جائے اور آخری مطالبہ یہ تھا کہ ریاست اندور کے استحکام کی ضمانت کی جائے۔ اسی کے ساتھ دھمکی بھی تھی کہ اگر اُسکے شرائط نامنظور کیے گئے تو "ہولکر کا گھر گھوڑے کی پیٹھ پر ہے اور جس طرف اُسکے سوار باگ موڑیں گے اُدھر کی دنیا تباہ ہو جائے گی"۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا آفتاب اقبال اُسوقت عروج پر تھا۔ چڑھتی دھوپ میں یہ ٹھنڈی گرمیاں کیونکر برداشت ہو سکتی تھیں۔ انگریزی فوج نے ہولکر کی ریاست پر حملہ کرنے کی رائے قائم کر لی۔

ہولکر نے سندھیا کے تجربہ سے سبق لیکر اپنی فوج کے تین انگریز افسروں کو جو اُسکی ملازمت چھوڑنے یا بغاوت کرنے پر تیار تھے۔ سنہ ۱۸۰۴ء میں قتل کر دیا۔ اور اس خبر نے کمپنی کی آتش غضب پر تیل چھڑکا!!

انگریزوں کا کرنل جے پور کی طرف بڑھا کیونکہ اُسوقت ہولکر اجمیر میں تھا۔ اور اُسکی فوج کا بڑا حصہ جے پور کی سرحد پر خیمہ زن تھا۔ ہولکر نے اپنے آبائی اصول کے مطابق حملہ کرنا مناسب

[۱] اٹاوہ وغیرہ بارہ اضلاع چنبل اور جمنا کے درمیان ٹوکوجی ہولکر کے وقت سے اندور کی ملکیت تھے گر موقعہ پاکر شجاع الدولہ نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور بعد کو نواب سعادت علی خاں وزیر اودھ نے یہ اضلاع سرکار کمپنی بہادر کے نذر کر دیے تھے۔

نہ سمجھا اور پیچھے کی طرف ہٹا۔ یہاں تک کہ چمبل کو عبور کرکے اپنی ریاست میں داخل ہوگیا۔ انگریزوں نے ٹونک اور رامپورہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن اسکے جواب میں امیرخاں نے مندیلکھنڈ میں کمپنی کی فوج کو شکست دی۔ اور چند توپیں چھین لیں۔

ہولکر برابر ہٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن موقع پاکر اُس نے کمپنی کے فوجی سردار کرنل مانسن کو بے موقع گھیر لیا۔ اب تختہ اُلٹ گیا۔ کرنل شمال کی طرف بھاگنے لگا۔ اور ہولکر نے تعاقب شروع کیا۔ مانسن بھاگتا ہوا کوٹہ تک پہونچا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ وہاں کے حاکم ظالم سنگھ نے انگریزوں کو مدد دی یا نہیں۔ انگریز لکھتے ہیں کہ راناؔ نے نہ تو فوج کو اپنے ملک میں داخل ہونے دیا اور نہ اُسکو رسد پہونچائی۔ لیکن جسونت راؤ کے پاس یہ باور کرنے کے وجوہ ہونگے کہ کوٹہ نے کرنل مانسن کی اعانت کی۔ اور اس قصور پر اُس نے ظالم سنگھ پر دس لاکھ روپیہ جرمانہ کیا۔

بہرحال انگریزی فوج بہزار خرابی دریائے چمبل کی طرف بڑھی۔ اپنے ذخائر جنگ تباہ کردیے اور توپیں راجہ بوندی کے سپرد کردیں۔ بڑی مشکل سے دس دن میں یہ فوج چمبل کو عبور کرسکی۔ بہت سے سپاہی دریا میں غرق ہوگئے۔ اور سب سے دردناک یہ ماجرا تھا کہ انگریزی سپاہیوں کے بیوی بچے جو عجلت اور سراسیمگی میں دریا کے اس پار رہ گئے تھے۔ بھیلوں کے قبضہ میں آ گئے۔ اور اُنھوں نے سخت بے رحمی سے اُن سب کو ہلاک کیا۔ سپاہی جو دریا کے پار پہونچ چکے تھے اپنی آنکھوں سے یہ تباہی دیکھتے تھے اور کچھ نہ کرسکتے تھے!!

ہولکر بھی چمبل کو عبور کرکے انگریزوں کے تعاقب میں ہندوستان پہونچا۔ کرنل نے تمام سامان چھوڑدیا اور خوشحال گڈھ میں پناہ لی جو اُسوقت راجہ جے پور کے قبضہ میں تھا۔ جسونت راؤ نے یہاں بھی پیچھا کیا تو کرنل آگرہ کی طرف بھاگا اور اُسکے باقیماندہ سپاہی بہت بے سروسامانی کے ساتھ ۳۱۔ اگست ۱۸۰۴ء کو آگرہ میں داخل ہوے۔

ہولکر کے پاس اسوقت ۶۰ ہزار سوار ۱۵ ہزار پیدل[1] اور ۱۹۲ توپیں تھیں وہ متھرا پہونچا تو انگریزوں کو یہ شہر بھی خالی کرنا پڑا[2]۔ اگر وہ اسوقت آگرہ پر حملہ کردیتا تو کمپنی کی فوجی قوت کا خاتمہ تھا۔ مگر اُسکے ہمراہیوں نے دہلی پر چڑھائی کرنے اور بادشاہ کو قبضہ میں لانے کی صلاح دی۔ اور یہ مشورہ جسونت راؤ کے حق میں زہر قاتل ہوگیا۔ مرہٹوں کو دارالسلطنت کا محاصرہ

---

[1] ڈف گرانٹ تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم صفحہ ۲۷۷

[2] ڈف گرانٹ تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم صفحہ ۲۸۱

کرنا پڑا۔ کمپنی کو طاقت سنبھالنے کا وقت مل گیا۔ ہولکر کو زچ ہو کر دلی سے فوج ہٹانا پڑی اور پھر بازی کا نقشہ بدل گیا۔ ہولکر پسپا ہوا اور انگریزوں نے تعاقب شروع کیا۔ شاملی کے مقام پر اُس نے کمپنی کے ایک فوجی دستہ کو تنگ کیا اور دوآبہ کے دیہات کو خوب لوٹا۔ لیکن ڈیگ کے قلعہ کے پاس وہ بُری طرح گھر گیا اور اُسکی ۸۷ توپیں چھن گئیں۔ فرخ آباد کے مقام پر پھر انگریزوں نے آدبایا۔ اور قبل اسکے کہ ہولکر لڑائی کے لیے تیار ہو پائے اُسکے تین ہزار سپاہی قتل ہوگئے۔ مجبوراً وہ ڈیگ کے قلعہ میں محصور ہوا اور پہلی دسمبر ۱۸۰۴ء کو جنرل لیک نے اس گڈھی کا محاصرہ شروع کیا۔ جب یہاں بھی امن نصیب نہ ہوا تو ہولکر بھرت پور کی طرف ہٹا۔ اور وہاں کے مشہور قلعہ میں پناہ لی۔

ہولکر ادھر لڑائی میں مصروف تھا اور مالوہ میں اُسکی ریاست کی حفاظت کے لیے کچھ فوج نہ تھی۔ انگریزوں نے دکن سے اپنے لشکر کو حرکت دے کر ہولکر کے تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا اور بمبئی کے ایک سالہ نے گجرات سے آکر اندور پر اپنا پھریرا اُڑا دیا۔

۲۵ جنوری ۱۸۰۵ء سے بھرت پور کا محاصرہ شروع ہوا جو چار مہینے تک قائم رہا اور قلعہ فتح نہ ہوسکا۔ انگریزی فوج کو بہت نقصان پہونچا اور اسکے ۳۲۰۳ آدمی مارے گئے۔ جن میں سے ۱۰۳ یورپین افسر تھے۔ آخر کار محاصرہ کے شدائد سے عاجز آکر راجہ بھرت پور نے صلح کے لیے نامہ وپیام شروع کیا۔ اور ہولکر کو مجبور ہوکر بھرت پور سے رخصت ہونا پڑا۔ وہ دولت راؤ سندھیا کی طرف گیا جہاں اُس کا نہایت خلوص سے استقبال کیا گیا اور انگریزوں نے باعزت صلح کرادینے کا وعدہ کیا گیا۔ مگر جسونت راؤ ابھی ہمت نہ ہارا تھا۔ وہ اپنی فوج اور توپخانہ لیکر اجمیر کے راستہ سے پنجاب کی طرف چلا تاکہ سکھوں اور افغانوں کی مدد لیکر انگریزوں سے ایکبار پھر مقابلہ کرے۔ مگر اُس کی قسمت کا ستارہ زوال پر تھا۔ سکھوں نے کچھ مدد نہ کی اور انگریزی فوج نے اُسکی واپسی کا راستہ مسدود کر دیا۔ ناچار ہولکر صلح پر راضی ہوا اور دریاے بیاس کے کنارے راجپوت گھاٹ کے قریب صلحنامہ لکھا گیا۔ جسکے رو سے اُسکی مالوہ کی کل ریاست اور دکن کے بیشتر مقبوضات واپس کیے گئے۔ اور بغیر کسی تاوان کے ادا کیے ہوے اُسکو جنوب کی طرف جانے کی اجازت دی گئی۔

جھلکی ذرا چشم جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جاے جنگ ہو کر

چند مہینوں کی لڑائی نے ہولکر کو بہت نقصان پہونچایا۔ اُسکے سپاہی قتل تو کم ہوئے لیکن بہت سے دغا دیکر فرار ہوگئے۔ یہ محض اُسکی بہادری کا دبدبہ تھا کہ کمپنی سے با عزت صلح ہوئی۔ ورنہ اُسکی فوج میں لڑنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔

بہرحال پنجاب سے واپس آکر وہ ایک مہینہ کے قریب جے پور میں مقیم رہا۔ اور وہاں کے راجہ سے آٹھ لاکھ روپیہ وصول کیا۔ جب وہ اجمیر پہونچا تو میواڑ یا مارواڑ کا راجہ مان سنگھ جسونت راؤ کے اہل و عیال لیکر حاضر ہوا۔ جو پنجاب کی طرف جاتے ہوئے اُسکے سپرد کر دیے گئے تھے۔ اس خدمت کے صلہ میں اُس نے ہولکر کی امداد راجہ جے پور کے خلاف چاہی تاکہ رانا اودے پور کی خوبصورت لڑکی سے جودھ پور کی شادی ہو جائے۔ ہاتھی ہزار لٹے تب بھی لاکھ ٹکے کا!!
جسونت راؤ کا اب بھی وہ دبدبہ تھا کہ اُس کی امداد پر راجہ جودھ پور کو اصرار تھا اور اُدھر راجہ جے پور اٹھارہ لاکھ روپیہ دینے کو تیار تھا، بشرطیکہ ہولکر اُسکی اعانت کرے!!

اتفاق سے اسی زمانہ میں ہولکر کی فوج نے بغاوت کر دی اور یہ بہانہ لیکر جسونت راؤ نے فریقین کی امداد سے انکار کر دیا۔ فوجی بغاوت کا سبب یہ تھا کہ جسونت راؤ نے اپنا خرچ گھٹانے کے لئے دکھنی سواروں کو برخاست کرنا چاہا۔ اُنھوں نے بقیہ تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ جسونت راؤ نے غلطی سے اپنے بھتیجے کھنڈی راؤ کو بطور ضامن کے انکے سپرد کر دیا۔ انھوں نے موقع پاکر کھنڈی راؤ کو جسکے نام سے امور سلطنت انجام پاتے تھے واقعی راجہ بنانے کی کوشش کی۔ لڑکا عقلمند تھا۔ اُس نے فوجی سرداروں سے کہا کہ "تم میری خرابی کی فکر میں ہو۔ چند روز میں تمھاری تنخواہ مل جائے گی اور تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے" مگر کسی نے نہ سنا۔ آخرکار وہی واقع ہوا جو اُس لڑکے کا خیال تھا۔ جے پور سے جو روپیہ وصول ہوا تھا وہ جسونت راؤ نے فوج کو تقسیم کر دیا۔ سپاہی اپنی جیبیں بھر کر گھر کو رخصت ہوئے اور ایک ہفتہ کے اندر کھنڈی راؤ کا خاتمہ ہو گیا!! بلکہ چند روز کے بعد کاشی راؤ اور اُسکی بیوی بھی قتل کر دیے گئے!!!

اس بغاوت کے دوران میں امیر خاں نے بھی اپنے حقوق یاد دلائے اور وہ قدیم تحریر پیش کی جسکے رُو سے تمام مفتوحہ علاقوں میں وہ نصف کا حصہ دار تسلیم کیا گیا تھا۔ جسونت راؤ نے اپنی شرافت سے ٹونک کی جاگیر نواب کو عنایت کی اور کوٹہ کا خراج بھی اُسی کو عطا فرمایا۔ لیکن ظاہری طور پر اپنی ملازمت سے برطرف کر دیا تاکہ امیر خاں راجہ جے پور کا نوکر ہو جائے اور اپنی تلوار کی طاقت سے رانا اودے پور کی لڑکی اُسکو دلائے!!

مہارانا کی لڑکی کشن کنور حسن و جمال میں اپنے وقت کی پدمنی تھی۔ وہ پہلے بھیم سنگھ راجہ

جودھ پور سے منسوب تھی مگر شادی سے قبل اُس کا منگیتر مرگیا۔ اور مان سنگھ وارث ہوا تو اُس نے اپنے پیشرو کی منسوبہ سے شادی کرنا چاہی۔ اُدھر جے پور کا راجہ جگت سنگھ اس خوبصورت اور نزاکت کی دیبی پر غائبانہ عاشق تھا۔ مہارانا نے جے پور کو جودھ پور پر ترجیح دی۔ مگر مان سنگھ نے لڑائی چھیڑ دی۔ سندھیا نے جودھ پور کی مدد کی۔ جے پور نے امیر خاں کی امداد حاصل کی۔ اور دونوں ریاستیں باہمی خانہ جنگی سے تباہ ہوگئیں۔ مان سنگھ کو شکست ہوئی۔ راج پاٹ چھن گیا۔ اور دھونکل سنگھ اُس کا جانشین ہوا۔ امیر خاں جے پور کا ساتھ چھوڑ کر مان سنگھ سے مل گیا اور اُسکو دوبارہ ریاست و حکومت دلائی۔ جنگ ختم کرنے کے لیے جے پور سے اس طرح صلح کرائی کہ جگت سنگھ کی شادی مان سنگھ کی لڑکی سے اور مان سنگھ کا بیاہ جگت سنگھ کی بہن سے کرا دیا۔ یہاں تک تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ مگر ستم یہ کیا کہ ان دونوں کی عزت برقرار رکھنے کے لیے رانا کی مابہ النزاع لڑکی کی جان لینا چاہی! اودیپور کا ایک رکن سلطنت ان قاتلوں کا ہمخیال ہوگیا۔ اور رانا کی بہن چاند بائی نے زہر کا پیالہ کرشن کنور کے سامنے پیش کیا، اور عاجزی سے کہا کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرکے باپ کی عزت بچائے!! اپنے چاہنے والوں کی الفت کا کشتہ کشن کنور زہر کا پیالہ نوشجاں کرگئی اور بولی کہ "یہی بیاہ میری تقدیر میں لکھا تھا" !!!

یہ حسرت انجام ڈراما اس طرح ختم ہوا تسلسل داستان کے لیے ہم نے سارا قصہ اسی جگہ درج کردیا، ورنہ اسکے آخری سین تو کئی برس کے بعد دکھائے گئے تھے!!!

غرض امیر خاں سے قطع تعلق کرکے ہولکر بہورہ پہونچا۔ اور توپیں ڈھالنے کا کارخانہ قائم کیا۔ وہ خود دن بھر کام میں مصروف رہتا اور اکثر گلا ہوا پیتل اپنے ہاتھ سے سانچوں میں ڈالتا تھا۔ چار مہینہ کے اندر پیتل کی دو سو توپیں اُس نے تیار کرلیں۔ فوجی نظام میں اصلاح کی۔ سپاہیوں کی ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ اور ہندوستان کے ہر حصہ میں اُسکے ملازم فوج کے لیے گھوڑے خرید کرنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی عظیم الشان جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔ اور قسمت ساتھ دیتی تو معلوم نہیں کہ وہ کیا کر گزرتا!! مگر شراب خواری کی افراط اور کارخانہ کی سخت محنت نے اُسکے دماغ پر اثر کیا۔ پہلے حافظہ بگڑا۔ مزاج میں غصہ بڑھا۔ پھر یہ حالت ہوئی کہ وہ اشارے پر کام چاہتا تھا اور ایک منٹ کی دیر سے بیقابو ہوجاتا تھا۔ وہ صبح ہوتے ہی فوج کی قواعد دیکھتا۔ سواروں سے پیادوں پر حملہ اور توپوں سے آتشبازی کی مشق کراتا تھا۔ روزانہ دوبار مصنوعی جنگ ہوتی تھی لیکن دماغ روز بروز بگڑتا جاتا تھا اور آثار جنوں ظاہر ہوتے جاتے تھے۔

جسونت راؤ کو اپنی کمزوری کا خود احساس تھا اور وہ اپنے دیوان بلرام سیٹھ سے اکثر کہا کرتا تھا کہ "ایک وقت جو بات میں کہتا ہوں دوسرے وقت یاد نہیں رہتی۔ میرے دماغ کا علاج ہونا چاہیے"۔ لیکن اُسکے رعب و داب سے کسی کو بولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اور جبتک مرض قابل علاج تھا کوئی دوا نہیں کی گئی!!

ایک رات محلسرا میں غل مچا۔ رانیاں اور باندیاں باہر نکل آئیں۔ دیوان بلایا گیا۔ اور معلوم ہوا کہ راجہ مجنون ہوگیا۔ اور کپڑوں کی گٹھری میں اپنا بدن چھپائے بیٹھا ہے۔ ۲۰-۳۰ آدمیوں نے مل کر بمشکل گرفتار کیا۔ اور رسیوں سے باندھکر دوسرے کمرہ میں لے گئے۔ رات پریشانی میں گزری اور صبح کو سارے شہر میں یہ افسوسناک خبر مشہور ہوگئی۔ تین دن کے بعد راجہ کو ہوش آیا تو اُس نے کہا کہ "میرے بھائی امیرخاں کو بلاؤ۔ مجھکو وہی اچھا کر سکتا ہے"۔ امیرخاں کو خبر بھیجی گئی اور وہ اپنے قدیم آقا کی خدمت میں فوراً حاضر ہوا اور ایک حکیم کو بھی ساتھ لایا۔ طبیب نے چند روز کے بعد علاج سے انکار کردیا اور کہا کہ بیمار دور غفلت کرتے ہیں۔ جو پرہیز بتایا جاتا ہے اُس پر عمل نہیں ہوتا، اور بیمار کو وہی غذا دی جاتی ہے جسکی ممانعت کی جائے۔

دولت راؤ سندھیا نے بھی ایک بید علاج کے لیے بھیجا۔ مگر جسونت راؤ نے اُسکا مضحکہ اُڑایا۔ اور اتنا ستایا کہ وہ بھاگ گیا۔

المختصر سب تدبیریں اُلٹی ہوئیں اور دوا نے کچھ کام نہ کیا۔

ازدوا کردن مرضہا می فزود　　روغن بادام خشکی می نمود

سال بھر تک جنون کا زور رہا۔ اور اسکے بعد راجہ بالکل خاموش اور لایعقل ہوگیا۔ تین برس اسی حال میں گزرے۔ آخر ۲۰۔ اکتوبر سنہ ۱۸۱۱ء کو بھورہ کے مقام پر یہ بلند ہمت راجہ اپنی زندگی کا کام ناتمام چھوڑکر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اور اُسکی آشنا تلسا بائی جو دیوانگی کے دور میں منتظم ریاست تھی پورے طور پر صاحب اختیار ہوگئی۔

جسونت راؤ کا قد میانہ، جسم نہایت مضبوط، اور رنگ سیاہ تھا۔ ایک آنکھ ضایع ہوجانے سے صورت کسی قدر بگڑ گئی تھی لیکن چہرہ پر ہر وقت خوشی نمایاں رہتی تھی۔ اُسکی گفتگو میں جوش پیدا کرنے کی تاثیر تھی۔ اور اسکے پاس بیٹھنے والا کبھی افسردہ خاطر نہ ہوتا تھا۔ وہ کافی تعلیمیافتہ تھا۔ فارسی سمجھ سکتا تھا۔ مرہٹی بے تکلف لکھتا تھا۔ سناہے کہ [illegible] خاصی مہارت تھی۔ گھوڑے کی سواری اور نیزہ بازی میں اُسکا جواب نہ تھا۔ اُس کی بہادری ضرب المثل تھا

پونا کی لڑائی میں سندھیا کے توپخانہ پر حملہ کرتے وقت زخمی ہوا - اور ایک توپچی نے اُسکو گھوڑے سے اُتارنا چاہا لیکن باوجود شدت جراحت کے توپچی سے دست و بغل ہوگیا اور کشتی لڑتا رہا - یہاں تک کہ اُسکے ہمراہی آ پہونچے - توپچی قتل کیا گیا - اور راجہ گرفتاری سے محفوظ رہا -

اُسکی زندگی کے انقلابات فسانۂ عبرت کے ورق ہیں اور انگریزی کی وہ مشہور مثل ثابت کرتے ہیں، کہ "خدا صرف اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کریں" - وہ کبھی پونا سے بے یار و مددگار بھاگتا ہے اور کبھی اجین کا دارالریاست تباہ کرتا ہے! کبھی اندور کے میدان سے فرار ہوتا ہے اور کبھی ایک لاکھ فوج لیکر ہندوستان پر چڑھائی کرتا ہے -

اُس پر غارتگری اور لوٹ مار کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن پیشوا اور سندھیا کے مظالم کوئی نہیں دیکھتا!! وہ اپنے پیشرو ملہر راؤ ہولکر کی تقلید میں مرہٹوں کی عالمگیر سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا اور اسکا کوئی ذریعہ سوائے چھاپے مارنے اور اچانک دھاوے کرنے کے نہ تھا - یہ قسمت کے کھیل ہیں کہ ملہر راؤ کو مغلوں سے سابقہ پڑا - جنکی زندگی کے دن پورے ہوچکے تھے، اور اس لیے وہ کامیاب ہوا - برخلاف اسکے جسونت راؤ کو انگریزوں سے لڑنا پڑا - جنکی قوت و شوکت کا سورج چڑھ رہا تھا - اور وہ دن قریب تھا کہ انکی مملکت میں آفتاب کا غروب ہونا ہی ممنوع ہو جائے - اس وجہ سے وہ ناکام رہا - کوشش اور ہمت دونوں نے یکساں کی - بہادری اور سپہگری کے ہنر دونوں نے یکساں دکھائے لیکن تقدیر کے فرشتہ نے مغلوں کی سلطنت تو تباہ کی مگر انگریزی راج کو ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لیے مستحکم کردیا -

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و من در کوچہا رسوا شدم

"خافی خاں"

مرزا غالب کی شاعری - انجمن اُردو لکھنؤ کے لائق معتمد جناب مرزا محمد عسکری بی اے نے مسلم اکیڈمی کی ایک محفل میں غالب کی شاعری پر جو مختصر مضمون پڑھا تھا وہ بہت پسند کیا گیا - اور علاوہ وہ ولگداز میں شایع ہونے کے بصورت رسالہ علحدہ چھپ گیا ہے - دلدادگان کلام غالب اُسکو پڑھ کر مرزا صاحب کی جدت طبع اور غالب فہمی کا لطف حاصل کریں - قیمت ۴ر

ایڈیٹر

تعلیمات بشِشٹ
و
تربیت سری رامچندرجی

اتفاقاً ایک دوست کے یہاں میری نظر سے ہندو تصوف پر ایک کتاب گذری جو جوگ بششٹ کا ترجمہ ہے، اور جہانگیر کے زمانہ میں صوفی شریف صاحب کوئی بزرگ تھے انھوں نے فارسی میں کیا ہے، اور اس کا نام اطوار و رحل اسرار رکھا ہے۔ خود فرماتے ہیں " در تحریر کلمات بششٹ و رامچندر کہ از راہ طلب عرفان بہ ظہور رسیدہ۔ از پردہ و لباس روے بیروں کشیدہ بہ زبان فارسی ترجمہ یافتہ " یہ صاحب معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت کے بڑے فاضل تھے۔ ان مضامین کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ الناظر کے ذریعہ چند احباب کی خدمت میں پیش کردوں اور اپنے ہندو دوستوں سے مخاطب ہوکر عرض کردوں کہ ایسے پاکیزہ خیال رکھنے والے لوگ کہیں کسی سے نفرت کیا کرتے ہیں؟ تمھارے بزرگوں کی جب یہ تعلیم ہے، تو پھر ہندوستان میں یہ رات دن کے جھگڑے اور نا اتفاقیاں کیوں ہیں؟ کیوں نہیں اپنے سرچشمہ کی طرف نظر کرتے اور اُس میں سے صاف پانی لیتے؟ خدا کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے سرچشمہ سے اگر پانی لوگے، تو پھر ہماری تمھاری کوئی لڑائی باقی نہ رہیگی۔

تجرید:" سجدہ مجھ سے اور تعظیم دل سے ہے۔ اور اُس ذہن کے واسطے جو ہمیشہ ایک حالت پر قرار رکھتا ہے۔ نہ آرام کو اُسکے پاس راہ ہے اور نہ بیقراری کو۔ قید زمان و مکاں سے مبرا۔ ابتدا و انتہا کے بند سے منزہ۔ سرمد۔ دائم۔ قائم۔ عین علم و معرفت ہے۔ بغیر معرفت نفس کے اُسکے پاس رسائی ممکن نہیں "

بششٹ جی کہتے ہیں کہ میرے ان کلمات کا مخاطب طالب راہ تحقیق ہے۔ جسکا قصد ہونا چاہیئے کہ قید عالم سے رہائی پاکر اور کُن فیکون کے بندوں سے خلاصی حاصل کرکے یگانگی اور بے رنگی کے عالم میں جلوہ گر نظر آئے اور ماسوائے کے بند سے آزاد رہے۔

بششٹ جی کہتے ہیں کہ جب تک عنایت بے غایت الٰہی دستگیری نہ کرے اور مدد نہ فرمائے اور ایک دانا اُستاد اس راہ میں ہاتھ نہ پکڑے کچھ نہیں مل سکتا۔ اُستادِ کامل ایک ملاح کی طرح ہے جسکی توجہِ بازو اور امداد سے اس دریائے بیکراں اور تعلقاتِ عالم فانی کے سمندر سے عبور ممکن ہے۔

بششٹ جی رام چندر جی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ عالم کے تعلقات ایک مرض صعب ہیں اور اسکی دوا سوائے اسکے اور کوئی نہیں کہ دائم اس فکر میں رہے کہ ہم کون ہیں اور عالم کیا چیز ہے۔ اور کس سے ظہور میں آیا ہے۔ اے رام چندر! جس زمین میں سایہ دار درخت نہ ہو، جہاں پانی نہ ہو، اور جس شہر میں انسان کامل نہ ہو وہاں رہنا نہ چاہیے۔ اے رام چندر۔ ہمیشہ استاد کی صحبت کا جویاں و خواہاں رہنا چاہیے۔ اگر مل جائے تو اُسکی خدمت کو نہ چھوڑ۔ اگر وہ بے توجہی کرے تو کچھ پروا مت کر۔ اگر خالی الذہن خود بخود کسی سے کچھ کہے تو اُسے اپنی ذات سے مخاطب سمجھ اے رام چندر۔ گو عارف ہر وقت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مشغول رہتا ہے لیکن اہل علم کو اُسکی صحبت کے بغیر مفر نہیں۔ عالم کے مصائب و محن سے نجات اگر ممکن ہے تو اُسی کی بناء میں ممکن ہے۔ جو کچھ وہ کہے وہی عین معرفت اور کمال علم تجرید ہے۔

اے رام چندر! راہِ سلوک گو مرشد و طالب سے وابستہ ہے لیکن طالب صادق اس راہ میں بہت بھلا کہا جاتا ہے اور استاد کے فیض سے سب سے زیادہ حصہ پاتا ہے۔ یافتِ الٰہی کا راستہ صرف طالب سے تعلق رکھتا ہے، کتب و اُستاد سے نہیں۔ اسلیے طالب صادق کو چاہیے کہ اس معنی کو خود اپنے میں تلاش کرے۔ اے رام چندر۔ جو نادان کہ خود اپنے آپ میں فکر نہ کرے اور خدا طلبی اور یافت الٰہی کو خود اپنی ذات میں نہ تلاش کرے اور اطراف و جوانب عالم میں تلاش کرتا پھرے اُسکی مثال اُس شخص کی سی ہے کہ گھر میں خزانہ موجود ہے اور باہر گدائی کرتا پھرتا ہے۔ اے رام چندر۔ آدمی میں ایک خاصیت ہے کہ جس طرف وہ متوجہ ہو اُسی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ پس دانا وہ شخص ہے کہ لایعنی فکروں کو اپنے پاس آنے نہ دے اور ہمیشہ یافتِ حق کی فکر میں لگا رہے۔

عالم کا محض وہم و خیال ہونا: ۔ اے رام چندر۔ عالم محض وہم و خیال ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ وہم و خیال کا یہ پردہ اُٹھ جائے، تو دل کو من و تو اور این و آں کے تفرقہ سے بچا۔ یہ نمودِ بے بود عالم تفرقہ باطن کے باعث ہے۔ جب پریشاں خیالی دور ہو جائے گی تو یہ تفرقہ بھی زائل

ہو جائے گا۔ اے رام چندر۔ عالم کی نابودی دل کے سکون اور صبر سے پیدا ہوتی ہے۔ جب دل حرکت کرتا ہے (یعنی اُس میں پریشانی پیدا ہوتی ہے) تو عالم پیدا ہوتا ہے اور جب ساکن ہوتا ہے تو عالم ناپید ہو جاتا ہے۔ اسکی مثال آنکھ کی سی ہے۔ اگر کھولے گا تو سب عالم نظر آنے گا اور اگر بند کر لے گا تو سب ناپید ہو جائے گا۔ پس کمال ہوشیاری کے ساتھ دل کو اس تفرقہ سے یکسوئی دسے تاکہ کرنے نہ کرنے، اس اور اُس کے تفرقہ سے نجات حاصل ہوے اور یہ بات اُسوقت پیدا ہوگی جبکہ دل سے خواہشات بالکلیہ جاتی رہیں گی۔

اے رام چندر۔ یہ عالم نابود جو بود نظر آتا ہے، سب تیرا اندیشہ ہی اندیشہ ہے۔ اس اندیشہ کی تشویش سے بچنے کی کوشش کر۔ عالم کی مثال ایک رسی کی ہے جو سانپ معلوم ہو رہی ہے۔ اس خیالی سانپ کا دفعیہ یافت دل سے ہوتا ہے۔ جب وہم دل سے دور ہو جائے گا تو اس سانپ کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔ پس خود اپنے اندر فکر اور دھیان کر اور اس وسوسہ کو دل سے نکال تاکہ تعلقات و حوادث زمانہ سے امان میں رہے۔

اے رام چندر۔ عالم کی نسبت حق کے ساتھ ایسی ہے جیسے شعاع کی آفتاب کے ساتھ۔ اور موج کی دریا کے ساتھ۔ لیکن نادان خیال کرتے ہیں کہ عالم حق سے اور حق عالم سے جدا ہے۔

اے رامچندر۔ مرنا اور جینا خواب اور بیداری کے مانند ہے۔ جب آدمی سوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ بیداری کوئی چیز نہیں، اور جب بیدار ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خواب کوئی چیز نہ تھا۔ پس دانا اُس ذات پاک پر نظر رکھ اور عالم کی بود و نابود کو نظر میں مت لا۔

آزادی:۔ اے رامچندر۔ آدمی کو چاہیے کہ ہمیشہ اس تخیل میں رہے کہ عالم عین علم ہے اور علم عین حق ہے اور یہی عین حق آزادی ہے۔ اے رامچندر۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ جو کچھ عالم کا خلاصہ ہے اُسے نصیب ہو جائے تو چاہیے کہ علائق ماسوئے سے اپنے آپ کو پاک رکھے۔ خلاصۂ عالم یہی ہے کہ بود و نابود کی قید سے آزادی حاصل ہو۔ اے رام چندر۔ جو اپنے آپ کو دیکھنے لگا اگر اس عالم میں رہے اور اہل عالم سے ملے جلے اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ اُسکی نظر میں یہ عالم مٹی کا ایک ڈھیلا یا پتھر کا ٹکڑا معلوم ہوگا۔ اُسکے نزدیک مرنا جینا برابر ہے۔ اے رام چندر۔ اگر نظر بصیرت سے دیکھو گے تو ظاہر و باطن میں ایک ایسی ہستی نظر آئے گی جو تمام عالم پر محیط ہے۔ جس کسی نے خواہشات نفس کے قید سے خلاصی پائی اور کبر و کرا اور کن و مکن سے کنارہ کر لیا یقین جان کہ اس عالم کی قید سے چھوٹ گیا۔ گو اس عالم میں وہ رہے گا مگر تعلقات عالم

اُسے مشوش نہیں کر سکیں گے۔ اے رام چندر۔ آزادی اُس وقت حاصل ہوگی جب اپنی معرفت کے لیے کوشش کرے گا۔ آزادی نہ اوپر ہے اور نہ نیچے اور بیچ میں۔ یہ خود اپنے اندر ہے۔

حالت دل :- اے رام چندر۔ دل کے تفرقہ سے سوائے قید و غلامی کے کچھ حاصل نہیں۔ اگر خلاصی چاہتا ہے تو تفرقہ کو دُور کر۔ پھر وہ وقت آجائے گا کہ دل خود معرفت دل میں لگ جائے گا۔ اے رام چندر۔ تفرقۂ دل سے مراد یہ ہے کہ نابود کو بود خیال کرے اور بود کو نابود۔ اے رام چندر۔ کیوں نہیں کوشش کرتا کہ نفس شوم کو جس سے دل میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے گرفتار کرکے قید کرے اور قتل کر ڈالے۔ اے رام چند۔ نفس عجیب شے ہے۔ جس نے اُسے فتح کر لیا وہ بڑے بڑے ملک فتح کرے گا۔

اے رامچندر۔ جس نے کہ نفس کو اس طرح مارا کہ میں نیست ہوں ہست صرف حق ہے، اُسے کوئی غم نہیں۔

رفع خواہش :- اے رام چندر۔ خواہشات نفس کو ایک جنگل سمجھو۔ جسے پھونکنے کے لیے آگ درکار ہے۔ وہ آگ فکر و دھیان ہے کہ ہم کون چیز ہیں اور کون ہیں۔ اے رام چندر۔ غیر حق سے نظر بند کر لو۔ پھر کوئی خواہش باقی نہ رہے گی۔ اے رام چندر۔ خواہش بمنزلہ ابر کے ہے جو چاند کو ڈھانک لیتا ہے اور مثل ظلمات کے ہے جو نور کو چھپا لیتا ہے اور مثل سیاہی کے ہے کہ سفیدی اس اس میں گم ہو جاتی ہے۔ اسکے شر سے بچنے کی کوشش کر۔ اگر نفس کا تزکیہ کرے گا تو ایسا پاک و صاف ہو جائے گا کہ عالم پھر اُسے گرد آلود نہ کر سکے گا۔ جس کسی نے دوئی کے غبار سے اپنے دل کو پاک و صاف کر لیا اس پر علائق و موانع عالم پر تو نہیں ڈال سکتے۔ اور حوادث اُسے ہلا نہیں سکتے۔ اے رام چندر۔ اہل سلوک کی صحبت اور کتب صوفیہ کا مطالعہ کیا کرو۔ اس سے معرفت نفس تھوڑی مدت میں حاصل ہو جائے گی ورنہ برسہا برس میں بھی حاصل نہ ہوگی۔ اے رام چندر۔ جب تجھے ہمہ اوست پر یقین آجائے گا تو پھر عالم کے ناشایستہ اور زہر قاتل تجھے آب حیات ہو جائیں گے۔ اور جب یہ حالت پیدا ہو جائے گی تو قالب عنصری جو کثیف ترین اشیاء ہے روح کی صفت حاصل کرلے گا۔

معرفت نفس :- اے رام چندر۔ تجھے چاہیے کہ ہمیشہ اس عنوان سے تصور کیا کرے کہ میں ایک دریا ہوں صاف و لطیف خاک و بے کیف۔ دانا اور اس قالب سے جدا۔ یہ قالب عنصری میرا محض لباس ظاہری ہے مگر میں قائم بہ خود ہوں۔ اے رام چندر۔ عقل و نفس۔ حواس ظاہری و باطنی بظاہر الگ الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر دیدۂ بصیرت سے دیکھے تو یہ کچھ نظر نہ آئیں گے

اور صرف وہی ایک ذات یگانہ نظر آئے گی۔ اے رام چندر۔ اگر تو اس خیال پر قرار پکڑ لے کہ مجھے جنبش و حرکت نہیں ہوتی۔ ایک جگہ پر قرار رہتا ہے۔ کسی پر اعتماد نہیں۔ کسی سے امید نہیں ہم جیسے کہ تھے اب بھی ویسے ہی ہیں۔ کوئی خواہش ہماری دامنگیر نہیں۔ ہم خود مستغنی اور بے نیاز ہیں۔ سب سے آسودہ۔ کسی ایک کے بھی محتاج نہیں۔ ہمیشہ ایک ہی قرار پر ہیں۔ ہم میں کسی تغیر و تبدل کو راہ نہیں۔ سب سے آزاد اور سب کے ساتھ۔ جیسے کہ یہ آکاش ہے۔ با ہمہ و بے ہمہ ہیں اور ہمیشہ اسی فکر میں رہے اور یہ جانے کہ ہم مست ہیں اور ہمارے غیر کا وجود نہیں۔ ہمیں ہم ہیں۔ اگر ایسا کرے گا تو مطلوب کو پہونچ جائے گا۔

معرفت حق:۔ جو ثنا اور شکر کہ ظہور میں آتا رہتا ہے سب حق سے حق پر ہے اور خود حق ہے۔ پس حامد و محمود (محمد) و حمد سب ایک ہیں اور حق ہیں۔ اور حق عین علم و معرفت ہے۔ ظہور اسکی صفت ہے بلکہ عین وہی ہے۔ وہ خود سب میں ساری بلکہ سب کا عین ہے۔ عین ہمہ واز ہمہ جدا۔ اے رام چندر۔ عالم کی صورت جو اس کثرت ظاہر میں نظر آتی ہے سب اُس کا لباس ہے۔ باطن وہ یگانہ ہے۔ باطن میں کسی طرف مشغول مت ہو اور یگانگی حق کے ساتھ جمے رہو۔ اے رام چندر۔ اس قالب کے بند کو تیغ معرفت و شناسائی حق سے کاٹ دو تاکہ ماسوٰی کے بند سے خلاصی نصیب ہو۔ اے رام چندر۔ خواب و بیداری دونوں کو درمیان سے اُٹھا دو۔ جو صورت اصلی ہے وہ دائم ہے اُسی سے متصف رہو۔ رد و قبول دونوں کا خیال ترک کر دو اور ان تکلفات کو مت راہ دو۔ اے رام چندر۔ قالب جو گوشت پوست خون و استخوان ہے تجھے اس سے کیا نسبت۔ تو عین علم و دانش ہے اور لطیف و نورانی ہے۔ پھر تجھے کیا ہو گیا کہ ایسے امر میں مشغول ہے اور وہ ذات پاک جو معدن خیر ہے اُسے ہاتھ سے چھوڑے دیتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ یہی قالب سب کچھ ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ قالب سنگ و کلوخ سے زیادہ نہیں۔

دریافت خود:۔ اے رام چندر۔ جب تو اس قالب کے تعلقات سے گزر جائے گا اور اسے نظر میں نہ لائے گا اور یہ سمجھ لے گا کہ ہمیں قالب سے کیا علاقہ اور نسبت۔ جس طرح رہے رہے۔ اور اس حالت پر تو جم جائے گا۔ اُسوقت تجھ پر ظاہر ہو جائے گا کہ جو کچھ ہے تو ہی تو ہے۔

اے رام چندر۔ جو کچھ تجھے دکھائی دے اُسے سمجھ کہ میں وہ نہیں ہوں۔ جب سب سے نفی کرے گا تو اس نفی کے بعد جو باقی رہ جائے گا وہ تو ہوگا۔ اُسوقت دیکھے گا کہ تجھی میں تیرا مطلوب ہے۔ اے رام چندر۔ جو چیز تجھے نظر آتی ہے اُس میں تین چیزیں ہیں۔ ایک تو خود ہی کہ

عالم ہے دوم معلوم ہے اور تیسری علم۔ مگر علم تجھ سے جدا نہیں ہے اور معلوم علم سے وابستہ ہے پس درحقیقت عالم و معلوم و علم ایک ہی شے ہے۔ پھر کیوں نہیں اُسی ایک چیز کو دیکھتا کہ تو اُسکا عین ہے اور وہ ایک سے زیادہ نہیں۔

درمعرفت حال خود :- اے رام چندر۔ اپنے آپ کو اس طرح تصور کر کہ میں سب سے جدا اور سب سے الگ ہوں۔ جب اپنے آپ کو اس طرح دیکھے گا کہ ہم نہ جان ہیں اور نہ قالب۔ اور سب سے الگ ہیں۔ اور اس خیال کی ورزش کریگا تو سب کچھ تو ہی ہو جائے گا۔ اے رام چندر۔ اگر تو اپنے آپ کو جان تصور کریگا اور یہ سمجھے گا کہ قالب جو مرکب جان ہے اسکے علائق میں گرفتار ہوں تو تیری مثال اُس بڑے آدمی کی سی ہوگی جو گو تجسس میں ہے مگر نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ پس جو شخص کہ حق کو نہیں دیکھتا اور اپنے آپ کو جان تصور کرتا ہے وہ کبھی نہیں جان سکتا اگر یہ جان کی نسبت تیرے درمیان سے اُٹھ جائے تو خود صاحب جان ہو جائے گا۔

درکمال معرفت :- اے رام چندر۔ جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا تجھے چاہیے کہ اسکی ورزش کرے۔ تاکہ خود تو وہ ہو جائے۔ شکر شکر کہنے سے مُنہ میٹھا نہیں ہوتا۔ گنگا جل گنگا جل کہنے سے صاف نہیں ہوتا محنت کرنے سے یہ بات حاصل ہوتی ہے۔

اے رام چندر۔ تو وہی وجود واحد ہے جو کہ تھا۔ تجھ میں دوئی کی گنجایش ہی نہیں لیکن خود تو نے اپنے آپ کو دو سمجھ رکھا ہے کہ ایک ہم ہیں اور ایک عالم ہے۔ وہاں بھلا دوئی کا کیا کام۔ اس لیے چاہیے کہ یگانگی کا تصور محکم کر اور اثنینیت کو ترک کر۔ اے رام چندر۔ اگر اپنے آپ کو "ایک" خیال کرے گا، تو تو "ایک" ہو جائے گا، اگر "بسیار" خیال کرے گا تو "بسیار" ہو جائے گا۔ جس طرح چاند کا عکس مختلف ظرفوں میں پڑتا ہے اور بظاہر کثرت نظر آتی ہے لیکن درحقیقت چاند ایک ہی ہے۔ اُس میں کثرت و تعدد نہیں۔ یہی حالت حق کی ہے۔

گر در دلِ تو گُل گذرد گُل باشی — ور بلبل بیقرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل ست اگر روزے چند — اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

حامد علی خاں

(زائد ناظم عدالت رائچور)

مختصر تاریخ جاوہ و ملحقات

(بسلسلہ الناظر ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء)

ملایو زبان میں اس مختصر تحریر میں ملایو زبان کی تاریخ پر بحث کرنا نہیں چاہتا ۔ اور نہ یہ تبلانا چاہتا ہوں کہ اسکی ایجاد کب سے ہوئی ۔ یا یہ کہ اس پر کیا کیا انقلابات آئے ۔ بلکہ صرف اسکی موجودہ حالت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔ آجکل یہ زبان تمام جزائر ملایا، ملاکا، سماترا، جاوا، اور تمام جزائر ندرلینڈ انڈیا کی لنگو فرانکا ہے ۔ انگریزی علاقہ میں یہ زبان عام ہے ۔ اور ہر ایک نووارد کے لیے اس زبان کا جاننا لازمی ہے ۔ ورنہ بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ۔ لیکن ندرلینڈ انڈیا کی گورنمنٹ نے تو ملایو کو سرکاری زبان قرار دیا ہے ۔ تمام سرکاری دفاتر ملایو میں ہیں ۔ عام کاروبار ملایو زبان میں ہوتا ہے ہر ایک سرکاری یا غیر سرکاری ملازم کے لیے ملایو زبان کا سیکھنا، لکھنا پڑھنا لازمی ہے ۔ تمام احکامات ملایو زبان میں شایع ہوتے ہیں ۔ تمام عرضیاں چھوٹی عدالتوں سے لیکر ہائیکورٹ اور گورنر جنرل تک ملایو میں ہوتی ہیں ۔ کسی عدالت یا حاکم کے سامنے ملایو کے لیے ترجمان کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی زبان ملایو ہے ۔ اور تمام ڈچ آفیسر ملایو لوگوں کی طرح ملایو زبان بول، پڑھ اور لکھ سکتے ہیں اور زیادہ تر اسی ذریعہ سے اس زبان کو روز بروز ترقی ہو رہی ہے ۔ آپ ندرلینڈ انڈیا کے کسی ایسے جزیرہ میں جائیے جہاں کے اصلی باشندے وحشی ہیں ۔ اُنکی زبان علٰحدہ ہے ۔ اور اُس جزیرہ میں ملایو لوگ بھی آباد نہیں ۔ لیکن حکام کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے انکو ملایو زبان سکھائی جاتی ہے ۔ تمام اسکولوں میں عام طور پر ملایو میں تعلیم دی جاتی ہے ۔ جو وحشی عیسائی مذہب اختیار کرتے جاتے ہیں اُنکی مہذب زبان بھی ملایو ہے ۔ الغرض اس میں شک نہیں کہ ڈچ گورنمنٹ ملایو زبان کی محسن ہے ۔ اگرچہ ابھی تک اس زبان میں موجودہ علمی کتابوں کو ترجمہ کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جس کی اشد ضرورت ہے ۔ لیکن امید رکھنی چاہیے کہ نوجوان ملایو اس ضرورت کو محسوس کرکے بہت جلد اس طرف توجہ کریں گے ۔ اور نئے علوم کی مفید کتابوں کے تراجم کرکے اس زبان میں علمی خزانہ جمع کرکے اپنے ملک اور قوم پر احسان کریں گے ۔

جزائر ندرلینڈ انڈیا میں آپ بہت مرتبہ دو یوروپین کو آپس میں ملایو زبان میں گفتگو کرتے دیکھینگے جبکہ وہ ایک دوسرے کی زبان سے آشنا ہوں ۔ یہ زبان نہایت ہی مختصر اور آسان ہے ۔ اور اسلیے

بہت جلد اور آسانی کے ساتھ سیکھی جا سکتی ہے - فارسی کی طرح ملایو میں مونث اور مذکر کا ضمائر وغیرہ میں کوئی فرق نہیں - اور تثنیہ تو عربی کی طرح کجا؟ جمع تک بھی نہیں - مفرد سے جمع کرنے کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ اُس لفظ کو مکرر کہا جائے - شلاً بُواہ میوہ کو کہتے ہیں، بواہ بواہ میووں کو کہا جاتا ہے - آورنگ آدمی کو کہا جاتا ہے، اورنگ اورنگ بہت سے آدمی ہوے - وقس علیٰ ہذا - بھائی اور بہن کے لیے ایک ہی لفظ سدارا مستعمل ہے - جب بھائی کہنا ہو تو سدارا لاکی (مرد) کہا جائے گا، اور بہن کے لیے سدارا پرمیواں (عورت) کہکر سمجھایا جائے گا - اسی طرح اولاد کے لیے اناک کا لفظ مستعمل ہے - یعنی بچہ - بیٹا کہنا ہو تو اناک لاکی (یعنی بچہ مرد) اور لڑکی کے لیے اناک پرمیواں (یعنی بچہ عورت) کہا جائے گا - وغیرہ

یہ زبان بھی اُردو کی طرح مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے - عموماً ملایو زبان میں ذیل کی مختلف زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں (۱) عربی (۲) ہندوستانی (۳) پرتگیز یا سپینش (۴) ڈچ (۵) جاوانیز (۶) سنسکرت (۷) انگریزی (۸) جاپانیز اور (۹) فارسی - یہ ترکیب کثرت الفاظ کے تطابق سے ہے - کیونکہ اس زبان میں آجکل سب سے زیادہ الفاظ عربی کے ہیں - اسکے بعد دوسرا نمبر ہندوستانی کا ہے - پھر علیٰ ہذا القیاس درجہ بدرجہ دوسری زبانیں - اور سب سے کم فارسی -

عربی کے الفاظ نصف کے قریب ہیں - جسکا سبب یہ نظر آتا ہے کہ اول تو ان ممالک میں سب سے اول عرب تاجر آئے - اور قدرتی طور پر انکی زبان کے الفاظ کثرت سے داخل ہوے - علاوہ اسکے جب پرتگیز آئے تو اسپینی زبان کے واسطہ سے بھی کچھ عربی الفاظ بعینہ اور کچھ تبدیل ہیئت کے ساتھ داخل ہوے - شلاً کرسی کا عربی لفظ بعینہ پرتگیزوں کے ذریعہ سے ملایو میں داخل ہوا - اور قمیص کا عربی لفظ کمیجا کی شکل میں اسی واسطہ سے آیا - اسی طرح ہندوستانیوں کے اختلاط سے بھی ہندوستانی الفاظ کے ساتھ ایسے عربی الفاظ مستعمل ہوے جو کہ ہندوستانی میں مروج تھے - اور چونکہ عربوں نے تجارت کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزاروں کی تعداد میں اس جگہ آکر رہنے لگے - روز بروز قدرتی طور پر عربی کے الفاظ زیادہ داخل ہوتے گئے - چونکہ ملایو میں بہت کم الفاظ تھے اس لیے اُنکو جو لفظ سب سے پہلے جس زبان سے ملا اُسے لے لیا - شلاً ہفتہ کے سات دن کا عام دستور ہے، لیکن انکے ہاں پانچ دن کا ہفتہ مروج ہے - ان پانچ دنوں کے نام یہ ہیں: (۱) لگی (Legi) (۲) پائینگ (Paing) (۳) پون (Pon) (۴) کلیون (Kliwon) اور (۵) واگہ (Wage) جب عرب آئے تو سات دن کے ہفتہ کا رواج اپنے ہمراہ لائے - یہی سبب ہے کہ آجکل دنوں کے نام

انکے ہاں بالکل عربی ہیں - صرف نہایت قلیل فرق تلفظ کا پڑگیا ہے - مثلاً عربی نام اثنین کو سینیس، ثلاثہ کو سلاسہ، اربعہ کو ریبو، خمیس کو کمیس، جمعہ کو جماہت، سبت کو سبتو اور احد کو احد یا منگو کہتے ہیں - منگو ایک ہفتہ کو بھی کہا جاتا ہے -

منگولین اقوام میں بوسہ بازی کا رواج نہیں - یا یوں کہو کہ بوسہ انکے ہاں کوئی چیز ہی نہیں - جیسے جیسے ان لوگوں کا اختلاط دوسری اقوام سے ہوتا گیا بوسہ کو سمجھنے لگے - لیکن اس سے حظ تو ابھی تک نہیں اُٹھاتے - جاپانی زبان میں بوسہ کے لیے کوئی لفظ نہیں - لیکن چونکہ اقوام خارجہ سے جاپانیوں کا تعلق سب سے پہلے ان اقوام سے ہوا جو انگریزی بولتے تھے - اسلیے اب جاپانیوں نے بوسہ کے لیے انگریزی لفظ کس (Kiss) اختیار کیا - جو اب انکے ہاں مروج ہے - اسی طرح چونکہ ان جزائر کے باشندے بھی منگولین ہیں اور بوسہ کو نہیں جانتے تھے - جب عرب اول اول آئے تو انکی آپس کی بوسہ بازی کی عادت دیکھ کر لوگ سمجھے نہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بلکہ بوسہ کو سونگھنا سمجھے اور عربی کا لفظ شم جو سونگھنے کے معنی میں آتا ہے استعمال کرنے لگے - جو آہستہ آہستہ شیوم اور چیوم ہوگیا - چنانچہ اب تک ملایو میں بوسہ اور سونگھنے کے لیے یہی لفظ مستعمل ہے اور دونوں معنوں میں کہا جاتا ہے - بلکہ عربوں کے اختلاط سے اگرچہ بزرگوں کے ہاتھ کو چومنا اب انکے ہاں مروج ہے لیکن یہ لوگ دراصل ہاتھ کو چومتے نہیں بلکہ صرف سونگھتے ہیں - لطف یہ کہ بعض یہاں کے پیداشدہ عربوں کو بھی ملایو اقوام کی تقلید میں ہاتھ سونگھنے کا مرض پڑ گیا ہے - اور ممکن ہے روز بروز زیادہ ہوتا جائے -

معلوم ہوتا ہے جاپانیز کے اختلاط سے پہلے انکے ہاں مجلس یا محفل کے لیے کوئی لفظ نہ تھا اسلیے جاپانیز لفظ "کونکسی" مروج ہوگیا - اور بعض اوقات عربی لفظ شرکت بھی استعمال کیا جاتا ہے - اسی طرح سنسکرت کے الفاظ مانوسیا (انسان) کارنا (سبب) پنڈیتھ (راہب) راگم (گانا) وغیرہ بہت ہی کم تبدیلی کے ساتھ مروج ہیں - لیکن تعجب ہے کہ زنار کے لیے کوئی ہندی یا سنسکرت لفظ استعمال نہیں کیا جاتا - بلکہ تالی پنگانگ کہا جاتا ہے - حالانکہ زنار کا رواج ہندوؤں سے ہوا - اور لازمی تھا کہ سنسکرت کا کوئی لفظ مروج ہوتا -

ان جزائر میں عام خوراک چاول ہے - اسلیے چاولوں کے لیے انکے ہاں اپنا نام موجود ہے بلکہ بنگالی اور کشمیری زبانوں کی طرح پکائے ہوئے اور کچے چاولوں کے لیے الگ الگ نام ہیں - کچے چاولوں کو براس اور پکے ہوؤں کو ناسی کہا جاتا ہے - لیکن دھان کے لیے انکے ہاں کوئی خاص نام نہ تھا - انگریزی خلط ملط کے سبب سے سب سے اول جو لفظ دھان کے لیے انھوں نے بنادہ پیڈی

تھا - چنانچہ اب دھان کے لیے پیڈی ہی مروج ہے - چونکہ روٹی یہ لوگ جانتے ہی نہ تھے نہ یہاں گیہوں ہوتا ہے - قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اول اول بعض ہندوستانی ان اطراف میں آئے جنھوں نے روٹی پکائی - اسلیے اس کا نام روٹی پڑ گیا - یا یہ کہ آئے تو عرب بھی لیکن وہ عرب جو ہندوستان سے ہو کر آئے تھے - اسلیے انھوں نے روٹی کا نام بجائے خبز کے روٹی ہی تبلایا - کیونکہ ان جزائر کو بھی ہند ہی کہا جاتا ہے - اسلیے انھوں نے ہندی ہی نام تبلایا اور وہی زبان زد ہو گیا - لیکن گنک کے لیے جب ان عربوں سے نام پوچھا گیا تو شاید انھیں اتنی ہندوستانی تو آتی نہ تھی کہ ہندی نام تبلاتے، انھوں نے چاہا کہ کسی اور بھی زبان میں انکو سمجھائیں - چونکہ یہ لوگ خلیج فارس سے ہو کر آئے تھے، انھوں نے گنک کا نام گندم تبلایا - چنانچہ گندم ہی چلا آتا ہے -

اسپینش یا پرتگیز الفاظ بھی معقول طور پر رائج ہو گئے ہیں - کھڑکی کے لیے کوئی نام نہ تھا، جندیلا (پرتگیزی) رکھ لیا گیا - اسی طرح گاڑی کے لیے کرتیا، نیلام کے لیے لیلانگ وغیرہ انھیں زبانوں کے الفاظ ہیں - ملایو میں جناب، حضور، یا صاحب کے لیے "توان" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے - اور اسی طرح بیگم یا خاتون کے لیے "تونیا" کا لفظ مروج ہے - دراصل یہ دونوں الفاظ بھی اسپینی زبان کے دون اور دونا سے مشتق ہیں - اسپینی میں دون، صاحب، جناب یا مسٹر کے معنوں میں آتا ہے - ملایو میں بھی دون شروع ہو گیا - جو گڑتے بگڑتے "توان" ہو گیا - اسی طرح دونا بیگم یا میڈم کو کہتے ہیں - ملایو میں دونا کا تونا ہو گیا - جو غیر شادی شدہ معزز عورتوں کے لیے مستعمل ہونے لگا پھر انھوں نے تخصیص کر دی اور شادی شدہ عورتوں کے لیے تونیا رواج پکڑ گیا - لیکن ابھی تک دور دراز جزائر میں تونا دونوں کے لیے مستعمل ہے -

ڈچ گورنمنٹ اپنی کئی سو سال سے حکمراں ہے - اسلئے قدرتی طور پر انکی زبان کے الفاظ کثرت سے مروج ہونے چاہیے تھے - لیکن چونکہ ملایو زبان میں کافی ذخیرہ الفاظ کا جمع ہو چکا تھا - اس لیے ہالینڈوی زبان سے زیادہ تر وہی الفاظ آئے جو اول انکے ہاں موجود نہ تھے - مثلاً چونکہ ڈچوں کے زمانہ میں ریل اور ٹریم جاری ہوئے - ٹکٹ کے لیے ڈچ لفظ کرچیس جاری ہو گیا - اسی طرح جیبی گھڑی کے لیے ڈچ لفظ ہرلوجہ جو دراصل فرانسیسی ہے مستعمل ہے - ڈچوں کے زمانہ میں یہاں دفتر جاری ہوئے - ڈچ لفظ کنتور دفتر کے لیے رواج پکڑ گیا - لیکن اب چونکہ اس طرف کے باشندے ڈچ (حاکم) کی زبان کو قدرتی طور پر فخریہ استعمال کرتے ہیں اسلیے بعض قدیمی الفاظ کو چھوڑ کر ڈچ الفاظ جگہ پکڑتے جاتے ہیں - مثلاً ممبر (رکن) کے لیے ملایو میں دراصل لفظ انگوتا مستعمل ہے لیکن آجکل لدِ (ledem) کا ڈچ لفظ کہا

جاتا ہے - جاوی زبان کے جس طرح الفاظ ملایو میں داخل ہوئے ہیں ویسے ہی ملایو کے الفاظ بھی جاوی میں جگہ پکڑ گئے - اور یہی اس اختلاط کا نتیجہ ہے جو ان اقوام کا آپس میں تھا اور ہے - میرے خیال میں ملایو میں جو غیر الفاظ داخل ہیں انکے لیے ذیل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :-

عربی	پچاس	فی صدی	۵۰
ہندوستانی	بیس	"	۲۰
سپینش پرتگیز	آٹھ	"	۸
ڈچ	چھ	"	۶
جاوی	پانچ	"	۵
سنسکرت	چار	"	۴
انگریزی	تین	"	۳
چائینز	ایک	"	۱
فارسی	ایک	"	۱
متفرق	دو	"	۲
			۱۰۰

ملایو زبان میں صرف و نحو کے بعض قواعد ہیں - لیکن نا مکمل اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے - اگر اس زبان کو نئے سانچہ میں ڈھالا جائے تو ایک اچھی اور کارآمد زبان ہو سکتی ہے - ملایو میں کئی ایک الفاظ ایسے ہیں جو ایک جملہ کا کام دیتے ہیں - مثلاً بلوم کے معنی ہیں ابھی تک نہیں - بکان، نہیں یا ایسا نہیں پرچوما، بیفائدہ - اس سے کچھ فائدہ نہیں - مفت یا نیکی برباد گناہ لازم - ملایو میں دراصل مخاطب جیسے کوئی مناسب لفظ نہیں انگکاؤ - کاؤ - کوئی یا کو کے الفاظ تو کے برابر ہیں - تم یا آپ کے لیے کوئی لفظ نہیں اسلیے عام رواج انکے ہاں مخاطب کیلیے لفظ توان استعمال کرنے کا ہے - جسکے معنی میں جناب حضور وغیرہ - ملایو میں اگر ساڑھے چار بجے کہنا ہو تو اسے ستنگا لیما یعنی نصف پانچ کہا جائیگا - اور یہ ڈچ زبان کا محاورہ ہے جو انکے ہاں مروج ہے - اسی طرح ساڑھے تین ڈھائی یا ڈیڑھ کے لیے علی الترتیب ستنگا امپت، ستنگا تیگا ستنگا دوا یعنی آدھ چار آدھ تین آدھ دو کہا جائیگا -

عربی کا اثر اس قدر عام ہو گیا ہے کہ نصرانی اور کافر بھی خدا کے لیے اللہ ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں - اللہ، استغفر اللہ وغیرہ کئی ایک الفاظ ہر ایک کی زبان پر مسلمانوں کی طرح رہتے ہیں رسم الخط یا طرز تحریر اگرچہ ملایو رسم الخط عربی ہے - لیکن دراصل انکے ہاں حروف تہجی صرف ... میں - جو اس ترتیب کے ساتھ لکھے جاتے ہیں :-

ھ - ن - چ (چ) - ر - ک + د - ت - س - و - ل + ف - جہ
(چہ) - ج - ی - ڽ (پ) + م - گ - ب - ط - غ +

ان حروف تہجی میں الف نہیں - بلکہ الف کے عوض ہ مستعمل ہیں - لیکن اب الف کا رواج ہو گیا ہے - وہ بھی صرف اُسوقت جبکہ الف کی ضرورت ابتداء میں ہو - یا بعض اوقات وسط میں بھی - لیکن آخر میں کبھی استعمال نہیں کیا جاتا - مثلاً اِڈا کو ادِ لکھا جاتا ہے اور یا ڈا کو ڈایہ جیم کے بیچ میں دو یا تین نقطے لگانے سے چا کہلاتا ہے جو فارسی چ کی آواز دیتا ہے - اسی طرح معمولی ف یا اُسپر دو یا تین نقطے لگانے سے فارسی پ کی آواز دیتا ہے اور پا کہلاتا ہے - ڈ کی آواز کے لیے دال کے نیچے ایک یا دو نقطے لگائے جاتے ہیں - اسی طرح ٹ کی آواز کے لیے ط کے نیچے ایک یا دو نقطے مستعمل ہوتے ہیں - پ یا ث کا تلفظ عجیب ہے یعنی نیا نون غنہ - اور اسکا نام بھی یہی ہے - مثلاً سلاماپ پڑھا جائیگا - سلامانیا - کاف پر ایک دو یا تین نقطے لگانے سے فارسی گاف کی آواز نکلتی ہے - اور عین کے اوپر دو یا تین نقطے لگانے سے نغا بنجاتا ہے لیکن آواز ننگ کی نکلتی ہے مثلاً اورغ پڑھا جائیگا اورنگ -

اگرچہ خ ملایو میں بالکل مروج نہیں سوائے اُن لفظوں کے جو عربی سے آئے ہیں - لیکن چونکہ ڈچ زبان میں صرف سخ خ کی آواز دیتا ہے اسلیے جس جگہ ڈچ زبان کا ایسا لفظ آئے جس میں ہجے ہو تو خ لکھا جائیگا جیسا کہ معلوم ہوا - ملایو کے حروف تہجی صرف بیس ہیں گویا دنیا کی ہر ایک زبان سے کم - اگر اس رسم الخط کی اصلاح کی جائے تو ایک آسان اور مفید رسم الخط تیار ہو سکتا ہے -

آجکل رسم الخط افرنجی کا رواج زیادہ ہو رہا ہے - کیونکہ ڈچ گورنمنٹ کے دفاتر میں عربی رسم الخط کے ساتھ ہی افرنجی رسم الخط میں بھی اعلانات شایع ہوتے ہیں - نیز ان لوگوں کے لیے جو کسی یورپین زبان سے آشنا ہوں اس رسم الخط میں آسانی ہے - اور جاپانیز نے بھی ملایو کے لیے یہی رسم الخط اختیار کیا ہے - اخبارات بھی کثرت کے ساتھ اس خط میں شایع ہوتے ہیں - اور اسکا رواج روز بروز زیادہ ہو رہا ہے - چونکہ ملایو میں ہندوستانی کی زیادہ تر باریکیاں نہیں ہیں اسلیے یہ زبان آسانی کے ساتھ رومن میں لکھی یا پڑھی جا سکتی ہے اور کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی - اسکے علاوہ باشندوں کو ایک قسم کی آسانی اس میں یہ ہے کہ اسکولوں میں ڈچ اور ملایو رسم الخط ایک ہی وقت میں آجاتا ہے اور دو دو رسم الخطوں میں دقت ضائع نہیں ہوتا -

عبدالسلام رفیقی

حضرت جوش کی تائید میں

جناب من تسلیم - ماہ فروری کے رسالہ الناظر میں محترمی جناب قاضی غلام امیر صاحب امیر بدایونی کا ایک استفسار جو حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم "مسلم جوان مرد سے خطاب" کے قوافی کے متعلق شایع ہوا ہے نظر سے گذرا - اعتراض کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے جس سے فاضل مستفسر کا نشا بخوبی واضح نہیں ہوتا - خدا جانے قافیہ مقید سے صاحب موصوف کا کیا مقصد ہے - آیا اُس قافیہ سے مراد ہے جس میں حرف قید آئے یا اُس سے جس میں روی مقید یعنی ساکن واقع ہوئی ہو - میں دیکھتا ہوں کہ ان میں نہ کوئی حرف قید ہے اور نہ روی مقید - غالباً حرکت ماقبل "را" کے اختلاف کے سبب سے یہ اشتباہ پیدا ہوا ہے - ان قوافی میں روی یعنی آخری اور اصلی حرف 'رے' ہے اور 'یا' وصل جسکے سبب سے روی متحرک ہو گئی ہے - ماہرین علم قوافی کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب روی بسبب اتصال حرف وصل متحرک ہو جائے تو اسکے یعنی روی کے ماقبل کی حرکت خواہ وہ توجیہ ہو یا اشباع بدل سکتی ہے - لہذا آذری - پیمبری - سحر سامری اقسرہ خاطری - بلا تکلف باہم قافیہ ہو سکتے ہیں - البتہ روی ساکن ہونے کی حالت میں ایسا نہیں چاہیے - اگرچہ بقول محقق علیہ الرحمہ تازی میں یہ بھی ممکن ہے - اپنے قول کی تائید میں چند مستند کتب کے حوالے ذیل میں درج کرتا ہوں تاکہ فاضل مستفسر کی کافی تشفی ہو جائے :-

۱ - میر شمس الدین فقیر علیہ الرحمہ حدائق البلاغۃ کے حدیقۂ رابعہ فی علم القوافی میں لکھتے ہیں کہ " اگر روی بسبب اتصال او با حرف وصل متحرک گردد اختلاف حرکت ماقبلش جائز است چنانچہ دریں دو بیت خاقانی ؎

چشمۂ سازِ خضر لب از لبِ جام کوثری | کز ظلمات بر جست آئینۂ سکندری
گر ز حجاز کعبہ را رخصتِ آمدن بود | در حرم خدائیگاں کعبہ کند مجاوری
بو سبکتگیں توئی دولت ایاز خدمتت | بندہ بہ وُورِ دولتت رشکِ روانِ عنصری

دو ویں بیت سعدی

نیامد درایام او بر دلے ۔ نگویم کہ خارے کہ برگِ گلے

اسی صورت سے بیان اشباع میں فرماتے ہیں کہ "اختلاف اشباع در جائے کہ روی متحرک آید جائز نست

چنانچہ درین دو بیت سعدی۔

اے بادشاہِ وقت چو وقتت فرا رسید — تو نیز با گدا اے محلت برابری
مردے گماں مبر کہ بسر پنجہ اوست کتف — با نفس اگر برانی دانم کہ شاطری"

(۲) مولانا عطاء اللہ شاگرد جامی قدس سرہٗ اپنے رسالہ قافیہ کے حرف چہارم بیانِ توجیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت اُستادی مخدومی مدظلہ العالی فرمودہ کہ توجیہ حرکت قبل روی ساکن است و نشاید کہ مختلف گردد مگر وقتیکہ روی متحرک شود بسبب حرف وصل چنانکہ انوری در قصیدہ کہ مطلعش ایں ست

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری — وز نفاقِ تیر و قصدِ ماہ و سیرِ مشتری

سامری و عنصری را قافیہ ساختہ" اور بیان اشباع میں فرماتے ہیں کہ "حرکت دخیل در قوافی کہ مشتمل نیست بر حرف وصل جائز نیست اما در قوافی کہ مشتمل اند بر حرف وصل تجویز کردہ اند"

(۳) منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر مرحوم رسالہ روضۃ القوافی صفحہ ۲۷ سطر ۹ میں لکھتے ہیں کہ "تغیر توجیہ در روی غیر موصول ناجائز مگر وقتیکہ موصول شود تغیر حرکت ماقبلش جائز" اور اسکے بعد مثال میں عرفی کے یہ اشعار دیے ہیں

با حسن و جمالِ تو پری را — دعوے نرسد برابری را
چشمِ تو بیک نگاہِ جادو — آموختہ سحر سامری را

(۴) مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی مقیاس الاشعار بیان قافیہ کے باب خامس میں اختلاف حرکت ماقبل روی کے جواز کے قائل ہیں بشرطیکہ روی موصولہ ہو۔

(۵) نصیر المحققین خواجہ نصیر الدین طوسی علیہ الرحمہ بھی معیار الاشعار کے بیان عیوب قوافی میں یہ عبارت تحریر فرماتے ہیں کہ "اختلافِ توجیہ چنانکہ در اختر و عنصر و شاعر۔ اگر را متحرک شود ایں عیب مرتفع گردد"

بنظر اختصار انھیں پر اکتفا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ محترمی بدایونی صاحب کے لیے یہ جوابات تسلی بخش ثابت ہوں گے۔

خاکسار سید محمد نقوی از حیدرآباد دکن

یہ مکتوب جیسا کہ گذشتہ پرچہ میں لکھا گیا۔ مخلوط میں مل گیا تھا اس وقت پر تلاش کرنے کے باوجود ہاتھ نہ آیا۔ اس لیے اب قدرے تاخیر سے درج کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر

آزہر لکھنوی کی تنقید پہ تبصرہ

رسالۂ الناظر بابت مارچ ۱۹۲۵ء میں لسان الہند مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کی ایک غزل کے بعض اشعار پر اعتراض کیے گئے ہیں۔ جن میں ایک بھی ایسا اعتراض نہیں جو غلط و پوچ نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے غیر وقیع اعتراضات کا جواب لکھنا انکو غیر معمولی اہمیت دینا ہے۔ تاہم جناب آزہر کی اس خواہش کو پورا کرکے کہ وہ کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں "انکی عبارت" کے جواب کی عبارت کرتا ہوں۔ یہ بھی امید ہے کہ دیگر قارئین کرام کی دلچسپی کا موجب ہو۔ جناب عزیز کا مطلع ہے:-

شب آخر ہم بھی آخر دیکھیے کبتک رہ آتے ہیں   بصارت گھٹتی جاتی ہے چراغ اب بجھتے جاتے ہیں

جناب ازہر کا پہلا اعتراض یہ ہے، کہ "شب آخر" کے بعد "ہے" اور "ہم آخر" کے بعد "ہیں" ہونا چاہیے ورنہ "آخر" اس طرح "دیکھیے" کی دُم میں لگا ہوا ہے کہ پڑھنے والا معاً "آخر دیکھیے" پڑھے گا اور گمراہ ہو جائے گا۔ جسکی اُمید ایک ہادیِ زباں سے نہیں کیجاتی۔"

اس اعتراض کا بہترین جواب تو شاید یہ تھا "شعر مرا بہ مدرسہ کہ بُرد؟" اختصار جان فصاحت ہے، محذوفات بشرطیکہ ذہن بلا کاوش اُنکی طرف منتقل ہو جائے شعر کے معانی میں وسعت اور انداز بیان میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ اور اگر سلیقہ سے برتے جائیں تو اُنکا شمار محاسن شاعری میں ہے۔ بعینہ یہی حالت جناب عزیز کے مطلع کی ہے۔ اگر روابط کو حذف نہ کیا جاتا تو شعر میں دو "ہے" اور تین "ہیں" فصاحت و روانی میں درانداز ہوتے۔ مگر شاید یہ نکات اُنکی سمجھ میں نہ آئیں جو متین انشا میں "دُم میں لگا ہوا" لکھنا جائز سمجھے۔ رسالہ کے سرورق پر جناب آزہر کے اسم گرامی کے ساتھ لفظ لکھنوی دیکھ چکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کسی لکھنو والے کے قلم سے ایسا فقرہ کیونکر نکلا، مگر خاتمہ مضمون پر جو اندراج ہے اُس سے معلوم ہوا کہ جناب آزہر لکھنوی نہیں بلکہ "از لکھنؤ" ہیں، میرے تاسف میں گونہ کمی ہوئی۔ خیر! یہ جملۂ معترضہ تھا۔ لفظ "آخر" کے بعد ہی "دیکھیے" ہونے سے کوئی بچہ مغالطہ میں پڑے تو پڑے، ورنہ الفاظ کی ترتیب صاف بتا رہی ہے "کہ "آخر" کا تعلق ہم سے ہے نہ کہ "دیکھیے" سے۔

دوسرے مصرعہ میں صنعت لف و نشر غیر مرتب فرض کرکے جناب آزہر فرماتے ہیں "بصارت

گھٹنا آثار موت نہیں، چراغوں کا بجھنا دلیلِ سحر ہے۔" بہت درست! مگر کیا اُس وقت بھی نہیں جب
کوئی پکار کے کہے: "شب آخر ہم بھی آخر الخ" کیا ایسی صورت میں بھی بصارت کا گھٹنا پیام اجل
اور چراغوں کا بجھنا عنوان سحر نہ سمجھا جائے گا؟ یہ جواب تو دیا ہے جیسا کہ اعتراض۔ اب شعر کی
معنوی خوبیوں اور الفاظ کے نادر انتخاب کی طرف توجہ کیجیے۔ شب وعدہ ایک ہجراں کشیدہ کسی کا
منتظر ہے (دیکھیے کب وہ آتے ہیں) رات آنکھوں میں کاٹی، آثار سحر نمودار ہونے لگے مگر معشوق
نہیں آیا۔ اب مایوسی طاری ہوتی ہے، بصارت جواب دینے لگتی ہے اور چراغ (صرف وہ چراغ
نہیں جو کسی کے آنے کی خوشی میں جلائے گئے تھے بلکہ "چراغِ داغ" بھی جو اضطرابِ شوق میں لَو
دے رہے تھے) گُل ہونا شروع ہوتے ہیں۔ شاعر نے اپنی قدرت کمال سے مضمون کو اس اہتمام
اور ایسی جگہ ختم کیا کہ بعد کی کیفیتیں ہر شخص بقدر ذوق اپنے ذہن سے پوری کر سکتا ہے۔ بصارت
کی کمی اور چراغوں کا بجھنا ان تمام کیفیتوں پر حاوی ہے جنکا ذکر مصرعہ اولیٰ میں ہے یعنی شدید انتظار
کے بعد مایوسی و موت۔ انتظار بے پایاں بھی زوال بصارت کا موجب ہوتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ
کا قصہ یاد کیجیے۔ مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو سوداؔ کا یہ شعر پڑھیے۔

آنکھیں برنگ نقش قدم ہوگئیں سفید　　اس سے زیادہ خاک کروں انتظارِ خط

جس طرح تدریجی زوال بصارت، مایوسی و حرمان و اجل کا پیش خیمہ ہے اسی طرح چراغوں کا بجھنا
نہ صرف صبح کا پتہ دیتا ہے بلکہ بربادیِ حسرت کی ترجمانی کرتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:۔

بُجھ رہے ہیں داغِ دل تربت میں جانے کے لیے　　روشنی کم ہو رہی ہے نیند آنے کے لیے

یہ داغہائے دل کا بجھنا کیا ہے؟ ایک عمر آرزو مند رہنے کے بعد حسرت و ناکامی و مرگ بیکسی۔
جناب ازہر دوسرے مصرعہ میں لفظ "اب" کے متعلق فرماتے ہیں کہ بیکار، اور ممکن ہے کہ غلط
اور لغو بھی ہو۔

وائے بر جان سخن گر بسخنداں نہ رسد!

میرا دعویٰ ہے کہ اگر یہ لفظ نہ ہو تو مصرعہ ثانی اثر سے دور، اور اس قدر پھیکا اور کمزور ہو جائے کہ پہلے
مصرعہ سے توازن قائم ہی نہ رہے۔ یہی لفظ "اب" اُس ہلاک کرنے والی مایوسی کی طرف اشارہ
کرتا ہے جو سخت انتظار کے بعد رونما ہو۔ جسکے شاہد یعنی بجھنے والے چراغ ہیں۔

۲۔ اُٹھیں گی وہ حیا پرور نگاہیں کیا مری جانب　　مقابل ہے ابھی آئینہ اور شرمائے جاتے ہیں

اس شعر کے خلاف جناب ازہر کا قلم کچھ لکھتے ہوئے کانپتا ہے کیونکہ عوام الناس میں بہت

مقبول ہوا! مجھے آج معلوم ہوا کہ مملکت سخن میں بھی جمہوریت پھیل گئی ورنہ شاعری عوام الناس کی دست نگر نہ تھی۔ اسکے قبول یا رد کا اختیار صرف اُنکو تھا جو خود ماہر فن ادب، سخن سنج، و سخن فہم ہوتے تھے۔ تاہم جناب "ازہر" دبی زبان سے" فرماتے ہیں کہ لفظ "کیا" "اُٹھیں گی" سے اس قدر دور ہو گیا ہے کہ جملہ کو استفہامیہ بنائے دیتا ہے۔ اور دوسرے مصرعہ میں "وہ" یا کسی ایسی لفظ کا استعمال ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اسلیے کہ پہلے مصرعہ کا فاعل نگاہیں ہیں اور دوسرے مصرعہ میں "وہ" فاعل ہے اس لیے اظہار کی قطعی ضرورت ہے۔

ایسے اعتراضوں کا جواب کیا دیا جائے۔ اکثر استفہامیہ و انکاریہ جملوں کی شکل ایک ہوتی ہے، جیسا موقع ہوتا ہے ویسے معنی لیے جاتے ہیں۔ یہ نتیجہ "کیا" کی دورافتادگی کا نہیں ہے۔ "اُٹھینگی" کے قریب ہو تو بھی یہی بات رہے گی۔ مثلاً اُٹھینگی کیا حیا پرور نگاہیں وہ مری جانب۔ بندش بھدی ہو گئی حاصل کچھ نہ ہوا۔ "وہ" نئے مصرعہ میں جو چھیڑ چھاڑ کا مزہ ہے مفقود ہو جاتا۔ جو موجودہ صورت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عاشق اپنے محبوب کے ستانے کو ایک ایسا امر اُسکو سنا سنا کے بیان کر رہا ہے جو اُسے مجبور کرے کہ عاشق کی طرف غصہ سے گھور کر دیکھے۔ اگر لفظ "وہ" شامل ہوتا تو محض ایک دلکش منظر کا دوہرا دینا رہ جاتا، یہ لطف، راز و نیاز جاتا رہتا۔

۳۔ شب غم مختصر گریہ یہ ہے اختر شماری بھی	جب آنسو ضبط کرتا ہوں ستارے ڈوب جاتے ہیں

ڈوبے جاتے ہیں بجائے ڈوب جاتے ہیں کتابت کی صریح غلطی ہے۔ مگر جناب ازہر کی اس اردو کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے "زبان اُردو تو یوں بولے گی" !!! (غالباً ہمدم میں اسکی تصیح بھی ہو چکی ہے)

اس شعر کا مطلب سمجھنے میں جناب ازہر کو ہم ترین دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے"۔ اور آخرکار یہ حکم نافذ ہوتا ہے کہ سوائے ظاہری اوصاف کے بالکل صفر ہے۔ مطلب ہی غائب ہے۔ پھر چھان بین کیجاتی ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ شعر خلاف "واقعہ" ہے کسی کے آنسوؤں کے ضبط کرنے سے ستارے نہیں ڈوب سکتے۔ چاہے کوئی شخص گھنٹوں آنکھیں بند کیے اور دل مسوسے بیٹھا رہے چمکنے والے اُسی طرح چمکا کریں گے۔ اسکے بعد جناب ازہر یوں رطب اللسان ہوتے ہیں "ہمیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عزیز صاحب لفظی مناسبت کی زنجیر میں پھنس کر ایسے پابند ہو گئے کہ معنویت کو کھو بیٹھے۔ کیا اسکے علاوہ کوئی اور بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ صرف ستاروں اور اشک کے قطروں کی مشابہت نے شعر کو مہمل کر دیا"۔

کس قدر افسوسناک ہے یہ امر کہ شعر کا مطلب سمجھے بغیر اُسپر اعتراض کیا جائے۔ شب غم

میں اختر شماری دلیل ہجر و کرب و اضطراب ہے۔ ہجر و تنہائی کا اس سے بہتر مشغلہ ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ ان چمکنے والوں میں کسی کی برق نگاہ کی جھلک ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ بھی کسی شاعر کی طرح کسی کے غم فراق میں آبدیدہ ہیں۔ نہ معلوم شاعر کے دل سے ستارے کیا کیا کہا کرتے ہیں۔ اختر شماری بجائے خود حزن و ملال کی نشانی ہے۔ مگر ایک مصیبت اور ٹوٹی۔ یہ اختر شماری گریہ پر منحصر کردی روؤ گے نہیں تو تارے بھی نہیں گننے پاؤ گے۔ ایک شغل بیکاری رہ گیا تھا وہ بھی جاتا ہے۔ مجبوراً روتے ہیں! ان آنسوؤں نے تاروں کو زیادہ چمکدار اور انکی تعداد میں بیشمار اضافہ کیا۔ پھر بھی شاعر ترقی کرتا ہے اور فطرت کے ایک لطیف مشاہدہ کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہوں اور ستاروں یا کسی روشن چیز کی طرف دیکھو تو ایک چادر نور پھیل جائے گی۔ ایک نورانی کرن آکر تمہاری آنکھوں کو بوسہ دیگی۔ الغرض ستارے یا نورانی اجسام اگر آنکھوں میں اشک بھرے ہوں تو اپنی اصلی صورت میں نظر نہیں آتے۔ بلکہ ایک سیل یا شعاع نور معلوم ہوتے ہیں اس واقعہ کو شاعر اپنے انوکھے انداز میں یوں بیان کرتا ہے

جب آنکھیں بند کرتا ہوں ستارے ڈوب جاتے ہیں

میرے لیے اتنی دیر کو ستارے ڈوب گئے۔ [illegible]ی کی چنڈی نکالنے والے نحویوں، منطقیوں سے غرض نہیں، رونے میں اختر شماری کہاں، مگر طبیعت گل کھلا رہی ہے، اُلٹی بات کہتے ہیں اور اسکو ثابت کر دیتے ہیں۔ اور اس کامیابی کے ساتھ کہ حقیقت سے دور نہیں ہوتے۔

۴۔ غبار اُٹھتا ہے بھر دیتے ہیں جوشِ بندگی اتنا زمیں گردوں کو ٹھکراتی ہے جب ہم سر جھکاتے ہیں

اس شعر پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ غبار اُٹھتا ہے کی بجائے غبار اُٹھنے لگتا ہے ہونا چاہیے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جوشِ بندگی کس چیز میں بھرا جاتا ہے؟ یہاں اُس چیز کا ذکر نہیں۔ پھر معترض صاحب فرض کرتے ہیں کہ جوش بندگی زمین میں بھرا جاتا ہے، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے بھی سر جھکانے یا سجدہ کرنے سے اس قدر غبار اُٹھتا ہے کہ وہ آسمان کو ٹھکرا دے۔ اسکی کوئی دلیل معترض صاحب نے پیش نہیں کی کہ اُٹھتا ہے سکے بجائے اُٹھنے لگتا ہے کیوں ہونا چاہیے؟ میرے نزدیک اُٹھتا ہے بہتر ہے۔ ایسی صورت میں غبار کا بلند ہونا ایک غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ استمراری صیغہ سے یہ بات کہاں پیدا ہوتی ہے۔ اب شعر کا مطلب سنیے۔ شاعر نے اپنے جوش اضطراب و عبودیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ زمین پر ہم مضطربانہ سجدے کیے ایسی حالت میں خاک ضرور بلند ہوگی۔ اور یہ ضروری نہیں کہ وہ خاک ظاہر بین نگاہوں کو دکھائی بھی دے، یا اگر دکھائی دے تو اسکا حجم اتنا

کہ اسکی ٹکر یا ٹھوکر آسمان کو ہلا دے۔ اگر آہِ مظلوم سے عرش کا ہلنا معتبر ہے تو سجدۂ اضطراب کا ایک ایک ذرۂ خاک گردوں کو ٹھکرا دے تو کیا عجب ہے۔ یہ بھی جانے دیجیے شاعر نے ایک خیالی دنیا قائم کی ہے جس میں وہ اپنے خالق کی عبادت اس سرگرمی سے کرتا ہے اور ہر سجدہ میں (زمین میں نہیں جیسا کہ معترض صاحب کو گمان ہے) اس قدر جوش و خلوص بھرتا ہے کہ ان سجدوں کے فیض سے زمین باوجود پست ہونے کے گردوں پر فخر ہی نہیں کرتی بلکہ ٹھکرا دیتی ہے۔ ٹھکرا دینے کے اصطلاحی معنی (بے حقیقت یا کم مایہ سمجھنا) بھی ذہن میں رہیں تو شعر میں لطف زیادہ آئے۔

مادہ پرست نگاہیں ان کیفیات سے لطف اندوز نہ ہوں مگر ایک شاعر کا ذوقِ وجدان عشِ عش کرتا ہے۔ معترض صاحب استادِ ریختہ میر تقی میر مرحوم کے اس شعر کے متعلق کیا فرماتے ہیں

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

۵ - تا گورِ غریباں تجھے کس نے قدم رکھا
نشانِ تربت کے سطحِ خاک سے کیوں ابھرے لگتے ہیں

نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہ شعر جناب اظہر کو بھی پسند آیا۔ مگر قابلِ افسوس ہے یہ امر کہ داد دینے سے قاصر ہیں۔ غالباً یہ ان اشعار میں سے جن کا مطلب بیان کرنے میں لطف کم ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب کسی کی شوخیِ رفتار کا مذکور ہو۔

۶ - مری ہستی ذرا دکھلا انھیں آئینِ خودداری
مجھے بھی دیکھنا ہے تجھ کو وہ کیونکر مٹاتے ہیں

جناب اظہر نے یہ فرما کر کہ عزیز صاحب نے یہ شعر بہت ہی جھنجھلا کر کہا ہے انکے خیالات کو نفور داور میں گستاخانہ و باغیانہ" قرار دیا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ دل کھول کر اس شعر کی تعریف کروں اور اسکی وہ خوبیاں دکھاؤں تاکہ وہ سب باتیں پیشِ نظر ہو جائیں جن کی طرف اشارہ ہے۔ مگر فرصت کہاں اور نتیجہ کیا۔ صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ گستاخی کا گمان اسوقت ہوتا جب شاعر اتنا کہ دیکھوں مجھے کیونکر مٹاتے ہیں۔ وہ تو ہستی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ وہ تجھ کو کیونکر مٹاتے ہیں۔ علاوہ بریں جہاں معاملہ راز و نیاز گرم ہو وہاں حفظ مراتب کہاں۔ عزیز صاحب نے تو بہت کچھ پاسِ ادب ملحوظ رکھا ہے۔ تصوف قطع نظر دو زبردست مسائل سائنس و اخلاق کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے ایک تو مسئلہ بقائے قوت (Conservation of Energy) اور دوسرا کامل ارتقائے انسان جسے منزلِ فنا فی اللہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان سب سے حیرت انگیز وہ کیفیت ہے کہ انسان کی ہستی ہر ایک کے سامنے مٹائی جائے اور وہ خاموش دیکھا کرے۔ اور ہستی بھی وہ ہستی جو محتاج نہ ہو بلکہ فطرتِ انسانی کا بہترین

نو... اور تمام آئین خود داری سے مسلح ہو!

- شدت سے دل ہے بیتاب یہ تجلی کہتی ہے ... کہ حریم ناز کا پردہ اٹھتے ہیں

اس شعر میں لفظ "بیتاب" پر جناب اثر لکھتے ہیں یہ بیکار لا دیا گیا ہے۔ محض بھرتی کی بنا پر کہنے کو ... کہے اور کون سمجھے کہ اس لفظ نے شعر کو حقیقت سے ہمدوش کر دیا ہے۔ دل کی بیتابی ہی کے سبب سے تجلی کہتی اور حریم ناز کا پردہ اٹھتا نظر آتا ہے۔ یہ سب اسی کشمکش و اضطراب دل کے کرشمے ہیں، ورنہ حریم ناز کا پردہ اٹھنا کیا معنی۔ یہ لفظ نکال دیجیے تو شعر لفظوں کا گورکھ دھندا رہ جائے۔ مگر ہمارے کرم فرما اسی لفظ کو بیکار ٹھہراتے ہیں اسکا کیا علاج!

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ لفظ "یہ" بہت بری جگہ رکھی گئی ہے۔ یہ معترض کی پسند تعقیب گزیر ہے۔ میں نے تو غالب کے ہاں دیکھا ہے۔ ع

اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

حالانکہ منشا یہ تھا کہ گھر میں ایک مختصر سا بیاباں ضرور تھا۔ اب اچھی بری جگہ کے فیصلہ کا صرف ایک طریقہ رہ گیا۔ آیا قیود نظم کا خیال رکھتے ہوئے اس سے بہتر بندش ہو سکتی ہے؟ اگر ہو سکتی ہے تو دکھاؤ۔

۸- پریشاں دل کے ذرے ہیں ذرا انکو بہم کر لیں ... دیار عشق تجھ میں ہم بھی اک کعبہ بناتے ہیں

جناب اثر فرماتے ہیں کہ خوب شعر ہے مگر دوسرے مصرعہ میں "تو" یا "تو پھر" یا کسی ایسے ہی بہتر لفظ کی نہایت ہی ضرورت ہے۔ شعر کے حسن میں داغ لگ رہا ہے۔

واہ ری دقت پسند طبیعت! بیچارے عزیز نے "ہم" کے ساتھ "بھی" لگاکر مصرعہ میں کافی زور پیدا کیا، مگر نقاد صاحب خوش نہیں۔ عزیز کی قسمت، اور کیا کہا جائے۔

۹- دل ویراں کو دیکھو آسمان حسن کے تارو ... بتاؤ کس طرح اجڑی ہوئی بستی بساتے ہیں

جناب اثر فرماتے ہیں کہ خوب نظم کیا ہے مگر معشوق کے تخاطب کے لیے جو الفاظ چنے گئے ہیں وہ کچھ ناموزوں سے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو "خوب نظم کیا" چہ معنی دارد۔

معترض کے زعم میں حسینوں کو آسمان حسن کا تارا کہنا نازک مسئلہ ہے اور قبولیت قدرے مشکل ہے مجھے تو آسمان حسن کے تاروں سے زیادہ اس عبارت کا سمجھنا مشکل ہے۔ (اثر) "حسینوں کے پکارنے میں جو علت مخفی ہو سکتی ہے وہ محض یہ کہ انھیں کی برباد کی ہوئی بستی انھیں کے آباد کرنے سے بس سکتی ہے۔ اگر اس لیے حسینوں کو پکارا جا رہا ہے تو وہ الفاظ بیکار ہیں۔ غالباً عزیز صاحب نے ادھر

عجلت میں خیال نہیں فرمایا ورنہ قلم کی معمولی رفتار میں قبولیت کی راہ کا یہ روڑا دور ہو جاتا۔
معترض صاحب کا جواب انھیں کے الفاظ ہیں۔ اگر وہ اعتراض کرنے کے اسقدر شائق نہ ہوتے بلکہ اپنا وقت عزیز شعر کے سمجھنے میں صرف کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ حسینوں سے تخاطب محض اس لیے ہے کہ دل ویران کو ایک نظر دیکھ لیں۔ اُن کا غرور اُبھارا جاتا ہے اُن کا خیال اس طور سے ہٹایا جاتا ہے تاکہ یہ شبہ بھی نہ گذرے کہ جس دل ویران کو دیکھنے اور آباد کرنے کے وسائل بتانے کی فرمائش کی ہے اُنھیں کا تاراج کیا ہوا ہے۔ شعر کے الفاظ خوبصورت، معنی لطیف، بندش چست اور انداز بیان میں ندرت ہے۔ اب اور کوئی کیا آسمان کے تارے توڑ لائے۔

۱۰- تمھاری حسرت تعمیر پہ اے خاک کے پتلو — شکستہ ہر قد اتباب مقبروں میں مسکراتے ہیں

آزہر صاحب نے اس شعر کی تعریف کرتے ہوئے جناب صفی کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ ایسا تقابل نہایت خطرناک ہے۔ میں جناب آزہر کو صلاح دوں گا کہ آیندہ احتراز کریں۔ لکھنؤ کے لیے یہ دونوں ہستیاں قابل فخر ہیں۔ اس موضوع پر اس سے زیادہ لکھنا نہیں چاہتا اور نہ ضرورت ہے۔ غرضکہ جناب آزہر کے مضمون بھر میں سب سے زیادہ پُر مغز مجھے یہ جملہ نظر آیا کہ "عزیز صاحب کا پایہ اس سے کہیں بلند ہے کہ مجھ ایسے اصغر السنے کے الفاظ اُسکی پا بوسی کر سکیں یا ذرا بھی نقصان پہونچا سکیں"
میں اعتراف کرتا ہوں کہ ان الفاظ کا اطلاق آزہر صاحب کی طرح مجھ پر بھی ہوتا ہے مگر میرے متعلق لفظ نقصان کو فائدہ سے بدلنا ہوگا۔

آثر لکھنوی

مجھے قفس سے الٰہی چھڑا دیا ہوتا — کسی چمن کی فضا میں اُڑا دیا ہوتا
حضور آپ ہوئے مجھ سے سرگراں لیکن — مرے قصور کا بھی کچھ پتا دیا ہوتا
مجھے ہے شکوہ فقط تیری نیم سوزی کا — گلہ ہی کیا تھا جو بالکل جلا دیا ہوتا
مرے سوال پہ وہ ہوگئے ہیں چیں بجبیں — مجھے ہی صبر و قرار اے خدا دیا ہوتا
دل حزیں سے نکلتیں دعائیں اے ساقی — گر ایک گھونٹ ہمیں بھی پلا دیا ہوتا
عجب نہ تھا کہ ترا دل بھی نرم ہو جاتا — جو میں نے حال دل اپنا سنا دیا ہوتا
لگا یا دل تو ہوئی قدر عافیت معلوم — کسی نے پہلے ہی یارب بتا دیا ہوتا

یقین و وہم کے جھگڑے تھے تفرقے سارے
جو تو نے ایک ہی جلوہ دکھا دیا ہوتا

میر ولی اصغر

بادِ صبا

کہتی ہے بادِ صبا - صحرا میں جب آتی ہوں میں
سبز مخمل کا بچھونا سا بچھا جاتی ہوں میں

صحن گلشن میں اگر رکھتی ہوں میں آکر قدم
کھیلتی پھولوں سے ہوں غنچوں کو بہلاتی ہوں میں

سیر کرنے کو نکلتی ہوں میں اکثر صبحدم
نوجوانانِ گلستاں کو جگا جاتی ہوں میں

چھوڑ کر خشکی کو آتی ہوں تری کی سمت جب
موج کے شانہ سے زلفِ بحر سلجھاتی ہوں میں

عطر بھر دیتی ہوں میں کلیوں میں ٹپکا کر انھیں
اپنی ان ہی دستیوں پہ آپ اتراتی ہوں میں

جنگلوں میں تند ہو کر کرتی ہوں ہل چل بپا
گلشنوں میں ناز سے چلتی ہوں اٹھلاتی ہوں میں

فصل گل میں کرتی ہوں میں جب جوانوں پر گزر
عیش کے جذبات کو سینوں میں اکساتی ہوں میں

سبزہ زاروں میں لٹاتی ہوں شبنم کے گہر
لالہ زاروں میں پہونچکر پھول برساتی ہوں میں

عاشقوں کے کنجِ عزلت میں پہونچتی ہوں اگر
آتشِ غم کو دلوں میں انکے بھڑکاتی ہوں میں

کرکے روشن شمع پروانے کو دیتی ہوں خبر
گوشِ گل تک نالۂ بلبل کو پہونچاتی ہوں میں

کرتے لاسلکی اشارے ہیں جو یہ اہلِ فرنگ
ساتھ بجلی کے پہونچکر انکو پھیلاتی ہوں میں

نیم شب میں سرد جھونکے جب گزرتے ہیں مرے
آنکھ اکثر پردہ داروں کی بھی جھپکاتی ہوں میں

میں درختوں کی رگوں میں دوڑتی ہوں بنکے خون
نو عروسانِ چمن کا رنگ جھلکاتی ہوں میں

گدگداتی ہوں حسینوں کو میں اکثر صبحدم
چپکے چپکے پاؤں معشوقوں کے سہلاتی ہوں میں

آبشاروں کو سکھاتی ہوں ترنم کوہ پر
ساتھ دیکر ان کا خود بھی ناچتی گاتی ہوں میں

مل کے فواروں کی دھاروں میں اڑاتی ہوں انھیں
چلتے چشموں کے کنارے انکو جھلکاتی ہوں میں

کرکے طے زینے پہاڑوں کے پہونچتی ہوں اگر
چوٹیوں سے برف کے تودوں کو پھسلاتی ہوں میں

کرتی ہوں شاداب میں پژمردہ پودوں کو کبھی
تشنہ لب پھولوں پہ شبنم آکے ٹپکاتی ہوں میں

آتی ہوں جب فصلِ گل میں لے کے پیغامِ بہار
دشتِ عریاں کو لباسِ سبز پہناتی ہوں میں

جب نمازِ صبح کی ہوتی ہیں آوازیں بلند
غافلانِ صبحدم کو آکے ٹھکراتی ہوں میں

بادِ طوفاں بنکے جاتی ہوں جہازوں پر اگر
ایک عبرت کا تماشا سب کو دکھلاتی ہوں میں

ریگزاروں میں دکھاتی ہوں تماشا بنکے سراب
نیستاں میں آگ کے شعلوں کو دوڑاتی ہوں میں

عاشق و معشوق کا آتا ہے جب وقتِ وداع
اشک کے قطروں کو رخساروں پہ ڈھلکاتی ہوں میں

شاخ جو کمھلا گئی ہو اُسکو کرتی ہوں نہال
آگ جو بجھلا گئی ہو اُسکو سلگاتی ہوں میں

پھول جو خود رَو اُگا کرتے ہیں دشت و کوہ میں
اُن کی خوشبوؤں سے اک عالم کو مہکاتی ہوں میں

سینچتی ہوں آبِ باراں سے ہزاروں کھیتیاں
جھومتے بادل سمندر سے اُٹھوا لاتی ہوں میں

سرد ہوتی ہوں پہاڑوں سے گزرتی ہوں اگر
نیّرِ رخشندہ کی کرنوں سے گرماتی ہوں میں

گدگدانے سے مرے ہوتے ہیں طائر نغمہ زن
چھیڑ دیتی ہوں اُنھیں خاموش اگر پاتی ہوں میں

سانس کے رستے اُتر کر جسمِ حیوانات میں
زندگی کی آگ کو ہر وقت دہکاتی ہوں میں

تسلیم۔

طنزِ محبت

کبھی جلوہ گر نہ ہوا اثر مری التجائے نیاز میں
ہیں غرور و ناز کی جھلکیاں وہی حُسنِ شعبدہ باز میں

یہی رنج ہے کہ نوا نہیں مرے دل کے پردۂ ساز میں
جو ذرا تو ڈال دے کھلبلی کسی گل کی محفلِ ناز میں

وہ ستم شعار ہے کیا غرض اسے ذکرِ حالِ تباہ سے
ہے غضب کہ اسکی نگاہ بھی نہیں ملتی اتو نگاہ سے

یہی اب تو رہتی ہے التجا مری بارگاہِ الٰہ سے
کہ وہ مضطرب ہو خدا کرے مرے شورِ نالۂ و آہ سے

کوئی کیا کہے کوئی کیا کرے وہ ہے محوِ شرم و حجاب میں
مجھے ان سے خوف ہے ہر گھڑی کہ بگڑ نہ جائے عتاب میں

مری التجا کو قبولیت ہو تو کیونکر اسکی جناب میں
ہے نزاکت اسکے مزاج میں میں ہوں اس سے سخت عذاب میں

کہوں کس زباں سے کہ بیوفا مجھے تجھسے کوئی گلا نہیں
مرے حق میں تو نے نہ کی ہو جو کوئی ایسی طرزِ جفا نہیں

نہیں رحم دل میں ترے ذرا تجھے کچھ بھی خوفِ خدا نہیں
مرے دل میں قدرِ جفا ہے پر ترے دل میں قدرِ وفا نہیں

اقدس حیدرآبادی

انعامی مضمون

حسب وعدہ دو ماہ کا مشترکہ پرچہ شائع کیا جا رہا ہے۔ مولوی سعید اللہ [illegible] کا مضمون انعامی مقابلہ میں اول قرار دیا گیا۔ تمام و کمال نذر ناظرین کیا جاتا ہے۔ صاحب مضمون کو اگر نظر ثانی کا موقع دیا جا سکتا تو جہاں کہیں جلدی میں غلطیاں رہ گئی ہیں وہ شاید رفع ہو جاتیں۔ بہرحال اگر یہ مضمون پسند کیا گیا اور پھر شائع ہوا تو نہ صرف یہ غلطیاں رفع ہو جائیں گی بلکہ اسکے ساتھ ان کی مرتب کردہ فہرست کتب جنکی امداد سے یہ مضمون لکھا گیا ہے، فہرست مضامین، اور ایک مختصر تمہید بھی انشاءاللہ اضافہ کر دی جائے گی۔ راقم مضمون ابھی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اور انکے اس مضمون سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آگے چل کر ہماری علمی و ادبی زندگی میں انکی منزلت کس قدر نمایاں ہو جائے گی۔ الناظر نے گزشتہ پندرہ سال کے اندر بحمداللہ ملک کو ایسے متعدد اہل قلم سے روشناس کرایا ہے جن کی قلمکاریوں کا سکہ آج سارے ملک میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور مجھے کمال مسرت ہے کہ الناظر کے اس انعامی مقابلے نے ایک اور جوہر قابل کو ملک کے سامنے پیش کیا۔

بقیہ مضامین میں سے مولوی سید مجیب اشرف ندوی بی اے کا مضمون، جسکو دوسرا درجہ دیا گیا، نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ "صحت زبان، حسن بیان، وسعت نظر" کے لحاظ سے ممتحنین کے ایک رکن کی رائے میں ان کا مضمون سب سے بہتر تھا۔ البتہ تنقید میں وہ اعتدال قائم نہیں رکھ سکے۔ انشاءاللہ الناظر کے آئندہ نمبروں میں وہ مضمون بھی نذر ناظرین کیا جائیگا اور ان کی مضمون نگار کی محنت پر نظر کرکے یہ طے کیا گیا ہے کہ اس مضمون کے پچاس نسخے مضمون نگار کو بطور تحفہ دیے جائیں گے

مجلس انتخاب کے جملہ ارکان نے جس طرح ان تمام مضامین کو ملاحظہ فرما کر اپنی قیمتی رائے سے مطلع فرمایا ہے وہاں میری درخواست پر عنوان مقابلہ کے متعلق اپنے خیالات بھی ظاہر فرمائے ہیں۔ انکی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ انشاءاللہ مجموعہ مضامین کے ساتھ سب صاحبوں کی رایوں کا خلاصہ اور خود اپنی حقیر رائے بھی پیش کی جائے گی۔

انعامی مضمون کتابی صورت میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ جو صاحب چاہیں دفتر الناظر سے طلب کر لیں۔ قیمت [illegible]

ظفر الملک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَدبِ اُردو کے عناصرِ اربعہ

میں

علامہ شبلی کا درجہ

تمہید | جس طرح حیاتِ انسانی مرکب ہے اربعہ عناصر سے، یعنی آب، باد، آتش، وخاک، اسی طرح ہمارے اردو لٹریچر کی ترکیب اصلی بھی چار بڑے عناصر سے ملکر ہوئی ہے یعنی آزاد، نذیر احمد، حالی، و شبلی۔ انھیں علحدہ کرلو تو اردو ایک قالب بے جان اور ایک تہی مایہ زبان رہجاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں عنصرِ اعظم کون ہے؟ اسی کا جواب دینا اس مضمون کا مقصد ہے۔ لیکن اصل میں اس سوال کی دو حیثیتیں ہیں (۱) ادبی (۲) علمی۔ ادبی حیثیت یہ کہ سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟ اور علمی حیثیت یہ کہ کس نے سب سے زیادہ اردو کی خدمت کی؟ سب سے پہلے ہم سوال کے حصہ اول کو لیتے ہیں۔

اردو انشا پردازی کے ادوار | یہ ایک بحث طلب امر ہے کہ آیا مصنف اپنے احول کا پابند

ہوتا ہے یا ماحول کو وہ اپنا پابند بنا لیتا ہے؟ تاریخ جہاں ایسے مصنفین کی فہرست پیش کرتی ہے جو اپنے گرد و پیش کے اثرات کا شکار رہے، وہاں اس کے اوراق میں ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے ماحول سے نکلکر مستقبل پر بھی بہت کچھ اثر ڈالا۔ ہمارے یہ مشاہیر اردو بھی اس قانون فطرت سے باہر نہیں۔ اس بنا پر مذکورہ بالا مصنفین کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے زمانہ کی لسانی و ادبی تغیرات کی تصویر ہے اور ہر ایک اپنا اپنا جدا رنگ رکھتا ہے۔ اگرچہ تاریخ میں بعض وقت زمانہ یا دوُر کی تقسیم ایک خود اختیاری فعل سمجھا جاتا ہے لیکن ایسا کرنا ضروری بھی ہوتا ہے۔ اس بنا پر ان مصنفین کی انشا پردازی کے چار مختلف دوُر نظر آتے ہیں۔

پہلا دوُر ادب اردو کی نشو و نما کا زمانہ وہ تھا جبکہ مغلیہ سلطنت کا چراغ سحری گل ہوچکا تھا اور حکومت انگریزی کا آفتاب افق مشرق سے طلوع ہوکر سارے ہندوستان پر چمک رہا تھا۔ اسلامی حکومت کے ساتھ اسلامی زبان و علوم بھی رخصت ہوچکے تھے لیکن چلتے چلتے اپنی بہت کچھ یادگار چھوڑ گئے۔ اردو زبان کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اس کے مصنفین پر یہ دشوار گزار فرض عاید ہوا کہ اسلاف کے اس ترکہ میں سے صرف وہی سامان لیں جو قابل قبول اور ضروری ہوں۔ انگریزی زبان کے مصنفین آج تک اس امر کے برابر کوشاں ہیں کہ اپنی زبان سے یونانی، لاطینی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے اثرات اگر یکسر مٹا نہ سکیں تو حتی الامکان انھیں کم سے کم کردیں۔ اس عہد اسلامی میں تعلیم و تعلم، درس و تدریس، شعر و شاعری سب کام فارسی یا عربی میں ہوتے تھے۔ فارسی، حکومت وقت کی زبان تھی اور عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان سمجھی جاتی تھی۔ علاوہ ان کے سنسکرت، بھاشا اور دوسری پراکرت زبانیں بھی ہندوستان میں پہلے سے موجود تھیں جب اردو نے

ان زبانوں کی جگہ لینی چاہی، تو اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا لے اور کیا نہ لے۔
پروفیسر آزاد جنھیں ان عناصر اربعہ میں اولیت کا شرف حاصل ہے، اپنے زمانہ کے
ان اثرات کا بیّن نمونہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں فارسی و عربی الفاظ کے علاوہ کثرت سے
تشبیہات و استعارے ملتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تشبیہ و استعارہ کا استعمال متقدمین
شعرائے فارسی کے ہاں بھی تھا لیکن متاخرین نے نہ تو ان میں کوئی جدت پیدا کی اور
نہ اعتدال کو ملحوظ رکھا اور انھی کی تقلید کورانہ ہمارے اردو شعرا و مصنفین نے کی جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ وہی شے جو قدما کے رخِ کلام کا خال تھا، اردو انشا پردازی کے چہرہ پر
بدنما مسّہ معلوم ہونے لگا۔ پروفیسر آزاد کی ہر بات تشبیہ و استعارہ میں ہوتی ہے اور
وہ بھی اکثر غیر مشبہ تشبیہوں اور مستعار استعاروں میں۔ ایک دوسرا اثر جو ان کی تحریر سے
نمایاں ہے، وہ ہندی اور بھاشا کا ہے۔ ہر چند کہ یہ یہاں کی اصلی زبانیں تھیں لیکن
ان سے وہی افعال و اسما لینا چاہیئے تھا جو فارسی و عربی کے ساتھ کھپ سکتے۔
انشا پرداز یا شاعر کا ایک بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ جس زبان اور طرز ادا میں
اپنے خیالات کا اظہار کرے، وہ زبان اور طرز ادا زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قایم رہنے
والی ہوں۔ سعدی اور حافظ کو آج تقریباً چھ سو برس کا عرصہ گزر گیا لیکن ان کی
زبان آج بھی ویسی ہی تر و تازہ اور با کیف معلوم ہوتی ہے، جیسی ان کے زمانہ میں
تھی۔ ان کے کلام و تحریر کا آج بھی ہر لفظ فارسی دانوں میں ویسا ہی گوش آشنا اور
متعارف ہے، جیسا چھ صدی پیشتر تھا۔ پروفیسر آزاد کی وفات کو ابھی صرف ۱۴ برس
گزرے ہیں لیکن ان کی زبان میں ایک طرح کی اجنبیت اور مغایرت کی جھلک
نظر آتی ہے اور یہ کیفیت جتنا ہی پیچھے ہٹتے جایئے اسی قدر زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے۔
ان کی تحریر کے بیسیوں الفاظ آج متروک ہو چکے ہیں، سیکڑوں تشبیہیں اور استعارے
ایسے ملیں گے جن کا آج استعمال کرنا ذوق سلیم کو غالباً پسند نہ ہوگا۔ طرز ادا میں

ایک طرح کی کہنگی اور دیرینہ پن نظر آتا ہے۔ یہ تمام باتیں بدرجہ غایت ایک تحریر میں پیش کرنا تو ناممکن ہے لیکن ان کا عام انداز بیان ظاہر کرتے کے لئے دربار اکبری سے یہ ٹکڑاہ ملاحظہ ہو۔

"غرض رات نے صبح کی کروٹ لی ستارہ نے آنکھ ماری اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جاکر بہ آواز بلند چلّایا کہ مستو! بے خبرو! کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہونچے اور دریا بھی اتر لیئے۔ اس وقت خان زماں کے کان کھڑے ہوے۔ مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے۔ مجنوں خاں قاقشال کو بھونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا۔ کچھ پرواہ نہ کی" (دربار اکبری (صفحہ ۲۳)

دوسرا دور | اردو انشاپردازی کا دوسرا دور ڈپٹی نذیر احمد سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے خالص اردو لکھنے کی کوشش کی۔ ان کا وطن اگرچہ بجنور تھا لیکن قیام زیادہ تر دلی میں رہا اس لئے انھیں ٹکسالی زبان لکھنے کا اچھا موقع حاصل تھا۔ ان کی تمامتر کوشش یہ تھی کہ ہر واقعہ اور ہر خیال عام فہم طریقہ پر اور سہل زبان میں ادا کیا جاے چنانچہ اسی لئے وہ بالکل ٹھیٹھ اور عامیانہ الفاظ و محاورے استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارے ان کے ہاں کم ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ تر دیسی لیکن اس کوشش میں وہ غالباً اس حقیقت کو نظرانداز کر گئے کہ عام بول چال اور ہوتی ہے اور تصنیفی زبان کچھ اور۔ بدقسمتی سے ادنی اور اعلی دو طبقے ہر زمانہ اور ہر ملک میں رہے ہیں اور اس بنا پر دونو طبقوں کی زبانیں بھی مختلف رہی ہیں انگریزی زبان میں لندن کو وہی درجہ حاصل ہی جو اردو میں دلی کو۔ لیکن انگلستان میں باوجود تعلیم عام ہونے کے لندن کے بازاروں میں جو زبان بولی جاتی ہی وہ علمی طبقہ کی زبان سے بالکل جداگانہ ہے۔ کوئی انگریزی زبان کا مصنف اگر لندن کی بازاری زبان لکھنے کی کوشش کرتا ہی یا بھولے سے کوئی لفظ یا محاورہ

استعمال کرلیتا ہے، تو نقادان زبان کی زد سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ ڈپٹی صاحب بھی روزمرہ اور ٹکسالی زبان لکھنے کے جوش میں ایسی زبان لکھ گئے ہیں، جو دلی کے بعض مخصوص محلوں اور کوچوں میں بولی جاتی ہے۔ روزمرہ لکھنا ہرچند کہ مقبول اور پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے لیکن وہ نہ اس قدر محدود اور ادنیٰ طبقہ کی زبان ہو کر اس سے باہر دوسرے حلقوں میں سمجھی نہ جاسکے اور اس کے سیکھنے کے لئے انھیں دور دراز مسافت طے کرکے اس مخصوص علاقہ میں آنا پڑے۔ خود ڈپٹی صاحب نے اس خامی کو محسوس کیا اور لغات مروجہ پر اکتفا نہ کرکے انہیں اپنے ترجمۂ قرآن میں اپنے مخصوص استعمال کردہ الفاظ و محاوروں کی ایک طویل جدید فرہنگ لگانی پڑی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ہر قوم میں روزانہ بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور علمی یا تصنیفی زبان اور۔ جہاں تک ڈپٹی صاحب کے افسانوں اور ناولوں کا تعلق ہے، ممکن ہے کہ ان کی زبان زیادہ ناگوار نہ ہو لیکن اس امر پر اتفاق ہونا ممکن نہیں کہ یہ زبان سنجیدہ علمی مضامین، یا مقدس مذہبی خیالات کی بھی متحمل ہوسکتی ہے۔ ڈپٹی صاحب نے بعض آیات قرآنی کے ترجمہ کرنے میں ایسے رکیک اور سخیف الفاظ استعمال کئے ہیں جنھیں سنکر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

آسان اور عام فہم زبان لکھنی اگرچہ ڈپٹی صاحب کی خصوصیت نمایاں ہے لیکن خود چونکہ عربی کے جید عالم تھے۔ زمانہ طالب علمی سے عربی زبان وادب سے خاص ذوق رکھتے تھے، عربی کے اثر نے ساتھ نہ چھوڑا۔ دلی کی زبان لکھنے بیٹھے ہیں لیکن عربی کے غیر معروف اور مشکل الفاظ بھی جا بجا لکھتے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں مفرد کی بجائے مرکب اور وہ بھی تین چار مفردات سے مرکب الفاظ استعمال کر جاتے ہیں عربی اقوال اور ضرب الامثال کی آمد بھی کچھ کم نہیں۔ قرآن کی آیات بھی گاہ گاہ آجاتی ہیں۔ یہ ہے وہ اجتماع اضداد جسے ڈپٹی صاحب باوجود کوشش کے نہ نبھا سکے اور یہ معجون مرکب

نہ تو اُن کے ادب لطیف کے لئے پورے طور پر راس آیا، اور نہ مذہبی لٹریچر ہی کے لئے۔ ان کے انداز بیان کا ہر پہلو تو یہاں پر دکھانا ممکن نہیں لیکن ان کی تحریر کا عام رنگ اس عبارت سے معلوم ہو جائے گا۔ اپنی مشہور کتاب **توبۃ النصوح** کی ابتداء وہ اس طرح کرتے ہیں:۔

"اب سے دو ایک سال پہلے دہلی میں ہیضے کا اشتداد رہا کہ ایک حکیم بقا کے کوچہ سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی تپ تجہیز لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی، حسرت نگاہ کرو وحشت و پریشانی، جن بازاروں میں آدھی آدھی رات کھوے سے کھوا چھلتا تھا ایسے اجڑے پڑے ہیں کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کٹوروں کی جھنکار نہ خوانچے سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا، اختلاط و ملاقات، آمد و شد، بیمار پرسی و عیادت، بازدید و زیارت، مہمانداری و ضیافت کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس، کتنے کو زندہ پر مردے سے بدتر، دہلی میں ہمت نہ پاؤں میں سکت، یا تو گھر اٹوانٹی کھٹوانٹی لیکر پڑ رہا یا کسی بیمار کی تیمارداری کی یا کسی عزیز آشنا کا مرنا یاد کرکے کچھ رو پیٹ لیا۔ مرگ مفاجات انہی دنوں کی موت تھی۔ نہ نشان نہ گمان، اچھے خاصے چلتے پھرتے یکایک طبیعت نے مالش کی۔ پہلی ہی کلی میں حواس خمسہ مختل ہو گئے۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہُ کوئی جزئی بچ گیا تو بچ گیا، ورنہ جی کا متلانا اور قضا سے مبرم کا آجانا۔" (توبۃ النصوح صفحہ ۱)

تیسرا دور | **مولینا حالی** کے پیش نظر ایک طرف پروفیسر آزاد کی وہ زبان تھی جو تشبیہات واستعاروں سے پُر، دوسری جانب ڈپٹی نذیر احمد کی زبان جو فارسی عربی اثرات کے ساتھ ساتھ دلّی کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات سے مملو تھی۔ مولینا حالی نے ان کی ترکیب باہمی سے ایک نئی زبان پیدا کرنی چاہی جو دونوں طرز تحریر کے حامیوں میں مقبول اور پسند ہو۔ ان کی تحریریں اس بات کا صاف پتہ دیتی ہیں کہ اس غرض کو

پورا کرنے کے لئے آزاد کے ہاں سے فارسیت اور عربیت لیگئی ہے اور نذیر احمد سے سادگی
بیان ۔ لیکن مولینا نے دونو طرز تحریر کی اصل روح لینے کی بجائے، صرف ان کی ظاہری
خصوصیات کی تقلید کی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زبان بلا کی پھیکی اور بے مزہ ہوگئی ہے
صفحے کے صفحے پڑھ جایئے، نہ جذبات میں کوئی حرکت اور نہ قلب پر کوئی اثر۔ سر سید
کی لائیف کا پہلا اڈیشن کم و بیش ایکہزار صفحوں کی کتاب ہے، شروع سے اخیر تک
پڑھ جایئے لیکن ایک ٹکڑہ عبارت کا بھی ایسا نظر نہیں آتا جس سے قلب پر رنج
وخوشی، محبت ونفرت، درس وعبرت، کا کوئی اثر طاری ہوتا ہو۔

مولینا حالی کے ادبی شباب کا وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزی حکومت کا پورے طور پہ
تسلط ہوچکا تھا۔ انگریزی علوم و ادب، تہذیب و تمدن کا ہر طرف چرچا تھا۔ انگریزی
لکھنا، بولنا ایک فخر سمجھا جاتا تھا۔ آزاد کی طرح حالی بھی اپنے اس جدید ماحول کے
اثر سے محفوظ نہ رہ سکے اور اردو میں بلا تامل انگریزی زبان کے الفاظ اور فقرے
استعمال کرنے لگے۔ انھوں نے اچھے خاصے اردو الفاظ کے ہوتے ہوئے انگریزی کے
مفردات و مرکبات استعمال کئے ہیں لیکن یہاں بھی اسی ظاہری تقلید کا خیال رکھا گیا
انگریزی زبان سے جدید خیالات یا تشبیہات و استعارات کو کسیقدر تصرف کے ساتھ
اردو میں لاتے تو وہی آج اس زبان کے رخ زیبا کے خط و خال بنتے یا بضرورت ایسے
انگریزی الفاظ لیے جاتے جن کے ہم معنی الفاظ اردو میں نہ ہوتے تو آج اردو کے ذخیرۂ الفاظ
میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ظاہری تقلید نے مولینا کی زبان کو بے نہایت
پھیکی، غیر دلچسپ اور بے اثر بنادیا ہے ذیل کی عبارت ان کے عام انداز بیان کا ایک نمونہ ہے

"سر سید اگر گھر کے انتظام اور فونٹین کلرک کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو
وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو انھوں نے گزشتہ چالیس پچاس برس میں
سرانجام کیں، وہ کون کرتا ہے۔ انھوں نے ایسے کاموں کے لئے جو ہندوستان میں

اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کی ان کو بالکل عادت نہ تھی؛ دس بارہ لاکھ سے کم وصول نہ کیا ہوگا۔ اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسے میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اگر وہ اپنے گھر کو مہمان سرا نہ بناتے تو علی گڑھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا تھا۔ اگر وہ ہزار ہا روپے اپنے پاس سے صرف کرکے اطراف ہندوستان میں چندہ کے لئے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ذمے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے کیونکر اپنا وقار قایم رکھ سکتے تھے۔ اگر وہ یورپین طبقہ پر ہائی لائیف نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر متوجہ کر سکتے تھے۔" (حیات جاوید، صفحہ ۴۱۲)

چوتھا دور

علامہ شبلی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔ انھوں نے آزاد کی "شاعرانہ اردو"، نذیر احمد کی "سوقیانہ اردو" اور حالی کی "پھیکی اردو" دیکھی۔ خود ایک دوربیں نظر اور نقد پسند طبیعت رکھتے تھے۔ معاملہ کی اصل تہ کو پہونچے۔ انھوں نے سوچا کہ آزاد کے تشبیہات و استعارات کی آورد اردو کی قوت برداشت سے باہر ہے نذیر احمد کا عامیانہ طرز بیان اور سوقیت زبان اردوے معلّٰی کی شان سے پست تر ہے حالی کی بے نمکی اور پھیکا پن انشاپردازی کے حق میں سم قاتل ہے۔ زمانہ کا بھی رنگ دیکھا کہ اب نہ وہ پہلی سی اسلامی حکومت ہو کہ فارسی و عربی کا اثر باقی رہ سکے اور نہ ہندوستان کا ہر شہر دہلی و لکھنؤ ہو، جہاں کی ٹکسالی زبان تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور نہ انگریزی راج کے ساتھ انگریزی کا یہ اثر دیرپا ہے کہ انگریزی زبان کا ہر لفظ اور فقرہ قابل قبول ہو سکے، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ "برادران وطن" ناگری رسم خط کے ساتھ ہندی کی ترویج میں کوشاں ہیں۔ ان تمام زمانی و مکانی دشواریوں کا لحاظ کرکے علامہ شبلی نے وہ طرز ادا اور

زبان اختیار کی جسمیں بہ یک وقت آزاد کی شوخی تحریر، نذیر احمد کی روزمرہ اور حالی کی سادگی ادا بھی موجود ہو، مگر ہر ایک اعتدال کے ساتھ نہ اس قدر تشبیہات و استعارے کی بھرمار کہ زبان صرف شاعری کے کام کی ہو جاے، نہ اسقدر سوقیت اور عامیانہ پن کہ سنجیدہ اور علمی و مذہبی مضامین کو اس کا جامہ پہننے سے عار آے اور نہ ایسی پھیکی اور بے مزہ کہ سامع پر کوئی اثر یا جذبہ پیدا نہ ہو۔ بلکہ اس زبان کو لیجئے اور اُسے خواہ شاعری سے نازک اور لطیف مضامین کے لئے استعمال کیجیے، خواہ علمی، مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کو اسکے ذریعہ ادا کیجیے یا اسے ادب لطیف میں برتئے۔ ہر صنف ادب اور ہر طرز ادا میں قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ یکساں طور پر استعمال ہوسکتی ہے۔ ایم۔ مہدی حسن ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوے خاصہ" کی داد ملتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اُٹھتی تھیں، آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانیوں پر آئی ہوئی نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی، مدتوں شعرا سے گاڑھا چھنتا رہا۔ بہ اقتضاے سن بری طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے، اور بہتیرے بنائے بگاڑے کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا لیکن یہ باتوں ہی میں سب کو ٹالتی رہی۔ بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی۔ آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول نویس تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اسکی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا، کبھی کبھی دبی زبان سے اسے یہ کہتے سنا، 'اری اٹھ جاؤں گی میں صحنک'۔ لیکن دفعتہً اسکی حالت نے پلٹا کھایا، کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہو گئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علمار کی کنیزوں میں داخل ہو لیکن سنا گیا ہو خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہو اور قریب قریب انھی کے تصرف میں رہتی ہے" (افادات مہدی صفحہ ۲۰۳ و ۲۰۴)

الفاظ کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ مثلاً کتے کو جب اس کا مالک پیار کرتا ہے تو وہ محبت سے دُم ہلانے لگتا ہے ۔ یا بلی جب بھوکی ہوتی ہے تو مسکینت بھری آواز سے " میاؤں میاؤں " کرنے لگتی ہے لیکن انسان جذبۂ محبت یا خواہشِ گرسنگی کے اظہار کے لئے موضوع کلمات زبان سے نکالتا ہے ۔ چنانچہ اسی وصف کو جو حیوان و انسان کے درمیان ما بہ الامتیاز ہے ، عربی میں " نطق " کہتے ہیں ۔ اسی بنا پر انسان کو " حیوان ناطق " کہا جاتا ہے ۔ لیکن اگر نطق ہی کا نام انشا پردازی ہے تو یوں بولنے کو جاہل و عالم ، دیہاتی و شہری سب بولتے ہیں مگر ہر ایک محض انشا پرداز نہیں سمجھا جاتا ہے ۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک دریا طغیانی پر ہے ، ایک دیہاتی اسکو پار کرکے اپنے گاؤں کو جاتا ہے گھر پہنچکر وہ اپنے بیوی بچوں میں راستہ کی سرگذشت کا جس معمولی طریقہ پر ذکر کرے گا اُسے انشا پردازی نہیں کہا جا سکتا ۔ لیکن اسی واقعہ کو جب کوئی بڑا انشا پرداز بیان کرے گا تو وہ پانی کے تلاطم ، کشتیوں کے تھپیڑے کھانے ، کھڑی فصلوں کے تہِ آب ہونے اور جل تھل سب ایک ہو جانے کو جس موثر طریقہ پر بیان کرے گا ، اس سے سننے والے یا پڑھنے والے پر خوف و رنج اور حیرت و استعجاب کا ایک اثر طاری ہو جائیگا ۔ دور کیوں جائیے ، اصل لفظ کے معنی پر غور کیجیے ۔ " نَشَا " کے لغوی معنی اُبھرنے ابھارنے ، یا بُلندی و ترفع ، کے ہیں ، چنانچہ " اِنشا " کے لغوی معنی میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے اور مجازی معنی " شعر کہنے یا خطبہ دینے " کے ہیں اور وہ اسی بنا پر کہ شاعر یا خطیب ایک تو خود مشتعل جذبات سے پُر ہوتا ہے ، دوسرے وہ اپنے کلام یا بیان کے زور سے اَوروں کے جذبات ابھارنا چاہتا ہے ۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ جذبات انگیز نثر نگاری کے لئے بولا جانے لگا ۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بڑا " منشی " ہے یعنی اعلیٰ درجہ کا لکھنے والا ہے (گو اب یہ لفظ گر کر عرفِ عام میں محرر یا کلرک کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے ۔)

خطابت، شاعری، و انشا پردازی کا فرق | مذکورہ بالا تشریح کے مطابق جب انشا پردازی کی غرض اصلی اثر ریزی اور جذبہ انگیزی ٹھیری تو پھر خطابت، شاعری اور انشا پردازی میں فرق ہی کیا رہا؟ (یہاں پر فنون لطیفہ کی صرف ان اصناف سے بحث ہے، جو الفاظ کی شکل میں بذریعہ تقریر یا تحریر ظاہر ہوتی ہیں۔ اس بنا پر مصوری، صنعتگری، ونقاشی وغیرہ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں)۔ خطابت میں زیادہ تر فوری جوش و اثر کا پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، کوئی اتفاقی واقعہ پیش آیا اور اس کے لئے سامعین کے جذبات کو تھوڑی دیر کیلئے مشتعل کر دیا گیا لیکن جیسا ہنگامی اس جوش وخروش کا چڑھاؤ ہوتا ہے، ویسا ہی فوری اسکا اتار بھی۔ مدوجزر کی طرح ان جذبات کو کوئی قیام نہیں ہوتا۔ اس وقتی اثر ریزی کے لئے خطیب کو قریبی گرد و پیش کی اشیا سے ہی کام لینا پڑتا ہے، تشبیہ و استعارہ یا مثل وحکایت کے لئے اسے بعید از قیاس یا دیر فہم چیزوں سے کام لینا مناسب نہیں، کیونکہ سامعین کے جذب توجہ یا غور و فکر میں ذراسی تاخیر بھی خطیب کی تمام محنت کو رائگاں کر دیگی۔ مثلاً ایک مقرر اپنے مخاطبین کو قتل وخونریزی کی یاد دلانا چاہتا ہے تو وہ بجاے اس کے کہ میدان کربلا کا نقشہ کھینچے یا کسی خونریز جنگ کے واقعات بیان کرے، اس کا صرف یہ کہدینا کافی ہوگا "مجھے تم میں سے کتنوں کے سر تن سے جدا نظر آتے ہیں؟ کتنوں کی لاشیں زمین پر تڑپتی دکھائی دے رہی ہیں!" یا مثلاً وہ سامعین کو صلح جوئی اور امن پسندی کی تلقین کرنی چاہتا ہے تو بجاے اس کے کہ وہ فلسفۂ امن وصلح بیان کرے، وہ ہاتھ سے اشارے کر کر کے یہ کہتا ہے کہ "تم جس غرض سے آج اس چھت کے نیچے جمع ہوئے ہو، کیا سمجھتے ہو کہ اس چپہ زمین سے ایک ائی برابر امن بھی اپنے دامن میں (دامن کو ہاتھ سے پکڑ کر) لیکر اٹھو گے؟" غرض خطابت کی جوش انگیزی اور اثر ریزی صرف وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے۔ یہ جوش انگیزی

وخروش نہ اس سے زیادہ ٹھہرتا ہی اور نہ زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت ہوتی ہی۔
شاعری کا مفہوم عام طور پر کلام موزوں سمجھا جاتا ہی یعنی کلام میں ایک طرح کا وزن پایا جائے۔ آگے چلکر قوافی و ردیف کی شرط بھی آجاتی ہی۔ لیکن بعض محققین کے نزدیک شاعری نام ہے تخئیل کا۔ یعنی ایسا کلام جسے شاعر کی قوت تخیل نے نہایت لطیف اور پر اثر طریقہ پر ادا کیا ہو۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہی کہ شاعری ایک طرح کی محاکات ہی اور وہ محاکات کے دائرہ کو اسقدر وسعت دیتا ہی کہ تخئیل اس سے باہر نہیں جاسکتی۔ اس گروہ کے نزدیک واقعات زمانہ یا مناظر قدرت کا نقشہ اس طرح پر پیش کیا جائے کہ کلام کے سننے والے پر وہی اثر طاری ہو جو ان واقعات و مناظر کو خود دیکھنے سے ہوتا۔ معنی کے لحاظ سے اگرچہ موخر الذکر دونو گروہ پہلے گروہ سے مختلف ہیں لیکن کلام میں وزن ہونے سے انھیں بھی انکار نہیں۔ یہ اسکو شاعری کا ایک جزو سمجھتے ہیں گو اول الذکر گروہ کی طرح اسی کو اصل شاعری نہیں قرار دیتے۔ ایک اور خاص فرق جو خطابت اور شاعری میں ہے، وہ یہ کہ شاعر کو اپنے مخاطب یا سامع سے کوئی غرض نہیں۔ وہ جن جذبات سے خود متاثر ہوتا ہی، یا جو واقعات اسکی نظر سے گزرتے ہیں، ان جذبات و واقعات کو ظاہر کردینا اسکی غرض اصلی ہے لیکن اس طریقہ پر کہ کوئی شخص جب پڑھے یا سنے تو وہ بھی انہی جذبات سے متاثر ہو۔ شاعری کی ظاہری حیثیت سے ایک خاص بات جو اسمیں ہی، وہ کسی میں نہیں۔ یعنی کلام میں وزن کے التزام اور قافیہ و ردیف کی پابندی سے ضروری و مناسب الفاظ کی آمد ہر موقع پر ممکن نہیں ہوتی اور نہ اس قید اور پابندی کی وجہ سے یہ کلام ہر شخص اور ہر وقت کے لئے مناسب اور ممکن ہوسکتا ہی۔ دوسرے، معنوی لحاظ سے شاعری میں صحت واقعات اور اظہار حقیقت کی شرط کوئی لازمی امر نہیں۔ ممکن ہی اور بہت ممکن ہی کہ اظہار جذبات کے جوش اور

تخئیل کی بلند پروازی میں صحتِ واقعہ اور حقیقت امر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔
ان دونوں کے برعکس انشا پردازی کی غرض و غایت کچھ اور ہے۔ اس کا مقصد خطابت کی طرح نہ تو فوری جوش و خروش کا ابھارنا ہنگامی اثر پیدا کرنا ہوتا ہے اور نہ شاعری کی طرح اظہار جذبات یا خیال آرائی ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ایک مستقل بالذات شے ہے۔ اس کا مخاطب نہ تو کوئی انسانی مجمع ہوتا ہے اور نہ وہ تمام تر متکلم ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ اپنی اثر انگیزی میں ایک خاص ثبات اور مناسبت رکھتی ہے جو نہ بالکل وقتی ہوتی ہے اور نہ ضرورت سے زاید۔ اس کے ہاں نہ تعجیل اثر کا لحاظ ہے جس سے انشا پرداز صرف اپنے گرد و پیش کی چیزوں پر اکتفا کرے، نہ اوزان و قوافی کی قید، جس سے غیر ضروری یا نامناسب الفاظ کی بھرتی کرنی پڑے اور نہ اس کے ہاں تخئیل کی بلند پروازی اور محاکات کی شرط، جس سے صحت واقعات اور اظہار حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انشا پردازی اظہار خیالات اور تحریر واقعات کا ایسا ذریعہ ہے جو الفاظ کی بے جا نمائش اور معانی کے مبالغہ و غلو سے پاک ہے اس کے ذریعہ واقعات نہایت سیدھے سادہ طریقہ سے ادا کئے گئے ہوں۔ خیالات میں بعد اور پیچ نہ ہو۔ تشبیہ و استعارہ کی جگہ زیادہ تر نفس واقعہ سے کام لیا گیا ہو۔ غرض یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو ہر معمولی شخص کیلئے ممکن الحصول اور قابل عمل ہے۔

الفاظ و معانی | اسی سلسلے میں ایک نہایت لطیف اور دلچسپ بحث یہ آتی ہے کہ آیا انشا پردازی کا دار مدار الفاظ پر ہے یا معانی پر۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ انشا پردازی نام ہے بہترین الفاظ کے بہترین طریقہ پر استعمال کا۔ نئے معانی و خیالات ہر روز نہیں پیدا ہوتے۔ ایک ہی خیال ہوتا ہے جو مختلف انشا پرداز مختلف طریقہ پر ادا کرتے ہیں، لیکن ان میں جو فرق ہوتا ہے وہ انتخاب الفاظ اور طرز ادا کا۔ کوئی اسی خیال یا واقعہ کو اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا،

کسی کا طریقہ بیان اور انتخاب الفاظ ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے سے ایک خاص کیف اور اثر طاری ہونے لگتا ہے۔ انگریزی زبان کے جاننے والے اس نکتہ کو اس مثال سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ انگلستان کی تاریخ ہزاروں مصنفین نے لکھی ہے لیکن جو کیفیت اور اثر لارڈ میکالے کی تاریخ کے چند ابواب پڑھکر ہوتا ہے، وہ اور کسی کی تحریر سے نہیں

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ انشا پردازی یا حسن کلام موقوف ہے اعلیٰ معانی اور حسن خیالات پر۔ جبتک معانی میں کوئی ندرت یا خیالات میں کوئی کشش نہ ہوگی نرے الفاظ کا کوئی اثر نہیں۔ تحریر میں اثر اسی وقت ہوتا ہے جب خیالات پُر اثر ہوتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ "انچہ از دل خیزد بر دل ریزد"۔ دنیا کے اکثر بڑے مصلحین بڑے انشا پرداز بھی مانے جاتے ہیں۔ انگریزی لٹریچر میں زبان کے لحاظ سے انجیل کا جو درجہ ہے، وہ کسی کتاب کا نہیں۔ بعض نقاد ان فن مہاتما گاندھی کے طرز تحریر کو انگریزی انشا پردازی کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ الفاظ و معنی کا تعلق جسم و روح کا تعلق ہے جس طرح تنہا روح یا خالی جسم پر زندگی کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اسی طرح لفظ کو معنی سے یا معنی کو لفظ سے جدا کر کے انشا پردازی کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ اگر الفاظ نہایت شاندار اور پر شکوہ ہیں لیکن بے معنی، ممکن ہے کہ پڑھنے والا بادی النظر مین ان سے متاثر ہو جائے لیکن جہاں ذرا سنبھلا اور خیال معنی کی طرف گیا کہ وہ اثر ایکدم غائب ہو جائیگا۔ انشا پردازی کے متعلق اکثر غلط فہمیاں اسی قسم کی ہوئی ہیں یہی حال معنی کا ہے۔ خیالات اور معانی خواہ کتنے ہی بلند اور اعلیٰ ہوں لیکن ان کے ادا کرنے کے لئے الفاظ ناقص اور غیر موزوں استعمال کئے گئے ہیں تو ان مضامین و خیالات کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ دنیا میں کتنے ہی بلند خیالات اور اعلیٰ معانی ظاہر ہوئے لیکن اسوجہ سے مقبولیت اور رواج نہ پا سکے کہ ان کا طریقہ اظہار اور طرز ادا

پسندیدہ اور پُر اثر نہ تھا۔ غرض الفاظ و معانی کا تعلق باہمی لاینفک ہو، اور انشا پردازی ان دونوں کی باہمی اور مشترک خوبی اور موزونیت کا نام ہو، جسکی بہترین مثال ہماری کتاب قرآن حکیم ہو۔

اسی بنا پر علمائے ادب نے انشا پردازی کی دو بڑی جامع اور مانع خصوصیات بیان کی ہیں (۱) فصاحت اور (۲) بلاغت جن میں سے ایک کا تعلق زیادہ تر الفاظ سے ہے اور دوسری کا معانی سے۔ اب ہم ان میں سے ہر خصوصیت اور اس کی جزئیات سے بحث کریں گے اور اسی کے مطابق ان مصنفین کی تحریروں کے نمونے پیش کرتے جائیں گے جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ علامہ شبلی میں یہ خصوصیات کس حد تک پائی جاتی تھیں اور ان کے دوسرے معاصرین میں اس کی کس قدر کمی تھی۔

فصاحت اور اسکی جزئیات فصاحت میں زیادہ تر کلام یا تحریر کی لفظی حیثیت سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی الفاظ اپنی ظاہری حیثیت سے کیسے ہیں؟ بولنے یا سننے میں وہ کیا اثر رکھتے ہیں؟ صرفی قاعدہ سے ان کا کیا درجہ ہو؟ اور تحریر بہ لحاظ مجموعی کیسی ہو؟

فصاحت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہو کہ تحریر کے الفاظ نہایت صاف اور شستہ ہوں۔ صفائی اور شستگی الفاظ سے مراد یہ ہو کہ ان کے بولنے میں زبان کو آسانی ہو اور سننے میں کانوں کو بھلا لگے۔ مثال کے طور پر مولینا شبلی کی یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں:

"آج میں نے ایک عجیب دلآویز خواب دیکھا۔ عجیب اس لئے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں اور دلآویزی کی یہ کیفیت ہو کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہو اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے۔ مفصل سنئے۔ آج جمعہ کا دن ہے اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بنکر گیا۔ جامع حمیدیہ میں داخل ہوا۔ سلطان المعظم بڑی شوکت و شان سے آئے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا کیونکہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو گزرگاہ سلطانی پر پہلے سے موجود

ہوتے ہیں اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔" (مکاتیب شبلی حصہ اوّل صفحہ)
اسی کے برعکس تحریر کا ایک بڑا نقص یہ سمجھا جاتا ہے کہ الفاظ ثقیل اور کریہ ہوں جن کے بولنے سے زبان پر گرانی اور سننے میں کانوں کو ناگواری محسوس ہوتی ہو۔ بعض وقت تحریر میں دو ایک ثقیل لفظ کا آجانا عبارت کو بے لطف اور بدمزہ کر دیتا ہے۔ دربار اکبری کی چند سطریں بطور مثال پیش ہیں:-

"ایک سوار حکم شاہی لیکر دوڑا اور آواز کی طرح پہاڑ سے پھرا، معلوم ہوا کہ محاصرے کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر پلٹا ہے۔ لشکر میں کھلبلی پڑی۔ بادشاہ نے پھر بہادروں کو للکارا۔ نقارچی کے ایسے اوسان گئے کہ نقارہ پر چوٹ لگانے سے بھی رہ گیا۔ یہاں تک کہ اکبر نے خود برچھی کی نوک سے ہشیار کیا۔ غرض سب کو سمیٹا اور پھر فوج کو لیکر دل بڑھاتا ہوا دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ چند سرداروں نے گھوڑے جھپٹائے اور تیراندازی شروع کی۔ اکبر نے پھر آواز دی کہ نہ گھبراؤ۔ کیوں کھنڈے جاتے ہو۔ دلاور بادشاہ شیر مست کی طرح خراماں خراماں جاتا تھا اور سب کو دلاسا دیتا جاتا تھا۔ غنیم طوفان کی طرح چڑھا چلا آتا تھا۔ مگر جوں جوں پاس آتا تھا، جمعیت کھنڈی جاتی تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوا کہ اختیار الملک چند رفیقوں کے ساتھ جمعیت سے کٹکر جدا ہوا ہے اور جنگل کا رخ کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت حملہ کرنے نہیں آیا تھا متواتر فتحوں کے سبب سے تمام ہندوستان میں دھاک بندھ گئی تھی کہ اکبر نے تسخیر آفتاب کا عمل پڑھا ہے اب کوئی اس پر فتح نہ پا سکے گا۔ محمد حسین مرزا کی قید اور تباہی لشکر کی خبر سنتے ہی اختیار الملک بے اختیار محاصرہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ تمام لشکر اس کا جیسے چیونٹیوں کا قطار۔ برابر سے کترا کر نکل گیا۔ اس کا گھوڑا بگٹٹ چلا جاتا تھا یہ کمبخت بھی تھوہر میں الجھا اور خود زمین پر گر پڑا" (دربار اکبری صفحہ ۳۲۳)

صفائی، شستگی اور ثقل و کراہت کی تمیز تو بہتر طور پر انسان کا لطیف سامعہ ہی

کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کچھ اصول بھی مقرر ہیں۔ مثلاً بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ زبان سے آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور کانوں کو ان کا سننا بھی بھلا لگتا ہے جیسے بے، تے، رے، زے وغیرہ۔ بعض حروف ایسے ہیں جن کا بولنا اور سننا دونو ناگوار ہوتا ہے جیسے ٹے، ڈال، ڑے وغیرہ۔ اسی طرح الفاظ میں بھی ان حرفوں میں سے کسی ایک کے آنے یا ان میں سے دو یا تین کے قریب قریب جمع ہو جانے، یا ایک ہی حرف کے مکرر ہونے سے ثقل و کراہت پیدا ہو جاتی ہے اور اس بنا پر زبان میں شستہ اور لطیف، ثقیل اور کریہ الفاظ ہو گئے ہیں۔ مکاتیب کی پہلی عبارت میں یوں تو شاید ہی کوئی ثقیل یا کریہ بتایا جا سکے بلکہ "دلاویز"۔ "سماں"۔ "شوق"۔ "سیر" کے آجانے سے زبان و گوش دونو کو ایک خاص حظ محسوس ہوتا ہے۔ برعکس اس کے دربار اکبری کی دوسری عبارت میں "کھنڈے"۔ "جھپٹا ہے"۔ "فیتوں" "بگھوٹ"۔ "گھنڈی"۔ "تھوتھو" کے الفاظ سے پڑھنے والے اور سننے والے دونو کو ایک طرح کی گرانی اور ناگواری معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے بعض جگہ ہائے دو چشمی، جیم، اور ڈال کے قریب قریب آجانے سے یا "تھا" پر فقروں کے ختم ہونے سے عبارت میں موسیقیت باقی نہیں رہتی۔

فصاحت کی ایک بڑی خوبی روزمرہ اور بول چال کا استعمال ہے۔ روزمرہ سے مراد وہ زبان ہے جو نہایت سادہ اور عام فہم ہو اور جسے لکھے پڑھے اہل زبان استعمال کرتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی زبان کے الفاظ و محاورات بالکل رائج الوقت ہوں گے۔ علامہ شبلی سے بڑھکر اس نکتہ کو شاید ہی کسی نے سمجھا ہو۔ انھوں نے نہ تو جدید اور متبحر علما کی معرب اردو اور نہ اہل زبان کی بازاری اردو لکھی، بلکہ اہل زبان کے پڑھے لکھے طبقہ کی زبان کو اپنے لئے انتخاب کیا جس کا اندازہ اس ٹکڑہ سے بخوبی ہو سکتا ہے:-

"مدت سے قدمبوسی نہیں ہوئی اور بہت جی چاہتا ہے۔ میرا تو آنا نہیں ہو سکتا اس لئے

امید کرتا ہوں کہ آپ ہی قدم رنجہ فرمائیں ۔ ۱۱۔ دسمبر سے یہاں نہایت عمدہ جلسہ اور سیریں ہوگی اور ۱۹۔ دسمبر تک کالج ایک تماشا گاہ بنا رہیگا ۔ پھر بیچ میں وقفہ ہوکر ۲۷۔ دسمبر سے کانفرنس شروع ہوگی ۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ۱۱۔ تاریخ تک تشریف لائیں ۔ بیچ میں دلی اور آگرہ کی سیر بھی ہو سکیگی اور آپ نہایت محظوظ ہوں گے"۔ (مکاتیب شبلی، حصہ اول ، صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴)

لیکن بعض وقت روزمرہ کے مفہوم سے ایک بڑا مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے، یعنی اکثر سادگی بیان اور سہل زبان کے یہ معنی لئے جاتے ہیں جو سوقیت اور ابتذال کے قریب تر ہو جاتے ہیں ۔ خواندہ اور ناخواندہ جبتک یہ دو طبقے کسی سوسائٹی میں موجود ہیں، اسوقت تک ان کی زبانوں میں بھی فرق رہیگا اور اس اختلاف مراتب کی بنا پر ہر دو طبقہ کے مستعمل الفاظ و محاورات اور اقوال و امثال بھی مختلف رہیں گے ایک انشا پرداز کا فرض یہ ہے کہ انتخاب زبان کے وقت اس فرق کو ملحوظ رکھے ۔ ہمارے عناصر اربعہ میں اس کے متعلق سب سے بڑی غلط فہمی ڈپٹی نذیر احمد کو ہوئی ہے، جنھوں نے روزمرہ لکھنے کے جوش میں سوقیت کو دخل دیا ہے اور وہ بھی بری طرح ۔ توبۃ النصوح میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"ادھر تو نصوح اور سلیم دونو باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، ادھر اتنی ہی دیر میں نہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہوگئی ۔ نعیمہ اسوقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی ۔ پانچ مہینہ کا پہلونٹی کا لڑکا گود میں تھا ۔ ناز و نعمت میں پلی، نانی کی جیتی، ماں کی لاڈو، مزاج کچھ تو قدرتی تیز، باپ کے لاڈ پیار سے دہی کھا دتا ہے کریلا اور نیم چڑھا، اور بھی چڑچڑا ہو گیا تھا ۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا ۔ گھونگھٹ کے ساتھ منہ کھلا اور منہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہو گیا ۔ اب چھ چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی

مگر رسی جلی پر بل نہ گیا۔ باوجودیکہ اجڑی ہوئی میکے پڑی تھی۔ مزاج میں وہی طنطنہ تھا،
کوار سنے ہی ہیں سو اگز کی زبان تھی۔ کچھ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا، سو بیاہے
سے ان کو بھی دھتکار بتائی۔ بیٹا جنے پیچھے تو اور بھی کھل کھیلی، مردوں کا لحاظ اٹھا دیا۔
فہمیدہ نے میاں کے روبرو بیٹوں کا بیڑا اٹھاتے تو اٹھایا لیکن نعیمہ کے تصور سے
بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جی ہی جی میں کہتی تھی کہ ذرا بھی اس بھڑوں کے
کے چھتے کو چھیڑوں گی تو میرا سر مونڈ کر بھی بس نہ کرے گی" (توبۃ النصوح صفحہ ۴۹)۔

یہ ہے اُس زبان کا نمونہ، جو اردو بولنے والی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے
بولنے اور لکھنے کے لئے پیش کیگئی ہے۔ روزمرہ ہر زبان کے ناول اور افسانوں میں
ہوتا ہی مگر وہ اسقدر محدود رقبہ کی زبان نہیں ہوتی جسے دوسری جگہ کے لوگ
نہ سمجھ سکیں۔ اس زبان کے بولنے اور سمجھنے کا پورا پورا لطف تو گزشتہ صدی میں دلی کے
بعض محلے اور کوچے ہی کے لوگ اٹھا سکتے تھے۔

فصاحت کے سلسلہ میں ایک بڑی نازک بحث سلاست وعدم سلاست کی آتی ہی۔
بعضوں کا خیال ہی کہ سلاست وروانی بذاتہ کوئی وصف نہیں بلکہ روزانہ کے
بول چال اور کثرت استعمال سے تحریر میں سلاست وروانی پیدا ہو جاتی ہی۔
کہتے ہیں کہ کلام مجید کا جب یہ وصف ابو العلا معرّی سے (جس نے قرآن کا جواب
لکھا تھا) بیان کیا گیا تو اُس ملحد نے جواب دیا کہ "ہاں ابھی نہیں، میرا کلام بھی جب کچھ
عرصہ تک نمازوں میں متواتر کثرت سے پڑھا جائے، تو اُسمیں بھی وہی سلاست
وروانی پیدا ہو جائیگی"۔ لیکن اس طرز استدلال میں ایک بہت بڑا دھوکا ہی۔ سلاست
وروانی کا دارمدار کثرت استعمال پر ہرگز نہیں بلکہ خود الفاظ، محاورات اور ترکیبوں میں
بعض ایسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جن سے تحریر میں سلاست یا اجنبیت پیدا
ہو جاتی ہی، مثلاً بعض لفظ میں ایک طرح کی نزاکت ولطافت اور بعض میں

ایک شان و شکوہ پایا جاتا ہے جن کے آنے سے تحریر میں ایک روانی پیدا ہوتی ہے، مگر بعض الفاظ بڑے اور بھونڈے ہوتے ہیں جن سے عبارت میں ایک رکاوٹ اور مغایرت آجاتی ہے ان کی خصوصیات مع مثال کے ذیل میں زیادہ تصریح کے ساتھ آئیں گی۔

تحریر میں عدم سلاست یا مغایرت کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر الفاظ و محاورات متروک ہوتے ہیں، یا طریقۂ بیان بدلا ہوا ہوتا ہے، یا بعض وقت اسما و ضمایر کی غیر ضروری تکرار ہوتی ہے۔ ان اسباب سے تحریر میں وہ روانی اور سلاست باقی نہیں رہتی جو ایک مروجہ الفاظ اور غیر متروک انداز بیان کی عبارت میں ہوتی ہے۔ ذیل میں پروفیسر آزاد کی یہ عبارت اسکو واضح کر دیگی۔ لکھتے ہیں کہ:-

"سلیم شاہ کے محلوں میں ایک کشمیرن بی بی تھی، اس سے سلیم شاہ کی ایک بیٹی تھی، وہ خانخاناں کے لشکر کے ساتھ حج کو چلی تھی، وہ خانخاناں کے بیٹے مرزا عبدالرحیم کو بہت چاہتی تھی اور وہ لڑکا بھی اس سے بہت ہلا ہوا تھا اور خانخاناں اپنے فرزند مرزا عبدالرحیم سے لڑکی کی شادی کرنی چاہتا تھا۔ اس بات کا افغانوں کو بہت خار تھا ایک دن شام کے قریب سہس لنگ وہاں کے تلاؤ میں نواڑے پر بیٹھا، پانی پر ہوا کھاتا پھرتا تھا۔ مغرب کے قریب کشتی سے نماز کے لئے اترا" (دربار اکبری صفحہ ۱۹۱)۔

اس مختصر سی عبارت میں اتنے الفاظ مثلاً "ہلا ہوا"، "خار"، "تلاؤ"، "نواڑے" ہیں جن کا استعمال یا تو بالکل ہی ترک ہو گیا ہے، یا بعض کا موقع استعمال بدل گیا ہے لیکن اس سے بڑھکر طرز بیاں کی اجنبیت ہے۔ دیکھو کہ ابتدائی چاروں جملے ترتیباً "تھی" کے نقطہ پر ختم ہوتے ہیں اور بعد کے جملوں میں "تھا" کا التزام ہے۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ مثلاً "خانخاناں" یا "مرزا عبدالرحیم"۔ اور "وہ" کی تکرار سے عبارت میں کسقدر اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ عیب آزاد کی تحریر میں

بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ ہزاروں متروک الاستعمال الفاظ و محاورات مثلاً "پٹخ پٹخ کر"۔ "ناک گھسنی کرنا"۔ "باسن"۔ "چھندیانا"۔ "کھوانا" ان کے ہاں میں سکے۔ طرز ادا میں عام طور پر ایک طرح کی کہنگی اور دیرینہ پن پایا جاتا ہے۔

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کی تحریر میں اگر ایک طرف عربی کے دقیق لغات ہیں تو دوسری جانب اردو کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات بھی ہیں جن سے کہیں کہیں تحریر کی روانی و سلاست میں فرق آجاتا ہے۔ اول الذکر الفاظ اپنی دشواری کی وجہ سے چل نہ سکے، موخر الذکر اپنی عمومیت کے سبب ترک ہو گئے۔ عربی الفاظ و ضرب الامثال اور آیات قرآنی کے استعمال میں تو ڈپٹی صاحب اپنی کمال عربی دانی اور حافظ قرآن ہونیکی وجہ سے مجبور رہتے جسکی مثالیں طوالت کے اندیشہ سے دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن عامیانہ و سوقیانہ الفاظ کے استعمال کی کثرت تو افراط کی حد کو پہونچ جاتی ہے جنمیں سے بعض الفاظ کا نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مثلاً "شٹک جانا"۔ "چھیڑ خانی"۔ "پھٹکنا"۔ "لتاڑ"۔ "اکڑ بھوں"۔ "کنی کاٹنا"۔ "چلیے جانتے"۔ "تتو تھمو"۔ "چھدار کھنا" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سنکر غالباً اور حیرت ہوگی کہ یہ تمام الفاظ قرآن مجید کے ترجمہ میں استعمال کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ تو ایسے ہیں کہ ایک تحریر کیا ایک تصنیف میں آجانے سے نہ صرف اسکی سلاست کو بلکہ اسکی وقعت کو گھٹا دینے کیلئے کافی ہیں۔

مولینا حالی کی تحریر بھی جو سیدھی سادی زبان لکھنے کے لئے مشہور رہیں، اس عیب سے پاک نہیں نظر آتی۔ ان کی تصانیف سے بھی ایک طویل فہرست ایسے الفاظ کی تیار کیجا سکتی ہے جو یا تو دقیق ہونے کے باعث رفتار زبان کا ساتھ ندے سکے یا حد سے زیادہ عام فہم ہونیکی وجہ سے زبان کا مذاق لطیف ان کو نہ نبھا سکا۔ عربی کے ایسے دقیق الفاظ مثلاً "منوہ بالشان"۔ "استطرادی"۔ "مطارحات"۔

"محاربت"، "نادر راکد" کا اردو زبان بولنے والے طبقہ میں رواج پانا دشوار تھا۔ برعکس اس کے ایسے عامیانہ الفاظ جیسے "تلپٹ"، "او لو"، "تیکھا پن"، "ہینجڑا" وغیرہ وغیرہ کو قوم کا ادبی مذاق کب گوارا کر سکتا تھا!۔

یہاں تک تو عربی فارسی کے دقیق یا ہندی و بھاشا کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات سے گفتگو بھی جو تحریر میں مانعِ سلاست و روانی کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اب ایک تیسرے عنصر سے بحث ہے جو نہ صرف مانع سلاست ہو سکتا ہے بلکہ خود زبان کے حق میں مضر ہے۔ اس عنصر سے ہماری مراد انگریزی ہے۔ پروفیسر آزاد کے زمانہ میں عربی و فارسی کا بچا کھچا اثر اسقدر باقی تھا کہ انگریزی کی جو ہندوستان میں ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں تھی، کچھ پیش نگئی اور خیر سے پروفیسر موصوف اس زبان سے کچھ ایسا واقف بھی نہ تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی اپنا اثر جماتی گئی اور ایسا کیوں نہ کرتی، بادشاہِ وقت کی زبان تھی۔ اسمیں "ہاں" "نہیں" کہنا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ جس کسی کو انگریزی کی ابجد بھی آتی، وہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا یہی اسباب تھے جن کی بنا پر ہمارے دوسرے اور تیسرے مصنفین (نذیر احمد و حالی) اس انگریزی کا بے طرح شکار ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو انگریزی ملازمت کے تعلق سے اس زبان کا سیکھنا ناگزیر تھا چنانچہ انھوں نے اسے بڑے شوق سے سیکھا اور جلد سیکھ لیا۔ یہ اسی شوقِ حصول کا اثر ہے کہ انگریزی کا رنگ ان کے ابتدائی مضامین میں بہت زیادہ نظر آتا ہے خصوصاً لکچروں میں تو صریح آورد معلوم ہوتی ہے۔ کثرت استعمال کا یہ حال ہے کہ ان کے درباری لکچر کے صرف ایک صفحہ پر "سپورٹ" (کفالت کرنا) "ٹالرشن" (روا داری) "ریلیجس نیوٹریلیٹی" (مذہبی غیر جانبداری)۔ "انا کیولیشن" (ٹیکہ)۔ "کوالٹی" (قسم یا صفت)۔ "کوانٹیٹی" (مقدار)

اتنے الفاظ آئے ہیں، حالانکہ ان میں سے ہر ایک کیلئے بہتر اردو کا لفظ موجود تھا۔ نہ صرف الفاظ بلکہ انگریزی امثال، فقرے اور مرکبات بھی استعمال کر گئے ہیں مثلاً "ٹو بی آر ناٹ ٹو بی" (To be or not to be)۔ "جیک آف آل ماسٹر آف نن" (Jack of all master of none) "دی لاسٹ دو ناٹ دی لیسٹ" (The last though not the least) "اپ ٹو مارک" (Upto mark) "سینیر ممبر" (Senior member) "ریوینیو بورڈ" (Revenue Board) وغیرہ وغیرہ۔

مولینا حالی بھی اثر کا اس سے کچھ کم شکار نہ ہوئے اور یہ عیب ان کی سب سے بڑی تصنیفات حیات جاوید اور یادگار غالب تک میں پایا جاتا ہے۔ صفحے اُلٹتے چلے جائیے اور آپ کو انگریزی کے مفرد و مرکب الفاظ ملتے جائیں گے مثلاً "ورکس" (تصانیف)۔ "ایمیجینیشن" (تخیل)۔ "میٹریل" (مواد)۔ "رفارمیشن" (اصلاح) "ججمنٹ" (فیصلہ)۔ "ایشیاٹک پوئٹری" (ایشیائی شاعری)۔ "ڈسپاٹک گورنمنٹ" (مطلق العنان حکومت) "سلف ریسپکٹ" (خودداری)۔ "پبلک اسپیکنگ" (مجمع عام میں تقریر کرنا)۔ "اِم مورل" (خلاف تہذیب)۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز وہ مرکبات ہیں جنمیں ایک انگریزی لفظ ہے اور دوسرا اردو۔ مثلاً "کرسچینیٹی سلطنت" (عیسائی سلطنت)۔ "کریٹکل طریقہ" (ناقدانہ طریقہ)۔ "لٹریری دنیا" (علمی دنیا) وغیرہ۔ قوسین میں دیکھو کہ مذکورہ بالا الفاظ میں سے ہر ایک کا اردو مرادف اُسی زورِ معنی کے ساتھ ملسکتا تھا، لیکن کیا اسے مذاقِ ادبی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ خواہی نخواہی اس بن بلائے مہمان کو جگہ دیگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ انشا پرداز کو قوم کا بہت بڑا نباض اور زمانہ کا شناسا ہونا چاہیئے جو سوسائٹی کے میلان طبع اور رفتار زمانہ کے رخ کو پہچان لے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ قوم کا مذاق ادبی کیا ہونیوالا ہے اور زمانہ کس طرف کو لیجا رہا ہے۔ علامہ شبلی

اس راز سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اردو کا خمیر کچھ اور ہی ہے، اسمیں عربی وفارسی کی آمیزش صرف وہیں تک ہونی چاہیئے جہاں تک اس کے اصلی مزہ میں فرق نہ آئے وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اردو دہلی اور لکھنو تک محدود نہ رہیگی بلکہ اُسے ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلنا ہے۔ انگریزی کے اس قبول عام کو دیکھکر انھوں نے اندازہ کیا کہ یہ رنگ جمنے والا نہیں، جسدن ہندوستانی جیتے، یہ رنگ اڑ جائیگا۔ اس لئے اس زبان سے صرف وہی الفاظ لینے چاہئیں جو ناگزیر ہوں یا ہوا اپنے ساتھ کوئی مخصوص معنی ومفہوم رکھتے ہوں۔ یہ اسی حقیقت شناسی کا نتیجہ ہو کہ علامہ شبلی کی ابتدائی سے ابتدائی تحریر اُٹھا کر دیکھیے، ان عیوب سے بالکل پاک ہوگی۔ سر دست جو پرانی سے پرانی تحریر دستیاب ہوسکی ہو، وہ مئی ۱۸۸۶ء کا لکھا ہوا ایک خط ہو جسے انھوں نے نینی تال سے اپنے والد بزرگوار کو بھیجا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "گو میرا قلم، خامہ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب وغریب مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں، تاہم مجھکو امید نہیں کہ اس کوشش سے عزیزان وطن کو جو میرے خط پر آنکھ لگائے بیٹھے ہوں گے، اپنے شوق وانتظار کا صلہ ملجائے۔ میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ نینی تال ایک عجیب اور حیرت انگیز مقام ہے لیکن اگر "تعجب انگیز" اور "دلچسپ وفرحت زا" ہونا دو جداگانہ چیزیں ہیں تو مجھ ایسے ایشیائی خیال آدمی سے یہ امید رکھنا عبث ہو کہ میں اسکو "فرحت زا" بھی مان لوں گا۔ یہاں جو لوگ انگریزوں کی ہرادا پر جان دیتے ہیں، ان کا مذہب کیا پوچھنا ع ہرچہ آید در دلم غیر تو نیست"

اب حالات سنیئے کاٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہو اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہو۔ کاٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے مگر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی

وعظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے جس پر رستہ چلتا ہے۔
باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جسکی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے۔
دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت
سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دار السلطنۃ
ہوتے ...۔ (مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۰۱)۔

فصاحت میں جہاں تک الفاظ کا انفرادی تعلق تھا، گزشتہ صفحات میں اس پر
کافی بحث ہو چکی لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی یعنی عبارت کی صورت میں
انشا پردازی کی اس خصوصیت کو کہاں تک دخل ہے؟ اس کے لئے علمائے فن نے
دو اصول قرار دیے ہیں ایک تو یہ کہ مضامین اور تشلیس اسقدر عامیانہ اور رکیک
نہوں کہ ان سے تنفر پیدا ہو بلکہ نہایت دل پسند اور خوشکن ہوں۔ دوسرے
یہ کہ تحریر نہ اتنی طول ہو کہ سنتے سنتے جی گھبرا جائے اور نہ اتنی کوتاہ کہ مطلب خبط ہو جائے۔
ان دو خصوصیات کے اندازہ کے لئے کوئی آلہ اور پیمانہ تو ہو نہیں سکتا، البتہ صحیح مذاق ہی
اس کا بہتر اندازہ کر سکتا ہے۔ مولینا حالی نے "شعر و شاعری" میں جہاں شاعری
کی تدریجی رفتار کا ذکر کیا ہے اسکو ایک مثال کے ذریعہ اسطرح واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسکی مثال ایسی سمجھنی چاہیئے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم
کچے اور اَن ٹونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے۔ انھیں پانی میں
ابال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا، انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اسی کو بہت
غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر اور
مناسب مصالح اور گھی، دال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی
کے پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنی چاہتا ہو، اس کے سوا اور کوئی موقع تنوع
پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی

ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے" (مقدمہ شعر و شاعری، صفحہ ۱۲)

اور پھر اسی کے بعد تین چار مثالیں یکے بعد دیگرے اسی مضمون کو واضح کرنے کیلئے بیان کرتے ہیں لیکن ان میں نہ تو آپس میں کوئی خاص فرق ہے اور عامیانہ پن اسقدر کہ ان کے پڑھنے سے طبیعت میں ایک طرح کی بدمزگی پیدا ہوتی ہے لیکن اسی ارتقاء شاعری کے مضمون کو علامہ شبلی صرف ایک مثال سے بیان کرتے ہیں جسے پڑھکر طبیعت سیر ہو جاتی ہے اور جی خوش ہو جاتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی رفتار کی مثال ایک قوم کی مادی ترقی سے دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"مثلاً ابتدا میں رہنے سہنے کے لئے پھونس کے جھونپڑے اور خس پوش کچی دیواریں ہوتی ہیں پھر پختہ عمارتیں بنتی ہیں۔ پھر ان میں مختلف حصے، شہ نشین، دالان، صحنچیاں، بالاخانے قایم کئے جاتے ہیں۔ کمرے فرش فروش سے سجاتے ہیں، جھاڑ فانوس دیوار گیریاں لگاتے ہیں تاہم اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے۔ پھر سنگ مرمر کی عمارتیں بننی شروع ہوتی ہیں، جواہرات کی پچے کاری ہوتی ہے، دیواروں پر طلائی نقش و نگار بنتے ہیں، اطلس و کمخواب کا فرش بچھتا ہے، دروازوں پر گوہر نگار پردے آویزاں کرتے ہیں، کافوری شمعیں جلاتے ہیں، یہ ترقی کا آخری دَور ہے جس کے بعد تنزل شروع ہوتا ہے اور قوم تباہ ہو جاتی ہے" (شعر العجم حصہ ۱، صفحہ ۱۱)۔

دوسرے اصول (یعنی تحریر نہ طول ہو نہ کوتاہ) اسکی مثال میں سیرۃ النبی کی ابتدائی چند سطریں پیش کیجا سکتی ہیں جنمیں اتنا وسیع مضمون کہ تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس کے کیا طریقے ہونے چاہیئں نہایت اختصار اور خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:۔

"(اس کا) سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے

"بلکہ فضایل کا ایک پیکر مجسم سامنے...... آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو جسکی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بنجائیے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے۔ دیگر اور اسباب صرف ایوان تمدن کے نقش و نگار ہیں" (سیرۃ النبی حصہ صفہ)

اسی مضمون کو اگر پروفیسر آزاد بیان کرتے تو دفتر کا دفتر سیاہ کر ڈالتے۔ زور بیان پیدا کرنے کے لئے آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتے لیکن نہ جانے یہ بات بھی پیدا ہوتی یا نہیں جو ان چند سطروں میں ہے۔

بلاغت اور اسکی جزئیات | انشا پردازی میں فصاحت کا جہاں تک تعلق تھا، اس کا بیان ہو چکا، اب اسکی دوسری خصوصیت، بلاغت کا ذکر ہوگا بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ اسمیں فصاحت کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی تحریر یا الفاظ اسوقت تک بلیغ نہیں کہے جا سکتے جبتک وہ فصیح نہ ہوں۔ لیکن بالخصوص بلاغت کا تعلق الفاظ و تحریر کی معنوی حیثیت سے ہے۔ یعنی جو الفاظ استعمال کئے گئے ہوں وہ معانی کے لحاظ سے بالکل مناسب اور باموقع ہوں۔ نازک اور لطیف مضامین کے لئے ویسے الفاظ ہوں اور شاندار و پرشکوہ واقعات کے لئے ویسے۔ اظہار رنج وغم کے لئے دردآمیز اور غمناک اور مسرت و خوشی کے لئے سرور بخش و فرحت زا الفاظ استعمال کئے گئے ہوں۔ تاکید اور زور پیدا کرنے کے لئے الفاظ موکد اور مکرر ہوں، غرض جس واقعہ یا جس خیال کو انشا پرداز ادا کرنا چاہتا ہے، اس کا صحیح صحیح اور پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے مناسب اور موزوں الفاظ کے ذریعہ کھینچ کر رکھ دے۔ بلاغت کا ایک بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس سماں کو انشا پرداز پیش کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ایسے الفاظ اور ایسا طریقہ بیان اختیار کرے جس سے معلوم ہو کہ اس حالت کے وقت وہ خود موجود تھا۔ علامہ شبلی نے سیرت میں، جہاں رسم قربانی سے

بحث کی ہو، حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ ذبح کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو زبانمیں بلاغت کی مثال اس سے بہتر ملنی مشکل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی باہمی گفتگو کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اب ایک طرف نو د سالہ پیر ضعیف ہو جسکو دعا ہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جسکو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ اب اسی محبوب کے قتل کیلیے اسکی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہو۔

"دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا مہر پرور ہات اس کا قاتل نظر آتا ہو۔ ملائکہ قدسی، فضا ہائے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے آواز آتی ہے کہ

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ٥ (صٰفٰت)

(ابراہیم تونے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں)

طغیانِ ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل

در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند" (سیرۃ النبی حصہ۱، صفحہ۱۱۱)

غور کرو اور دیکھو کہ اس مختصر سی عبارت کے پڑھنے کے بعد جو نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہو، کیا وہ یہ نہیں ہو کہ ایک ضعیف کہن سال شخص دل مضبوط کر کے ایک کمسن مسکین بچے کے گلے پر چھری پھیرنا ہی چاہتا ہو کہ اتنے میں آسمان سے ایک آواز آتی ہے اور وہ اپنے ارادہ سے باز آجاتا ہو۔

بلاغت کی ایک دوسری خوبی جیسا کہ بیان کیگئی یہ ہو کہ الفاظ مناسب موقع و محل ہوں یعنی جنگ و جدل کے واقعات، بیان کرنے کیلئے شاندار اور پر شکوہ الفاظ لائے جائیں اور حسن و عشق کی داستان کے لئے نازک اور لطیف الفاظ استعمال کئے جائیں

یہی فرق ہے جسے اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو کلام یا تحریر کا اثر کما حقہ نہیں ہوتا ۔ یہ فرق اردو کے دو بڑے انشا پرداز کی تحریروں سے واضح ہو جائیگا ۔ علامہ شبلی، "جنگ قادسیہ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

"سعد نے یہ دیکھکر کہ ہاتھی جس طرف کا رخ کرتے ہیں، دَل کا دَل پھٹ جاتا ہے ۔ ضخم و مسلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلماں ہو گئے تھے، بلا کر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے؟ انھوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں ۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر اور گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے ۔ ایک ابیض اور دوسرا اجرب کے نام سے مشہور تھا ۔ سعد نے قعقاع، عاصم، حمال، ربیل کو بلا کر کہا کہ یہ مہم تمھارے ہاتھ ہے ۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیجدیے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کرلیں پھر خود برچھا ہاتھ میں لیکر پیل سفید کی طرف بڑھے، عاصم بھی ساتھ تھے، دونوں نے ایک ساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے ۔ ہاتھی جھرجھری لیکر پیچھے ہٹا ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہو گئی ۔ ادھر ربیل و حمال نے اجرب پر حملہ کیا وہ زخم کھا کر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہوئے اور دم کی دم میں یہ سیاہ بادل بالکل چھٹ گیا اب بہادروں کو حوصلہ افزائی کا موقع ملا اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گونج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی"۔ (الفاروق، صفحہ ۹)۔

تحریر بالا میں دیکھو کہ مضمون کی مناسبت سے الفاظ کیسے کیسے آئے ہیں مثلاً "دل کا دل" "بلائے سیاہ"۔ "مہیب و کوہ پیکر"۔ "مہم" "سوار و پیادے"، "نرغہ"۔ "سیاہ بادل" "رن"۔ اسی طرح ایک جنگ کے حالات پروفیسر آزاد نے "دربار اکبری" میں بیان کئے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"عصر کا وقت تھا کہ اکبری شفقت کا دریا چڑھا و پر آیا ۔ بہت سے بہادر انتخاب کیئے کہ کشتیوں پر سوار ہو کر جائیں اور میدان جنگ کی خبر لائیں ۔ قلعہ والوں نے دیکھکر اوپر سے

گولے برسانے شروع کئے اور اٹھارہ کشتیاں ان کے روکنے کو بھیجدیں۔ بیچ منجدھار میں ٹکر ہوئی۔ دیکھ گئے تھے کہ بادشاہ ہمارا دیکھ رہا ہے۔ دریا کے دھوئیں اڑاتے اور آگ برساتے پانی پر سے ہوا کی طرح گزر گئے، حریف دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر بھی چڑھاؤ کی چھاتی توڑ کر جانا کچھ آسان کام نہ تھا اور کمک کو غنیم نے دریا میں روکا ہوا تھا۔ دور ہی سے مقام جنگ پر گولے مارنے شروع کئے۔ ان کے گولوں نے غنیم کی ہمت کا لنگر توڑ دیا اور کشتیاں ہٹانی شروع کیں اب ایک کے ملاح پہلو کاٹ کر چلے۔ اگرچہ قلعہ سے گولے پڑنے شروع ہوئے گر یہ بھاگا بھاگ ایک موقع کے گھاٹ پر جا پہنچے اور وہاں سے کشتیوں کو چھوڑا کہ تیر کی طرح سیدھی معرکہ جنگ پر آئیں۔ بادشاہی فوج کناروں پر اتری ہوئی تھی اور سینہ بسینہ لڑائی ہو رہی تھی۔ افغانی سرداروں نے کوچہ بندی کر کے بھی لڑائی ڈالی مگر تقدیر سے کون لڑ سکے۔ خلاصہ یہ کہ حاجی پور فتح ہو گیا اور بادشاہی فوج قلعے پر قابض ہو گئی" (دربار اکبری صفحہ ۲۴۲،۲۴۳)۔

اسی کے آگے فتح پٹنہ کا بیان آتا ہے جو اس سے کچھ کم قصہ نما نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد بنگالہ فتح کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور آیندہ کا نقشۂ جنگ مرتب کیا جاتا ہے۔ فن جنگ کے جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کسقدر سنجیدگی طلب اور غور و فکر کا موقع ہوتا ہے لیکن آزاد کا رنگینی پسند قلم یہاں بھی گل و بلبل کی ہمنوائی سے نہیں چوکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"خلوت کے چمن میں حکم ہوا کہ مشورت کی بلبلیں آئیں کہ بنگالہ کے لیے کیا صلاح ہے۔ بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بند و بست ہو، جاڑے کی آمد میں بنگالہ پر خونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم کو دم نہ لینے دو۔ اڑ جائیں اور چھری کٹاری ہو جائیں کہ یہی بہار رہے۔ فتح کے گلچیں اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی بانگ سچی ہے"۔ (صفحہ ۲۴۴)۔

بلاغت کی ایک اور بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ جب ایک ہی معنی کے متعدد

الفاظ ہوں تو اُن میں سے صرف ایسے الفاظ کا انتخاب کر لیا جائے جو معنی کے لحاظ سے وہاں سب سے زیادہ موزوں ہو۔ ورنہ یوں ادائے مطلب کے لئے تو ہر شخص لکھ لیتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطالب کا جو ہجوم ایک لفظ میں ہوتا ہے، وہ سطروں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک اچھے انشا پرداز کا بڑا وصف یہ بھی ہے کہ انتخاب الفاظ کا صحیح مذاق اسمیں موجود ہو۔ علامہ شبلی کی نقد پسند طبیعت اس نکتہ کو خوب سمجھتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک موقع پر شیخ سعدی کے سومنات جانے کے واقعہ کو اسطرح پر لکھتے ہیں کہ:۔

"وہ (شیخ سعدی) سومنات آئے، یہاں ایک عظیم الشان بتخانہ تھا۔ پوجاریوں سے راہ ورسم پیدا کی۔ ایکدن ایک برہمن سے کہا کہ مجھکو سخت حیرت ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں۔ وہ نہایت برہم ہوا اور تمام بتخانہ میں چرچا پھیل گیا۔ سب اُن پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ بت کے ظاہری حسن وخوبی کا میں بھی معترف ہوں لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے! برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے۔ میں نے بھی بہت سفر کئے اور ہزاروں بت دیکھے لیکن جو معجزہ اسمیں ہے کسی میں نہیں، یہ ہر روز صبح کو دعا کے لئے خود ہات اُٹھاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن شیخ نے یہ شعبدہ خود اپنی انکھوں سے دیکھا۔ شیخ کو نہایت حیرت ہوئی اور اس فکر میں ہوئے کہ اصل راز کیا ہے؟ تقیۃً بت کے ہاتھ چومے اور بہت خشوع وخضوع ظاہر کیا۔ اور بتخانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پوجاری مندر میں رہا کرتے ہیں" (شعر العجم حصہ۲، صفحہ۴)۔

مندرجہ بالا عبارت میں دیکھو کہ جو خاص الفاظ استعمال ہوئے ہیں، انھیں ان کے مرادفات پر کیا وجہ ترجیح ہے۔ "راہ ورسم" کے ہم معنی اردو میں بہت سے الفاظ ہیں مثلاً 'ملاقات'، 'شناسائی'۔ 'دوستی'۔ 'جان پہچان'۔ لیکن ملنے جلنے کی ابتدا کرنے اور آمد ورفت رکھنے کا جو مفہوم "راہ ورسم" میں پایا جاتا ہے، وہ انہیں سے

کسی میں نہیں ۔ پھر "پتھر" کے ایک لفظ کہدینے سے بت کی شان میں حقارت و مذمت کا جو اظہار ہوتا ہے، اسکے لئے پجاریوں کی برہمی اور ہنگامہ آرائی کافی دلیل ہے۔ اسی مفہوم کو حقارت و مذمت کے لفظ کے ساتھ ایک سطر میں ظاہر کرتے تو اسمیں بلاغت کی وہ شان نہ رہتی ۔ آگے چلکر ایک لفظ "معجزہ" کا آیا ہے جو عین اقتضائے حال کے مطابق ہے۔ اس ایک پنج حرفی لفظ میں مذہبی تقدس اور جذبات عقیدت کے جو مفہوم داخل ہیں، ان کو برہمن کی زبان سے ادا کرنے کے لئے اردو میں کوئی دوسرا لفظ ہو نہیں سکتا تھا اسی کے بالمقابل سعدی کی زبان سے بت کے اسی فعل کو "شعبدہ" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ ان دونو الفاظ میں عقیدت اور عدم عقیدت کا جو فرق پایا جاتا ہے، وہ فن بلاغت کا ایک باریک نکتہ ہے جس کا لحاظ شبلی سا نقاد فن ہی کر سکتا تھا۔ "شعبدہ" کے قریب المعنی الفاظ اور بھی بہت سے تھے مثلاً "کرشمہ"، "ماجرا"، "تماشا"، لیکن انمیں سے کسی میں وہ بات نہیں جو شعبدہ کے لفظ میں ہے۔ "چومنا" اور "بوسہ دینا" ان دونو لفظوں میں بظاہر کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن اول الذکر سے جس عقیدت و خلوص کا اظہار ہوتا ہے، وہ دوسرے سے اُسقدر نہیں بلکہ اس سے ایک حد تک تکلف و تصنع ٹپکتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایک خالص اردو کا مفرد لفظ فارسی کے مرکب لفظ پر بہر صورت مرجح تھا۔ بعینہ یہی فرق "پوجنے" اور "پرستش کرنے" کے الفاظ میں بھی ہے جس مذہبی عقیدت اور خلوص کو ظاہر کرنے کیلئے اوپر الفاظ آئے ہیں، اسی غرض کے لئے "خشوع و خضوع" کا استعمال بھی ہے جسکے بغیر لائے ہوئے کسی مذہبی عقیدت و خلوص کے خیال کا اظہار مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

بالکل اسی واقعہ کو مولینا حالی نے بھی اپنی حیات سعدی میں بیان کیا ہے، ذیل میں ان کی عبارت کو پڑھو اور دیکھو کہ کیا انھوں نے بھی بلاغت کی ان خوبیوں کو ملحوظ رکھا ہے؟ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"جب میں (سعدیؒ) سومنات پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کیلیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھکو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بیجان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اسقدر فریفتہ ہیں؟ اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کردی۔ سب نے مجھکو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اسکے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ میں نو وارد ہوں اور اسرار نہانی سے واقف نہیں ہوں، اس لئے اسکی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اسکی پوجا کروں۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو مندر میں رہ تجھکو اصل حقیقت معلوم ہوجائیگی میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد عورت وہاں جمع ہوگئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنسکر مجھ سے کہا۔ کیوں اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا؟ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑکر اس مورت کے سامنے لے گئے میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لئے برہمن بنگیا" (حیات سعدی صفحہ ۳۴ و ۳۵)

ایک اور طریقہ اقوام یا افراد کی اہلیت اور قابلیت کے اندازہ کرنے کا ایک منصفانہ طریقہ یہ ہی کہ یہ دیکھا جاسے کہ وہ قوم یا اس کے افراد ابھر کر کہاں تک پہونچے؟ اُن کی بلند پروازی کی آخری حد کہاں تک پہنچتی ہی؟ ان کی ترقی کا پارہ زیادہ سے زیادہ کس درجہ پر آتا ہی اور پھر اس کے بعد باہم مقابلہ کر کے دیکھا جائے کہ ان میں کون سب سے آگے ہی؟ اب تک ہم نے انشا پردازی کی تعریف، اسکی غرض، اور اسکی دو بڑی خصوصیات

فصاحت و بلاغت مع ان کی جزئیات سے بحث کی ہے اور اُن کے ثبوت میں ہر چار مصنفین کی تحریروں کے نمونے پیش کئے ہیں جس سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ علامہ شبلی کا درجہ ان کے دیگر معاصرین انشا پردازوں میں کسقدر بلند ہے۔ اب ہم اس جدید طریقہ کے مطابق ان مصنفین کی تحریروں کے منتخب اور چیدہ نمونے (جو ان کے اختراع فائقہ (ماسٹر پیس) کہے جا سکتے ہیں) پیش کرتے ہیں اور فیصلہ خود ناظرین کے مذاق ادبی اور انصاف پر چھوڑتے ہیں۔ سب سے پہلے آزاد کو لو، دربار اکبری میں اکبر کے خصائل و عادات بیان کرنے میں انھوں نے اپنے پورے زور قلم سے وہ کام لیا ہے جسکی نظیر ان کی تمام تصانیف میں کہیں دوسری جگہ نہیں ملسکتی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"اسکی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا کبوتر ونیں اڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے گھوڑے بھگانے اور باز اڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شاہانی لیکر آئی۔ بیرم خاں وزیر صاحب تدبیر ملگیا تھا۔ یہ سیر و شکار، اور شراب و کباب کے مزے لینے لگے لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگان دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوع جوانی میں اکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیز گار رنماز گزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے اور نماز کے لئے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ ہے مگر مطالب علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا، سواری شکاری بھی برابر جاری تھی۔ مگر وہ علم کا عاشق علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لئے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے

ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کام کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی، یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا، ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سناتا اور اتفاق رائے اور صلاح و اصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا" (دربار اکبری، صفحہ ۱۲۹،۱۳۰)

ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تصانیف میں توبۃ النصوح ان کی سب سے بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اور اس میں بھی بالخصوص وہ حصہ جہاں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے بندہ کی توبیخ کی ہے، روز بیان کیلئے مشہور ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر تو ہمکو صمیم قلب سے حاضر و ناظر، سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا، تو گناہ پر تجھکو کیونکر جسارت ہوتی تھی؟ تو بھولکر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا؟ کبھی کھولتے پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا؟ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا؟ مگر تو گناہوں کا نہایت بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا۔ ضرور ہے کہ یا تو تجھکو یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتش دوزخ ہے، یا اگر یقین تھا تو تو اسکو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ، جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھکو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا، کیا تو نے اسکو ہمیشہ اپنی حسن تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا؟ جو تکلیف تجھکو دنیا میں پہنچی، اگرچہ تو اپنی ہی ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلھاڑی مارا کرتا تھا، مگر کیا تو اسکا الزام ہماری ذات مستجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔ اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھپر کئے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکر، بے شمار نعمتیں میں نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا، اتنا ہی تو میری مخالفت پر کمربستہ رہا، جتنی میں

تیری رعایت کرتا رہا، اسیقدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیات بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا۔ اس چندروزہ زندگی پر تو اسقدر مغرور تھا کہ دائرہ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا" (توبتہ النصوح، صفحہ ۱۷۱)

مولینا حالی کی تصانیف میں تو اسقدر بلند اور پرزور عبارت ملنی مشکل تھی، البتہ ان کے متفرق مضامین میں "زبان گویا" کے عنوان سے ایک خطیبانہ پرزور مضمون ملگیا ہے جس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو:۔

"اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد، اے میری ترجمان! اے میری وکیل، اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد، نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو، نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی "اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔۔۔۔ اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور اے میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا، نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں تو زہر ہے

اور کہیں تریاق" (مضامین حالی، صفحہ ۲۱)

آزاد، نذیر احمد اور حالی کی انشا پردازی کے اختراعات فائقہ (ماسٹر پیسز) آپ نے دیکھ لیے، جو عام طور پر اردو کے انتخابات میں داخل ہیں، اب ایک میری طرف سے شبلی کی انشا پردازی کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو، "ظہور قدسی" کے عنوان سے آنحضرت صلعم کی ولادت کا واقعہ وہ اس طرح لکھتے ہیں :-

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

"لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاعہائے گراں ارزش شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔

"آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدہ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنمخانوں میں خاک اڑنے لگی، تبکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک

کرکے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعامیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔

"یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا، اللّٰھم صلّ علیہ وعلےٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلّم۔" (سیرۃ النبی حصہ ۱، صفحہ ۱۲۳ و ۱۲۴)



(۲)

گزشتہ صفحات میں، جہاں تک سوال کے پہلے جزو کا تعلق تھا، ہم نے انشا پردازی اور اسکی خصوصیات سے کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، تاکہ انشا پردازی کا ایک صحیح مفہوم اور معیار قایم ہو جائے۔ اب تک اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز کی تعیئن میں جو غلطی ہوتی چلی آئی ہے اُس کا سبب یہی تھا کہ انشا پردازی کا کوئی صاف وصریح مفہوم پیشِ نظر نہیں ہوتا تھا۔ اسی غرض سے ہم نے ان مصنفین کی تحریروں سے مختلف نوعتیوں کے نمونے بھی دیے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ علامہ شبلی کا درجہ اپنے معاصرین انشا پردازوں میں کسقدر بلند ہو! سوال کا دوسرا جزو اسقدر پیچیدہ اور بحث طلب نہیں ہو۔ کم و بیش ہر شخص سمجھتا ہے کہ اردو کے ذخیرۂ علمی میں سب سے بڑا اور بیش بہا حصہ علامہ شبلی کا ہے، تاہم ان میں سے ہر ایک کی تصانیف پر ایک سرسری نظر ڈال لینے سے اس خیال کی مزید تصدیق ہو جائیگی۔

اردو کا سرمایہ علمی | ہم جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں، اردو ادب (یہاں ادب سے مراد

صرف نثر کا ذخیرہ ہی) کی ترکیب اصلی انھی چار عناصر سے ہے، یعنی آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی، یعنی اردو کا تمام تر ذخیرۂ علمی انھیں چار مصنفین کی کوششوں کا اندوختہ ہی، باقی دوسرے مصنفین ایک حیثیتِ ثانوی رکھتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہی کہ انمیں سے ہر ایک کا کسقدر حصہ ہی اور کس قیمت کا؟ پروفیسر آزاد سے پہلے جنھیں ان عناصر اربعہ میں اوّلیت کا فخر حاصل ہی اردو ادب کا سرمایہ بہت ہی مختصر اور معمولی تھا۔ پرانے خیال کے لوگ زیادہ تر فارسی و عربی کی تحصیل اپنی تعلیم کا مقصد سمجھتے تھے، کوئی کچھ لکھنا چاہتا، تو انھی زبانوں میں لکھتا۔ ان میں بھی فارسی کو زیادہ رواج حاصل تھا، کیونکہ پہلے حکومت وقت کی زبان رہ چکی تھی، اس کا رعب اب بھی لوگوں کے دلوں پر باقی تھا۔ علاوہ اس کے اسلامی اور دینی علوم بھی انھیں دونو زبانوں میں تھے۔ اگر کسی نے بڑی ہمت کی تو تھوڑی بہت انگریزی سیکھ لی، کیونکہ بعد میں یہی زبان ذریعہ معاش ہوگئی۔ اردو کی طرف کسی نے اگر بڑی توجہ کی تو چند غزلیں اور قصیدے لکھ لئے یا فارسی و عربی سے بعض افسانے اور قصے ترجمہ کرکے رکھ دیے۔ بعد میں کچھ انگریزی کے ناولوں اور افسانوں کے بھی ترجمے ہوئے۔

تصانیف آزاد: غرض یہ کل سرمایہ تھا جو پروفیسر آزاد کو وراثت میں ملا، اسمیں سے بھی شاعری کے جزو کو نکال دیجئے تو یہ ترکہ اور بھی قلیل اور حقیر رہجاتا ہے۔ آزاد نے اردو کی اس بے مائگی کو محسوس کیا اور لٹریچر کی ہر صنف میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہی کہ آج ان کے قلم کی مختلف اصناف ادب میں تحریری یادگاریں باقی ہیں۔ مثلاً ادب میں افسانے، قصے اور ڈرامے ہیں۔ تاریخ میں زبان اور لٹریچر کی تاریخ اور اشخاص کے سوانح زندگی بھی ہیں۔ علوم میں علم الانسہ ان کا سب سے نمایاں کارنامہ ہے۔

ان کی ایک اہم تصنیف جو شاعرانہ خیال آرائیوں اور ادبی گلکاریوں کی

وجہ سے آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھی جاتی ہے، "نیرنگ خیال" ہے۔ انگریزی زبان میں لٹریچر کی ایک صنف "مائی تھالوجی" ہے جسمیں انسانی جذبات اور مذہبی معتقدات مشخص طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ انسان کا تخیل اشکال و صور کو جلد گرفت کر سکتا ہے مثلاً غصہ اور رحم کو ان کے خصائص طبعی کی بنا پر ویسی ہی انسانی شکلوں میں پیش کیا جائے تو پڑھنے والے پر اس کا صحیح اور زیادہ اثر پڑتا ہے۔ انگریزی میں اسی طرز بیان میں ایک مشہور کتاب "ترقیِ زائر" (پلگرمس پروگرس) کے نام سے ہی جسمیں عیسوی مذہب کے عقاید اور محاسن اخلاق کو مادی صورتوں میں پیش کیا گیا ہی۔ کہا جاتا ہی کہ انجیل کے بعد جس کتاب نے مسیحیت کے قبول کرنے کی سب سے زیادہ ترغیب لوگوں کے دلوں میں پیدا کی، وہ یہ "ترقی زائر" ہے۔ اس کتاب کے مقبول عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہی کہ اس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ۴۰ زبانوں میں ہو چکا ہی۔ اسی طرز بیان کو سامنے رکھکر آزاد نے بھی "نیرنگ خیال" لکھی ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ "یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا" غرض اصل کتاب میں انسان کے اوصاف و خصایل، اس کے جذبات خواہ نیک ہوں یا بد، مشخص طور پر دکھائے گئے ہیں۔ مثلاً سچ، عدل، رحم، شہرت طلبی، غصہ، خود پسندی وغیرہ اپنی اپنی خصوصیات کے مطابق مرد یا عورت کی شکل میں ظاہر کیگئی ہیں۔ اخیر میں عرب، ایران و ہندوستان کے مشہور و معروف شعرا و سلاطین کی بھی جیتی جاگتی تصویریں الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کی گئی ہیں۔ لیکن باوجود ان سب کے "نیرنگ خیال" کو وہ قبول عام کہاں حاصل ا جو "ترقی زائر" کو ہوئی! پروفیسر آزاد کی تاریخی تصانیف میں "دربار اکبری" سب سے مشہور کتاب ہی۔ اس میں اکبر اور اس کے دربار کے بڑے بڑے امرا مثلاً بیرم خاں

بیربل، فیضی، ابوالفضل، ٹوڈرمل وغیرہ کے حالات درج ہیں۔ اردو زبان میں اکبری عہد حکومت کے واقعات اس قدر تفصیل کے ساتھ ملنے مشکل ہیں۔ جہاں تک وقایع نگاری کا تعلق ہے یہ کتاب چھوٹے بڑے تمام واقعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن واقعہ نگاری اور تاریخ نویسی میں بہت بڑا فرق ہے۔ جو اس تصنیف میں صاف نظر آتا ہے۔ اکبر اور اس کا عہد حکومت اس کے امرا اور رعایا میں کچھ ایسا مقبول ہا ہے کہ اس کے متعلق بہت سے مصنوعی مبالغہ آمیز قصوں کا رواج پا جانا کچھ بھی خلاف امید نہیں۔ اکبر کی حکمت عملی (پالیسی) ایسی مرنجاں ومرنج کی رہی ہے اور دیگر مذاہب کے ساتھ اس کا ایسا بے تعصبانہ اور روادارانہ رویہ رہا ہے، جو سترہویں صدی عیسوی میں ایک حیرت انگیز واقعہ ہے، بالخصوص ہندو مسلمانوں کے ساتھ اس کا یکساں مساویانہ سلوک اس زمانہ میں ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ خود اس کے اسلام میں شبہ کرنا بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں۔ یہ چند اہم بالشان امور تھے جو بہت زیادہ نقد وبحث کے قابل تھے اور جنکے محض ضمنی تذکرہ کر دینے سے اکبر کا سوانح نگار کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ اس کے عہد اکبری کی بعض زراعتی واقتصادی اصلاحات بھی جن پر ہمارا موجودہ نظام زراعتی بہت حد تک مبنی بتایا جاتا ہے، کسی طرح نظر انداز کر دینے کے قابل نہ تھیں۔ اکبر کے زمانہ حکومت میں بعض علوم وادب مثلاً ہیئت و نجوم اور فارسی شاعری کی ترقی اور اکثر فنون لطیفہ مثلاً مصوری نقاشی وموسیقی وغیرہ کی رفتار بھی بہ تفصیل ذکر کئے جانے کے لایق تھیں۔ تاریخ کا اقتضا یہ تھا کہ دیگر سلاطین مغلیہ سے جو بعد میں تخت دہلی پر بیٹھے اور غیر ملکی معاصر حکمرانوں سے (مثلاً ملکہ الزبیتھ جو تقریباً اسی زمانہ میں انگلستان پر حکومت کرتی تھی) اکبر اور اسکی طرز حکومت کا مقابلہ وموازنہ کیا جاتا، تو آج دربار اکبری تاریخی حیثیت سے نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ایک بلند پایہ تصنیف سمجھی جاتی۔

اشخاص کی تاریخ لکھنے کے علاوہ پروفیسر آزاد نے زبانوں کی تاریخ بھی لکھی ہے اور نہ صرف تاریخ بلکہ ایک حد تک فلسفۂ زبان کی طرف بھی توجہ کی ہے یعنی ایک زبان کا دوسری زبانوں سے تعلق اور الفاظ کی اصل اور معنی کے تغیرات کے اسباب سے بھی بحث کی ہے۔ یہی علم آج مدوّن صورت میں علم الالسنہ یا انگریزی میں "فیلالوجی" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا شوق انھیں اہل یورپ کی غیر زبانوں میں تحقیق و تفتیش کو دیکھکر پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے فارسی زبان کی تاریخ و تحقیق کی طرف توجہ کی۔ اور اس کے لئے ایران اور بخارا وغیرہ کی دشوار گزار مسافت بھی اختیار کی۔ ان ممالک میں جاکر انھوں نے وہاں کے رسم و رواج لوگوں کے عادات و اطوار کا مطالعہ کیا۔ نیز ژند، پہلوی اور دری زبانوں کے متعلق بھی بہت کچھ معلومات حاصل کئے۔ ہندوستان رہکر سنسکرت زبان اور یہاں کے رسوم و عادات سے کم و بیش واقفیت حاصل کی غرض ان کی اس علمی و لسانی تحقیق و کاوش کا اصل مظہر "سخندان فارس" ہے۔ جس میں زبان فارسی کی تاریخ اور اسکی عہد بعہد کی ترقیوں سے بحث کی گئی ہے۔ علاوہ اس کے مشہور شعرا و مصنفین کے کلام کے نمونے بھی دکھائے گئے ہیں، ایرانیوں کے رسوم و رواج کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کی دوسری کتاب "نگارستان فارس" ہے جسمیں رودکی سے لیکر واقف بٹالوی تک کے مشاہیر شعرا کی سوانح عمریاں درج ہیں۔ یہ سب کچھ سہی لیکن زمانہ کی تیز رفتاری کا ساتھ کون دیسکے! پروفیسر آزاد نے جہاں زبانوں کی تقسیم و تفریع کی ہے وہ علم السنہ کی موجودہ ترقیوں کے لحاظ سے ایک ابتدائی معلومات کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ علاوہ اس کے یہ علم چونکہ واقعات نہیں بلکہ زیادہ تر قیاسات عقلی پر مبنی ہے اس لئے اس کے نظریے دن بدن بدلتے رہتے ہیں۔ اس بنا پر آج سے ۴۰، ۵۰ برس پہلے کا کوئی نظریہ کیونکر قابل قبول ہو سکتا ہے۔ یوں الفاظ کی

باہمی مشابہت و مناسبت بتانی خواہ صُوری ہو یا معنوی، ایک دلچسپ مشغلہ ہو
اور پر لطف مطالعہ بھی۔ اس نوعیت کی ایک دوسری تصنیف "آبحیات" ہے
جو مصنف کی انشا پردازی، تاریخی و لسانی تحقیق، اور ادبی خصوصیت کا مجموعہ سمجھی جاتی ہو
اس میں شبہ نہیں کہ اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد کی ترقیوں پر
اردو میں اس سے پیشتر کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی۔ اسی سلسلہ میں آزاد
کا ترتیب دیا ہوا "دیوان ذوق" بھی آجاتا ہے۔ گو ذوق کے حالات اور ان کی
شاعری کا تذکرہ "آب حیات" میں بھی آچکا ہے لیکن استاد ہونیکی حیثیت سے
آزاد کو جو عقیدت ان کے ساتھ تھی وہ ایک مستقل تصنیف کی متقاضی ہوئی۔
لیکن ان تمام تنقیدی تصانیف میں بجائے اس کے کہ کہیں فلسفۂ شاعری اور
اس کی خصوصیات سے بحث کیجاتی، صرف نمونۂ کلام اور شاعری کی تدریجی ترقی کے
دکھانے پر اکتفا کیا گیا۔ کم از کم دیوان ذوق ہی میں اس ضرورت کو ملحوظ رکھا جاتا
اور ذوق و غالب کی شاعری کا تفصیل کے ساتھ باہم مقابلہ و موازنہ کیا جاتا اور
ہر دو کی خصوصیات شاعری بیان کر کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیجاتی تو آج اردو
لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ لیکن ذوق کی بعض غیر مطبوعہ غزلوں کو شائع
کر دینا کافی سمجھا گیا جو کسی طرح ہماری امیدوں کے مطابق نہیں۔

غرض باوجود ان سب کے پروفیسر محمد حسین آزاد نے اردو نثر کے دامن کو
جسمیں اب تک قصے و حکایات کے سوا کچھ نہ تھا، تاریخ و ادب کے جواہر ریزوں سے
بھر دیا اور سچ پوچھئے تو اردو لٹریچر کا سنگ بنیاد انہی نے رکھا اور اس حیثیت سے
انھیں ادب اردو کا بانی کہا جائے تو بیجا نہیں۔

تصانیف نذیر احمد ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تصنیفات پر نظر ڈالنے سے ایک عجیب اجتماع
ضدین نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو اُن کے ناولوں اور افسانوں کا مجموعہ ہے،

دوسری طرف ان کی مذہبی سنجیدہ تصانیف ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی عربی قابلیت اور قرآن، حدیث و فقہ پر عبور کلی ہونے کا اقتضا تو یہ تھا کہ ان کے قلم سے انہی مذہبی علوم پر کتابیں نکلتیں لیکن بعض خارجی اثرات کی کشش نے انھیں اس جادۂ مستقیم سے ہٹا دیا اور ناولوں اور قصوں کی یہ طویل فہرست جو ان کے مصنفات میں نظر آتی ہے، اسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے۔ ان کے تصنیفی مشغلہ کا آغاز ایک عجیب طرح سے ہوا جو خود انہی کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ اپنے "درباری لیکچر" میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاوسے پڑھیں۔ ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال آپ کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کیلئے "مراۃ العروس"، چھوٹی کے لیے "منتخب الحکایات" بشیر کے لئے "چند پند"۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں بلکہ ہر ایک کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھکر ہر ایک کے حوالے کر دیے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جسکو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لئے اور جسکو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے لئے مستعجل تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی، کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھدیا کرتا۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان پورا ہوا" لیکن ان قلمی مسودات کو کتابی صورت میں لانے کا ڈپٹی صاحب کو کوئی خیال بھی نہ تھا۔ انھوں نے تو یہ قصے اور افسانے اپنے بچوں کی خانگی تعلیم کی غرض سے لکھے تھے انھیں کیا معلوم تھا کہ آئندہ نسلیں ان قصے کہانیوں کو میری تصنیفات کی سرفہرست قرار دینگی بہرحال ان قلمی مسودات کا مطبوعہ صورت میں آنے کا واقعہ پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ ہی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایکدن انکے چھوٹے لڑکے بشیر کی کہیں صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی ڈائرکٹر صاحب نے بشیر سے پوچھا کہ آجکل تم کیا پڑھتے ہو؟ بشیر نے جو ان کتابوں کا نام لیا تو صاحب نے

تعجب سے کہا کہ ان ناموں کی کتابیں کوئی اردو میں نہیں ہیں۔ اس پر بشیر نے جواب دیا کہ یہ کتابیں تو ابا نے میرے اور آپا کے لئے لکھدی ہیں۔ پھر کپتان صاحب نے کہا کہ اچھا دوڑ کر انھیں لے آؤ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور چند پند، مراۃ العروس اور منتخب الحکایات کے قلمی نسخے اٹھا لایا۔ ڈائرکٹر صاحب نے جب انھیں دیکھا تو مراۃ العروس کو بہت پسند فرمایا اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دیے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب کو اس کتاب پر ایکہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی ٹائم پیس انعام میں ملا۔ اس سے بڑھکر یہ کہ ان کا نام گورنمنٹ گزٹ میں نکل گیا۔ پھر کیا تھا" بقول خود انھوں نے "تصنیف کا ڈربہ کھولدیا۔۔۔۔۔ مراۃ العروس کے بعد سینڈ فورڈ کی طرح ایک ناول "بنات النعش" لڑکیوں کے لئے لکھا اور اسکو بھی بطمع انعام سرکار میں چلتا کیا"

غرض ڈپٹی صاحب کے تصانیف کی ابتدا اپنے بچے بچیوں کی خانگی تعلیم دینے کے خیال سے ہوئی، اور سرکاری انعامات نے اسمیں ان کی مزید ہمت افزائی کی۔ ان کی تمام ابتدائی تصانیف میں ان دونوں میں سے کسی نہ کسی ایک جذبہ کی کار فرمائی ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے صرف ونحو میں دو رسالے اپنے لڑکے کے لئے لکھے جن کا نام مَا یَغْنِیْکَ فی الصرف اور مَا یُغْنِیْکَ فِی النَّحْوِ رکھا۔ ان رسالوں میں انھوں نے قدیم طریقۂ درس کے خلاف کسیقدر جدت سے کام لیا تھا جسے بدقسمتی سے اس زمانہ کے صرفی ونحوی مولویوں نے پسند نہ کیا اور اس پر انھیں کچھ انعام بھی نہ ملا۔ اس کے بعد انھوں نے سرکاری اعلان پر منطق میں ایک رسالہ "مبادی الحکمۃ" لکھا جو مقبول ہوا اور پانسو انعام کا مستحق قرار پایا۔ اسی زمانہ میں گورنمنٹ کی طرف سے علم ہئیت کی ایک انگریزی کتاب "گولمنز ہون" کے ترجمہ کا اشتہار مع ایکہزار انعام کے شایع ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے بعض دوستوں نے انھیں اس کام پر آمادہ کیا

چنانچہ بڑے اصرار کے بعد انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور پورا کر کے گورنمنٹ ہند کو بھیجدیا۔ ایک عرصہ کی ردوکد کے بعد سرکار سے وہ ترجمہ مع ایکہزار انعام کے واپس ملا۔ (نہ جانے اس کے طبع ہونے کی بھی نوبت آئی یا نہیں۔) ان متفرق چھوٹی چھوٹی تصنیفات کے علاوہ ڈپٹی صاحب کے قلم سے سرکاری رویدادول وغیرہ کے ترجمے بھی وقتاً فوقتاً نکلتے رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تعزیرات ہند کے اردو ترجمہ میں بھی ڈپٹی صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ڈپٹی صاحب کے تصنیفی مشغلہ کی ابتدا خواہ کسی طرح پر ہوئی ہو لیکن افسانہ نویسی ان کا طبعی رنگ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے تمام ناولوں میں "توبۃ النصوح" کو غالباً سب سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے اقتباسات نہ صرف سرکاری مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں بلکہ پوری کتاب نو وارد انگریزی حکام کے نصاب میں داخل ہے۔ ہر انگریز بتدی کے لئے جو اردو سیکھنا چاہتا ہے اس کتاب کا پڑھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ قصے میں چونکہ صوم وصلوٰۃ کی تاکید، خیرات و زکوٰۃ کی ہدایت اور دیگر اسلامی عقاید مثلاً جنت و دوزخ جزا و سزا وغیرہ کا ذکر ہے اس بنا پر شروع شروع میں گورنمنٹ نے اپنی مذہبی غیر جانبدارانہ پالیسی کے منافی سمجھکر اسے رواج دینا مناسب نہ سمجھا تھا لیکن پھر بعد میں کوئی خاص نقصان نہ دیکھکر اسکی اشاعت کی اجازت دیدی اور اسکی وہ قدر افزائی کی کہ مسلم غیر مسلم ہر طبقہ سے اسکی مانگ آنی شروع ہوگئی۔ "ترقی زائر" (پلگرمس پروگرس) جس کا "نیرنگ خیال" کے سلسلہ میں اوپر ذکر ہوچکا ہے، عام مضمون کے لحاظ سے "توبۃ النصوح" سے ایک حد تک بہت ملتی جلتی ہے لیکن اس میں اسلام کے ان بنیادی اور عالمگیر عقاید و مسایل کی تصریح کرنیکی کوئی کوشش نہیں کیگئی ہے جس سے یہ کتاب بے تعصب غیر مسلموں کے دلوں کو اپیل کرسکتی۔ ممکن ہے ایک محدود طبقہ میں اصلاح اخلاق اور پابندی مذہب میں

کسی حد تک ممد ثابت ہوئی ہو۔
"مراۃ العروس" جیساکہ اوپر بیان کیا گیا، ڈپٹی صاحب نے اپنی بڑی لڑکی کے پڑھانے کے لیۓ لکھنا شروع کیا تھا لیکن دراصل اسکی تہ میں ایک اور مقصد نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سلطنت مغلیہ کے چراغ گل ہو جانے سے کتنے اسلامی گھرانے بے چراغ ہو رہے تھے۔ باہر کی حالت تو جیسی کچھ تھی ظاہر تھی، گھر کے اندر اس سے بھی بدتر کیفیت تھی۔ عورتوں میں نہ کوئی تعلیم و تربیت، نہ کچھ مذہبی و اخلاقی روح اور نہ زندگی کے کوئی آثار نظر آتے تھے۔ لے دے کے کچھ پرانے رسم و رواج باقی رہ گئے تھے ڈپٹی صاحب نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ بچہ کی تعلیم و تربیت کی پہلی معلم ماں ہے، اس کا پہلا مکتب گھر کی چہار دیواری ہے اس لیۓ مردوں کی تعلیم و تربیت سے مقدم اور ضروری عورتوں کی اصلاح و تربیت ہے چنانچہ اس غرض کے لیۓ انھوں نے متعدد قصے اور افسانے لکھے تاکہ انھیں پڑھکر عورتیں اپنی حالت سدھاریں اور ان کی گودوں سے اچھے تربیت یافتہ بچے نکلیں۔ غرض عورتوں کے عادات و اطوار ان کی معاشرتی اور مذہبی خرابیوں اور ان کی جاہلانہ رسوم و رواج کا جس عبرت انگیز طریقہ میں اس میں ذکر ہے، اس کے لحاظ سے یہ کتاب معناً بھی 'مراۃ عروس' ہے جسے پڑھکر عورتیں اپنی اخلاقی و مذہبی حالت درست کر سکتی ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ "بنات النعش" کے نام سے موسوم ہے جسمیں علمی معلومات حاصل کرنے کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے۔ "مراۃ العروس" کو تھوڑے ہی عرصہ میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ انگریزی، بنگالی، گجراتی، بھاشا، پنجابی اور کشمیری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو گئے۔ اس سلسلے کی سب سے آخری کتاب غالباً "رویائے صادقہ" ہے جو بعض کے نزدیک ان کا سب سے بہتر ناول خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں دہلی کی معاشرتی زندگی کا بہت ہی پر اثر نقشہ کھینچا گیا ہے،

لیکن ڈپٹی صاحب کی آخری قلمی یادگاریں کچھ دوسری نوعیت رکھتی ہیں اور وہی اُن کا اصلی اور فطری رنگ معلوم ہوتا ہے جو اخیر زمانہ عمر میں صاف طور پر نمایاں ہوکر رہا۔ اس سے ہماری مراد مذہبی رنگ ہے۔ حیدرآباد کے سکون بخش زمانۂ ملازمت میں ڈپٹی صاحب جب سرکارِ انگریزی کے بارِ احسان سے کسیقدر سبکدوش ہوئے اور حکومت کی برکات سے کنارہ کش ہوکر اطمینان وعافیت کی زندگی بسر کرنے لگے تو اسوقت انھیں خدا یاد آیا۔ عربی زبان وادب کا ذوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ کلام جاہلیت کے سیکڑوں ہزاروں اشعار اور نثر ین صفحے کے صفحے زبانی یاد تھے۔ اسی ذوق ادبی کی بنا پر قرآن کا بھی بہت حصہ یاد کرلیا تھا چنانچہ بعد میں صرف چھ مہینے کی محنت سے پورے حافظ ہوگئے۔ کلام مجید سے ایک تو ذاتی شغف اور دوسرے احباب کا ایک بامحاورہ ترجمہ کا اصرار، یہ اسباب تھے جنھوں نے ڈپٹی صاحب کو اس خدمتِ دین پر آمادہ کیا۔ ہر چند کہ کلام الٰہی کا رعب اس جرارت کی اجازت نہ دیتا تھا لیکن آخر کار کمر بستہ ہوگئے اور تین سال کی مدت میں اس کام کو انجام دیا جو آج "مصحف القرآن" کی شکل میں ہر مسلمان کے ہاتھ میں نظر آتا ہے اور جو عرف عام میں "ڈپٹی صاحب کے قرآن" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کے ترجمے اس سے بیشتر بھی ہوچکے تھے لیکن وہ یا تو فارسی میں تھے یا تحت اللفظ اردو میں۔ ڈپٹی صاحب جو فن ترجمہ سے خوب واقف تھے، تمام دشواریوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ فارسی ترجمہ ملک کی عام ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا اور نہ تحتِ لفظی کا طریقہ مطالب قرآنی کے سمجھنے میں مفید ہوسکتا ہے۔ اس بنا پر عام فائدہ رسانی کی غرض سے انھوں نے قرآن کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا اور ربط مطلب کے لئے قوسین میں اپنی طرف سے عبارتیں بڑھاتے گئے ہیں۔ شروع میں ہر مضمون کے آیات کی فہرست بھی دیدی ہے تاکہ کسی خاص

عنوان پر قران حکیم سے مواد تلاش کرنا ہو تو آسانی سے فراہم کیا جا سکے ۔ غرض مسلمان جو ایک عرصہ سے زندگی کے اس دستور العمل سے ناآشنا ہو گئے تھے ' ڈپٹی صاحب نے انھیں اس سے روشناس کرا کر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے ۔ اس کے علاوہ ڈپٹی صاحب نے مسلمانوں کی عام حالت خراب دیکھکر ترجمہ قران ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ان کے معمولات زندگی اور عبادات مذہبی کی اصلاح و درستگی کے لئے انھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھی جو "الحقوق و الفرایض" کے نام سے تین جلدوں میں ہے جسکی مجموعی ضخامت ایک ہزار صفحوں سے کچھ اوپر ہے ۔ اس کتاب میں بتفصیل یہ بتایا گیا ہے کہ 'حقوق اللہ' اور 'حقوق العباد' کیا کیا ہیں ؟ کتاب کے پہلے حصہ میں تمام عبادات مع جزئیات کے آجاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ حج کے بیان میں مسجد حرم کے منارے اور کنگروں کی تعداد اور مسجد کا طول و عرض بھی دیا ہوا ہے ۔ دوسرے حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تعلقات والدین ' استاد ' ہمسایہ اور حکومت وغیرہ کے ساتھ کیسے ہونے چاہیئں ۔ جہاں حکومت کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات سے بحث کیگئی ہے ' آج ان کا مطالعہ کرنا دلچسپی اور حیرت سے خالی نہیں ۔ اطاعت حکام کے لئے جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں " انہیں سنکر ابتدائی جماعت کا ایک بچہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

لیکن ڈپٹی صاحب کی عربی زبان و ادب کی بے نظیر قابلیت کا صحیح اور کافی استعمال یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ایک قران کے ترجمہ پر اکتفا کیا یا احادیث و فقہ کے مطالب کو پھیلا کر اردو میں لکھدیا ۔ ترجمے ان سے پہلے بھی ہوئے اور بعد میں ہوتے ۔ حدیث و فقہ کے مسایل کی تعلیم و تلقین کے لئے عربی مدارس کے اساتذہ و طلبہ کافی تھے ۔ عربی کے اس فاضل سے جو کم سے کم توقع تھی وہ یہ کہ آزاد کی طرح عربی زبان و ادب کی ایک تاریخ ہی

"سخندانِ عرب" کے نام سے تیار کردے گا اور یہ ان کی بے مثال عربی دانی کا صحیح و بہترین استعمال ہوتا۔ ایک ایسی تصنیف کی کمی اردو زبان میں عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی اور مستقبل قریب میں بھی اس کے پورا ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

تصنیفاتِ حالی

اردو میں جس مخصوص شعبۂ علم کی ترقی مولانا حالی کی ذات سے ہوئی ہے، وہ 'فن سوانح نگاری' ہے۔ حالاتِ زندگی اس سے پہلے بھی اردو میں لکھے جاتے تھے لیکن مولانا نے اس فن میں ترتیب واقعات کا جو طریقہ اور ان کے انداز بیان کا جو نمونہ پیش کیا ہے، وہ نہ صرف ان کی علمی زندگی کا سب سے درخشاں کارنامہ ہے بلکہ اردو میں ایک بیش بہا اضافہ بھی ہے۔ قدما کے نزدیک سوانح نگاری کا دستور اب تک یہ رہا ہے کہ وہ جو حالات زندگی لکھتے تھے، وہ تصویر کا ایک رخ ہوتا تھا یعنی اس کے تمام تر محاسن اور خوبیاں ہی بیان کرتے تھے۔ اسکی زندگی کے کارناموں اور اس کے حالات پر کوئی تنقیدی نظر نہ ڈالتے تھے۔ برعکس اس کے یورپ کی سوانح نگاری کا یہ طریقہ ہے کہ ہیرو کے اوصاف حمیدہ اور اس کے کارنامے گناتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ کہیں کہیں اسکی لغزشوں اور کمزوریوں کی طرف بھی دبی زبان سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اگر ان کی نیت پر بے جا شبہ کرنے کا الزام نہ دیا جائے تو یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس سے ایک طرف ان کا مقصود اپنی نمائشی بے تعصبی و حق گوئی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری جانب یہ اپنے ہیرو کی عظمت اور بزرگی جتانے کا ایک دوسرا طریقہ ہے۔ بارگاہِ اخلاق سے پہلا گروہ اگر پاسداری اور بیجا حمیت کا مرتکب کہلائے گا تو دوسرا طبقہ ریا، فریب اور خدع کا مجرم قرار پائے گا۔ مولینا حالی پر جو "مناقب گوئی اور بے جا مداحی" کا الزام لگایا جاتا ہے، اس کے لئے وہ معذور تھے

یہ دونو طریقے اُن کے پیش نظر تھے جنمیں سے انھوں نے اول الذکر کا انتخاب کیا۔ یہ گویا دو برائیوں کے درمیان انتخاب تھا اور حالی نے اگر اُسے پسند کیا جو کم بری تھی تو کیا بے جا کیا۔

مولانا حالی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ "حیات جاوید" سمجھا جاتا ہے بے جا حمیت اور پاسداری کا جو الزام اُن پر عاید ہوتا ہے، وہ اسی تصنیف کی بنا پر ہے لیکن کوئی شخص بھی جو سرسید کی جگہ پر ہوتا اور حالی جیسا رفیق اسے ملتا تو وہی واقعہ پیش آتا جو "حیات جاوید" کی شکل میں نمودار ہوا تقریباً ایسی ہی ایک مثال ہم کو انگریزی لٹریچر میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے جو انگلستان کا بہت ہی لائق اور عالی دماغ شخص گزرا ہے، جب انتقال کیا تو اس کے ایک دوست جیمز باسول نے اسکی لایف ۴ جلدوں میں لکھی جسمیں اس کی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی نہایت تحسین آمیز لہجہ میں۔ مولینا حالی نے بھی سرسید کے ساتھ وہی حق رفاقت ادا کیا، جو باسول نے جانسن کے ساتھ کیا تھا۔ قطع نظر اس الزام کے کہ اس تصنیف میں بیجا مدح سرائی اور پاسداری سے کام لیا گیا ہے، دو خصوصیات بہت ہی نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ سرسید کی زندگی کے مشہور و غیر مشہور، ضروری و غیر ضروری، دلچسپ و غیر دلچسپ ہر قسم کے واقعات کا مصنف نے استقصا کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ پوری کتاب شروع سے اخیر تک ایک اعتذار (اپالوجی) کا پہلو لیئے ہوئے ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے۔ سرسید مرحوم اپنے وقت کے ایک غیر معمولی شخص تھے۔ ایسے زمانہ میں جبکہ ہر شخص زبان حال سے نفسی نفسی کر رہا تھا، اس شخص نے قوم کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں پر زوالِ حکومت کا خمار طاری تھا اور اس حالت میں وہ تعلیم و معاشرت، مذہب و سیاست سب کچھ بھلا بیٹھے تھے، سرسید نے ان

کو اس خواب گراں سے جگانا چاہا لیکن اس کوشش میں سب سے بڑا ظلم جو انھوں نے کیا وہ یہ کہ مذہب کو ہاتھ لگایا۔ مذہب مسلمانوں کو جان و مال ہر چیز سے زیادہ ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ انھوں نے اسپر جب کبھی آنچ آتے دیکھی تو چراغ پا ہو گئے۔ عربی داں مولویوں نے جب مداخلت کرتے دیکھا تو ان پر کفر کے فتوے لگانے شروع کئے۔

دوسری طرف اسی زمانہ میں برادران وطن حکومت سے اپنے سیاسی و ملکی حقوق حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور اس کے مطالبہ کے لئے تمام ہندوستانکی ایک قومی جماعت کانگریس کے نام سے قایم کر لی تھی۔ اور مسلمانوں کو بھی اس میں شرکت کرنیکی دعوت دی۔ سرسید نے یہ دیکھکر کہ مسلمانوں کی جماعت تعلیم میں اپنے برادران وطن سے بہت پیچھے ہے اور تاوقتیکہ وہ اس کمی کو پورا نہ کرلے، وہ انکا ساتھ جیسا کہ چاہیئے، نہیں دیسکتی۔ اس بنا پر انھوں نے کانگریس کی شرکت سے انکو علحدہ رکھنا چاہا۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مسایل تھے جنمیں سرسید نے عام روش سے جدا اپنی راہ اختیار کی تھی۔ جن کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہبی فرقہ ان پر "نیچریت" کا الزام لگاتا ہے اور ان کی تکفیر کے درپے ہے۔ پرانے خیال کا طبقہ انگریزی اور جدید علوم کے رواج دینے پر ناراض۔ برادران وطن ان کی مسلم نواز پالیسی سے نالاں اور ان کو سرکار پرستی اور ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کے اتہامات لگاتا ہے۔ غرض جو شخص اپنے اور بیگانوں دونو میں اس طرح معتوب و مطعون سمجھا جایے، اس کے سوانح نگار کا لب و لہجہ اعتذار آمیز نہ ہو تو کیا ہو سکتا ہے۔ اور رفع الزامات اور برارت کی یہی کوشش تھی جسکی بنا پر مولینا حالی نے سرسید کے متعلق چھوٹے بڑے ہر واقعہ کو جگہ دی اور ان کے ہر قول و فعل کو مستحسن اور قابل داد سمجھا۔

'لائف'، لکھنے میں خواہ قدیم طریقہ اختیار کیا جائے یا جدید۔ لیکن

اتنا ضرور ہے کہ مصنف ہیرو کے انتخاب کرنے اور اس کے سوانح زندگی لکھنے میں کوئی نہ کوئی متعین مقصد پیش نظر رکھتا ہے۔ مثلاً تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس مقصود ہو تو کسی بڑے پیغمبر یا ہادی کی سوانحعمری لکھے گا۔ علمی تحقیق و تفتیش کا شوق پیدا کرنا منظور ہے تو کسی ایسے شخص کے حالات زندگی بیان کرے گا جس نے اپنی تمام عمر جستجوئے علم اور تحقیقِ مسایل میں صرف کردی ہے۔ یا سوانح نگاری کی دوسری صورت یہ ہے کہ مصنف اپنے ہیرو کے عام حالات زندگی بیان کرنے کے بعد اس کا سب سے نمایاں وصف اجاگر کرکے دکھائے۔ مثلاً نپولین کی لائف لکھنی ہے تو اس کے دیگر واقعات زندگی کو معمولی طور پر بیان کرنے کے بعد مصنف کا فرض ہو کہ اس کے جنگی کارنامے اور دلیری و بہادری کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ دکھائے۔ یا مثلاً نیوٹن کی سوانحعمری میں ریاضی کے متعلق تحقیقات مسایل اور اس کے دوسرے علمی اور سائنٹفک نظریات کا ذکر تصنیف کا غالب جزو ہونا چاہیئے غرض یہ دونوں اصول ہیں جن میں سے ایک نہ ایک کا پابند ہونا سوانح نگار کے لیئے ضروری ہے چنانچہ انھیں مبادیات کی روشنی میں مولینا حالی کی طرز سوانح نگاری اور ان کی تصنیف کردہ سوانحعمریوں کو دیکھو۔ "حیات جاوید" کی تصنیف میں تو معلوم ہوچکا کہ ان مبادیات سے قطع نظر ذاتی و شخصی تعلقات کا وہ جذبہ کام کر رہا تھا جس نے باسول کو جانسن کی لائف لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ باقی رہیں دو تصانیف یعنی "یادگار غالب" اور "حیات سعدی"۔ ان میں مصنف کا کوئی خاص مقصد صاف طور پر نہیں ظاہر ہوتا ہے بلکہ مولینا کا ذوق ادبی ہندوستان و ایران کے ان دو بڑے شعرا کے حالات زندگی لکھنے کا متقاضی ہوا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کی زندگی ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے کوئی سبق رکھتی ہے یا مرزا کے خانگی حالات اور احباب کے تعلقات کا ذکر حیات انسانی میں کسی نئے باب

کا اضافہ کرتے ہیں، بلکہ جس چیز نے غالب کو غالب کیا، وہ ان کی بے مثل فلسفیانہ شاعری ہے۔ ایسی صورت میں "یادگار غالب" کے مصنف کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ مرزا کی شاعری کے مختلف دور، ان کے معاصرین میں ان کا درجہ، شاعری کے مختلف اصناف میں ان کے کمالات پیش کئے جاتے۔ لیکن اس سے قطع نظر کر کے مرزا کے حالات زندگی، اخلاق و عادات، لطائف و امثال پر تصنیف کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے۔ البتہ اخیر میں کسی قدر اردو و فارسی نظم و نثر کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری چند صفحوں میں مرزا کی فارسی نثر کا مقابلہ ظہوری، علی حزیں اور ابو الفضل کی نثر سے کیا گیا ہے۔ اس کے لئے مصنف کی طرف سے یہ معذرت کہ "یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گزار تھا اسی قدر پبلک کے لئے خاصکر اس زمانہ میں غیر مفید بھی تھا" آج کہاں تک قابل قبول ہو سکتی ہے، اس کا فیصلہ خود ناظرین پر چھوڑا جاتا ہے۔

سوانحمریوں کے علاوہ اردو نثر میں مولینا حالی کی ایک قابلانہ تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" ہے جس میں فن شاعری اور اسکی مختلف اصناف پر ایک حد تک فلسفیانہ اور ناقدانہ حیثیت سے بحث کیگئی ہے۔ بالخصوص اردو شاعری کے حسن و قبح اور اس کے اصل پر بہت کچھ تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ غیر ضروری مباحث یا بے جا طوالت سے بھی بہت کام لیا گیا ہے جس سے تصنیف کا رتبہ بہت کچھ گھٹ گیا ہے۔

ہر فن کا ایک خاص موضوع بحث ہوتا ہے جس کے دائرہ سے باہر نکلنا خود مصنف اور تصنیف دونو کی ایک بڑی خامی سمجھی جاتی ہے۔ "علم تشریح" (اناٹومی) کا ایک مصنف اگر ماہیت قلب اور اسکی نقل و حرکت سے بحث کرتے کرتے شاعری پر اتر آئے اور دل کے لئے "مدفن آرزو"، اور "آماجگہ مژگاں" کی شاعرانہ

اصطلاحات استعمال کرنے لگے یا "داغہائے دل" کی تلاش میں برسوں سر مارے
تو یہ اس کی کسقدر ناموزوں اور بے سود کوشش ہوگی۔ اسی طرح ایک شاعر
گلاب کی تعریف کے سلسلہ میں اس کے متعلق علم نباتات (بیالوجی) کی تحقیقات
شروع کرے تو اس کا یہ فعل کسقدر مضحک ہوگا گو اپنی اپنی جگہ پر علم تشریح و علم
نباتات اسی قدر ضروری اور مفید ہیں جسقدر شاعری و انشا پردازی غرض
مضامین کی بعض ایسی ہی نامناسبت اور بے تعلقی ہے جو "مقدمہ شعر و شاعری"
میں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ شعر و شاعری پر بحث کرتے کرتے شعرا کے اخلاق
کی اصلاح اور انھیں فن عروض کی تعلیم دینا ایسا ہی غیر مناسب اور ناموزوں
معلوم ہوتا ہے جیسے علم تشریح میں قلب کی مرکزیت اور اس کے افعال سے
بحث کرتے کرتے غالب کا یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا جاے کہ ۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　　جو چیرا تو اک قطرہ خوں بھی نہ نکلا

یہ مانا کہ بعض اردو شعرا مبتذل مضامین باندھتے ہیں یا سنگلاخ زمینوں میں
غزلیں لکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن فلسفۂ شعر و شاعری سے بحث کرنے والے کو
تہذیب اخلاق اور درس عروض سے کیا غرض ۔ اس کے علاوہ بعض مثالیں
جو مطالب کو واضح کرنے کے لئے پیش کیگئی ہیں انمیں اسقدر بیجا طوالت سے کام
لیا گیا ہے اور بعض ان میں ایسی عامیانہ ہیں جو شاعری کے ایسے فلسفیانہ اور لطیف
مباحث کے شایانِ شان ہرگز نہیں۔

تصانیف شبلی | ادب اردو کے ذخیرہ میں اب تک ہر سہ مصنفین نے جو اضافے کئے
وہ تاریخ، دینیات، سوانح اور تنقید ادب پر مشتمل ہیں۔ علامہ شبلی نے ان
اصناف علوم پر تو بہت کچھ بیش بہا اضافے کئے ہی لیکن ان کے علاوہ بہت سے
جدید علوم و فنون کو بھی اردو سے روشناس کیا۔ ان کی تصنیفات کسی اتفاقی سبب

یا صلۂ انعام کی رہین منت نہیں بلکہ انھوں نے وقت کی ضروریات اور اردو لٹریچر کی اصل کمی کو محسوس کرکے یہ کام شروع کیا تھا۔ یہ بھی نہ تھا کہ ہنگامی طور پر کوئی خیال دماغ میں آیا اور اس پر کچھ لکھ ڈالا یا دوسروں کو لکھتے پڑھتے دیکھا اور ان کی ریس میں قلم ہاتھ میں اٹھالیا۔ بلکہ ان کے پیش نظر ایک متعین مقصد اور ان کے طریقۂ عمل کے لیے ایک مقررہ پروگرام تھا۔ انھوں نے ایک طرف زمانہ 'حال' کی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے 'ماضی' سے سبق لیا اور دوسری طرف 'مستقبل' پر بھی نظر جمائے رکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ جسطرح اسلامی علوم جو سلطنت عباسیہ کے زمانہ تک مذہب اور اس کے متعلقات پر مشتمل تھے، یونانی علوم وفنون کے اثر سے یکبارگی بدل گئے، بعینہ آج بھی مغربی علوم اور سائنس کے رواج نے ہمارے قدیم فلسفہ، کلام، تاریخ اور ادب کی بنیادوں کو متزلزل کردیا ہے۔ اس بنا پر انہوں نے تصنیف وتالیف کا ایک مستقل لائحہ عمل تیار کیا، جن کے بعض اجزا ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"(۱) فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے

(۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفہ حال کے کون کون سے مسایل مذہب کے خلاف ہیں پھر ان مسایل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

(۳) جس قسم کے مضامین پر آجکل یورپ میں تصنیفات ہورہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں انھیں موازنہ کرکے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے۔ مثلاً تاریخ، اسمار الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں۔ انہی مضامین میں یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، موازنہ کرکے بتانا چاہیئے کہ دونو کے مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کسکو کس حثیت سے ترجیح ہے۔

(۴) خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کس زمانہ میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوئیں۔ اور کن اسباب سے ہوئیں؟ ان کا کسقدر حصہ صحیح ہے؟ کسقدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے؟۔

(۵) فارسی اور عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ لکھی جائے۔

(۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جارہے ہیں، اردو زبان میں ترجمہ کے ذریعہ سے لائے جائیں۔

(۷) مسلمانوں کی تہذیب وتمدن پر تاریخانہ مضامین لکھے جائیں۔ مثلاً انتظام عدالت، انتظام محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم ونسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مورخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس عہد میں کیا اضافہ ہوا؟"

اس پروگرام کو سامنے رکھئے اور علامہ شبلی کی تمام تصانیف کی بہ لحاظ فن تقسیم کیجئے اور پھر ہر ایک کا جائزہ لیجئے کہ انھوں نے ان دور اندیشانہ اور بلند پایہ تجاویز کو کہاں تک عمل کا جامہ پہنایا، اور جو کچھ ان سے رہ گیا، اسکی تکمیل میں اُن کے اخلاف کسقدر سرگرمی وانہماک کے ساتھ کوشاں ہیں۔ غرض علامہ شبلی کی تصانیف کی اگر بڑی بڑی تقسیم کی جائے تو وہ تاریخ اشخاص، یا تاریخ علوم یا ان دونوں کے علاوہ تنقید ادب پر مشتمل ہوں گی۔

کارلائل کا ایک بلیغ فقرہ مشہور ہے کہ "تاریخ عالم صرف اس کے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے"۔ غالباً اسی قسم کا خیال تھا جسکی بنا پر علامہ شبلی نے اسلام کی ایک مکمل اور باضابطہ تاریخ لکھنے کی بجائے "ناموران اسلام" کے سلسلہ سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی الفاروق ہے

جو خلیفہ ثانی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سوانحعمری اور ان کے علمی و عملی کارناموں کی محققانہ تاریخ ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ تاریخ اسلام کے روشن ترین صفحات ہیں۔ الفاروق مولینا کے مورخانہ اجتہادات اور علمی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے جس کے لئے انھوں نے مصر، شام اور ترکی کی خاک چھانی۔ المامون اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جو ہارون الرشید کے بیٹے مامون کی لائف پر ہے بلکہ ایک طرح سے تاریخ عباسی کا ایک چھوٹا سا مرقع ہے۔ یہ دونوں تصانیف اسقدر معروف ہیں کہ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

علامہ شبلی نے نہ صرف صاحبان تاج و تخت کی سوانحعمری لکھی بلکہ اہل علم و فن کے حالات زندگی بھی درج کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر تصنیف امام اعظمؒ کی سوانحعمری ہے جو "سیرۃ النعمان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں امام صاحب کے تفقہ فی الدین اور اجتہاد مسایل سے بحث کرنے کے علاوہ علم فقہ کی تاریخ بھی لکھی ہے، یعنی یہ کہ یہ علم کب سے رایج ہوا؟ کب اسکی تدوین ہوئی؟ فقہ حنفی کے اسقدر قبول و شیوع ہونیکی کیا وجہ ہے؟ ان سب سوالات کا نہایت محققانہ جواب دیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک بڑا کام اور بھی کیا ہے۔ اسلامی فقہ پر یورپ کی طرف سے ایک بڑا الزام یہ چلا آتا تھا کہ یہ قوانین رومہ (رومن لا) سے ماخوذ ہے، مولینا شبلی نے اس الزام کی تردید کی اور بتایا کہ امام صاحب کے وقت تک یورپ سے قانون یا فقہ پر کوئی کتاب ترجمہ ہو کر نہیں آئی تھی۔ اور فقہ حنفی جو کچھ بھی ہے وہ امام صاحب کا خود اپنا اجتہاد ہے۔

علامہ شبلی کی ایک دوسری تصنیف "سوانح مولانا روم" ہے۔ مولینا روم کو اب تک دنیا ایک صاحب دل اہل باطن کی حیثیت سے جانتی تھی اور ان کی مثنویوں کو اسرار نہانی کا خزینہ اور کشف صدر کا ذریعہ سمجھتی تھی لیکن انھیں

علامہ شبلی نے ایک دوسری حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی مثنویوں سے جس طرح صوفیائے کرام مسایل تصوف اخذ کرتے ہیں، علامہ نے ان سے عقاید و کلام کے مضامین کا استنباط کیا ہے، اور نہ صرف یہی بلکہ شاعری کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بہت بلند رکھا ہے۔ اسی ضمن میں طریقت، شریعت، اور معرفت کی منطقیانہ تعریفیں کی ہیں اور اُن پر جس حکیمانہ انداز سے بحث کی ہے وہ اردو کی بساط دیکھتے ہوئے بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔ علامہ شبلی نے تصوف اور اس سے متعلق بعض مسایل کی طرف اس کتاب میں مختصر جو کچھ لکھا ہے انھیں "الغزالی" میں میدان کشادہ پاکر تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ امام غزالیؒ کے حالات زندگی اور بھی کوئی شخص چاہتا تو آسانی کے ساتھ لکھ سکتا تھا لیکن دونوں میں جو فرق ہوتا اس کا اندازہ کسی قدر "الغزالی" پڑھکر ہو سکتا ہے جسمیں مولینا شبلی نے اس بڑے امام کے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کو اس سادہ اور عام فہم طریقہ پر بیان کیا ہے جسے پڑھکر فلسفہ پر ایک عام علم کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے تصوف کی وجہ تسمیہ، اسکی مختلف توجیہات نہایت سلجھے ہوئے پیرا یے میں بیان کئے ہیں۔ "سیرۃ النبی" نہ صرف تصانیف شبلی کی اس نوع یعنی "تاریخ رجال" میں آخری تصنیف ہے بلکہ خود مولینا کی زندگی کا سب سے آخری علمی کارنامہ ہے۔ پیغمبر اسلام کی سیرۃ لکھنی کوئی نئی یا غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن اکثر معمولی اور پرانی باتیں اسقدر محتاج توجہ ہوتی ہیں جتنی نئی اور غیر معمولی نہیں ہوتیں سیرت یا حیات نبی پر تقریباً ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر زبان میں جسے اسلام سے کچھ بھی تعلق رہا ہوگا، کچھ نہ کچھ ضرور لکھا گیا ہے۔ خود عربی میں ہزاروں لاکھوں تصانیف مختلف حیثیتوں سے آپ کی زندگی اور اخلاق پر موجود ہیں۔ سترھویں اٹھارھویں صدی میں یورپ نے جب اسلام کی طرف اعتنا کیا تو صدہا کتابیں

آپ کی لائف اور کارناموں پر مختلف مصنفین کے قلم سے جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں لکھی گئیں۔ ہندوستان میں بھی اس پیارے نبی کی حیات طیبہ پر کچھ نہ کچھ لٹریچر موجود ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود بھی ایک جدید تصنیف کی ضرورت اردو میں محسوس ہو رہی تھی جو موجودہ سیرتوں یا اور کسی کتاب کے ترجمہ سے ہرگز پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی صورت میں علامہ شبلی کا ایک ایسی تصنیف کا جو روایات کی پیچیدگی اور مغربی زہر آلود خیالات کی آلائشوں سے پاک ہو اپنے ہاتھ سے داغ بیل ڈالنا اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ اردو کی ایک ناقابل فراموش خدمت ہے یہ صحیح ہے کہ کہ علامہ مرحوم اس کام کو اپنے حین حیات پورا نہ کر سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کے حق میں اسکی عدم تکمیل ہی مفید تھی اس سلسلے سے اپنے بعد ایک جماعت تو ایسی چھوڑ گئے ہیں جو نہ صرف اس کام کی تکمیل میں سرگرم ہے بلکہ اردو کی دوسری خدمات بھی انجام دے رہی ہے۔

اردو تصانیف میں علامہ شبلی نے جس نئے باب کا اضافہ کیا ہے، وہ علوم و فنون کی تاریخ ہے اب تک نہ صرف اردو بلکہ فارسی و عربی تک میں علوم و فنون کی تاریخ لکھنے کا کوئی دستور نہ تھا۔ علامہ شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو ادب بلکہ اسلامی لٹریچر میں یہ بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ممکن ہے ضمنی طور پر انھوں نے بعض علوم مثلاً فقہ وغیرہ کی تدریجی ترقی پر لکھنے کی کوشش کی ہو لیکن "علم الکلام" ان کی وہ تصنیف ہے جسمیں انھوں نے باقاعدہ طور پر علم کلام کی ابتدا، اس کے عالم وجود میں آنے کے اسباب، اسکی عہد بعہد کی ترقیوں اور اس پر خارجی حالات کے اثرات سے مفصل بحث کی ہے اور اسی سلسلہ میں اکابر متکلمین کے حالات بھی مختصر طور پر لکھے ہیں اور ان کے دقیق فلسفیانہ خیالات کی بھی تشریح کرنے گئے ہیں اصل میں یہ کتاب "الکلام" کا تتمہ ہے جو اس فن پر ایک مستقل تصنیف ہے

اپنی عام روش سے علیحدہ اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس زمانہ میں مغربی علوم و تہذیب کا چرچا گھر گھر پھیلا ہوا تھا جن کی وجہ سے لوگوں کے مذہبی عقاید کی بنیادیں متزلزل ہونے لگی تھیں۔ سائنس کا اسقدر زور تھا کہ مذہب کوئی دن کا مہمان نظر آنے لگا، اس بنا پر بعض لوگوں نے ایک جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کی لیکن مولینا نے مسلمانوں کے اسی قدیم کلام کو موجودہ صورت حال کے مقابلہ کے لئے کافی سمجھا اور اس غرض سے انھوں نے اس فن پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ الکلام لکھا جسمیں مذہب کی ضرورت، اسلام کے فضایل، وجود باری کے دلایل، معجزات کا ثبوت، نبوت کی حقیقت اور یورپ کے ایک بہت بڑے الزام یعنی "اسلام مانع ترقی ہے" کا جواب اور ان تمام مسایل پر نہایت خوبی اور وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔

مولانا کی تصانیف میں تیسری نوع تنقیدات ادب کی ہے جسمیں سب سے معرکۃ الآرا تصنیف "شعر العجم" ہے۔ کسی قوم کے لٹریچر کی تاریخ پڑھو، تنقید ادبی کا نمبر سب سے بعد میں آئیگا اور اسکی وجہ ہے۔ کیونکہ تنقید موقوف ہے ذخیرۂ ادبی کی فراہمی پر۔ تاوقتیکہ ادب کا ایک کافی سرمایہ موجود نہ ہو، تنقید نہیں ہو سکتی۔ اور اس سے بڑھکر "تنقیدات عالیہ" (ہائی کریٹی سزم) نہ صرف ذخیرہ ادبی کے وجود بلکہ قوم کی صلاحیت و قابلیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اردو اگرچہ اپنی زندگی کے اس قلیل عرصہ میں اسقدر ذخیرہ فراہم نہ کر سکی لیکن اس کے پڑھنے والوں میں کم از کم وہ صلاحیت و قابلیت ضرور موجود تھی۔ اس بنا پر فارسی شاعری پر تنقیدات عالیہ اردو کے لئے نہ صرف ایک وقت کی چیز بلکہ اسکی نشو و نما میں بہت حد تک ممد ہیں۔ اس طرز کی تصنیف نہ صرف کسی غیر زبان بلکہ فارسی تک میں موجود نہیں ہے۔ "شعر العجم" کا نام لیتے ہی اور اس کے ساتھ اس ادعا کو سنکر

بعض لوگوں کا خیال پروفیسر براؤن کی "تاریخ ادبیات ایران" کی طرف مایل ہوتا ہے لیکن یہ خیال صرف دونوں سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ براؤن نے ایران کی دماغی وذہنی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے نہ کہ ایران کی شاعری پر۔ مستشرقانہ قابلیت اور وسیع النظری اَور چیز ہے اور شعر و سخن کا مذاق اور ذوق ادب کا ہونا ایک دوسری چیز۔ علامہ شبلی نے جو کچھ لکھا ہے وہ آشنائے فن ہوکر لکھا ہے جس سے براؤن قطعاً محروم تھے۔ اس نوع کی دوسری تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" ہے جسکے شایع ہونے پر بڑی لے دے ہوئی کہ ایک غیر شخص نے اس 'ارض ممنوعہ' میں کیوں قدم رکھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں ایک صاحب نے بڑے زور شور سے "المیزان" لکھی جسمیں انصاف کے ساتھ انیس اور دبیر کے دونوں پلے میزان میں برابر رکھنے کی کوشش کیگئی ہے جو موازنہ میں انیس کی طرف جھک گیا تھا۔ ان مصنفانہ مناظروں سے قطع نظر کرکے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو شعر العجم اور موازنہ دونوں اردو لٹریچر میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتیں۔

سب سے اخیر میں مولینا کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو "مقالات شبلی" اور "رسایل شبلی" کے نام سے الگ الگ موسوم ہے۔ ان میں بعض مضامین تو ایسے ہیں جو اردو میں تاریخی حیثیت سے اپنا مثل نہیں رکھتے۔ مثلاً "جزیہ" "کتبخانہ اسکندریہ" اور "فلسفہ یونان و اسلام"۔ اول الذکر نہ صرف اسلام میں بلکہ تاریخ ہند میں بھی ایک مابہ النزاع مسئلہ رہا ہے غیر مسلمین پر اس ٹکس کا عاید کرنا نہ صرف طلبہ کے نزدیک بلکہ اساتذہ کے زمرہ میں بھی اسلام کا ایک بڑا ظلم سمجھا جاتا تھا' لیکن مولینا شبلی نے جس محققانہ طور پر اس بے بنیاد ظلم کی بیخکنی کی ہے' اسے دیکھکر مصنف کی مورخانہ قابلیت کا غیر ستایشی اعتراف کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح کتبخانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام بھی مسلمانوں کی گردن پر ایک زمانہ سے

چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ بیگانے تو بیگانے یگانوں کو بھی اس ظلم کا یقین ہو چلا تھا لیکن علامہ شبلی نے اصل حقیقت کو جس طرح بے نقاب کیا ہے، وہ ان کے وسیع ذرائع تاریخی پر دسترس رکھنے کا بین ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں ایک چیز رہی جاتی ہے اور وہ مولینا کے مکتوبات ہیں جو ان کی غیر ارادی تحریر کا نمونہ ہیں اور وہ بھی کسیطرح ادبی حیثیت سے معاصرین کے مجموعۂ مکاتیب سے کم نہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ برعکس اور لوگوں کے مکتوبات کے علمی و تعلیمی معلومات و مشاہدات کا وہ بیش بہا مجموعہ ہیں۔

خاتمہ سوال کے دونو پہلو یعنی ادبی اور علمی کا جہاں تک تعلق تھا، ان پر کافی بحث ہو چکی۔ اور ہر ایک کے واقعات و شواہد کا دستیاب ہونا جہاں تک ممکن تھا، وہ سب پیش کئے گئے۔ اب ان پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ بے شک آزاد نے اردو زبان و ادب کا سنگ بنیاد رکھا اور نذیر احمد و حالی نے اس پر بہت کچھ اضافے کئے لیکن اس تعمیر کی تکمیل جس نے کی، وہ شبلی کی ذات تھی۔ یہ صحیح ہے کہ سلطنت مغلیہ کی بنیاد بابر نے ڈالی اور ہمایوں نے اسے بہت کچھ سنبھالا لیکن جس نے سلطنت مغلیہ کو اس قابل بنایا کہ وہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہو سکے، وہ شہنشاہ اکبر تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آزاد نے اردو کا علمی زبان کی حیثیت سے تخم رکھا اور نذیر احمد اور حالی نے اس میں سلاست و روانی کے ذریعہ اس کی نشو و نما کی، لیکن جس نے اردو کو دنیا کی اور زبانوں کے ساتھ آنکھیں ملانے کے قابل بنایا وہ شبلی تھے۔ اسی طرح اردو ادب کو جس نے اسقدر مالا مال کیا کہ وہ اپنے ہمعصر لٹریچروں کے ہم پلہ ہو سکے، وہ شبلی کی ذات تھی، بے شک آزاد نے اشخاص کے حالات زندگی لکھے اور حالی نے اسے ترتیب دیکر ایک فن کی صورت میں کر دیا لیکن شبلی نے اس فن کو جس درجۂ کمال پر پہنچایا، اس کا ثبوت "الفاروق" "سیرۃ النبی" اور "الغزالی" دیکھتی ہیں۔ آزاد نے اردو

اور فارسی شاعری کی تاریخ اور شعرا کے حالات لکھے، حالی نے شعر و شاعری پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے لکھا، لیکن شبلی نے چار جلدوں میں "شعر العجم" اس مورخانہ اور فلسفیانہ نقطۂ خیال سے لکھی جسکے آگے آزاد کی "سخندان فارس" اور "آب حیات" اور حالی کا "مقدمہ" دبکر رہ گیا۔ آزاد و حالی نے اپنے بعض مخصوص شعرا کو لیکر "دیوان ذوق" اور "یادگار غالب" ترتیب دیا لیکن ذوق و غالب اپنے اپنے مرتبہ سے ایک انچ آگے نہ بڑھے۔ شبلی نے جب "موازنہ" لکھا تو انیس کی تمام عالم میں ایک دھوم مچ گئی۔ نذیر احمد نے اگر کسی سنجیدہ مضمون کو ہاتھ لگایا تو مذہب کو لیا اور وہ بھی خدمت دین کے خیال سے۔ لیکن شبلی نے مذہب کو ہاتھ لگایا تو اسوقت جبکہ وہ مغربی علوم اور سائنس کے نرغہ میں تھا انھوں نے "علم الکلام" اور "الکلام" اسی غرض سے لکھی کہ مذہب کو اس کے ان دشمنوں سے بچائیں۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان تصانیف نے اس سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچایا جتنا نذیر احمد کے ترجمۂ قران اور "الحقوق والفرائض" سے ہوسکتا تھا۔ شبلی نے ایک اسلام پر اسقدر لٹریچر فراہم کردیا، جتنا ان کے دیگر معاصرین نے کسی چھوٹے سے چھوٹے مضمون پر بھی نہیں کیا۔ اور اس بنا پر اردو اپنی فارسی اور عربی بہنوں کے مقابلہ میں جسقدر ناز کرے کم ہے۔ اسلام عرب سے اٹھا، فارس اس کا عرصہ تک مسکن تھا لیکن اس کے متعلق اسقدر گرانبہا سرمایہ مرتب صورت میں عربی و فارسی میں غالباً نہ ہوگا، جتنا اس ایک اردو میں ہے اور یہ سب شبلی کا طفیل ہے۔ غرض۔

ادب کا دیکھا ہو یا تمھیں تاریخ کا مخزن + تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھو

سعید انصاری، علی گڈھ ۱۳ر جنوری ۲۵ء

کلام حالی

مولانا حالی کی متفرق نظمیں جو بیحد مقبول ہیں
شکوہ ہند بیوہ کی مناجات۔ عرض حال
مسدس ٹنگ خدمت مناظرہ رحم و انصاف
حب وطن چپ کی داد بیکسے کا مناظرہ
(خریداران الناظر کے لیے تین چوتھائی قیمت)

مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر و انشاپرداز و فلسفی
مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم
جسے اردو میں اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ خیالات
کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا۔ قیمت ۴ر
(خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

کلام اقبال

ڈاکٹر اقبال کی مقبول عام نظمیں:-
شکوہ۔ جواب شکوہ۔ شمع و شاعر
بلال۔ فریاد امت۔ تصویر درد
(خریداران رسالہ کو تین چوتھائی قیمت پر)

مسلمانان اندلس

نامور مورخ اسٹینلی لین پول کی کتاب
مورس ان اسپین کا اردو ترجمہ از مولوی
سید عبد الغنی وارثی قیمت ۱۲ر
(خریداران رسالہ سے ۹ر)

خوان دعوت

لڑکیوں کو کھانا پکانا سکھانے کیلیے
م۔ ب صاحب لکھنوی نے افسانہ کے دلکش
پیرایہ میں یہ کتاب مرتب کی ہے جسمیں
باورچی خانہ کے ضروری انتظامات
اور عمدہ و لذیذ کھانوں کی مجرب
ترکیبیں ذاتی تجربہ کی بنا پر تحریر
کی ہیں۔
قیمت ۸ر
(خریداران رسالہ کے لیے ۶ر)

تذکرہ حزیں

مشہور شاعر شیخ علی حزیں۔ جو ایران
سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے
انکی لکھی ہوئی سوانح عمری قیمت ۴ر
(خریداران رسالہ سے ۳ر)

دلچسپ مختصر افسانے

ایک نامدار خدا پرست اور دنیادار کی
کہانی اور مساوات۔ از منشی سلطان
حیدر جوش اور اتفاقات زمانہ
(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

حیات نظامی

مشہور شاعر حضرت نظامی گنجوی
کی سوانح عمری۔
قیمت ۴ر
(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

جمیل و بثینہ

عرب کے حسن و عشق کا
دلچسپ افسانہ
قیمت ۳ر
(خریداران الناظر کے لیے ۲ر)

عورتوں کی انشا

خواتین اور انکی صاحبزادیوں کو خطوط
نویسی سکھلانے والی کتاب بمصنفہ بیگم
صغرا علی صاحبہ۔ قیمت ۸ر
(خریداران رسالہ کے لیے ۶ر)

مصنوعی شوہر

انقلاب ایران کی ایک ظریفانہ داستان
ہنستے ہنستے لوٹ جائیے گا۔
قیمت ۲ر
(خریداران الناظر کے لیے ۱ر)

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مسلمانوں کی تہذیب

یعنی مسلمانوں کی تمدنی ترقی کے متعلق نواب محسن الملک مرحوم کا ایک فاضلانہ لکچر۔ ۴ر

قیمت ۶ر

(خریداران الناظر سے ۵ر)

میلاد النبی

مشہور محدث حضرت ابن جوزی کے رسالہ کا اصل عربی متن کے مقابل اس کا نہایت فصیح اردو ترجمہ۔

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین بھلوی مرحوم جس میں لفظ صوفی کی تحقیق تصوف کی ابتدا اور اسکی درجہ بدرجہ ترقیوں کا ذکر ہے اور آخر میں تصوف کے تمام شعبوں کو اسلام سے تطبیق دیگئی ہے

قیمت ۸ر (خریداران رسالہ کے لیے ۵ر)

مقدمہ شعر و شاعری

مولانا حالی نے اپنے دیوان کے شروع میں جو لاجواب مقدمہ لکھا تھا وہ دوسرے ایڈیشن کے وقت ایڈیٹر الناظر نے دیوان سے علحدہ کرکے چھاپا۔ جس میں شعر کی حقیقت ماہیت اور شاعری کے اصول مسائل پر بحث کرکے اردو شاعری پر ایک بسیط تبصرہ لکھا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر خریداران رسالہ سے ۸ر

خطاب

(از ملا جی)

سرکاری خطابات کے آرزومند کوشش کرنے سے پہلے اسکو ملاحظہ فرمالیں ۴ر

(خریداران الناظر کیلئے ۳ر)

ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار و تاریخ مولفہ مسٹر عنایت اللہ بی اے رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۴ر

(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

وکرم اروسی

مترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم۔ یہ کالی داس کے مشہور معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے جس میں لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ اضافہ کیا ہے اور ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر بحث کی ہے اور کالی داس کا موازنہ شیکسپیر اور سیر نیشن وغیرہ سے کیا ہے۔ قیمت ۱۲ر خریداران الناظر سے ۸ر

تسخیر فرانس

شکسپیر کے لاجواب ڈرامہ ہنری دی ففتھ کا اردو ترجمہ۔ از منشی تفضل حسین صاحب ناظر۔ قیمت ۸ر

(خریداران الناظر کے لیے ۶ر)

سفرنامہ مصر و شام و روم

مولانا شبلی کا مشہور سفرنامہ جو ان ممالک کے متعلق بہترین تاریخی علمی معاشرتی معلومات فراہم کرتا ہے۔ قیمت ۱۲ر

(خریداران الناظر کے لیے ۸ر)

میکفرن اور لوسی

حضرت شوق قدوائی کا لاجواب ڈراما

قیمت ۲ر

(خریداران الناظر سے ۱ر)

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ